سلگتے معاشرتی مسائل و ناہمواریوں کا آئینہ اور خاندان کی اسلامی تربیت کیلئے بہترین راہنمائی

قلم کے آنسو

جلد اوّل

ہفت روزہ غزوہ میں شائع ہونیوالے تعاقب کے
منتخب کالموں کا مجموعہ

محمد طاہر نقاش

بسم اللہ الرحمن الرحیم

DR. A. Q. KHAN
N I & BAR, HI

"Mountain View"
Islamabad
Pakistan

Date: ۱۹ اکتوبر ۲۰۰۸ء

برادرم جناب محمد لقاش صاحب کی تحریر کردہ کتاب "قلم کے آنسو" پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ جب شروع کی تو ختم ہونے تک ہاتھ سے رکھنے کو جی نہیں چاہا۔

جس طرح قرآن شریف اور اس کی تفسیر کے بعد صحیح بخاری شریف، سیرت النبی، تاریخ اسلام، تذکرۃ الاولیاء، بہشتی زیور وغیرہ ہر مسلمان گھرانے میں لازمی طور پر ہونا چاہئیں بالکل اسی طرح محمد لقاش صاحب کی لاقیمت، بے انتہا مفید کتاب "قلم کے آنسو" بھی ہر مسلمان گھر کی زینت ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ لقاش صاحب کے قلم میں مزید قوت عطا فرمائے تا کہ مزید مسلمان امت کی خدمت کر سکیں۔ آمین۔

احقر: ڈاکٹر عبدالقدیر خان

۱۹ اکتوبر ۲۰۰۸ء، اسلام آباد

محسن پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خان کا "قلم کے آنسو" کے متعلق تاثر و تبصرہ کا تحریری عکس

قلم کے آنسو

کتاب وسنت کی اشاعت کا مثالی ادارہ

جملہ حقوق اشاعت برائے دارالابلاغ محفوظ ہیں

قلم کے آنسو

جلد اول

تالیف .... محمد طاہر نقاش

اشاعت اول .... دسمبر 2006ء

اشاعت دہم .... دسمبر 2010ء

پاکستان میں ہماری کتب مندرجہ ذیل اداروں سے مل سکتی ہیں

دارالابلاغ پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز

رحمان مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور۔ فون: 0300-4453358, 042-37361428

ن والقلم وما یسطرون
قسم ہے
قلم کی اور جو وہ لکھتے ہیں

آئینہ

قلم کے آنسو

قلم کے آنسو

محسن پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے ہاتھ میں

بندۂ ناچیز کی اس تالیف کو اللہ کریم نے بے پناہ مقبولیت بخشی۔ جونہی کتاب شائع ہوکر منظر عام پر آئی پہلا ایڈیشن ایک ماہ جبکہ دوسرا دس دن میں ختم ہوگیا۔ اس کے بعد تیسرا اور پھر چوتھا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ ختم ہوا۔ پھر کتاب بلیک میں منہ مانگے داموں فروخت ہوتی رہی۔ اس کو ہفت روزہ غزوہ نے رپورٹ بھی کیا۔ فللہ الحمد

کتاب کو ملک کی مقتدر شخصیات نے پڑھا اور نہایت پسند کیا۔ ان شخصیات میں ایک ایسی ہستی کا بھی نام آیا کہ جسے سن کر مجھے یقین نہ آیا۔ لیکن مجھ سے محبت کرنے والے ایک خاص دوست نے ہر طرح یقین دلایا اور کہا کہ میں خود ڈاکٹر عبدالقدیر خان صاحب حفظہ اللہ کو ملا ہوں اور میں نے قلم کے آنسو کو ان کے زیر مطالعہ پایا۔ وہ اس سے بہت متاثر ہوئے، پھر آبدیدہ بھی ہوئے۔ ان کو کتاب اس قدر پسند آئی کہ جب انھوں نے پڑھنی شروع کی تو پھر اس وقت تک نہیں چھوڑی جب تک ختم نہیں ہوگئی۔ یوں انھوں نے صرف دو دن میں قلم کے آنسو پڑھ ڈالی اور کمال محبت اور بڑے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے قلم سے اپنے جذبات اور تاثرات کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنے کے بعد آپ کو بھیجنے ہی والے ہیں۔

مجھے اس دوست کی بات پر یقین نہ آیا کہ کہاں میں بندۂ ناچیز اور کہاں محسن پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خان !!!...... ایک ذرے کو آفتاب سے کیا نسبت! ...... لیکن یہ کیا!! واقعی چند دن بعد وہ دوست ڈاکٹر صاحب کا خط لے کر میرے پاس پہنچ گئے۔ میں نے اپنے ہیرو...... محبوب اور محسن پاکستان کے ہاتھوں سے لکھے گئے اپنے نام خط اور تحریر کو چوم کر سینے سے لگا لیا۔ میرا یہ دوست بتانے لگا کہ ڈاکٹر صاحب فرما رہے تھے کہ اس سے قبل ماضی قریب میں میں نے نسیم حجازی رحمہ اللہ کی ایک کتاب پر تاثر لکھا تھا۔ اس وقت ابھی میں نے ایٹم بم نہیں بنایا تھا۔ اس کے ایک عرصہ بعد آج میں نے برادرم نقاش صاحب کی کتاب پر اپنے محسوسات کو قلم بند کیا ہے۔ یوں میری زندگی میں یہ دوسری کتاب ہے جس پر میں نے متاثر ہوکر اپنے جذبات وخیالات پر مبنی تبصرہ کیا ہے۔

مجھے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ پاکستان میں احقر کی کتاب کو جس نے تمام مصروفیات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے...... سب سے تیز سپیڈ...... دلچسپی ودلجمعی اور کمال محبت سے پڑھا ہے اور دعائیں بھی دیں وہ ہستی ڈاکٹر عبدالقدیر خان حفظہ اللہ ہیں۔ یہ یقیناً ان کا بڑا پن ہے ورنہ بندہ اس قابل کہاں، اور اصل

میں یہ سب اللہ احکم الحاکمین کی کرم فرمائیاں ہیں۔

راقم ڈاکٹر عبدالقدیر خان ﷾ کی اپنے متعلق ان یادوں باتوں، احساسات اور اپنے قلم سے لکھے گئے تاثرات کو اپنی نسلوں کے لیے سرمایہ افتخار سمجھتا ہے۔ اپنی خوش قسمتی و خوش بختی تصور کرتا ہے۔ باعث فخر و صد افتخار قرار دیتا ہے۔ میں خود بھی ان کو اپنی دعاؤں میں ہر دم یاد رکھتا ہوں اور اپنے قارئین سے بھی درخواست کروں گا کہ ان کی صحت و حفاظت کے لیے ہر وقت دعا کرتے رہیں۔ میں یہاں پہ ڈاکٹر صاحب کی رہائی کے حوالے سے محسن پاکستان فاؤنڈیشن کی شاندار خدمات کو بھی خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں۔

ڈاکٹر صاحب نے وہ دشمن جو پاکستان کو تباہ و برباد کر دینا چاہتے تھے، ان کی سازشوں سے ایٹم بم بنا کر وطن عزیز کو محفوظ و مامون بنایا، یوں پاکستان کو ناقابل تسخیر قوت بنا دیا۔ آج ہم اس ہستی کو اپنی آنکھوں کا تارا بنانے، اپنے سروں پر فخر کا تاج بنا کر پہننے کی بجائے، ان کو مجرموں کی طرح قید کر چکے ہیں۔ اللہ کریم ہمیں اور ہمارے حکمرانوں کو ہندوستان کی مثال کو سامنے رکھ کر سبق حاصل کرنے کی توفیق بخشے، کہ جنھوں نے ایٹمی میزائل پروگرام کے سائنسدان عبدالکلام کو اپنے ملک کا صدر بنا دیا۔ ہم بھی ڈاکٹر صاحب کو پہنچائے گئے زخموں اور چرکوں کو کسی ایسے ہی عزت افزائی کے رویے سے مندمل کرنے کی کوشش کریں۔ شاید اللہ کریم ہمیں اس جرم کی معافی دے دیں ورنہ تاریخ ہمیں کبھی معاف نہ کرے گی، اور ''احسان فراموش و محسن کش'' کے نام سے اپنے اوراق میں رہتی دنیا تک کے لیے محفوظ کر دے گی۔ اللہ کریم سے دعا ہے کہ وہ ڈاکٹر صاحب کو جلد از جلد صحت کاملہ و عاجلہ عطا فرمائے۔ آمین۔ اور وہ اے کیو خان ریسرچ لیبارٹریز میں اسی شان سے اور اسی آن سے دوبارہ امت مسلمہ کی سربلندی و دفاع کا کام، قرآن کریم کے اس حکم کو سامنے رکھ کر شروع کر سکیں: ﴿ وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ ﴾

''اور دشمنوں کے لیے اپنی طاقت کے مطابق قوت (اسلحہ وغیرہ) جمع و تیار کیے رکھو۔''

آخر میں میں محسن پاکستان سے عرض کرتا ہوں کہ ہم اپنے حکمرانوں کے آپ پر روا رکھے گئے ظلم و زیادتیوں پر شرمندہ ہیں...... ہم آپ کا احسان کبھی نہیں بھول سکتے ...... امت مسلمہ کو سر بلند ہو کر جینے کی ہمت و حوصلہ و توانائی ایٹم بم کی صورت میں فراہم کرنے پر...... ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ...... اس کا بدلہ ہم آپ کو دنیا میں دینا بھی چاہیں تو نہیں دے سکتے...... اس کا بدلہ آپ کو صرف اللہ کریم ہی دے سکتا ہے...... اور وہ ضرور دے گا...... جنتوں میں درجات کی بلندی کی صورت میں......!! اللہ کریم! آپ کو اس قدر بلند و روشن کر دیں گے کہ ساری دنیا آپ کو چڑھتے سورج کی مانند دیکھے گی۔ ان شاء اللہ

خادم کتاب و سنت

محمد طاہر نقاش

۱۲ نومبر ۲۰۰۸ء لاہور

انتساب

○ کہ جن کے گلشن محبت کی بھینی بھینی خوشبو نے...... میری سانسوں کو مہکا رکھا ہے!

○ جن کے خوشبوؤں و الفتوں بھرے تحائف نے میری زندگی کو......
الفت و چاہت اور پیار کے قوس قزاح کے سے رنگوں سے رنگین......
اور بے لوث جذبوں سے معمور کر رکھا ہے!

○ کہ جس کی محبت کی رم جھم بارش میں میں آج تک...... سیراب وشاد کام ہو رہا ہوں!

آنسو

وہ پانی کا اک قطرہ سا
جب آنکھ میں آ کے رک جائے
اک موتی بن کر بہہ جائے
اور سب کچھ ہی وہ کہہ جائے

من موہنا کتنا پیارا ہے
وہ میری آنکھ کا تارا ہے
جو دیکھے، دیکھتا رہ جائے
اور سب کچھ ہی وہ کہہ جائے

یاں گھپ اندھیری راتوں میں
تنہائیوں میں سناٹوں میں
میرے ساتھ اکیلا رہ جائے
اور سب کچھ ہی وہ کہہ جائے

دکھوں کے بھرے سمندر میں
وہ پانی کا اک قطرہ سا
جب آنکھ میں آ کے بہہ جائے
اور سب کچھ ہی وہ کہہ جائے

حرفِ تمنا

تب سے اب تک

جونہی میں اسلام آباد سے وفاق المدارس کا امتحان دے کر لاہور مرکز واقع موچی دروازہ پہنچا تو حافظ محمد سعید ﷾ امیر جماعۃ الدعوۃ پاکستان سے ملاقات ہوگئی۔ انہوں نے ملتے ہی پوچھا: طاہر کیا کر رہے ہو؟ میں نے کہا: ابھی اسلام آباد سے امتحان دے کر واپس آ رہا ہوں' سمندری اپنے گھر والدین کو ملنے کے لیے جانے کا ارادہ ہے۔ پوچھنے لگے: اس کے بعد کیا کرنے کا ارادہ ہے؟ میں نے کہا: مزید پڑھنے کا۔ مزید پڑھ کر کیا کرو گے؟ میں نے کہا: دین کی خدمت کروں گا۔ یہ سنتے ہی کہنے لگے: اگر تمہیں ابھی دین کی خدمت کا موقعہ مل جائے تو؟...... میں نے کہا: میں سمجھا نہیں! تو کہنے لگے کہ سامنے مجلّۃ الدعوۃ کا کمرہ ہے' وہاں میز اور کرسی تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ مجلّۃ الدعوۃ کا کام سنبھال لو اور دعوت کے فریضے کو ادا کرو۔ آج سے یہی تمہاری ڈیوٹی ہے۔ میں نے بہت ادھر ادھر ہونے کی کوشش کی لیکن انہوں نے صاف کہا کہ اگر تم مجھے امیر مانتے ہو تو پھر ابھی سے قلم سنبھال کر کام شروع کر دو۔ میں نے کہا: میں امتحان کا عرصہ اسلام آباد گزار کر آیا ہوں' مجھے چند دن کے لیے گھر والوں سے ملنے کے لیے جانے دیں۔ حافظ صاحب کہنے لگے: ابھی ادھر ہی بیٹھو' کام کرو' پندرہ بیس دن بعد گھر بھی چکر لگا آنا۔ میں اپنے دل و جان سے پیارے امیر کا حکم مان کر مجلّۃ الدعوۃ میں محترم امیر حمزہ صاحب کی رفاقت میں قاضی کاشف نیاز کی مصاحبت میں پہلے سے لگی میز پر بیٹھ کر قلم چلانے لگا۔

اس سے قبل میں کچھ تحریریں دوران تعلیم لکھ کر مجلّہ میں بھیج چکا تھا۔ جس میں سے ایک عربی سے اردو ترجمہ ''جس نے حج کیا کافر و مرتد ہوگیا'' ٹائٹل سٹوری کی حیثیت سے شائع ہو چکا تھا۔

چونکہ میری طبیعت جمود پسند نہ تھی' ٹیبل ورک سے کوسوں دور بھاگتی تھی' میں باہر کھلی فضاء میں نکل کر کچھ کرنا چاہتا تھا' لہٰذا امیر حمزہ صاحب مجھے افغانستان' مالاکنڈ' دیر' پشاور' سندھ اور ملک کے دوسرے حصوں میں بھیجنے لگے۔ میں وہاں پہنچ کر مشاہدہ کرتا اور پھر لاہور پہنچ کر اپنے مشاہدات' تجربات' محسوسات و معلومات کو سپردِ قلم کر کے صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیتا۔

یوں فروری ۱۹۹۲ء سے لے کر دسمبر ۱۹۹۶ء تک کا عرصہ گزرا کہ والد صاحب فوت ہو گئے۔ مجبوراً مجھے مجلّہ چھوڑ کر کچھ عرصہ کے لیے اپنے آبائی شہر سمندری (ضلع فیصل آباد) جانا پڑا۔ اس موقعہ

پر محترم امیر حمزہ صاحب نے مجھے کہا کہ والد کی وفات کے بعد تم مجھے اپنا بڑا بھائی سمجھو۔ آج کے بعد اپنے آپ کو کسی بھی جگہ اکیلا نہ سمجھنا بلکہ اللہ کی رحمت سے تمہارا بھائی دامے درمے قدمے اور سخنے تمہارے ساتھ ہمرکاب سفر ہوگا۔ تم دعوت دین کے کام کو پھیلانے اور تندہی سے کرنے کے لیے اپنے والد کا کاروبار سمیٹ کر لاہور چلے آؤ۔ اللہ تعالیٰ دین کی برکت سے سب کچھ دے دے گا۔ ان شاء اللہ۔

لہٰذا میں اپنا آبائی قصبہ سمندری چھوڑ کر مستقل طور پر لاہور آ گیا۔ جناب حمزہ صاحب میرے بہت قریبی دوست اور بڑے بھائی کی حیثیت سے از روئے محبت دل میں گھر کر چکے تھے' میں ان سے مزید بہت کچھ سیکھنا چاہتا تھا' اس لیے خواہش تھی کہ مریدکے میں ان کے گھر کے قریب ہی کہیں گھر لے کر رہوں۔ میں وہاں مکان کا بندوبست کر ہی رہا تھا کہ وہ مریدکے چھوڑ کر مستقل سکونت کے لیے لاہور چلے آئے۔ لہٰذا میں نے بھی لاہور میں مستقل رہائش اختیار کر لی۔ اب دن رات ایک ساتھ کام کرتے بہت مزہ اور لطف آتا۔ حمزہ صاحب سے میری محبت' دوستی اور قلمی رفاقت اس قدر زیادہ ہو گئی کہ دنیا والے ہمیں دو بھائیوں کی حیثیت سے پہچاننے لگے۔ یہ اسی بات کا ثبوت تھا کہ انہوں نے اپنی تمام کتب کی ایڈیٹنگ تحقیق اضافہ اور اضافہ شدہ مصور ایڈیشن تیار کرنے کے لیے مجھ سے کہا۔ میں نے شروع سے لے کر 1998ء تک پوری جانفشانی اور رات دن ایک کر کے ان کی کتب کے اضافہ شدہ ایڈیشن سالانہ اجتماع سے پہلے پہلے تیار کر دیے۔ حمزہ صاحب کا برادر نسبتی محمد طیب کہنے لگا: طاہر بھائی آج تک حمزہ صاحب کی کتاب ''آسمانی جنت'' کے 7 سال میں 8 ایڈیشن شائع ہوئے تھے لیکن آپ کی تیار کردہ کتاب اس قدر پسند کی گئی ہے کہ اس کے ایک سال میں دس ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور ڈیمانڈ مسلسل جاری ہے۔ میں سمجھتا ہوں اس میں جہاں میرے منفرد تحقیقی کام کا دخل تھا وہاں اصل محرک ان کی دل پذیر تحریر اور توحید کی خوشبو میں رچی بسی فکر تھی۔ طیب بھائی نے بتایا کہ آپ کی تیار کردہ دیگر کتب کی اشاعت کا بھی یہی حال ہے۔ حقیقت میں اس میں میرا کوئی کمال نہ تھا بلکہ یہ صرف اللہ کا کرم اور توحید سے محبت کی برکت تھی۔

یوں امیر محترم کے حکم سے چلایا گیا قلم امیر حمزہ صاحب کی محبت کے زیر سایہ اور قاضی کاشف نیاز صاحب کی رفاقت میں جنوری ۲۰۰۱ء تک چلتا رہا۔ فللّٰہ الحمد! جنوری ۲۰۰۱ء میں امیر حمزہ صاحب نے مجلّۃ الدعوۃ کا آخری دعوت و اصلاح بعنوان ''الحمد للہ! آج مجلّہ کی اشاعت ایک لاکھ دس ہزار ہو گئی'' لکھا اور پھر اس کے بعد امیر محترم کے حکم سے ہماری (راقم اور حمزہ صاحب کی) ذمہ داری ہفت روزہ غزوہ میں لگا دی گئی۔ یہاں عبداللہ منتظر' علی عمران شاہین اور عبدالوارث ساجد جیسے بھائیوں نے بہت محبت و احترام دیا اور ہم سب نے مل کر نئے انداز میں کام کرنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی باہمی مشاورت سے غزوہ کو بلیک اینڈ وائٹ سے فور کلر (رنگین) کر دیا گیا۔ اب اس میں حمزہ صاحب کے

ساتھ ساتھ میرا کالم بھی شائع ہونے لگا۔ کچھ ماہ بعد غزوہ کی اشاعت معمول سے بڑھ کر ایک لاکھ پچھتّر ہزار (1,75000) ہوگئی۔ فللّٰہ الحمد

غزوہ میں ذمہ داری کے ابتدائی دنوں میں عبداللہ منتظر بھائی نے کہا: طاہر بھائی! آج آپ بھی کالم لکھیں۔ میں نے کہا: بھئی میں تو مجلّہ میں لمبے لمبے مضامین لکھنے کا عادی ہوں مختصر سا کالم لکھنا شاید مشکل ہو۔ کہنے لگے: آپ جو بھی لکھیں گے ہم شائع کریں گے۔ میں نے ان کے خلوص محبت اور عزت وتکریم کے جذبے کو دیکھ کر کرسی اٹھائی اور کمرہ سے باہر آ کر صحن کے اندر دھوپ میں بیٹھ کر قلم چلانا شروع کر دیا۔ جب قلم رکا تو دیکھا کہ ایک کالم تیار تھا۔ میں نے عبداللہ بھائی کو دیا انہوں نے شائع کر دیا۔

جونہی یہ مختصر کالم شائع ہوا تو اللہ کی رحمت سے اس نے مقبولیت کے ریکارڈ قائم کر دیے۔ مجھے عبداللہ بھائی نے بتایا کہ کراچی میں کسی نے اس کالم کی ۵ ہزار فوٹو کاپیاں تقسیم کی ہیں۔ اس طرح اور لوگوں نے بھی ایسا کیا ہے۔ پھر علی عمران شاہین بھائی نے بھی بتایا کہ ملتان' فیصل آباد' لاہور اور دیگر شہروں میں کالم شائع ہو کر خوب تقسیم ہو رہا ہے۔ پھر میں نے لاہور میں لوگوں کو چھپوا کر عوام میں تقسیم کرتے خود بھی دیکھا۔ اس کے علاوہ اسے اخبارات نے بھی ہفت روزہ غزوہ سے اخذ کر کے شائع کیا۔ خاص طور پر ضرب مومن' روزنامہ اسلام وغیرہ' اسی طرح دیگر ہفت روزوں اور ماہناموں نے بھی اسے خصوصی طور پر شائع کیا۔ عبداللہ بھائی مسکرا کر کہنے لگے: لو طاہر بھائی! آپ کا تو پہلا ہی کالم ہٹ ہو گیا۔ اگرچہ مجھے ذاتی طور پر اس کے ساتھ کلی طور پر اتفاق نہیں تھا لیکن افادہ عام کے لیے شائع کر دیا۔ اس مشہور کالم کا نام تھا...... ''آخری ہیپی'' ...... جو اس کتاب میں شامل ہے۔ اس کے بعد ''لڑکیاں گھروں سے کیوں بھاگتی ہیں'' اور ''لڑکیوں کو آشناؤں کے ساتھ بھگانے والی عدالتیں'' والے کالموں کے متعلق بھی دیگر لوگوں کے علاوہ عبداللہ منتظر بھائی نے ہی بتایا کہ ملک میں اس کی فوٹو کاپیاں تقسیم ہوئیں۔ خاص طور پر حیدرآباد کے تعلیمی اداروں اور ہوسٹلوں میں۔ پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ فللّٰہ الحمد

محترم ومکرم قارئین کرام...... ! ...... نہ میرے قلم میں اتنی جان تھی ...... نہ میں کوئی بہت بڑا ادیب ہی تھا ...... نہ ہی میں نے جرنلزم کی کوئی بہت بڑی ڈگری لے رکھی تھی ...... اور نہ ہی مجھے کسی اخبار میں باقاعدہ کام کرنے کا تجربہ تھا ...... تو پھر یہ سب کیا تھا!! ...... یہ عزتیں' یہ رفعتیں ...... یہ قلم کے نقوش کی مقبولیت کے سلسلے ...... میرے بھائیو! ...... بغیر لگی لپٹی کے ...... سیدھی بات ہے' یہ صرف اور صرف مجھ ناچیز پر اللہ کریم کا فضل وکرم اور احسان عظیم تھا ...... اس کی رحمتوں کی برکھا تھی ...... جو مجھ ناچیز پر رم جھم رم جھم برس رہی تھی ورنہ مجھ میں تو ایسی کوئی بات نہ تھی۔ اللہ کریم کی طرف سے بندہ عاجز کے کالموں کی یہ پذیرائی ہر دلعزیزی اور پسندیدگی کو دیکھتے ہوئے محترم امیر حمزہ صاحب نے مجھ سے کہا

کہ آپ آج کے بعد مستقل طور پر معاشرتی ایشوز پر لکھیں۔ لہٰذا میں نے حکم کی تعمیل میں ایسا ہی کیا اور معاشرے میں اپنی حساس طبیعت کے ساتھ جو دیکھتا' محسوس کرتا' دل کھول کر لوگوں کے سامنے رکھ دیتا۔ کالم کی اشاعت کے بعد قارئین کی ٹیلی فون کالوں کا تانتا بندھ جاتا۔

شروع دن سے احباب کا مطالبہ تھا کہ اپنے کالموں کو کتابی شکل دے دیں تاکہ دعوت واصلاح اور تربیت کے کام آ سکے۔ گزشتہ برس جب میں سعودیہ گیا تو ریاض کے بھائی امین نے کہا: ہم اپنے دوستوں کو آپ کا کالم ای میل کر کے بطور تحفہ بھیجتے ہیں۔ اگر یہ سب کالم کتابی شکل میں آ جائیں تو کیا ہی اچھا ہو۔ اسی طرح کے جذبات کا اظہار مجھ سے جدہ' مکہ اور مدینہ شریف کے احباب نے کیا۔ کتنی ہی دفعہ جماعۃ الدعوۃ کے مسئولین نے بھی اس خواہش کا اظہار کیا لیکن ان سب مطالبوں کو لوگوں کی اپنے ساتھ محبت سمجھتا رہا اور ان کا یہ مطالبہ سن کر یہ سوچنے لگتا کہ میں کون سا کوئی بہت بڑا کالم نگار اور ادیب ہوں کہ جس کی تحریروں کو کتابی شکل دے کر عوام کے سامنے لایا جائے۔ لوگ ''تعاقب'' کے نام سے ہفت روزہ غزوہ میں شائع ہونے والے کالموں کا بے چینی سے انتظار کرتے اور مجھے ہر دفعہ ڈھیر ساری دعائیں دیتے۔ لیکن میں نے کبھی بھی اپنے کالموں کو جمع کرنے والے مسئلہ کو اہمیت نہ دی۔ حتیٰ کہ مجھے پاکستان کے معروف سکالر' ادیب اور مداح صحابہ ابوضیاء مولانا محمود احمد غضنفر ﷾ اور میرے بہترین دوست مربی اور بھائی امیر حمزہ چیف ایڈیٹر ہفت روزہ غزوہ نے بھی کہا کہ نقاش صاحب! آپ اپنے کالموں کو جمع کر کے کتابی شکل میں شائع کریں۔

اس دوران مجھ پر یہ انکشاف بھی ہوا کہ محض اللہ کی رحمت سے بعض محبت کرنے والے میرے کالموں کو خاص اہتمام سے البم کی شکل میں سجا کر ترتیب سے رکھتے ہیں۔ جس نے بھی مجھے کوئی ایسا واقعہ بیان کیا میں نے اس کو صرف کمال محبت پر محمول کیا اور دل میں کہا کہ یہ مجھ سے محبت کا انداز ہے ورنہ اتنا ٹائم کس کے پاس ہے کہ وہ میرے کالموں کو سجا سنوار کر جمع کرتا پھرے' پھر ان کی البم بناتا پھرے ہاں یہ جو لوگ بتاتے ہیں ان کو جھٹلا بھی نہیں سکتا۔ اس لیے کہ ممکن ہے کسی نے اپنی پسند کے دو چار کالم جمع کر لیے ہوں۔

پانچ ماہ قبل مجھے ایک بھائی اکمل شاہ ملا جس کی کبھی سکھر ایئرپورٹ پر جبکہ آج کل لاہور ایئرپورٹ پر ASF (ایئرپورٹ سیکیورٹی فورس) میں ڈیوٹی ہے۔ اس نے تفصیل سے اپنی محبت بھری کہانی سنا کر حیران کر دیا۔ مختصراً اس نے بتایا کہ اس کی عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کے ساتھ گہری فرینڈ شپ تھی۔ خط و کتابت تھی۔ تحفے تحائف اور خاص مواقع پر تہنیت کے کارڈ اور عید کے مواقع پر عید کارڈ وغیرہ بھی ایک دوسرے کو بھیجتے تھے۔ میرے جنون کا عالم یہ تھا کہ میں اکثر اوقات اس کے گانے سنتا رہتا۔ میرے پاس اس کے گانوں کے تمام والیم موجود تھے۔ اچانک میں نے غزوہ کا مطالعہ شروع کیا تو مجھے آپ کا کالم اچھا لگا۔ اب میں مستقل طور پر پڑھنے لگا۔ آخر آپ کے کالموں کے مطالعہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ

مجھے عیسیٰ خیلوی سے بیزاری ہوگئی۔ میں نے اس کے گانے سننے بند کر دیے۔ پھر خط و کتابت بھی بند، دوستی ختم۔ اس کی تصویریں پھاڑ ڈالیں اور پھر ہمیشہ کے لیے اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ اب میرا مشغلہ یہ ہوگیا کہ میں آپ کے کالم کا ہفتہ بھر انتظار کرتا' جب اخبار آتا تو مطالعہ کر کے آپ کے کالم کو اپنے البم کی زینت بناتا۔ آپ کے کالموں نے مجھ میں بہت بڑی مثبت تبدیلی پیدا کر دی ہے' میں نے عیسیٰ خیلوی سے دوستی ترک کر دی ہے' اب اللہ کی رضا کی خاطر آپ سے دوستی کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے بہت خوشی ہوئی۔ خاص طور پر اس کی زندگی کے لائف سٹائل کی تبدیلی پر۔ لیکن معذرت کے ساتھ کہوں گا کہ میں نے اپنی سابقہ سوچ کے مطابق اس کو صرف محبت کا ایک رنگ قرار دیا اور سوچا کہ بھائی نے دیگر احباب کی طرح محبت میں آ کر مبالغہ آرائی کی ہے' حقیقت میں ایسا نہیں ہوسکتا۔

اب یہ بھائی قادسیہ میں جمعہ پڑھنے آتے اور ملک بھر کے دیگر محبین کی مانند مطالبہ کرتے کہ آپ اپنے کالموں کو کتابی شکل میں شائع کریں' میں دوستوں کو گفٹ کرنا چاہتا ہوں۔ ویسے بھی لوگوں کو بہت فائدہ ہوگا۔ میں ان کو مسلسل ٹالتا رہا۔ جب ان کا دوسرے لوگوں کے ساتھ مسلسل اصرار بڑھا تو میں نے یہ کہہ کر جان چھڑائی کہ میں کالم لکھتا ہوں اور بھول جاتا ہوں' نہ میرے پاس کوئی ریکارڈ ہے نہ مجھے پتہ ہے کہ میں نے کتنے اور کون کون سے کالم لکھے ہیں۔ اور میں اب اپنے سارے کالم کہاں سے لاؤں؟ اس بھائی نے جھٹ سے جواب دیا: آپ پریشان نہ ہوں' میں نے جو آپ کے تمام کالم جمع کر رکھے ہیں' آپ وہ البم منگوا کر کمپوز کروالیں اور میرا ریکارڈ مجھے واپس کر دیں۔ اب مجھے حامی بھرنے کے علاوہ جان چھوٹتی نظر نہ آئی لیکن میں اب تک ان کی باتوں کو مبالغہ ہی تصور کرتا رہا۔

ہفت روزہ غزوہ کے اکاؤنٹنٹ بھائی خالد محمود دوست چیچہ وطنی میں اس کے گھر کے قریب ہی رہتے ہیں۔ وہ گھر گئے تو اکمل شاہ نے ان کی دعوت کر دی۔ دعوت کھانے کے بعد جب خالد محمود بھائی میرے پاس دفتر آئے تو ان کی آنکھیں حیرت سے پھیلی ہوئی تھیں' کہنے لگے: طاہر بھائی! آپ کے تمام کالم سجا سنوار کر اکمل شاہ نے البم میں لگا رکھے ہیں۔ اور پھر یہ بھی بتایا کہ میں اس کے پاس عیسیٰ خیلوی کی تصاویر اور شاہ صاحب کے نام خطوط بھی دیکھ کر آیا ہوں۔ اور اس کے گانوں کی متروک شدہ کیسٹوں کا ڈھیر بھی دیکھ آیا ہوں۔ اب میں بھی حیران اور شرمندہ ہوا۔ لہٰذا میں نے عام لوگوں مسئولین' بہنوں' ماؤں' بیٹیوں' بھائیوں اور دیگر محبین کے محبت بھرے مطالبے پر عمل کرنے کے لیے کام شروع کر دیا۔ سکیم موڑ لاہور سے محترم جمیل احمد اعوان صاحب نے مجھے میرے ۷۰ فیصد کالم لا دیئے' باقی بھائی شاہد سلیم غزوہ اور خالد محمود دوست وغیرہ نے تلاش کر کے فراہم کیے۔ فجزاھم اللہ احسن الجزاء۔

کالم تمام جمع ہو چکے تھے لیکن پھر وہی مسئلہ تھا کہ سستی کاہلی کی بنا پر ان کو اہمیت نہ دیتا تھا اور شائع کرنے سے گریزاں تھا کہ میری اہلیہ محترمہ نے زور دیا کہ جب اتنے لوگ آپ کے کالموں کے مجموعے

کے منتظر ہیں' غزوہ میں اشتہار شائع ہونے کے بعد بار بار آپ کو فون کر رہے ہیں اور آپ ہیں کہ ان سے ہر دفعہ یہی کہتے جا رہے ہیں کہ ''ان شاء اللہ آئندہ ہفتہ میں شائع ہو جائے گی۔'' آپ قارئین کی محبتوں اور ان سے کیے گئے وعدوں کا پاس رکھیں اور فوری شائع کریں۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ بیوی محبوبہ نہیں بن سکتی اور محبوبہ بیوی نہیں بن سکتی...... حقیقت یہ ہے کہ میری اہلیہ نہ صرف یہ کہ میری بیوی ہے بلکہ میری محبوبہ بھی وہی ہے۔ اور اسے اس بات کا اس لیے بھی حق پہنچتا ہے کہ میں نے کتنے ہی کالموں کے لکھنے سے پہلے ان سے مشورہ کیا۔ خاص طور پر عورتوں کے کالموں کے متعلق' اس لیے کہ ایک عورت کو ایک عورت ہی بہتر سمجھ سکتی ہے۔ ویسے بھی انہوں نے مجھ پر اس قدر محبتیں نچھاور کی ہیں کہ میں ان کی محبتوں کی رم جھم بارش سے مسلسل مستفید ہو رہا ہوں۔ ان کے اعلیٰ ادبی ذوق سے میں نے خوب فائدہ اٹھایا...... کتنی دفعہ انہوں نے میرے کالموں میں استعمال ہونے والے ایک ایک لفظ پر نقد و جرح تک کی...... محض تحریر کی اثر پذیری اور تاثر کو دو چند کرنے کے لیے۔ اسی لیے میں نے اپنی اس کتاب کا انتساب بھی اپنی محبوب اہلیہ کے نام کیا ہے۔ اب اللہ کریم نے مجھے یہ کتاب آپ کے ہاتھوں میں پہنچانے کا عزم بخشا تو میں نے بھائی یوسف سراج آف دارالاندلس کے ساتھ مل کر اس کتاب کو منظر عام پر لانے کی ٹھانی۔

لہٰذا اب ایک عرصہ کی پیہم کوشش و جدوجہد کے بعد یہ کتاب ''قلم کے آنسو'' آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ مداح صحابہ مولانا محمود احمد غضنفر ﷾ نے بتایا کہ میں آپ کا ہر کالم اپنی بیگم کو پڑھ کر سناتا ہوں' میرا مشورہ ہے کہ ان مفید سبق آموز اصلاحی اور تربیتی کالموں کو افادہ عام کے لیے جلد از جلد کتابی شکل میں شائع کر دیں اور اس کا نام ''قلم کے آنسو'' رکھیں۔ اس لیے کہ یہ پڑھ کر اکثر آنکھیں آنسوؤں کی رم جھم برسانا شروع کر دیتی ہیں۔ لہٰذا میں نے ان کی خواہش کے احترام میں اس کا نام ''قلم کے آنسو'' ہی رکھ دیا۔ دعا کریں اللہ کریم میرا اور میرے خاندان کا خاتمہ بالایمان کرے' اس کاوش کو ریا کاری سے بچا کر اپنی بارگاہ میں قبولیت کے اعزاز سے سرفراز فرمائے آمین۔

اور میرے شفیق و کریم والد کو کروٹ کروٹ فردوس کی بہاریں نصیب فرمائے کہ جن کی قربانیوں جانفشانیوں اور مہربانیوں سے میں اس مقام کو پہنچا ہوں۔ آمین یا رب العالمین۔

والسلام

خادم کتاب و سنت

محمد طاہر نقاش

❀❀❀

کتنے ہی گھرانوں اور افراد کی اصلاح کرنے والی کتاب

از

امیر حمزہ

چیف ایڈیٹر ہفت روزہ غزوہ لاہور

اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت کچھ ایسی بنائی ہے کہ قصہ' واقعہ اور داستان اس پر فوراً اثر کرتی ہے جبکہ فلسفیانہ موشگافیاں ہزاروں میں سے کسی ایک طبیعت کو تو راس آ سکتی ہیں لیکن عام انسان کی طبیعت و فطرت اس سے گریزاں ہی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کے خالق نے ...... اپنے بندے کے لیے آخری کتاب ''قرآن'' نازل فرمائی تو اس میں متعدد قصے بیان فرمائے۔ یوسف علیہ السلام کا قصہ بیان کرتے ہوئے فرمایا!

﴿ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ هَٰذَا الْقُرْآنَ وَإِن كُنتَ مِن قَبْلِهِ لَمِنَ الْغَافِلِينَ ﴾ (یوسف : ۱۲/ ۳)

میرے رسول! ہم آپ کی طرف یہ جو قرآن بھیج رہے ہیں اس میں تجھے خوبصورت ترین قصے سنا رہے ہیں۔ ہمارے سنانے سے قبل ان قصوں کا آپ کو کوئی علم نہ تھا۔

اللہ تعالیٰ نے خوبصورت ترین قصوں کے ساتھ ساتھ بری قوموں اور برے افراد کے برے قصے اور پھر ان کے انجام سے بھی ہمیں آگاہ کیا ہے...... اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے فرمودات میں پہلی قوموں کے خواتین و حضرات کے کئی قصے سنائے ہیں۔ ان سچے قصوں سے انسان کو یہ فائدہ ہوتا ہے کہ وہ اچھے کرداروں کو اپنانے کی کوشش کرتا ہے اور برے کرداروں

اور قصوں سے اجتناب برتتا ہے۔

ناول نگاروں نے انسان کی اسی فطرت سے غلط فائدہ اٹھایا اور ناول ایجاد کر دیے۔ ڈائجسٹ بنائے اور ان میں من گھڑت اور اخلاق باختہ کہانیاں گھڑ گھڑ کر بے شمار انسانوں کو گمراہ کیا۔ ایسے حالات میں ضرورت تھی ایسے صحافیوں کی جو معاشرے کے سچے کرداروں کو سامنے لائیں اور کتاب وسنت کی روشنی میں انہیں کردار سازی کا ذریعہ بنائیں۔

کوئی چودہ پندرہ سال قبل کی بات ہے' محترم طاہر نقاش نے ''مجلۃ الدعوۃ'' میں ایک مضمون بھیجا' وہ شائع ہوگیا۔ محترم قاضی کاشف نیاز نے مجھ سے کہا: ''طاہر نقاش نوجوان ہے اچھا لکھتا ہے' اسے مجلّہ میں لانا چاہیے''۔ میں نے تحریر ملاحظہ کی تو کہا: اس نوجوان کو ہم مجلۃ الدعوۃ میں مستقل طور پر لے آتے ہیں۔ آج قاضی صاحب مجلّۃ الدعوۃ کو بطور مدیر سنبھالے ہوئے ہیں جبکہ طاہر نقاش صاحب بہت ساری کتابوں کے مصنف اور ''ہفت روزہ غزوہ'' کے ایڈیٹوریل صفحہ کے انچارج ہیں۔

موجودہ کتاب ''قلم کے آنسو'' ہمارے چاروں طرف پھیلے ہوئے معاشرے کی سچی داستانیں ہیں جنہیں قلم کی نوک سے زبان دی گئی ہے' طاہر نقاش کی...... سلگتے ہوئے سماجی اور خاندانی مسائل پر لکھنے کی...... ان کی ذمہ داری میں نے ہی لگائی تھی۔ اللہ نے ان سے یہ کام لیا اور یہ مضامین بہت زیادہ معروف اور مقبول ہوئے اور نہایت دلچسپی سے پڑھے گئے...... ان کالموں سے کتنے ہی گھرانوں اور افراد کی اصلاح ہوئی...... یہ سب طاہر نقاش کے لیے صدقہ جاریہ ہے' ان شاء اللہ...... آخرت کے لالچی' طاہر نقاش نے اس صدقہ جاریہ کو اب کتابی شکل دے دی ہے' تاکہ کام پکا اور مستقل ہو جائے...... میری دعا ہے اللہ ان کی اس خواہش کو پورا فرمائے۔ (آمین)

امیر حمزہ

۲۲ اکتوبر 2006ء لاہور

قلم کے آنسو

پچھلے دنوں راقم کے سابقہ لکھے گئے کالموں پر اندرون اور بیرون ملک سے شدید قسم کا مثبت ردعمل سامنے آیا لیکن ساتھ ہی یہ شکایت بھی کی گئی کہ آپ رلاتے بہت ہیں..... ہم اور ہمارے ساتھی آپ کا کالم پڑھ کر بے اختیار رو دیتے ہیں۔ آپ کا کالم آنسوؤں کی زبان میں لکھا ہوا ہوتا ہے۔ تیمر گرہ سے بھائی محبوب گل نے کالم پڑھتے ہی میرے موبائل فون پر رابطہ کیا اور بتایا کہ آپ کا کالم ''آپ مجھے اب بھی یاد آتی ہیں'' پڑھ کر میں مسلسل آدھ گھنٹہ تک روتا رہا ہوں۔ اسی طرح دوسرے تمام کالموں کے متعلق سعودی عرب، جدہ، ریاض، مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، دمام سے اور سرالیون اور اندرون ملک میں ساہیوال، لاہور، سیالکوٹ، گوجرانوالہ، فیصل آباد، کراچی اور تین صوبوں سے بعض بھائیوں نے خاص طور پر کہا کہ آپ کا کالم پڑھ کر ہم سے اپنے آنسوؤں پر قابو رکھنا مشکل ہوجاتا ہے۔ دو کالموں کے متعلق عبداللہ منتظر بھائی ایگزیکٹو ایڈیٹر غزوہ بھی کہنے لگے ''میں نے بڑی مشکل سے اپنے آنسو روکے ہیں''۔ اسی قسم کا اظہار خیال سیرت اصحاب رسول کے موضوع پر کئی کتابوں کے مترجم ومؤلف اور مشہور عالم دین جناب مولانا محمود احمد غضنفر نے بھی کیا کہ جو آج کل قرآن حکیم کی تفسیر لکھنے میں مصروف ہیں، بلکہ ان کالموں کے مجموعے کا ایک نہایت ادبی اور رقت انگیز عنوان بھی تجویز کردیا۔ اسی طرح کے جذبات مشہور ادیب اور شاعر توحید مولانا علیم ناصری رحمہ اللہ کے بھی ہیں اور غزوہ اخبار کی ٹیم کے جذبات بھی یہی ہیں۔ بھائی علی عمران شاہین نے بھی کالموں کو سراہتے ہوئے جناب امیر حمزہ صاحب سے کہا کہ یہ کالم عوام میں ہمارے عرصہ سے لکھے گئے کالموں سے کہیں بڑھ کر سراہے اور پسند کئے گئے ہیں، جس کی

جناب امیر حمزہ صاحب نے تائید بھی کی اور توضیح بھی کی کہ نقاش بھائی کا کالم کیوں پسند کیا جاتا ہے؟

لاہور سے ہی ایک خاتون محترم نے فون پر کہا کہ ہم حساس مزاج کی مالک اور کمزور مخلوق ہیں۔ اتنے رقت انگیز کالم ہمیں بہت رلاتے ہیں۔ آپ کچھ ذرا ہلکے پھلکے کالم بھی لکھیں۔ بہر حال اسی طرح کے جذبات اندرون و بیرون ملک خاص طور پر عرب ممالک سے موصول ہوئے۔

سچی بات ہے میں بالکل متاثر نہ ہوا اور نہ ہی خوش ہوا کہ بندہ ناچیز کی تحریر نے کسی کو معاشرے کے کسی گھمبیر مسئلہ پر نہ صرف سنجیدہ طور پر غور وفکر کرنے پر مجبور کیا ہے بلکہ اس مسئلہ کی سنگینی پر اسے رلا بھی دیا ہے۔ لیکن راقم کے کالم "انکل! مجھے مت مارو" کی اشاعت کے بعد منگل کی شام ایک دن معمول کے مطابق حمزہ صاحب دفتر آئے تو کہنے لگے: طاہر نقاش بھائی! آپ کے کالم پڑھ کر بچے اور عورتیں بہت روتے ہیں، آپ کچھ کالم ہنسی خوشی اور مزاح کے بھی لکھ دو" جب میں نے چیف ایڈیٹر غزوہ اور اپنے محسن بھائی امیر حمزہ کے یہ الفاظ سنے تو تب جا کر مجھے یقین آیا کہ معاملہ کچھ ایسا ہی ہے۔ کیونکہ معاشرت پر ایسے کالم لکھنے کی میری ذمہ داری بھی انہوں نے لگائی تھی اور اب انہوں نے مزید کہا کہ نقاش بھائی! سماجیات و معاشرت پر اپنے کالم کو جاری رکھیں لیکن ان کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہوئے معاشرے کی دیگر برائیوں کو بھی منظر عام پر لائیں۔ انداز بے شک بدل لیں۔

اصل میں مسئلہ یہ ہے کہ اس مصروف ترین زندگی میں ہر انسان ایک مشین بنا ہوا ہے۔ ہر ایک نفسا نفسی کے عالم میں گرفتار ہے۔ ہر کوئی اپنے گرد مسائل کا بوجھ اس قدر اٹھائے ہوئے ہے کہ اسے اپنے آپ کے علاوہ کسی دوسرے کی خبر ہی نہیں ہے۔ زندگی بہتی ندیا کے پانی کی مانند ہے، نہ یہاں کوئی ہمیشہ رہنے کے لئے آیا ہے اور نہ ہی کسی نے چاہنے کے باوجود رہنا ہے۔

ہر لمحہ، ہر لحظہ زندگی ایک نئے روپ میں جنم لیتی ہے اور پھر پانی کے بلبلے کی طرح دم توڑ دیتی ہے۔ یوں زندگی کے مختصر سفر میں وقتی طور پر اپنا تاثر چھوڑ کر پانی کے بلبلے کی طرح

مٹتے رہتے ہیں مختلف اوقات میں رونما ہونے والے واقعات رونما ہوتے ......اور یوں جیون کی کہانی بنتی اور ٹوٹتی رہتی ہے۔ زندگی کے اس سفر میں رونما ہونے والے ان واقعات کو ہر کوئی اپنے نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ کوئی تو ان کو محض خبر کی حد تک لیتا ہے۔ چند لمحوں کے لئے گاڑی روکتا ہے اور کھڑے لوگوں سے پوچھتا ہے کہ کیا ہوا ہے جو اس قدر لوگ سڑک بلاک کئے کھڑے ہیں۔ لوگ بتاتے ہیں کہ ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔ وہ سنتا ہے اور گاڑی اسٹارٹ کر کے چلتا بنتا ہے۔ کوئی ذرا سا بڑھتا ہے، اردگرد مجمع پر نظر دوڑاتا ہے اور اندازہ لگاتا ہے کہ کوئی حادثہ رونما ہوا ہے اور پھر فراٹے بھرتا ہوا اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہو جاتا ہے اور ایک وہ انسان بھی ہوتا ہے کہ جب برلب سڑک کسی غمزدہ کو مدد کے لئے پکارتے دیکھتا ہے تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ لرز جاتا ہے، کانپ جاتا ہے کہ آج پھر کسی ماں کا لخت جگر ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ مجمع کو چیرتا ہے آگے بڑھتا ہے اور تمام حالات سے آگاہی حاصل کر کے جو کرسکتا ہے کرتا ہے۔ یہ حساس دل کا مالک انسان ہے جو دوسروں کے درد کو اپنا درد جان کر تڑپ اٹھتا ہے اور لوگوں کو آگاہ کرتا ہے کہ تمہارا کام کھڑے ہو کر محض تماشا دیکھنا نہیں بلکہ جو (مدد) کر سکتے ہو وہ باقی ماندہ افراد کی زندگی بچانے کے لئے کرو۔ کیونکہ اگر تم صرف تماشائی بنے رہے، بے حس و جامد پتھر کے بت بنے رہے تو جان لو کہ کل یہ حادثہ آپ کی زندگی میں بھی رونما ہوسکتا ہے۔

قارئین محترم!...... یہ عاجز بندہ بھی اس آخری فرد کی طرح ہے جو زندگی میں رونما ہونے والے اندوہناک واقعات کو دیکھ کر نہ تو چپ چاپ گزر سکتا ہے اور نہ ہی خاموش رہ سکتا ہے۔ راقم جب کوئی ایسا واقعہ دیکھتا یا سنتا ہے تو وہ اس کے دل و دماغ میں پیوست ہو کر اس کو بے قرار و بے چین کر دیتا ہے۔ اس کے دل و دماغ میں ان مناظر کی جو تصاویر بن چکی ہوتی ہیں وہ مسلسل ایک ہلچل مچا رہی ہوتی ہیں، اس کو مضطرب کر کے اپنے باہر نکلنے کے لئے اظہار کا راستہ ڈھونڈ رہی ہوتی ہیں...... جب ایسی صورت ہوتی ہے تو بندہ کی آنکھیں روتی ہیں...... دل تیزی سے دھڑکتا ہے...... قلم لرزتا ہے اور پھر اندر کے اضطراب کو...... اندر کے طوفان کو دیکھ کر قلم بھی لرز اٹھتا ہے...... اور اس کے آنسوؤں سے یہ تحریر وجود میں آجاتی ہے...... کہ جسے بعد میں پڑھنے والے بھی ......رو دیتے ہیں...... اور ان کی آنکھیں بھی قلم

کے ساتھ رونے میں شریک ہو جاتی ہیں ...... اور پھر پڑھنے والے تہیہ کرتے ہیں کہ...... ہم اپنی زندگی میں اپنی طاقت کے مطابق ایسا واقعہ رونما نہ ہونے دیں گے۔

قارئین محترم!...... یہ معاشرے کے شریعت اسلامیہ قرآن و حدیث سے دوری کی بنا پر بن جانے والے وہ ناسور ہیں کہ جو ہر درد دل رکھنے والے کو رلا دیتے ہیں، بشرطیکہ بصیرت باقی ہو۔ میں صرف آپ کو رلاتا نہیں بلکہ تحریر لکھنے سے پہلے اور لکھنے کے دوران خود جذبات سے بے قابو ہو کر روتا ہوں' پھر اپنے آپ کو سنبھالتا ہوں، ضبط کا دامن تھامتا ہوں اور تحریر مکمل کرتا ہوں۔ ''آپ مجھے اب بھی یاد آتی ہیں'' تحریر لکھنے کے دوران میں کتنی ہی دفعہ دلبرداشتہ ہو کر قلم رکھ بیٹھا، اب تحریر کی بجائے آنسوؤں کی لڑیاں رقم ہو رہی تھیں۔ اسی طرح ''انکل مجھے مت مارو'' کا کالم میں مسلسل اضطراب اور غم کی وجہ سے دو ہفتہ تک ارادے کے باوجود نہ لکھ سکا۔ جب قلم سنبھالتا آنسو اور ذہنی و اعصابی تناؤ مجھے پکڑ لیتے اور قلم گر جاتا...... ایسے ہی دوسرے کالموں کا حال ہے۔ تو عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ نہ مجھے رلانے کا شوق ہے نہ رونے کا۔ بلکہ آپ کے رونے سے پہلے کالم لکھتے ہوئے میں خود بے اختیار روتا ہوں۔ یوں یہ وہ قلم کے آنسو ہوتے ہیں جو میرے حساس دل و دماغ کی آواز ہوتے ہیں ...... یہ چیخیں اور سسکیاں ہوتی ہیں ان لوگوں پر کہ جنہوں نے اللہ اور رسول کے احکامات کو چھوڑ کر دنیا میں ہی دل لگا لیا اور یہاں کے غلط اور شریعت مخالف رسوم و رواج کا شکار ہو کر رہ گئے۔ میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ میرے کالموں کو پڑھ کر رونے والوں کے اس عمل کو قبول کر کے راہ ہدایت سے نوازے اور میرے لئے ذریعہ آخرت بنائے، اور ہمیں ان تحریروں میں نشاندہی کی جانے والی برائیوں سے بچنے کی توفیق دے۔ آمین

پیارے قارئین!...... میری آنکھ جو مشاہدہ کرتی ہے' دل جو محسوس کرتا ہے آپ کے سامنے پیش کر دیتا ہوں۔ اب اس وقت تک اللہ نے چاہا تو ایسا رقت انگیز معاشرتی کالم نہ لکھوں گا کہ جب تک آپ خود اجازت نہ دیں گے۔ آخر میں صرف اتنا کہوں گا:

رونا میرا الٰہی ہر فرد کو رلا دے
بے ہوش جو پڑے ہیں شاید انہیں جگا دے

''آپ مجھے اب بھی یاد آتی ہیں!''

جولائی ۱۹۹۲ء کا ایک دن ہے۔ یہ سراجیو (بوسنیا) کا فٹ بال گراؤنڈ ہے۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر سربی درندے اسلحہ و بارود سے مسلح ہوکر چوکس کھڑے یہ سارا منظر دیکھ رہے ہیں۔ فرانسیسی این جی اوز نے بوسنیا والوں سے مسلمان بچے ہتھیانے کے لئے کہا ''جنگ لگی ہوئی ہے، آپ کے بچے بے موت مارے جائیں گے۔ آپ ان کو ہمارے حوالے کریں تو ہم ان کو بحفاظت دوسرے یورپی ملکوں میں پہنچا کر ان کی جانیں بچا سکتے ہیں۔'' بوسنوی مائیں ممتا کے ہاتھوں مجبور بچوں کو لے کر مقررہ وقت پر متعین مقام پر پہنچ گئی ہیں۔ گراؤنڈ میں بسیں ننھے مسافروں کو کہیں دور لے جانے کے لیے تیار کھڑی ہیں۔ مائیں اپنے بچوں کو اٹھائے اور کوئی انگلی پکڑے بسوں کی طرف بوجھل قدموں سے بڑھ رہی ہیں۔ ایک ماں اپنے جگر کے ٹکڑے نہایت خوبصورت اور معصوم بچے کو یہ سبق رٹائے جا رہی ہے کہ بیٹا یاد کرو ''تمہاری ماں عائشہ ہے' تمہارا نام الفاتح ہے' تمہارا پتا ہاؤس نمبر ۲۵ سٹریٹ نمبر ۲ عقب اسلامک ماڈل سکول سراجیو ہے۔'' پھر اسے ایک کاغذ تھماتی ہے کہ راستے میں بھی اس پتا کو یاد کرتے جانا۔ وہ چاہتی ہے کہ لکھی ہوئی عبارت اور معلومات اس کے ذہن میں راسخ اور پختہ ہوجائیں اور یوں وہ اپنی ممتا کی یادوں کا نقش کبھی بھی اپنے دل و دماغ سے نہ کھرچ سکے۔ کیوں؟ وہ ایسا کیوں چاہتی ہے؟۔ اس لئے کہ..... اسے آس و امید ہے کہ اس کا پھول اپنی خوشبو بکھیرتا ہوا کبھی واپس اس کے آنگن میں لوٹ آئے' تو کہیں راستہ نہ بھول جائے..... اور برسوں کے پیار اور جدائی کی آگ میں تڑپی ممتا کے بے تاب و بے قرار سینے سے لگ کر اس بدنصیب کے قلب و جگر کو ٹھنڈک و سکون پہنچا سکے.....

فرانس کی این جی او خوب متحرک و فعال ہے' وہ یہ سارا منصوبہ بنا کر اب اس پر عمل کروا رہی ہے۔ پھر اس کے سفاک کارندوں نے اچانک ماؤں سے ان کے لخت جگر چھین کر بسوں کے اندر پہنچا دیے۔ اب بسیں سٹارٹ ہو رہی ہیں...... بسوں میں بند بچوں کے ہاتھوں میں کپڑے' چند سکے' پیاروں کی تصویریں یا چند معمولی کھانے پینے کی چیزیں ہیں۔ وہ حسرت و یاس کی تصویر بنے' مرجھائی اور مسلی ہوئی کلیوں کی طرح شیشے سے باہر کی دنیا کو پتھرائی ہوئی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں...... اب ایک طرف ممتا بلک رہی ہے تو دوسری طرف ان کے جگر گوشے تڑپ رہے ہیں...... یہ معصوم فرشتے...... شیشوں پر اپنے ناتواں ہاتھوں کو پھیلائے ہوئے' ان کو توڑ کر باہر نکلنے کے لیے بے قرار ہیں' گویا چاہتے ہوں کہ یہ حائل (شیشے کی) دیواریں ٹوٹ جائیں اور ہم چشم زدن میں اڑ کر ماؤں کی آغوش میں جا سوئیں...... ان کی نرم گرم اور شفقت بھری گود میں جا بیٹھیں۔ ان کے سینے سے اس مضبوطی اور وارفتگی و دیوانگی سے لپٹ جائیں کہ دنیا کی کوئی طاقت ہم کو جدا نہ کر سکے۔

......لیکن...... پھر کیا ہوا؟...... نہ شیشہ ٹوٹا...... اور...... نہ ممتا ہی اپنے سسکتے' کپکپاتے اور ترستے ہوئے ہونٹوں کو بس کے اندر لا سکی...... دوبارہ کبھی نہ ملنے والے' اپنی امنگوں آرزوؤں کے پھول کو بوسہ نہ دے سکی...... اور نہ یہ ننھا معصوم فرشتہ...... کمزور و ناتواں شہزادہ...... مضبوط شیشے کا کچھ بگاڑ سکا اور نہ اپنی سسکتی ممتا کو بوسہ دے سکا...... نہ سینے سے لگ سکا...... نہ کوئی وعدہ نہ کوئی گلہ شکوہ اور نہ کوئی آخری بات کر سکا...... کہ اتنے میں اچانک سیٹی بجی...... اور پھر آہستہ آہستہ بسیں فٹ بال سٹیڈیم میں رینگنے لگیں...... ماؤں کو جیسے کرنٹ لگا ہو...... جیسے وہ یکدم ہوش میں آ گئی ہوں...... انہیں احساس ہوا کہ ''اپنوں سے جدائی کے جان لیوا لمحات آن پہنچے ہیں'' اب وہ چلتی پھرتی انسانی لاشوں کی صورت میں' بوجھل قدموں کے ساتھ' بس کے ساتھ بھاگ رہی ہیں' شیشوں کو ہاتھ لگا لگا کر اپنے ہاتھوں کو چومتی جا رہی ہیں...... گویا اپنے پیاروں کو بوسہ دے رہی ہیں...... بس کے اندر بچوں کی دلخراش چیخوں اور دلدوز آہوں اور سسکیوں نے رپورٹنگ کرنے والے بی بی سی کے نمائندے کو بھی آنسوؤں

کے سمندر میں غرق ہونے پر مجبور کر دیا..... پھر اچانک..... بسوں کی سپیڈ تیز ہو گئی..... بسیں دور..... دور..... اور بہت دور..... ہوتی گئیں..... مائیں تڑپتے' سلگتے جذبات سے ہاتھ اٹھا اٹھا کر اپنے معصوموں کو الوداع کر رہی ہیں..... آخر بسوں کا قافلہ' ان جانی منزلوں کے معصوم مسافروں کا قافلہ' آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے..... کتنی ہی مائیں شدت غم سے نڈھال ، بیہوش ہو کر زمین پر گر پڑی ہیں اور باقی کی دھاڑیں اور فریادیں پہاڑوں میں گونج رہی ہیں..... آخر ماؤں کو ان کے گھروں تک کسی نہ کسی طرح پہنچا دیا جاتا ہے.....

وقت پر لگا کر اڑنے لگا..... اس کے بعد سال بیتے' صبحیں شاموں میں اور شامیں صبحوں میں ڈھلیں..... اس دوران دنیا نے صلیبی سربی درندوں کا ایک عجیب اور لرزا دینے والا بھیانک کھیل یوں دیکھا کہ وہ ہر وقت کلاشنکوف کے ساتھ چھرا اپنے پاس رکھتے..... جہاں کہیں کوئی معصوم نظر آتا اس کے ہاتھوں کی معصوم انگلیوں کو کاٹ کر..... اس کا ہار بناتے اور اپنے گلے میں پہنتے..... یہ چنگیزیت پر مبنی ایک عام مشغلہ بن گیا..... جو بچوں کی انگلیوں کو کاٹ کر ہار بناتا اور پھر گلے میں پہن کر سربی عوام' فوج یا پولیس میں گھومتا' صلیبی اسے ''بہادر'' اور ''نڈر جنگجو'' کا خطاب دے کر اس کی بہت زیادہ عزت و تکریم کرتے۔ یوں ہر فوجی کی خواہش ہوتی کہ وہ یہ بہادری والا اعزاز حاصل کر سکے۔ ہر درندہ صفت فوجی معصوم مسلمان بچوں کی تلاش میں رہتا۔ یہ مناظر دیکھ کر اپنے بچوں کو انجانی منزلوں کی طرف روانہ کرنے والی مائیں مطمئن ہو جاتیں کہ ہمارے راج دلارے جہاں بھی ہیں جس حال میں بھی ہیں' زندہ تو ہیں اگرچہ بہت ہی دور انجانے جہاں میں ہیں۔

وقت بیتا اور اب نامعلوم منزلوں کے مسافروں کے قافلے کو روانہ ہوئے دس سال ہو چکے ہیں..... ایک دن ڈاکیا ایک خط لے کر اسلامک ماڈل سکول کے عقب میں مکان نمبر ۲۵ پر دستک دیتا ہے۔ ایک ادھیڑ عمر خاتون دروازہ کھولتی ہے' وہ باپردہ ہے اور اس کے ہاتھ میں چھوٹے سائز کا قرآن ہے' شاید تلاوت کرتے کرتے ویسے ہی اٹھ کر چلی آئی ہے۔ ڈاکیے نے سلام کے بعد خط تھما دیا۔ خاتون نے دیکھا کہ اوپر عائشہ کا نام لکھا ہے..... تو

دھڑکتے دل اور لرزتے ہاتھوں کے ساتھ جلدی جلدی خط کھول کر پڑھنے لگی۔ جوں جوں پڑھتی گئی اس کی ہچکی بندھتی گئی، حتیٰ کہ آنسوؤں کے سیل رواں نے اسے خط پڑھنے سے روک دیا۔ خط کا مضمون کچھ اس طرح تھا:

میری جنت، میری شفیق ماں!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

میں تیرا بیٹا، تیرا لخت جگر ابھی زندہ ہوں۔ تو نے چلتے وقت مجھے گھر کا ایڈریس یاد کروا دیا تھا، لو آج میں تجھے خط لکھ رہا ہوں۔ اللہ جانے خط تجھ تک پہنچتا بھی ہے اور تو جواب دیتی بھی ہے کہ میں تیرے جواب کے انتظار میں ہی عمر گزار دیتا ہوں۔ ماں تو مجھے بہت پیار کرتی تھی نا۔ تو نے مجھ سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں...... جنہیں میں پورا نہ کر سکا۔ میری غمزدہ اور دکھیاری ماں!...... تو نے میرا نام ''الفاتح'' یورپ و بوسنیا کو فتح کرنے والے بہادر سلطان، سلطان محمد الفاتحؒ کے نام پر رکھا تھا نا، لیکن ماں آج تیرا فاتح بے حس انسانوں کی دنیا میں مفتوح ہو چکا ہے۔ اس کی اپنی ہر مرضی ختم ہو چکی ہے۔ اب وہ غلام ہے۔ اب اگرچہ تیری طرح اس کی جبین سجدہ ریز ہونے کے لئے تڑپتی ہے، لیکن ایسا کر نہیں سکتی...... کیوں؟...... اس لئے کہ مجھے ایک چرچ کا خادم بنا دیا گیا ہے...... میں چرچ آنے والوں کی سروس (خدمت) کرتا ہوں اور چرچ کے ساتھ ساتھ یسوع مسیح اور مریم کے مجسمے کی دیکھ بھال اور جھاڑ پونچھ کرتا ہوں۔ میں تیرا دیا ہوا نام ''الفاتح'' ہی صحیح تسلیم کرتا ہوں...... لیکن کافروں نے میرا نام ''دانیل'' رکھ چھوڑا ہے۔ وہ مجھے کہتے ہیں کہ تیرے ماں باپ مرکھپ چکے ہیں۔ اب یہ مسیح و مریم ہی تیرے (معنوی) ماں باپ ہیں...... ماں تیرے جتنا پیار آج تک مجھے کسی نے نہیں دیا...... میں تیرا پیار، تیرا لاڈ، تیری شفقت اور تیری محبت تلاش کرتا پھر رہا ہوں۔ تیری محبت کا ترجمان وہ فٹ بال سٹیڈیم کا الوداعی منظر آج بھی میرے دل

و دماغ کی سکرین پر محفوظ ہے...... ماں! تجھ جیسی شفیق ہستی اپنے بیٹے کو چھوڑ کر کیسے مر سکتی ہے' تو تو میرا انتظار کر رہی ہے نا' ایسے ہی میں بھی تیرے پاس اڑ کر آجانے کے لئے مضطرب و بے قرار ہوں۔ پیاری ماں! یہ مجھے یہاں سے کہیں جانے نہیں دیتے' مجھے بتا میں کیسے پلک جھپکتے تیرے پاس پہنچ جاؤں؟ ماں میرا اس ظالم دنیا میں کوئی غمگسار نہیں۔ پوری اسلامی دنیا میرے درد والم سے نا آشنا ہے۔ کوئی ہمیں یہاں سے رہائی دلانے والا نہیں' کوئی ہمارے دکھوں کا مداوا' زخموں پر مرہم رکھنے والا نہیں۔ ہماری کہانی یونہی بغیر کسی انجام کے ختم ہو جائے گی۔ ماں! اے دکھیاری و غمگین ماں!...... آپ مجھے اب بھی یاد آتی ہیں تو دل آپ کو یاد کر کے روتا رہتا ہے...... لیکن تو غم نہ کر...... ہاں پریشان نہ ہو...... حوصلہ رکھ...... میں کسی نہ کسی طرح ایک دن تیرے پاس ضرور پہنچ جاؤں گا۔ پھر ہم اکٹھے مل کر ویسے ہی مسجد میں جمعہ پڑھنے جایا کریں گے جیسے تو مجھے بچپن میں لے کر جاتی تھی...... اور دوبارہ قرآن پڑھوں گا' اس لئے کہ اب میں قرآن بھول چکا ہوں...... میں عنقریب تیرے آنگن میں پھول کی مانند آؤں گا۔ ان شاء اللہ۔ آخر میں اے ماں!...... تجھ سے التجاء ہے کہ اپنے بیٹے کے لیے ان صلیبیوں سے رہائی کی دعا کر' کیونکہ مسلمانوں میں کوئی ایسا فاتح نظر نہیں آ رہا جو ہمیں آزاد کروا سکے' میں صرف تمہاری دعاؤں کا طالب ہوں......!!

تمہارا کھویا ہوا بیٹا
محمد الفاتح

خاتون یہ خط پڑھ کر لرزتی آواز سے بلبلاتی ہے...... اے بچے!...... اے مظلوم الفاتح!...... تجھے کیا معلوم کہ تیرے جانے کے بعد ہر ہفتہ تیری ماں پوسٹ آفس جاتی رہی' کہ شاید اس کے لعل کا کوئی سندیسہ آیا ہو۔ ایک دن پوسٹ آفس سے واپسی پر سربیوں سے اپنی عزت بچاتے بچاتے ان کی گولیوں کا شکار ہو کر جنتوں کی وارث بن گئی...... اب تو تو اس

سے جنتوں ہی میں مل سکتا ہے..... جبکہ تیرا باپ جہاد بوسنیا میں اس سے پہلے ہی شہید ہو چکا تھا. ...کون تجھے بتائے کہ اب دنیا میں کوئی تیرا غمگسار نہیں.....اب تو سراجیو میں تیری غمگسار ماں بھی زندہ نہیں بچی.....اور کتنی مائیں جو زندہ ہیں.....ان کی سانسیں صرف اس انتظار میں اٹکی ہوئی ہیں..... کہ کبھی ان کے بیٹوں کے صرف زندہ ہونے ہی کی خبر ان تک پہنچ جائے' لیکن آج تک ان کے بیٹوں کی کسی طرح کی خبر نہیں آئی کہ وہ کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں؟..... پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی' اس کا خاوند آگے بڑھا' اس کے ہاتھ سے خط پکڑا اور خط پڑھ کر وہ بھی دھاڑیں مار مار کر رونے لگا.....ڈاکیے کو جب اس حقیقت کا پتا چلا کہ مرحومہ بہن عائشہ کا بیٹا زندہ ہے اور اس کا خط آیا ہے تو اس نے بھی خط پڑھ کر زاروقطار رونا شروع کر دیا.....اس لئے کہ یہ دونوں خاندان بھی اسی قافلہ میں جانے والے اپنے لخت جگر' نورنظر اور ننھے شہزادوں کی' کسی طرح کی خبر آنے کے انتظار میں زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں.....اللہ جانے ان کی کوئی خبر آتی ہے یا زندگی کے دن یونہی پورے ہو جاتے ہیں؟

انکل! مجھے مت مارو!

پچھلے دنوں میں ٹریڈ سنٹر (یتیم خانہ لاہور) میں کھڑا ایک نہایت معصوم منظر ملاحظہ کر رہا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ میرے سامنے ٹریڈ سنٹر کے فرش پر لوہے کے چھپر کے نیچے' ۲ بجے' دن کے وقت دو ننھے منے اور معصوم بچے دنیا و مافیہا کی دلچسپیوں اور مصروفیتوں سے بے نیاز لیٹے سو رہے ہیں۔ بچے بے سدھ ہیں' جیسے لمبے سفر کا تھکا ماندہ مسافر لمبی تان کر گہری نیند کی وادی میں جا سویا ہو۔ پھٹے پرانے اور بوسیدہ کپڑے ان کے جسموں کو ڈھانپے ہوئے ہیں۔ جب دنیا والے ایئر کنڈیشنڈ کمروں اور ٹھنڈے ایئر کولروں کے مزے لے رہے ہیں تو یہ پھول' جھلسا دینے والی لو کی لوریوں میں تپتے فرش پر خوش باش و مطمئن پسینے سے شرابور لیٹے سو رہے ہیں۔ اچانک چھوٹی بچی بیدار ہوتی اور دیکھتی ہے کہ اس کے پیارے بھیا کے چہرے کو مکھیوں نے گھیر رکھا ہے اور وہ اسے بے آرام کر رہی ہیں۔ یوں اس کی نیند خراب ہو رہی ہے۔ یہ معصوم گڑیا اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنی نیند کو قربان کر دیا اور اپنے سے بڑے بھائی کو اپنے ننھے ننھے ہاتھوں کا پنکھا جھلنے لگی تاکہ مکھیاں بھاگ جائیں اور اس کے دیر کی نیند میں خلل نہ آئے اور نہ وہ بے آرام ہو۔

ایک چھوٹی سی، معصوم سی گڑیا کا اپنے چھوٹے سے بھائی کے لیے ننھے منے ہاتھوں سے پنکھا جھلنے کا محبتوں بھرا کیا ہی رقت انگیز منظر تھا۔ میں آگے بڑھا اور ایک روپیہ اس کے ہاتھ میں تھما دیا کہ ٹافی لے کر کھالینا۔ اس نے خاموشی سے وہ لیا اور اپنے سوئے ہوئے بھائی کی جیب میں ڈال دیا اور پھر اپنے کام میں لگ گئی۔ میں تھوڑا سا آگے بڑھ کر' ایک طرف ہٹ کر کائنات کے ان معصوم پھولوں کا' خوبصورت نظاروں کو ساکت کر دینے والا' دل و

دماغ کو جھنجھوڑ دینے والا...... اور سوئے ہوئے انسانی ضمیر کو بیدار کر دینے والا' یہ منظر دیکھنے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ چند لمحات بعد کیا دیکھتا ہوں کہ ایک برقعہ پوش خاتون جو باپردہ ہے' ویگنوں کے سٹینڈ کی طرف سے بچی کی طرف آتی ہے۔ قریب آ کر اس کا ماتھا چومتی ہے' ایک نظر اپنے اس خزاں رسیدہ چمن کو سانس لیتا اور اپنے زعم میں لہلہاتا دیکھ کر پیچھے مڑ جاتی ہے اور ویگن سٹینڈ پر جا کر دوبارہ بھیک مانگنا شروع کر دیتی ہے۔ گویا کہ تھوڑے تھوڑے وقفے بعد اپنے بچوں کو دیکھ کر دل ٹھنڈا کرتی ہے اور پیٹ کے جہنم کو بھرنے کے لیے مانگنا شروع کر دیتی ہے' تاکہ شام کے کھانے کے لیے چولہا گرم کیا جا سکے۔ میرا ایک دوست جو ایک دوسرے صوبے سے آیا ہوا تھا' میری یہ کیفیت ایک طرف کھڑا نوٹ کر رہا تھا۔ اچانک میرے پاس آ کر کہنے لگا: طاہر بھائی! اتنی دیر سے کیا دیکھ رہے ہیں؟ میں نے اس کو اس باپردہ عورت کی مجبوری اور بچوں کی نگہداشت' بھیک مانگنا اور بچوں کا ایک دوسرے کا خیال رکھنے کا قابل دید مشاہدہ کہہ سنایا' وہ گہری سوچ میں پڑ گیا اور کہنے لگا:

ہمارے معاشرے میں اسلام سے دوری کا نتیجہ ہے کہ صاحب ثروت لوگوں نے ایسے مجبور لوگوں کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ صدقات و خیرات کا تصور تو یکسر ختم ہو کر رہ گیا ہے۔ پھر اس نے ایسا ہی اپنا ایک مشاہدہ بتاتے ہوئے کہا کہ ایک دن میں موٹروے کی ایک لنک روڈ پر جا رہا تھا کہ اچانک کیا دیکھتا ہوں کہ میرے قریب سے ایک چھوٹا سا بچہ جس نے صرف نیکر پہن رکھی ہے' بھاگتا ہوا گزرا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی چیز دبی ہوئی ہے۔ میں نے دیکھا کہ ایک ٹانگ سے معذور ہونے کی بنا پر وہ مسلسل لنگڑاتا اور اچھلتا کودتا ہوا آگے بڑھتا جا رہا تھا...... شاید اس خوف سے کہ کوئی اس کو پکڑ نہ لے۔ پھر چند لمحات بعد ہی اس کے پیچھے ایک پرفیوم سے معمور مائع لگے قیمتی لباس میں ملبوس شخص بھاگتا ہوا گزر گیا۔ میں بھی پیچھے بھاگا۔ معصوم بچہ کب تک ایک ٹانگ پر لڑکھڑا کر بھاگ سکتا تھا۔ آخر اس آدمی نے اس کو وحشی درندے کی طرح دبوچ لیا اور مسلسل تھپڑ مارنے لگا۔ بچہ التجا کے انداز میں اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہے جا رہا تھا: انکل! مجھے معاف کر دیں' میں واپس کر دیتا ہوں...... انکل

مجھے معاف کر دیں..... انکل جی مجھے معاف کر دیں..... لیکن یہ آدمی غصے سے غرائے جا رہا تھا' چور کے بچے' حرامی کہیں کے..... چوری کر کے بھاگتا ہے..... بھاگ لے جتنا بھاگ سکتا ہے..... کہاں بھاگے گا؟ اتنا کہہ کر وہ بچے کو ایک اور تھپڑ جڑ دیتا.....

بچہ جو پہلے ہی وحشت وخوف سے سہما ہوا تھا' مزید ڈر گیا۔ اب وہ رونا چاہ رہا تھا لیکن اس سے رویا نہیں جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں اور کانوں سے خون کی ننھی ننھی بوندیں پھوٹ پڑی تھیں..... پھر اس نے اس کو غلیظ گالی دی اور اٹھا کر زور سے فرش پر پڑی پٹ سن کی خالی بوریوں پر دے مارا۔ اتنی دیر میں لوگ اکٹھے ہو چکے تھے اور یہ سب تماشا گونگوں اور بے جان پتلوں کی طرح دیکھ رہے تھے۔ درندے کے ساتھیوں کے پاس آتشیں اسلحہ اور گنیں تھیں اس لئے کوئی اس کو روکنے والا نہ تھا۔ پھر یہ وحشی درندہ مزید دھاڑا' اس نے قریب پڑا اینٹ کا ٹکڑا اٹھایا اور لہرا کر اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان دے مارا..... لیکن نشانہ خطا ہو گیا..... کیونکہ بچہ خوف سے سہم کر ایک طرف ہو گیا تھا۔ اب لوگوں نے دیکھا کہ بچہ کے منہ سے بار بار صرف یہ الفاظ نکل رہے تھے لا الہ..... لا الہ..... لا الہ..... شاید اسے یقین ہو گیا تھا کہ اس کی زندگی کے آخری لمحات آ گئے ہیں۔ شاید اس لئے وہ اپنے دم آخریں کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ..... پڑھنا چاہتا تھا اور شدید تکلیف سے اس کی زبان سے ٹوٹے پھوٹے صرف لا الہ..... کے الفاظ نکل رہے تھے۔ آفرین اور شاباش ہے اس کی عظیم ماں پر کہ جس نے ایسا بچہ جنا کہ جس کو اس ننھی' کھلونوں سے کھیلنے والی عمر میں بھی' اس بات کا پتا ہے کہ مرنے کا وقت جب آ جائے تو کیسے رب کائنات، مالک کائنات اور اپنے رحمان و رحیم مولا کو پکارنا ہے۔

سلام ہے ایسی پاکیزہ مگر غریب ماں کی عظمت کو..... کہ جس نے غریبی میں اپنے بچے کو توحید کی دولت کی یہ تونگری بخشی..... اس سفاک درندے اور وحشی پر خون سوار تھا۔ اس نے ذرہ برابر ترس نہ کھایا اور اپنا ظلم جاری رکھا۔ میں نے آگے بڑھ کر کہا او ظالم! اگر مارنا ہے تو مجھ کو مارو' اس بے چارے معصوم کا کیا قصور ہے؟ ہاں مجھے مارو' اسے چھوڑ دو..... لیکن

یکدم اس نے دوبارہ اپنا ہاتھ فضا میں لہرایا...... اور پھر اس کی کنپٹی کے پاس ضرب لگا دی...... بچے کے منہ سے گھٹی گھٹی چیخ نکلی لیکن وہیں دب کر رہ گئی۔ اس کے بعد پھر ہاتھ اٹھا اور اب دوسری کاری ضرب معصوم کی دونوں آنکھوں کے درمیان اور ناک کے بالکل اوپر لگی۔ یکدم آوازیں بلند ہوئیں' مرگیا...... ' مرگیا...... ' مرگیا بچہ...... مرگیا...... سب نے دیکھا کہ پھول مسلا جاچکا ہے۔ کچلا جاچکا ہے۔ خاک وخون میں لت پت پڑا ہے...... اس کا چہرا سرخ اور سیاہ ہو رہا ہے...... خون چہرے سے ہوتے ہوئے گردن سے نیچے بہہ رہا ہے...... سانسیں رک رہی ہیں...... آنکھیں آسمان کو تکے جارہی ہیں...... جیسے وہاں کچھ تلاش کر رہی ہوں...... جیسے وہاں کسی سے کچھ گلہ شکوہ کر رہی ہوں۔ بچے کا مسلا ہوا زخمی جسم کسی اپنے کی نرمی ومحبت بھری آغوش کی تلاش میں بے یارومددگار وہاں پڑا تڑپ رہا تھا...... اچانک اس کی سانسیں اکھڑ گئیں اور بیٹھنے لگیں۔ ادھر یہ وحشی درندہ ایسے کھڑا اپنے ماتھے سے پسینا صاف کر رہا تھا کہ جیسے بہت بڑا معرکہ سر کرکے' آدمی تھک ہار کر اپنا پسینا صاف کرتا ہے۔ جیسے کہ ایک بہت بڑا بوجھ ہو جو اس کے سر سے اتر گیا ہو۔ ایک بار پھر آوازیں گونجیں: بچے کو پانی پلاؤ...... پانی پلاؤ...... جلدی کرو...... بھاگ بھئی ریڑھی سے گلاس میں لے آؤ...... یہ کولر ہی پکڑ لو دکان سے' کیا نقصان ہوجائے گا؟...... ایک آواز ابھری: قریب بہنے والے نل ہی سے پانی پلادو۔ پھر کیا تھا؟ اس درندہ کے قریب کھڑے اس کے ایک عزیز نے بچے کو ٹانگوں اور بازوؤں سے ایک مردہ جانور کی طرح پکڑ کر اٹھایا اور نل کے نیچے رکھ دیا۔ قاتل درندہ بولا: دو سے زیادہ سانس نہ لے گا' اس لئے کوئی فائدہ نہیں۔ یہ سب بیکار ہے۔ پھر کیا تھا اچانک ننھے فرشتے نے ہچکی لی اور ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کرلیں۔

اس کی آنکھیں کھلی تھیں' آسمانوں میں کسی سے کچھ کہہ رہی تھیں۔ گویا وہ زبان حال سے اپنا دکھڑا یوں بیان کر رہی ہوں:

اے اللہ میاں!...... یہ لوگ کتنے ظالم ہیں...... بڑی بڑی گاڑیوں میں بیٹھ کر آتے ہیں...... اپنے بچوں کو زرق برق لباس پہنائے ہوئے ہوتے ہیں...... طرح طرح کے

میوے کھا رہے ہوتے ہیں...... میرا باپ چونکہ تیرے پاس آ چکا ہے...... ماں کا کوئی آسرا نہیں...... اس لئے میں ماں کو ہاتھ پھیلانے سے روکنے اور عزت سے گھر بیٹھے رکھنے کے لیے...... ان لوگوں سے ایک روپیہ کا سوال کرتا ہوں...... میں نے کبھی ان سے اور تو کچھ نہیں مانگا...... اللہ میاں! اگر میرا پیار کرنے والا باپ ہوتا تو میں کبھی بھی ایسا نہ کرتا۔ نہ وہ مجھے ایسا کرنے دیتا......

اور اے اللہ میاں!...... تو جانتا ہے کہ ماں کی محبت و عزت کے لیے کہ وہ عورت ذات در در لوگوں کے آگے ہاتھ نہ اٹھاتی پھرے...... اس بیچاری کے لیے مانگتے ہوئے میں ٹریفک حادثے کا شکار ہو کر اپنی ٹانگ بھی کٹوا چکا ہوں...... اے اللہ میاں!...... آج تو میں نے اس کار والے انکل سے بھی صرف ایک ہی تو روپیہ مانگا تھا...... لیکن انہوں نے مجھ ننگ دھڑنگ کو دھتکار دیا...... اور جاہل' گنوار' بدمعاش' چور' اچکا' حرامی اور نہ جانے کیا کیا گالیاں دیں...... میں نے برا نہ منایا...... کیونکہ میں بچہ ہوں...... ماں کی خاطر یہ سب سہنا پڑتا ہے...... لیکن پھر میری نظر انکل کی چھوٹی سی بچی پر پڑی جو اپنے باپ کی شفقت و محبت کے سائے میں بڑے فخر سے سیٹ پر بیٹھی بڑے ترس بھرے انداز میں مجھے دیکھ رہی تھی...... اور پھر اس نے اپنے چاکلیٹ میری طرف بڑھا دیے تھے...... گویا ایک باپ والا بچہ ایک دوسرے یتیم بچہ کو تحفہ دے رہا ہو...... میرا دل للچایا...... جی چاہا کہ یہ میٹھی چیز کھا لوں...... کیونکہ ہمارا تو چولہا جلنا ہی بڑی بات ہے...... اس طرح کے مزے ہم نے کبھی نہ لوٹے تھے...... اور ہمارا تھا بھی کون؟ جو ہمارے ناز اٹھاتا' لہٰذا میں نے چاکلیٹ پکڑنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا تو بہن نے اپنا ہاتھ پیچھے کر لیا۔ مجھے غصہ آیا کہ تو نے مجھے یوں ذلیل کیوں کیا؟ پھر میں نے ہاتھ آگے بڑھا کر اس سے چاکلیٹ چھین لیا۔ ابھی میں نے چاکلیٹ پکڑا ہی تھا کہ انکل نے چور' چور کی آواز لگائی اور کار سے نکل کر میرے پیچھے بھاگے...... اور پھر...... اور پھر...... مجھے تیرے پاس پہنچا دیا...... اب تو ہی بتا' اے میرے مالک! کہ میری ماں کا کیا بنے گا؟...... وہ پہلے مجھے تلاش کرنے کے لیے گھر سے باہر جگہ جگہ ٹھوکریں کھائے

گی..... اور پھر پیٹ بھرنے کے لیے لوگوں کے ظلم وستم سہتی مرجائے گی۔ جنہیں تو نے مال و دولت سے نوازا ہے' انہیں چاہیے کہ سجدے میں پڑ کر تیرا شکر ادا کریں۔ صدقات و خیرات کریں۔ اللہ کی راہ میں اپنا مال لگائیں لیکن ..... اے اللہ اتنا دکھ دیتے ہیں ہم غریبوں کو یہ دولت والے..... اے اللہ! میری ماں کو بھی میرے پاس بھیج دے۔ اس لئے کہ اس کا میرے سوا دنیا میں اور میرا اس کے بنا یہاں دل نہ لگ سکے گا۔

بچے کا جسم سیاہ ہو رہا تھا کہ اچانک درندہ نما قاتل کے عزیزوں میں سے ایک نے اسے اٹھایا اور باقی اسلحہ لہراتے ہوئے ایک طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔ پھر وہ اپنی کاروں میں بیٹھ کر چشم زدن میں وہاں سے فرار ہو گئے۔ اے دولت کے پجاری!..... اے ظالم سفاک درندے..... تو جاتے جاتے ظلم پہ ظلم کر گیا..... ایک اور گھناؤنا ستم کر گیا..... کہ معصوم کی مردہ جسم کی نشانی کو بھی ساتھ لے جا کر غائب کر دیا۔ ظالم! تو کم ازکم اس کو تو پڑا رہنے دیتا..... کہ اس کی دکھیاری ماں تک جب یہ جسم پہنچتا' تو وہ رو دھو کر صبر کر لیتی..... اب کسی کو بھی پتا نہیں کہ یہ معصوم بچہ کہاں سے آتا تھا اور کس کا جگر گوشہ تھا؟..... اب اس کی ماں دروازے پر ساری ساری رات کھڑی ہو کر اس کا انتظار کرتی رہے گی..... اسے کون بتائے گا کہ اے اللہ کی نیک بندی! صبر کر لے' تیرا بیٹا تجھے چھوڑ کر جنتوں میں جا چکا ہے..... اب اس کے لوٹ آنے کا مجنونانہ انتظار ختم کر دے۔ یقیناً وہی اس کی کل متاع تھا..... اسی سے وہ ہر بات کرتی' دکھ درد کہتی، غم غلط کرتی..... اور وہ اپنی ماں کو جھوٹی توتلی تسلیاں دے کر اس کا غم بانٹ لیتا تھا..... اے ظالم! تو اس لئے اس کا جسم ساتھ لے جا کر ضائع کر چکا کہ تو دنیا کی عدالت اور قانون سے بچ جائے گا لیکن تو کیا بھول گیا ہے کہ سب سے اوپر بھی ایک عدالت ہے' جو ہر وقت لگی رہتی ہے' وہاں تیرے خلاف مقدمہ درج ہو چکا ہے' وہاں سے اپنے آپ کو کیسے بچائے گا؟ کیا تو مکافات عمل کے کوڑے کے برسنے سے اپنے آپ کو محفوظ کر سکتا ہے؟ کہیں تیرے گناہوں کی سزا تیرے ان بے گناہ بچوں ہی کو نہ بھگتنی پڑے..... یوں تو اپنے آپ کو محفوظ کرنے کی تدبیر کر رہا ہے..... لیکن یاد رکھ! کہ اس دکھی ماں کے بے قرار و

مضطرب اور زخمی دل کی آہیں، کرچی کرچی دل کی صدائیں ...... اللہ کے حضور مسلسل پہنچ رہی ہیں...... یہ کبھی رائیگاں نہ جائیں گی...... اور تجھے پوری زندگی کسی پل سکون وچین کے لمحات میسر نہ آنے دیں گی...... آنکھوں سے آنسوؤں کی بہنے اور ٹوٹنے والی لڑیوں کے ساتھ...... رخساروں پر گرم گرم گرنے والے قطروں کے ساتھ...... میں سوچ رہا ہوں کہ شاید یہ یتیم خانہ کے سٹاپ پر کھڑی پردہ دار ماں ممتا، جو بار بار اپنے بچوں کو دیکھنے آتی ہے...... اور ان کو سلا کر خود مانگنے چلی جاتی ہے...... شاید وہ بھی کسی ایسے ہی حادثے سے بچنے کی کوشش کر رہی ہے...... اس کو کون ضمانت دے گا کہ تیرے نونہالوں کا مستقبل بھی ہمارے بچوں کی طرح روشن ہوگا اور تیرا بچہ بھی قرآنی احکام کے مطابق اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ خود ہمارا بچہ۔

''ابو جان گڑیا لائیں گے''

ہم خیمہ بستی میں خیمہ نمبر 14 کی طرف بڑھنے لگے تاکہ زلزلہ سے بچ جانے والی گورنمنٹ ہائی سکول چھلہ بانڈی مظفر آباد کی طالبہ 11 سالہ وسیم اختر سے اس کی المناک کہانی سن سکیں۔ ہمیں بتایا گیا کہ بچی سے اس کے والد کے متعلق زیادہ نہ پوچھیں کیونکہ اس کا باپ فوت ہو چکا ہے' ہم نے اسے نہیں بتایا' اور وہ یہ سمجھ رہی ہے کہ اس کا باپ زندہ ہے اور کسی بھی وقت خیمہ میں اس کے پاس پہنچ جائے گا۔

ہم خیمہ میں داخل ہوئے تو بھولی بھالی وسیم اختر اپنے 12 سالہ بھائی سدیم ملک کے ساتھ خیمہ میں مستقبل کے سپنوں میں کھوئی اور سوچوں میں گم بیٹھی تھی۔ ہم نے اس سے زلزلہ کی بنا پر بیتنے والی بپتا کے متعلق پوچھا تو وہ کہنے لگی: میں کلاس میں ڈیسک پر بیٹھی تھی۔ دوسرا پیریڈ شروع ہونے والا تھا۔ اچانک میرا ڈیسک اور کرسی زور سے ہلے اور میں زمین پر گرتے گرتے بچی۔ ابھی سنبھلی بھی نہ تھی کہ دوبارہ زوردار جھٹکا لگا۔ استانیاں اٹھ کر کمرے سے باہر بھاگیں اور بھاگتے بھاگتے چلائیں: بھاگو بچو بھاگو! زلزلہ آ گیا ہے...... اور یوں چیختی ہوئیں کمرے سے باہر نکل گئیں۔ ان کے پیچھے ہی طالبات بھی بھاگ اٹھیں۔ میں تیزی سے ڈیسک سے اٹھی' اسی لمحے زمین زور سے ہلی اور میں زمین پر گر گئی۔ زمین مسلسل کانپ رہی تھی۔ زمین پر پاؤں نہیں ٹک رہے تھے۔ میں ہمت کر کے پھر اٹھی لیکن زلزلہ کے ایک جھٹکے سے پھر زمین پر جا گری۔ کمرے میں رہ جانے والی دوسری طالبات کے ساتھ بھی ایسا ہی ہو رہا تھا۔ ایک ہلچل مچی ہوئی تھی۔ ہر کسی کو یہ فکر لگی تھی کہ بس میں بچ جاؤں۔ ناکام ہو کر کمرہ میں رہ جانے والی لڑکیاں خوف سے چیخنے چلانے اور رونے لگیں۔ اللہ کو مدد کے لیے پکارنے

لگیں۔ میں نے بلند آواز میں کہا: بہنو (شاید آخری وقت آن پہنچا ہے لہٰذا) کلمہ پڑھو' سب کلمہ پڑھنے لگیں لیکن ساتھ ہی چیخیں مارنے لگیں۔ کوئی بھی ہماری مدد کو نہ آ رہا تھا۔ سب عمارت سے باہر جا چکے تھے۔ ہم سب لڑکیاں ڈیسکوں سے اٹھ کر زمین پر بیٹھ گئی تھیں اور آپس میں ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑ لیے تھے۔

اچانک ایک زوردار دھماکے سے کمرے کی چھت ہمارے اوپر آن گری۔ چھت سیدھی ڈیسکوں پر ٹک گئی جبکہ چند انچ نیچے ہم دبکی ہوئی تھیں' لینٹر میں لگا سریا سروں پر تو نہ لگا البتہ میرے بازو سے آ ٹکرایا اور تکلیف سے میری جان ہی نکل گئی۔ گرنے والی چھت کے لینٹر کے کچھ بڑے ٹکڑے ہو کر بعض طالبات کے سروں پر لگے اور وہ وہیں گر گئیں۔ یہ دیکھ کر لڑکیاں اونچی آواز سے چیخنے لگیں۔ اب گری ہوئی چھت کے نیچے ہم دبکی ہوئی تھیں اور چھت کا ملبہ ہمارے سروں سے تھوڑا سا اوپر تھا۔ میں نے چیخنے والی لڑکیوں سے کہا: بہنو! صبر کرو' حوصلہ رکھو' اللہ ضرور اپنا فضل کرے گا۔ اسی دوران ہم نے دیکھا کہ زلزلہ کی وجہ سے کلاس روم کی دیوار میں ایک شگاف پڑ چکا تھا لیکن اس سے آسانی سے گزر کر باہر نکلنا ممکن نہ تھا۔ ہم نے سوچا کہ ہم بھی یہاں دبکی ہوئی گھٹ کر مر جائیں گی۔ اسی دوران باہر سے کسی نے شگاف میں ہاتھ ڈالا اور آواز دی: بیٹیو! میرا ہاتھ پکڑو۔ میں فرش پر رینگتی رینگتی شگاف کی طرف بڑھنے لگی۔ آخر اللہ اللہ کر کے میں شگاف تک پہنچ گئی۔ میں نے شگاف کے اندر نظر آنے والا ہاتھ پکڑا۔ باہر موجود آدمی بڑی احتیاط سے گھسیٹ کر مجھے باہر نکالنے میں کامیاب ہو گئے۔ پھر انہوں نے مزید 15 لڑکیوں کو اسی طرح نکالا' جبکہ باقی ماندہ لڑکیوں کی لاشیں ہم کمرے میں ہی چھوڑ آئے تھے۔

کلاس روم سے باہر نکلنے کے بعد میں نے سوچا کہ ایسا صرف ہمارے سکول میں ہی ہوا ہے لیکن جب گیٹ سے باہر نکلنے لگی تو جگہ جگہ فرش پر پڑا خون دیکھ کر گھبرا گئی۔ میں نے اپنے کپڑوں پر نظر ڈالی تو وہ بھی خون سے بھرے ہوئے تھے۔ یہ دوسری لڑکیوں کا تھا' میں ایک سہیلی کو ساتھ لے کر واپس گئی اور کلاس روم میں پڑنے والے شگاف کے پاس منہ کر

کے اپنی بچھڑ جانے والی پیاری سہیلی کو زور زور سے پکارنے لگی: ثوبیہ تم کہاں ہو؟ ثوبیہ تم کہاں ہو' اگر زندہ ہو تو مجھے آواز دو تمہیں باہر نکالیں۔

میرے بار بار آواز دینے کے باوجود کوئی جواب نہ ملا تو میں سمجھ گئی کہ میری پیاری سہیلی ہمیشہ کے لیے ہم سے بچھڑ گئی ہے۔ وہ اب کبھی نہ ملے گی۔ میں اس سہیلی کے ساتھ گرتی پڑتی زخموں سے چور اپنے گھر کی طرف بھاگی کہ دیکھوں ابا اور اماں زندہ ہیں یا......؟ میں نے سوچا گھر سے کون ہمیں سکول سے لینے آئے گا۔ وہ سب مر چکے ہوں گے۔ لیکن پھر بھی جا کر دیکھوں شاید کسی میں زندگی کی رمق موجود ہو۔ راستے میں ماموں ملے' وہ مجھے لینے کے لیے سکول کی طرف بھاگے چلے آ رہے تھے۔ ہم گھر پہنچے۔ گھر سے دیواروں کا سہارا لیتی ہوئی ماں بیٹی جماعت الدعوۃ کے میڈیکل کیمپ تک پہنچیں۔ یہاں انہوں نے ہمارا بھر پور علاج کیا اور اب ہم یہاں خیمہ بستی میں تندرستی کے عالم میں مقیم ہیں۔ یہ لوگ صبح و شام ہماری خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔ اللہ ان کی حفاظت کرے۔ یہ بہن اپنی بپتا سنا کر چپ ہوئی تو ہم نے پوچھا: بہنا! تمہارے ابو تم کو کس بات پر ڈانٹتے ہیں اور کس بات پر ناراض ہوتے ہیں' جب تمہیں ملیں گے تو تم ان سے کیا فرمائش کرو گی؟

وہ فوراً جواب دینے لگی: نہیں جی! میرے ابو ہم سے کبھی بھی ناراض نہیں ہوتے' نہ وہ ہمیں کسی بات پر ڈانٹتے ہیں۔ وہ ہمیں بہت زیادہ بہت ہی پیار کرتے ہیں۔ لاڈ کرتے ہیں۔ ہمارے ساتھ کھیلتے ہیں۔ خود بھی ہنستے ہیں ہمیں بھی خوب ہنساتے ہیں۔ ہماری ہر فرمائش پوری کر کے ہمیں خوش کرتے ہیں۔ مجھے شروع سے گڑیاں جمع کرنے کا شوق ہے۔ میں ابو سے ہمیشہ نئی گڑیا کی فرمائش کرتی ہوں' وہ مجھے لا دیتے ہیں۔ ان کی لا کر دی ہوئی سب گڑیاں گرنے والے مکان کے ملبے کے نیچے دب گئی ہیں۔ اب جب ابو مجھے یہاں ملنے آئیں گے تو میں ان سے گڑیا لا کر دینے کا مطالبہ کروں گی۔ وہ فوری لا کر دیں گے اور میں اس سے کھیلوں گی۔

قارئین!...... دل پر ہاتھ رکھ کر سوچیں۔ کون بتائے اس بیچاری کو کہ اس کے پیار

کرنے والے ابو اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ اس کو پیار کرنے والے اللہ کے پاس پہنچ گئے ہیں۔ اب کون اسے پیار کرے گا؟ کون اس کے مطالبات پورے کرے گا؟ کون اس کو ہنسائے گا اور کون اس کے سر پر ہاتھ رکھے گا؟ ہم نے اس کو بتانا مناسب نہ سمجھا کہ اس کا لاڈو پیار کرنے والا ابو اس سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ چکا ہے۔

اس بہنا کے پاس اس کی حافظ قرآن کزن بیٹھی تھیں، میں نے اور بھائی شبیر احمد سلفی نے اس سے وعدہ کرتے ہوئے کہا: بہنا تم فارغ وقت میں اپنی اس بہن کو آیات قرآنی حفظ کروانا شروع کردو۔ ہم تمہارے لیے اہل پاکستان کو کہیں گے وہ تمہیں اس کے بدلے میں ایک خوبصورت تحفہ یا انعام بھیجیں گے۔ ہم نے ایک ہفتہ بعد اس بہن کے پاس دوبارہ جانا ہے دیکھتے ہیں کون اہل دل اس بہن کے لیے بہترین تحفہ بھجواتا ہے۔ وہ بہن قرآن یاد کر رہی ہے۔ ہم نے اس یتیم کی قرآن یاد کرنے کے صلے میں بہترین حوصلہ افزائی کرنی ہے۔ دیکھئے کون سبقت لے جاتا ہے؟

بابا گھر کب آؤ گے؟

(زلزلہ میں بے گھر ہونے والی کشمیری بیٹی کا پیغام باپ کے نام)

لٹ چکی ہے یہاں ارمانوں کی دنیا
کھل گئے ہیں یہاں زخموں کے خزانے
بابا گھر کب آؤ گے؟
بیچارگی کے زخم ہیں، یہاں بے بسی کے پھول ہیں
یہاں بستیاں مکینوں سے خالی ہوگئی ہیں
خواب آنکھوں سے بچھڑ گئے ہیں
باغ شہر کے پھول سے طالب علم
سب ہم سے بچھڑ گئے ہیں
مقدر میں اب اپنا گھر ہی نہیں ہے شاید

لفظوں سے دل کا خون ٹپک رہا ہے
ماں کو کن لفظوں سے تسلی دو گے
آ جاؤ کہ مل کر اشکوں سے باوضو ہو کر
سینے میں چھپا کر اپنے غم کو نماز عید ادا کریں
لپٹ کر اپنے غم سے ہم
رب ذوالجلال سے صبر جمیل کی دعا کریں
بھیا عبداللہ کالج کے ملبے کے نیچے ہے
بہن علینہ سکول کے ملبے کے نیچے ہے
منی بھی ہم سے بچھڑ گئی ہے
اپنی پلکوں پہ سجائے اشکوں کے چراغ
دامن میں لیے ہوئے آس وامید
بابا گھر کب آؤ گے؟

احساس کے آنسو

صبح ہی صبح موبائل کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف ایک بہن کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی' وہ پوچھنے لگی:

آپ طاہر نقاش بول رہے ہیں؟ میں نے کہا: جی بہن! بتایئے کیا بات ہے؟ وہ بہن کہنے لگی: ''بھائی جان! رات کے وقت غزوہ میں میری ۱۲ سالہ بیٹی اقصیٰ نے آپ کا ایک کالم ''ابو جان گڑیا لائیں گے'' پڑھا تو وہ رونے لگی۔ آپ نے اس کالم میں وسیم اختر نام کی بچی کے گھر کی زلزلہ میں تباہی کے نتیجے میں بے گھر ہو جانے اور زلزلہ میں ملبے کے نیچے دب کر اس کے باپ کے فوت ہو جانے کا دلدوز واقعہ لکھا ہے۔ میری بچی نے رات جب سے یہ واقعہ پڑھا ہے تو مسلسل روئے جا رہی ہے اور کہتی ہے کہ اللہ جانے وسیم اختر بیچاری یتیم ہو کر کیمپ میں کس طرح زندگی گزار رہی ہوگی۔ اس کے ابو تو فوت ہو چکے ہیں' لیکن اس کو اب تک کسی نے نہیں بتایا، اس کو گڑیا کون لا کر دے گا؟ کہ جس کی وہ خواہش کر رہی ہے۔'' تھوڑی دیر رکنے کے بعد پھر بہن دوبارہ گویا ہوئی:...... ہمارے خاندان میں ایک شادی آنے والی ہے. بچی نے اس کے لیے ضد کر کے نئے کپڑے بنوائے ہیں۔ میں نے اپنی مالی پوزیشن کمزور ہونے کی بنا پر بڑی مشکل سے محنت مزدوری کر کے اس کو بنا دیے ہیں' کہ اس معصوم کی خواہش بے بسی کی بنا پر ہی نہ دم توڑ دے، لیکن اب وہ مسلسل روئے جا رہی ہے کہ میرے یہ شادی کے لیے تیار کیے گئے کپڑے، جیولری اور چوڑیاں وغیرہ سب کچھ اس زلزلہ زدہ یتیم بچی کو بھیج

دیں۔ وہ بہن لے کر خوش ہو گی تو میں خوش ہو جاؤں گی' کیونکہ اس کو اب کون لے کر دے گا؟ اس کا تو باپ فوت ہو چکا ہے۔ میں شادی کے موقعہ پر پرانے کپڑے ہی پہن لوں گی۔ اب بتایئے بھائی جان! میں کیا کروں؟ میں گزشتہ رات سے بچی کی یہ حالت دیکھ کر بہت پریشان ہوں۔"

میں نے بہن کی آواز سے محسوس کیا' جیسے وہ خود بھی رو رہی ہو یا ابھی کھل کر رو دے گی۔ ایک کم سن بچی کا زلزلہ زدہ یتیم بچی کے لیے یہ احساس، یہ تڑپ، یہ ایثار اور جذبہ دیکھ کر میری آنکھیں بھر آئیں اور سوچنے لگا کہ اگر ساری قوم اپنے زلزلہ زدہ اور آفت زدہ بھائیوں کے غم میں یوں ہی تڑپنے لگے، گھلنے لگے اور ان کے درد کو اپنا درد سمجھنے لگے تو ہمیں کبھی غیروں کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے نہ دیکھنا پڑے اور نہ کوئی ڈونرز کانفرنس بلانی پڑے۔

میں سوچوں میں گم تھا کہ اس بہن کی آواز ایک وقفے کے بعد دوبارہ ابھری:

...... بھائی! وہ کہتی ہے: جیسے میں لاڈ پیار اور شفقت کرنے والے باپ کے سائے سے محروم ہوں' ایسے ہی میری یہ بہن محروم ہو چکی ہے۔ لہٰذا میرا شادی میں شرکت کے لئے تیار کیا گیا سارا سامان اسے پہنچا دیا جائے"۔ یہ سن کر میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا: کیا اس کا باپ ......؟؟ ہاں بھائی! یہ ابھی چار سال کی تھی' جب اس کا باپ اس کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے اس سے بچھڑ گیا اور قبر میں جا سویا۔ اسی لئے یہ ایک یتیم بچی کے درد کو زیادہ شدت سے محسوس کر رہی ہے اور روئے چلے جا رہی ہے۔

میں فون سن رہا تھا تو اب تک تو میری آنکھوں کی پلکوں کے حصار نے آنسوؤں کو روک رکھا تھا لیکن اب وہ انہیں مزید نہ روک سکیں۔ میں اپنی بے بسی پر، اپنی کم مائیگی اور قوت ادراک کے جذبے کی عدم دستیابی پر رو دیا اور دل ہی دل میں پکار اٹھا: اے اللہ، کاش! یہ جذبہ صادقہ، یہ تڑپ اور احساس کے یہ آنسو، دوسرے کے درد میں پگھلنا، جھلسنا، اور گھلنا ...... کاش یہ میرے نصیبے میں آیا ہوتا۔ یہ یتیم و بے آسرا بچی ہم جیسے نام نہاد ناموروں، مفکروں، مدبروں، محققوں، اور معلّموں پر سبقت لے گئی' اور میرا دل چاہا کہ میرے پاس کوئی

ایسی قوت ہو کہ میں چیخ چیخ کر چلاؤں اور پوری دنیا کے ان باپوں کو اپنی آواز سناؤں جو بچیوں کی پیدائش پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ اپنی بیویوں پر برستے ہیں۔ بچیوں کو بوجھ سمجھ کر ان سے نفرت کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کے ہاں بچے ہی بچے پیدا ہوں' بچی کبھی پیدا نہ ہو۔ انہیں بتا دوں کہ بچیاں ہی رحمت ثابت ہوتی ہیں۔ نیک پرورش کرنے پر جنت کی کنجی ثابت ہوتی ہیں۔ بچیاں ہی ہمیشہ سب سے زیادہ ماں باپ کے درد کو محسوس کرتی ہیں۔ جب والدین فوت ہو جاتے ہیں تو اکثر بیٹے، اپنی راتیں ٹی وی' فلموں' دوستوں یاروں تاش پتوں یا لڈو کیرم وغیرہ جیسی مجلسوں اور محفلوں میں مصروف رہ کر گزارتے ہیں' سوائے ان بچوں کے جن پر اللہ کا خاص کرم ہو...... جبکہ بیٹیاں رات دن والدین کی محرومی کو محسوس کرتی ہیں اور ان کے لیے اپنے رب کے حضور ہاتھ اٹھا کر دعا گو رہتی ہیں...... یہ بھی ایک یتیم بچی ہی ہے جو کہہ رہی ہے کہ میرے شادی کے کپڑے اور سامان وغیرہ اس بچی کو پہنچا دیں' اور ان سے کہہ دیں کہ وہ اس کے بدلے میں اس کے پیارے باپ کے حق میں دعا کر دیں کہ اللہ تعالیٰ اس کو جنت الفردوس میں جگہ دے دے۔ میں نے اس بہن سے وعدہ کر لیا کہ میں اس کے تحفے زلزلہ زدہ یتیم بچی وسیم اختر تک خود مظفر آباد جا کر پہنچاؤں گا۔ وہ مرکز القادسیہ کسی کے ہاتھ بھیج دے۔ ملک بھر اور بیرون ملک سے دیگر بہت سے لوگوں نے اس بچی کے لیے تحائف بھیجے۔ سوائے اہل کراچی کے کہ وہ ایسے مواقع پر ہمیشہ سبقت لے جانے کی کوشش کرنے والے آخر دم تک سوئے ہوئے ہیں:

یہ بڑے کرم کے ہیں فیصلے
یہ بڑے نصیب کی بات ہے

بہر حال میں وعدہ کر کے اپنے معمولات میں مصروف ہو گیا اور اس واقعہ کو تھوڑی دیر کے لیے بھول گیا تھا۔ ایک دن جب میں دفتر پہنچا تو ایک دو نہیں بلکہ پورے پانچ کارٹن میرے منتظر تھے۔ ان کو بند کر کے اوپر لکھا ہوا تھا ''بھائی طاہر نقاش کو ملے'' جی ہاں! یہ یتیم بیٹی اقصیٰ اکرم کے بھیجے ہوئے تھے۔ مجھے یقین نہ آیا لیکن ان کارٹنوں پر بھیجنے والے چار

ناموں میں اس کا نام بھی شامل تھا۔ معلوم کرنے پر پتا چلا کہ اس نے اپنے تین چھوٹے بہن بھائیوں کو ساتھ ملایا اور بازار جا کر سردی کے اس ٹھٹھرتے موسم میں اس بچی کے لیے خاص طور پر ہر طرح کی ضروریات زندگی سے متعلق اشیاء کی خریداری کی۔ اس میں جیکٹیں، جرسیاں، گرم سوٹ، دستانے، جرابیں، شال وغیرہ اور ساتھ ایک کارٹن میں کھانے پینے کی چیزیں مثلاً شہد، ٹافیاں، چاکلیٹ بسکٹ وغیرہ اور ایک کارٹن میں کھلونے تھے خاص طور پر ایک خوبصورت قیمتی گڑیا بھی تھی۔ اس طرح کتنے ہی دیگر قیمتی نئے سلے ہوئے خوبصورت سوٹ تھے ...... میں یہ سب کچھ غزوہ کی ٹیم کے ساتھ دیکھ رہا تھا ...... سب بھائی انگشت بدنداں تھے اور دعا کر رہے تھے کہ اللہ ایسا ہی جذبہ پوری قوم کے لوگوں کو عطا کر دے۔ بھائیوں نے بتایا کہ بچی نے اس سامان کے ساتھ یہ دو ہزار روپے بھی بھیجے ہیں اور کہا ہے کہ اس بہن کو دے دینا اور کہنا کہ کھلونوں میں سیل وغیرہ ڈالنے کے لیے ان پیسوں کو استعمال کر لے۔ مجھے یہ جذبات، یہ آنسو ...... اور یہ تڑپ دیکھ کر محسوس ہوا کہ اس بچی کا یہ سامان کروڑوں روپے بھیجنے والوں پر بھاری ہوگیا۔ یہ تو پوری قوم سے بازی لے گئی۔ ان کو ایک سبق دے گئی، اگر کوئی سمجھے تو۔

ایک ہفتہ بعد وعدہ کے مطابق ہم اس کے تحائف اور ملک بھر سے اکٹھا ہونے والا سامان لے کر اس یتیم بچی کے پاس چہلہ بانڈی جماعت کے کیمپ میں پہنچ گئے اور اس بچی کو اس کے لواحقین کی موجودگی میں سامان دے دیا۔ وہ یہ سامان لے کر اس قدر خوش ہوئی جیسے اس کو دنیا جہاں کی دولت کے خزانے مل گئے ہوں ...... وہ پھولے نہ سما رہی تھی ...... اس نے ان کپڑوں سے ایک خوبصورت سوٹ پہن لیا ...... اور سب خاندان والوں کو اترا اترا کر دکھانے لگی ...... کہ دیکھو! پاکستان سے میری ایک بہن نے میرا کس قدر خیال رکھا ہے اور مجھے نہ جانتے ہوئے بھی اس قدر تحائف بھیج دیے۔ میں ان کو اپنی ساری زندگی سینے سے لگا کر رکھوں گی۔ اس بہن اور اس کے شفیق والد کو اپنی دعاؤں میں یاد کرتی رہوں گی۔

ہم نے حسب وعدہ مظفر آباد خیمہ بستی سے لاہور میں اس بہن سے فون پر رابطہ کیا کہ

ہم نے اقصیٰ بہن کے تحائف وسیم اختر کو پہنچا دیے ہیں۔ وہ کہتی تھی کہ میری بات فون پر کروا دینا' اب اس سے بات کروا دیں۔ والدہ نے بتایا: وہ سکول گئی ہے۔ پھر کہنے لگی: میں اسے ابھی لاتی ہوں۔ وہ پندرہ منٹ بعد بچی کو لے کر گھر پہنچ گئی۔ ہم ابھی خیمہ میں ہی تھے کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ ہم نے حال احوال پوچھنے کے بعد کہا: اقصیٰ بیٹی! وسیم سے بات کرو گی؟ وہ تو جیسے پہلے ہی بیقراری سے منتظر تھی۔ فوراً بولی: جی ہاں۔ میں نے کہا: لو کر لو بات اور موبائل زلزلہ زدہ یتیم وسیم کو دے دیا۔ سلام دعا کے بعد اقصیٰ نے پوچھا: دکھیاری بہن! میرے تحائف مل گئے ہیں اور کیا پسند آ گئے؟ اور مزید بتاؤ تمہیں کس کس چیز کی ضرورت ہے؟ میں لاہور سے خرید کر تجھے بھیجوں گی۔ وہ کہنے لگی: مجھے آپ کے بھیجے تمام تحائف مل گئے ہیں ...... سب بہت اچھے اور قیمتی ہیں ...... مزید مجھے دعاؤں اور پیار کے علاوہ کچھ نہیں چاہئے ...... میں آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ آپ نے مجھے یاد رکھا۔ ہمارے دکھوں کو اپنا دکھ، ہمارے درد کو اپنا درد سمجھا اور اس قدر پیار دیا...... اس بیٹی کو کیا معلوم کہ یہ بیٹی جو پیار کی برکھا برسا رہی ہے' خود بچپن ہی سے پیار جیسی نعمت سے محروم ہو چکی ہے۔ آج تک اس کے لیے ترس رہی ہے' کیونکہ تین چار سال کی عمر میں ہی باپ اللہ کو پیارا ہو گیا ...... یہ خود لاڈ پیار کی لذتوں سے محروم ہو کر دوسروں پر اس کی برسات برسا رہی ہے۔ خزاؤں میں گھری ہوئی کلی بہار کے غنچے کھلا رہی ہے، خود کملا کر دوسروں کو مہکا رہی ہے۔

فون پر وسیم اختر کا جواب سن کر یہ گڑیا اس بہن کے غم میں رونے اور آنسو بہانے لگی کہ اے بہن! پیاری بہن! میری طرح تو بھی آج باپ کے سایہ شفقت سے محروم ہو گئی ...... وہ روئے چلی جا رہی تھی ...... جبکہ دوسری طرف یتیم وسیم اختر اب اس کو چپ کروا رہی تھی کہ بہنا چپ ہو جاؤ، مت روؤ میری عظیم بہنا! ...... میں تم سے التجا کرتی ہوں کہ مت رو۔ دیکھو جب میں نہیں رو رہی، میں صبر کر چکی ہوں تو تم کیوں رو رہی ہو؟ ...... مت رو ورنہ مجھے بھی رونا آ جائے گا۔ پھر ہمیں کون چپ کروائے گا (کہ دونوں کے چپ کروانے والے شفیق باپ تو ہمیشہ کے لیے بچھڑ چکے ہیں) مگر اقصیٰ بیٹی تھی کہ مسلسل ہچکیاں باندھے روئے چلی جا

رہی تھی۔ اب وسیم کی کزن حافظہ قرآن باپردہ بہن نے فون لے کر اپنے انداز سے اس کو چپ کروانا شروع کیا...... لیکن کوشش بسیار کے باوجود ناکام رہی...... پھر میری طرف...... فون بڑھا دیا کہ آپ اسے چپ کروائیں...... میں کیا چپ کرواتا۔ یہ صورت حال دیکھ کر میرا دل تو خود اندر سے رو رہا تھا گو ظاہری طور پر میں مطمئن و خاموش بیٹھا تھا۔ میں نے لرزتے ہاتھوں سے فون پکڑ کر دلاسہ دینا شروع کیا...... مت روؤ میری بہن!...... مت رو...... اگر تم نے بھی رونا شروع کر دیا تو پھر وسیم کو کون چپ کروائے گا...... یہ یہاں بہت خوش ہے...... جماعۃ الدعوۃ والے اس کا بہت خیال رکھ رہے ہیں...... اسے تقریباً کسی قسم کی پریشانی نہیں...... لیکن دوسری طرف ہچکیوں کا ایک سلسلہ تھا...... آہوں کا ایک طوفان تھا...... سسکیوں کا نہ ختم ہونے والا سیلاب تھا...... معصوم چیخیں تھیں...... میں کیا چپ کرواتا...... میں اس سیلاب اور اس طوفان کا...... مقابلہ نہ کر سکا...... بلکہ خود رو پڑا اور پھر روتا چلا گیا...... آنسو تھے کہ بہتے چلے گئے...... بہت چھپانے اور روکنے کی کوشش کروں لیکن یہ رکنے کا نام نہ لیتے تھے...... خیمے کا ماحول بہت افسردہ، خاموش...... غمگین...... بن گیا تھا۔ سب دیکھ رہے تھے کہ چپ کروانے والا خود رونے لگا ہے۔ یوں میں روتا چلا گیا...... آنسو بہاتا چلا گیا...... اور مجھے ناکام دیکھ کر میری چپ کروانے کی ڈیوٹی وہاں موجود ایک اور فرد نے سنبھال لی...... آخر ہم ان مناظر میں افسردگی کی حالت میں اپنا فریضہ ادا کر کے واپس آ گئے۔ لاہور آ کر مجھ سے شبیر سلفی بھائی نے پوچھا: طاہر بھائی! آپ نے کس لئے آنسو بہانے شروع کر دیے تھے؟ میں انہیں کیسے بتاتا کہ یہ سب احساس کے آنسو تھے۔ احساس ہی اصل زندگی ہے اگر یہ ختم ہو جائے تو قوموں کی زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ اگر برقرار رہے تو وہ دنیا میں سربلند و معزز بن کر ابھرتی ہیں۔

عید قربان اور آرزوؤں کی قربانی

میں نے مسواک خرید کر گلے میں پہنا ہوا مفلر درست کیا اور موٹر سائیکل کو کک لگا کر سٹارٹ کر لیا..... لیکن جونہی میں آگے بڑھنے لگا تو موٹر سائیکل کے چلنے اور حرکت کرنے سے پہلے ہی ایک دھیمی سی..... بیٹھی بیٹھی سی ..... کمزور سی..... پست اور دبی دبی سی..... جھجکی ہوئی آواز..... میرے کانوں سے ٹکرائی..... ''بھائی جان!..... بھائی جان! مجھے بھی اگلے سٹاپ تک اپنی گاڑی پہ بٹھائیں..... بہت مہربانی ہوگی آپ کی۔''

میں نے آواز سنی ان سنی کر کے نظر انداز کر دی کہ اللہ جانے کون کس سے مخاطب ہے۔ جیسے ہی میں آگے بڑھا تو وہی معصوم سی..... التجا آمیز رندھی وگلوگیر آواز دوبارہ میرے کانوں سے ٹکرائی: ''بھائی جان!..... مجھے بھی اگلے سٹاپ تک لیتے جائیں، میرے پاس کرایہ نہیں ہے۔ بہت مہربانی ہوگی۔'' میں نے گردن گھما کر پیچھے دیکھا تو ایک چھوٹا سا..... معصوم سا، شرمایا سا، سہما سا، چھوئی موئی سا، کمزور اور دبلا پتلا سا..... لڑکیوں جیسی انجانی شرم سے..... بمشکل ایک بڑا سا شاپر پکڑے سڑک پر کھڑا تھا..... شاپر کا بوجھ اس ننھی منی کمزور سی جان کیلئے ناقابل برداشت تھا..... اس کے چہرے ہاتھوں اور جسم کے دوسرے تنے اور سکڑے ہوئے اعصاب پکار پکار کر اس کی تھکاوٹ و نڈھالی کا قصہ بیان کر رہے تھے۔ میں نے اس کو بوجھ اٹھانے کی تکلیف میں مبتلا دیکھ کر اس کا شاپر پکڑ کر موٹر سائیکل کی ٹینکی پر رکھا اور اس سے کہا: بیٹھ جاؤ۔

اس کے بیٹھتے ہی موٹر سائیکل چلنے لگی..... اور میرا دماغ بھی اس کی آواز کو پہچاننے کیلئے تیزی سے کام کرنے لگا اور ماضی قریب کے زمانے کو اور اس روڈ پر ہونے والے مختلف

اوقات میں سفروں کو کریدنے لگا۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ اس آواز کو میں پہلے بھی جانتا ہوں۔ اس طرح کی آواز پہلے بھی دو تین دفعہ میرے ساتھ سفر کر چکی ہے۔ لیکن اس آواز کے نام میری یادداشت کے مطابق علی اور چاند تھے۔ موٹر سائیکل چلاتے ہوئے میں نے دریافت کیا: ننھے بھائی! تمہارا نام کیا ہے؟...... جی!...... میرا...... میرا...... نام سنی (Sunny)(سورج) ہے۔ میں نے کہا: بھائی میری یادداشت کے مطابق تم پچھلے تقریباً ڈیڑھ سال میں 5 دفعہ میرے ساتھ ایسے ہی سفر کر چکے ہو، میں تمہاری آواز پہچانتا ہوں۔ مجھے یاد ہے پہلے تم نے اپنا نام چاند بتایا...... پھر ایسے ہی ایک سفر میں...... علی بتایا...... اور اب تم سنی بتا رہے ہو؟ یہ تم اپنا نام بدلتے کیوں رہتے ہو؟...... ننھا منا...... معصوم پھول...... گھبرایا...... شرمایا...... ہکلایا...... اور پھر ڈرتے ہوئے ہلکے سے انجانے خوف کے خطرے کے احساس سے...... بلبلایا...... اور گویا ہوا: جی! میرا نام سنی ہی ہے...... چاند اور علی میرے سگے بھائی ہیں۔ آج میری باری تھی، وہ بیمار تھے...... اس لئے مجھے دربار آنا پڑا...... اچھا طریقہ ہے یہ' نام بدلتے رہے اور جب پکڑے گئے تو کہہ دیا: ان ناموں کے میرے اور بھائی ہیں...... خوب خوب بہت خوب۔ چھوٹی سی عمر میں ہی بہت تیز طرار اور ہوشیار و چالاک ہو...... میں خاموش ہو گیا کہ دیکھوں بچہ کیا جواب دیتا ہے؟...... موٹر سائیکل چلتا رہا...... گاڑیاں قریب سے ہارن بجاتی گزرتی رہیں...... میرے کان بھی بچے کے جواب میں محو انتظار اور ہمہ تن گوش رہے...... لیکن جواب نہ آیا...... البتہ تھوڑی دیر بعد ایک ہلکی سی...... حلق میں پھنسی سی...... رندھی گلوگیر...... تکلیف دہ...... آہ اور درد بھری...... سسکی...... میرے کانوں سے ٹکرائی...... یہ کس کے دل کی شمع پگھل گئی تھی...... کس کے احساسات لرز اٹھے تھے...... کس کے حواس زخمی و شل ہو گئے تھے...... کس کی سوچیں...... کس کی فکریں...... بکھر گئی تھیں...... کہ جن کی درد کی کسک سے یہ سسکی ابھری تھی...... لیکن یہ سسکی تو میرے بالکل قریب سے آئی تھی...... میں نے حیرت و استعجاب کے سمندر میں غرق فوری موٹر سائیکل سڑک کے ایک طرف روکا اور مڑ کر پیچھے دیکھا...... تو...... معصوم چھوٹی چھوٹی...... ننھی ننھی...... معصوم معصوم سی...... مستقبل کے سہانے خوابوں سے نامانوس آنکھوں میں...... دو

ننھے ننھے آنسو تیر رہے تھے..... یہ سسکی بھی انہی غمگین..... پرنم.....اور پر غم.....آنکھوں کی ترجمان بن کر نکلی تھی۔ میں اس معصوم کی یہ حالت دیکھ کر سکتے میں آ گیا.....فوری ذہن میں آیا کہ میں نے ایک معصوم دل کو دکھا دیا ہے.... ''یہ کیا!! تم جواب دینے کی بجائے..... سسکیاں لے رہے ہو، رو رہے ہو.....؟'' میں نے کہا.....''بھائی..... بھائی جا..... بھائی جان!..... میں ایسا بچہ نہیں ہوں..... میں کسی کو دھوکہ نہیں دیتا..... نہ ہی جھوٹ بولتا ہوں'' بچہ رو دیا۔ میں نے اس کی توجہ ہٹانے کیلئے فوری دوسرا سوال کر دیا: ''اچھا چھوڑو سب کچھ، یہ بتاؤ کہ یہ شاپر میں کیا ہے؟..... جو تمہاری کمزور سی نحیف و کمزور اور ناتواں جان سے اٹھایا بھی نہیں جا رہا..... حالانکہ یہ کوئی زیادہ وزن نہیں ہے۔'' میرے سوال پر کچھ خاموش رہنے..... سوچنے اور غور و فکر کرنے کے بعد اس نے دوبارہ آنکھیں اوپر اٹھائیں تو افسردگی اور غمناکی دوبارہ اس پر چھا چکی تھی۔ کہنے لگا: بھائی جان..... ہم چھ بہنیں..... اور چار بھائی ہیں..... کرائے کے مکان میں رہتے ہیں..... غریب ہیں..... بے کس و بے بس ہیں..... والد صاحب سات سال قبل ایک زیر تعمیر مکان کے لینٹر سے گر گئے' کمر کی ہڈی ٹوٹ جانے کی وجہ سے آج تک بیمار ہیں..... والدہ گھر سے باہر نہیں نکل سکتیں..... ہمارا کوئی غم خوار و غمگسار نہیں..... پیسے ہمارے پاس نہیں..... ہم نے روٹی بھی کھانی ہوتی ہے.....کوئی ہمیں دیتا نہیں..... اس لئے ہم تین بھائی مل کر باری باری روٹیاں اور کھانا اکٹھا کرتے ہیں اور رات کو گھر لے جاتے ہیں جو سب اللہ کا شکر ادا کر کے کھا لیتے ہیں۔ اب بھی اس شاپر میں چاول ہیں جو میں گھر والوں کیلئے لے جا رہا ہوں۔

میں اس کے ساتھ اپنے شک والے رویہ پر بہت پشیمان ہوا اور پوچھا کہ تم چھوٹے سے ہو' تمہیں ڈر نہیں لگتا اور کیا تم سکول نہیں جاتے اور یہ چاول کہاں سے اور کیسے لائے ہو؟ تفصیل سے بتاؤ۔ یہ سن کر وہ دوبارہ بولا لیکن اب وہ سنبھل چکا تھا اور اپنے آپ پر ضبط و کنٹرول کر چکا تھا۔ ''بھائی جان! ڈر تو لگتا ہے اتنی خوفناک ٹریفک میں جان جانے کا خطرہ ہے' بچوں کو پکڑنے والے بھی ادھر ہوتے ہیں..... کبھی کسی سے جھڑکیاں گالیاں بھی سننی پڑتی ہیں..... کسی سے مار بھی کھانی پڑتی ہے..... یہ سب کچھ اپنی جگہ ٹھیک ہے لیکن ہم اس چیز

سے خوف کھا کر گھر بیٹھ جائیں تو گھر میں بیٹھی بیمار والدہ اور بھوکی بہنیں کہاں سے کھائیں...... ان کے لئے یہ سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ باقی ہم چند خدا ترس لوگوں کی مدد سے سکول جاتے ہیں کبھی کبھی کچھ سکول والے بھی ہماری فیسیں کتابیں وغیرہ فری کر دیتے ہیں اور بعض لوگ ہم کو سکول کی وردیاں لے دیتے ہیں۔ یوں ہم سکول میں جا رہے ہیں جبکہ بہنیں وسائل نہ ہونے کی بنا پر 7 کلاسوں کے بعد گھر بیٹھ گئی ہیں۔ ہم سکول سے جب گھر آتے ہیں تو ہم میں سے ایک' فوری دربار علی ہجویری بھاٹی میں آ جاتا ہے۔ خیرات بانٹنے والوں کی خیرات جو چاول یا روٹی دال کی شکل میں ہوتی ہے' اکٹھی کرتا رہتا ہے۔ رات دس یا گیارہ بجے تک جتنا کھانا اکٹھا ہو جائے وہ لے کر گھر کو روانہ ہو جاتا ہے' اس لئے کہ بھوکے بہن بھائی دوپہر سے بھوکے پیاسے راہ تک رہے ہوتے ہیں۔ یوں کسی کی منت سماجت کر کے مختلف سٹاپوں پر اترتے چڑھتے ہوئے ہم گھر پہنچ جاتے ہیں۔ اس کھانے کے تین حصے کرتے ہیں۔ ایک گرم کر کے کھا لیتے ہیں۔ ایک صبح اور ایک حصہ دوپہر کو کھاتے ہیں۔ دربار پر بٹنے والی یہ خیرات ہی ہماری خوراک ہے' اس لئے کہ ہمیں کوئی کھانے کیلئے کچھ نہیں دیتا۔ آج باقی بھائی بیمار تھے اس لئے میری یہاں آنے کی باری لگی۔ اب رات کے گیارہ بجے اپنی ڈیوٹی پوری کر کے جا رہا ہوں۔ مہربانی ہوگی اگر آپ مجھے گھر پر چھوڑ دیں ورنہ لوگوں کی منتیں کرتے ہوئے گھر تک پہنچتے مجھے ایک دو گھنٹے مزید لگ سکتے ہیں۔ میں یہ سوچتے ہوئے کہ اس کو اس کے گھر ہی چھوڑ دیتا ہوں یوں اس کی بات کی تصدیق بھی ہو جائے گی' اب اس کے گھر کی طرف گاڑی دوڑانے لگا۔

کچی گلی میں پہنچ کر ان کے گھر کا خستہ و شکستہ حالت کا ٹین کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ تھوڑی دیر بعد کراہوں میں ہانپتی کانپتی ایک آواز کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر مگر موٹی سی عورت نے دروازہ کھولا۔ دیکھتے ہی پتہ چلا کہ ان محترم خاتون سے تکلیف کی بنا پر کھڑا نہیں ہوا جا رہا۔ ساڑھے گیارہ بجے کا وقت تھا۔ دروازہ کھولتے ہی خاتون پیار سے بولی: آ گیا میرا لعل' میرا چاند' میری آنکھوں کا تارا...... میں پریشان تھی...... پھر یکدم مجھے دیکھ کر اپنے بیٹے کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگیں۔ بیٹے نے بتایا امی جان! یہ بھائی جان ہمیں کئی دفعہ دربار کے

پاس سے لائے ہیں اور کئی دفعہ کرایہ دیا کہ گاڑی پر بیٹھ کر گھر چلے جاؤ۔ آج میں نے ان سے کہا کہ مجھے گھر تک چھوڑ دیں تو اس لئے یہ مجھے یہاں تک چھوڑنے آئے ہیں۔ ماں مجھے دعائیں دینے لگیں۔ میں نے دیکھا کہ کسی نامعلوم تکلیف کی بنا پر ان سے کھڑا نہیں رہا جارہا تو میں نے کہا: اماں جان! میں ان شاء اللہ کل آپ کے پاس چند معلومات کیلئے اور آپ کی داستان سننے آؤں گا اور واپس چلا آیا۔

اگلے دن میں گیا۔ پردہ کا اہتمام کروا کر اماں جان سے دریافت کیا کہ کیا مجبوری ہے کہ آپ اپنے پھول سے بچوں کو صبح 3 بجے سے لے کر رات گیارہ یا بارہ بجے تک دربار کھانا لانے کیلئے بھیجے رکھتی ہیں۔ کہنے لگیں: بیٹا! کیا بتاؤں اور کیا سناؤں۔ اب تو کہانی پرانی ہوگئی ہے۔ اپنے بھی اور پرائے بھی بھول چکے ہیں۔ ہم جلو موڑ سے آگے ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ وہاں محنت مزدوری کے مواقع کم تھے۔ خوشحال مستقبل اور بچوں کے روشن مستقبل کیلئے ہم گاؤں چھوڑ کر لاہور شہر آ گئے۔ کرائے پر رہنے لگے۔ میرے میاں نے مستریوں کے ساتھ دیہاڑی لگانی شروع کردی' یوں ہماری روکھی سوکھی روٹی چل پڑی۔ سات سال قبل میرے سرتاج شادباغ میں ایک مکان کا لینٹر ڈالتے ہوئے دوسری منزل سے نیچے گر گئے۔ ریڑھ کی ہڈی پاخانے والی جگہ سے فوراً ٹوٹ گئی۔ ہڈی گوشت پھاڑ کر باہر نکل آئی۔ وہ شدید زخمی تھے۔ ہم ہسپتالوں میں مارے مارے پھرنے لگے۔

میں جاننے والوں سے' رشتہ داروں سے اور ادھر اُدھر سے پیسے پکڑ کر اپنے محبوب خاوند کی صحت یابی کیلئے لگانے لگی۔ ادھر اُدھر سے قرض پکڑا...... ایک لمبا عرصہ علاج کے بعد میرے سرتاج کی جان تو بچ گئی لیکن وہ ہمیشہ کیلئے ناکارہ واپاہج ہو گئے۔ ہر وقت چارپائی پر پڑے رہنا اور دوائیں کھاتے رہنا ان کی مجبوری اور معمول بن گیا۔ اب لیٹے لیٹے ہی بے اختیار ان کا پاخانہ چارپائی پر خطاء ہو جاتا ہے...... کیونکہ صحت یاب نہیں ہو سکے البتہ کچھ دیر کیلئے صحن میں چلنے پھرنے کے قابل ضرور ہو گئے ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں ہمارے لئے یہی کافی ہے۔ اگرچہ ہمیں ان کا کسی قسم کا فائدہ نہیں لیکن یہ کیا کم ہے کہ وہ ہمارے درمیان زندہ سانسیں لے رہے ہیں۔ ہم پر یہ اللہ کا احسان کیا کم ہے کہ میرا سہاگ

اور سر کا تاج بیماری کی حالت میں ہی اپنے بچوں کے درمیان لیٹے' بیٹھے ان کو دیکھتے رہتے ہیں...... یوں بچے بھی یکسر یتیم ہونے سے اور میں بیوہ ہونے سے بچی ہوئی ہوں۔ اپنے خاوند کے معذور اور بے کار ہوجانے کے بعد میں نے بچوں کو پالنے کیلئے محنت مزدوری شروع کردی۔ میں اور میری بچیاں رات اڑھائی بجے یا تہجد کے وقت اٹھتیں اور جوتوں پر موتی لگاتیں' یوں مزدوری کرتیں۔ صبح سات بجے تک ہم مل کر سو یا ڈیڑھ سو کی مزدوری کرلیتیں۔

اب بچوں کو پالنے کیلئے میں دربار علی ہجویری پر جاتی' خیرات کا کھانا اکٹھا کرتی اور رات کو گھر لاکر بچوں کو کھلاتی۔ یہ میرا روزمرہ کا معمول تھا۔ ڈیڑھ سال پہلے کی بات ہے کہ ایک دن ساڑھے چار بجے میں سڑک پر دو بچیوں اور ان کی ماں کو پک اپ کی زد سے بچانے کیلئے بھاگ کر آگے بڑھی ان کو دھکا دے کر ایک طرف پھینکا۔ یوں وہ دور گرنے کی بنا پر بچ گئیں لیکن میں پک اپ کی زد میں آ گئی۔ پک اپ کے پیچھے ایک ٹرالا آرہا تھا جو پک اپ سے ٹکرا گیا۔ یوں میں ایکسیڈنٹ کا شکار ہوگئی چہرہ پھٹ گیا' جبڑا ٹوٹ گیا' سارے جسم میں ٹوٹے شیشے جا چبھے...... جسم جگہ جگہ سے کٹ پھٹ گیا...... جسم پر لگنے والے چرکوں کی بنا پر جسم کا خون نچڑ گیا...... مجھے کچھ خدا ترس لوگوں نے بیہوشی کی حالت میں میو ہسپتال پہنچایا۔ اللہ جانے مجھے کیا ہوگیا تھا کہ وہ مجھے مردہ سمجھ کر مردہ خانہ میں چھوڑ آئے۔ لیکن جب کچھ دیر بعد دوسری ایک لاش چھوڑنے آئے تو دیکھا کہ میری سانس چل رہی تھی تو فوری مجھے لے جاکر مرہم پٹی کی۔ ٹانگوں میں راڈ ڈالنے کیلئے 22 ہزار روپیہ طلب کیا جبکہ اس صورت میں بعض مخیّر حضرات کے دیئے ہوئے دس ہزار روپے دو تین دن میں ہی لگ چکے تھے۔ اب میرا علاج کروانے والا کوئی نہ تھا۔ اس لئے میں یہ رقم ادا نہ کرسکی۔ لہٰذا اسی حالت میں میری مرہم پٹی ہوتی رہی اور چند دن بعد مجھے ہسپتال سے ڈسچارج کردیا گیا۔ دوائیاں لکھ دی گئی تھیں۔

میری تکلیف اور چیخیں سن کر میرے چھوٹے چھوٹے بچے بعض لوگوں کے پاس میرا ڈاکٹری نسخہ لے کر جاتے' منت سماجت کرتے کہ ہمیں بھیک نہیں بلکہ ماں کو مرنے سے

بچانے کیلئے یہ دوائیاں چاہئیں' وہ گھر آ کر تصدیق کرتے اور میری حالت دیکھ کر دوائیاں لے دیتے۔ یوں وہ دوائیاں کھاتے اور بستر پر لیٹے لیٹے مجھے ڈیڑھ سال ہوگیا ہے۔ اس دوران میرا جسم بہت زیادہ پھول گیا ہے۔ اب میں کمرے سے گھر کے دروازے تک چل کر چلی جاتی ہوں اور یوں رینگ رینگ کر زندگی کی گاڑی کھینچ رہی ہوں۔ جب میں بیمار ہوئی بستر پر لگ گئی تو بچوں کا کھانا پینا بھی بند ہوگیا۔ لہٰذا مجبوراً میں نے اپنے ان پھولوں کو دنیا کے جہنم میں جھونکا کہ جاؤ اور دربار سے چاول و روٹیاں مانگ کر لاؤ اور اپنے بہن بھائیوں کا پیٹ بھرو۔ ڈیڑھ سال سے یہ معمول چل رہا ہے۔ ہم اللہ کی اس تقسیم پر راضی ہیں' شکوہ کرکے اپنا ایمان ضائع نہیں کرسکتے۔

یکے بعد دیگرے میری محرومیوں کی شکار زندگی میں غم کی آندھیاں یوں چلیں کہ دل و دماغ کا گلشن اجڑ کر رہ گیا۔ ابھی چند ماہ ہوئے کہ میری آنکھوں کی ٹھنڈک میری بیٹی ثمینہ کو کسی نے اغوا کرلیا۔ کچھ لوگوں پر مقدمہ درج کروایا لیکن ہماری شنوائی نہ ہوسکی اور نہ ہمارے پاس وسائل تھے کہ ہم ان کا پیچھا کرتے۔ لہٰذا وہ لوگ گرفت میں نہ آئے اور میری اس بچی کا آج تک پتہ نہ چلا کہ اسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ میں اکثر صبح نماز کے وقت زاروقطار اس کو یاد کرکے روتی ہوں۔ جانے میری بچی کس حالت میں ہوگی۔ زندہ ہے یا مرگئی ہے۔ کن ظالموں نے میری بچی کو مجھ سے جدا کردیا ہے۔ ان حالات میں اپنے بچوں کو گھر سے نکالتے ہوئے بھی ڈرتی ہوں لیکن کیا کروں ان کا پیٹ بھی پالنا ہے۔ اس مجبوری کے تحت بچوں کو اللہ کے سپرد کرکے گھر سے نکالتی ہوں اور جب تک وہ کھانا لے کر رات کو گھر واپس نہ آجائیں ہاتھ اٹھائے ان کیلئے اللہ کے حضور دعائیں کرتی رہتی ہوں۔

میں اللہ کے فیصلوں پر راضی ہوں' ہروقت شکر ادا کرتی ہوں۔ جادوٹونے تعویذ وغیرہ جیسی توہم پرستی کو نہیں مانتی۔ بچے کبھی اپنے تاریک مستقبل کے بارے میں پریشان ہوجاتے ہیں' روتے ہیں' تو میں ان کو حوصلہ دیتی ہوں کہ بیٹا گھبراؤ نہیں' تمہاری بہنیں جلد ہی گھر سے اٹھ جائیں گی۔ پھر تم ہوگے اور میں ہوں گی' ذمہ داریاں کم ہوجائیں گی۔ تم پڑھ لکھ لو' پھر نوکری کرلینا تم پیسے کماؤ گے میں کمیٹی ڈالوں گی پھر رقم جمع ہوگی ہم اپنا مکان بنائیں گے اور

خوشحالی آ جائے گی۔ بس میرے بیٹے میرے اور اپنے باپ کے مرنے سے پہلے پہلے جلدی جلدی جوان ہو جائیں اور کما کر لائیں۔ پھر خوشیاں ہی خوشیاں ہوں گی۔ ہمارے دن بدل جائیں گے۔ خوشحالی کا دور دورہ ہوگا اور یہ تمام پریشانیاں اور تکلیفیں ختم ہو جائیں گی۔

یوں میں اپنے ننھے بچوں کو حوصلہ دیتی ہوں اور ان کو ناامیدی اور مایوسی کی پرچھائیوں سے بچانے کی کوشش کرتی ہوں۔ ان کی محرومیاں' پریشانیاں اور ننھی شکلیں دیکھ کر مجھے خود رونا آتا ہے کہ اے رب ذوالجلال! اے مولا کریم...... اے رحمان و رحیم...... میرے ان ننھے پھولوں کا کیا بنے گا...... کہیں یہ کھلنے سے قبل ہی نہ مرجھا جائیں...... میں تو خوشیاں نہ دیکھ سکی۔ ان کے آنگن کو ہی پھولوں' کلیوں اور خوشیوں سے بھر دے۔ یہ ساری باتیں امنگیں' آرزوئیں' خواہشیں' دعائیں' التجائیں میں اپنے دل کے نہاں خانوں میں چھپائے رکھتی ہوں کیونکہ اگر ان کو روتا دیکھ کر میں بھی رونے لگوں تو پھر تو یہ بچے' یہ پھول مرجھا جائیں۔ ہلکان و بے جان ہو جائیں۔ میں ہمیشہ ان کو سہانے مستقبل کی نوید سناتی ہوں اور وہ امیدوں کی کشتی پر سوار زندگی کی موجیں گنتے ہوئے آگے بڑھتے جا رہے ہیں۔ جن معصوموں کا نام ہم نے چاند اور سورج یہ سوچ کر رکھا تھا کہ وہ چاند اور سورج بن کر ہماری زندگی کو روشن کریں گے وہ آج راہوں میں لوگوں کی ٹھوکروں کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ان کے اقبال کا سورج عنقریب بلند ہوگا جبکہ میری زندگی کا سورج آہستہ آہستہ غروب ہو رہا ہے۔ ان کے والد کو بیماری کی شدت کی بنا پر ان کے بھائی اپنے پاس لے گئے ہیں تاکہ تھوڑی بہت ان کی دواؤں وغیرہ کا بندوبست کر سکیں۔ رمضان میں کسی نے 5 کلو چینی' کچھ گھی اور ایک آٹے کا تھیلا لے کر دیا جس سے ہمیں رمضان گزارنے میں کافی آسانی رہی۔ اب میرے پاس صرف 55 روپے ہیں' بچے کہہ رہے ہیں کہ امی جان ہم عید کیسے کریں گے؟ میں نے کہا: گھبراؤ نہیں ہمارا اللہ حافظ ہے' حامی و ناصر ہے' وہی ہمارا کارساز ہے' ضرور ہمارے لئے اسباب پیدا کرے گا' اگر کچھ نہ بھی ہوا تو ہم پھر بھی اپنی خواہشات' آرزوؤں' تمناؤں اور خوشیوں کو عید قربان کے موقعہ پر قربان کر کے اس کی رضا پر راضی رہتے ہوئے عید گزار دیں گے لیکن اپنی زبان پر کوئی ایسی بات نہ لائیں گے جو اللہ تعالیٰ کی ناراضی و ناشکری کا باعث

بن جائے۔

عید آئی ہے' بچے کتنے ہی ارمان دل میں پالے ہوئے ہیں' خواہشات و آرزوئیں ہیں......لیکن ہمیں کسی رشتہ دار یا عزیز سے کسی تعاون کی توقع نہیں۔ ویسے کب تک ''اپنے'' ساتھ دیتے ہیں' شروع شروع میں ایک دو دفعہ مدد کی اب سب آنکھیں پھیر کر بیگانے ہو چکے ہیں......ہم خوشی کے موقعوں پر کس کے ساتھ خوشی منائیں......کس کو اپنا دکھڑا سنائیں۔ ایسے خوشی کے موقعہ پر ہمارے ''مہربان'' ہم سے فون پر بھی رابطہ نہ کریں گے......ان کی مجبوریاں اور مصروفیتیں اس قدر ہیں......ان کے پاس اتنا ٹائم نہیں کہ وہ فون کر کے ہی ہمیں خوش کر سکیں۔ وہ ''مہربان'' نہیں جانتے کہ ان کی خوشیوں کے زیر خاک کتنے لوگوں کی خوشیوں کے ارمان دفن ہیں۔ کتنے لوگوں کی خوشیاں اور سکون و چین چھن چکا ہے۔ لیکن میرے عزیزوں ''مہربانوں'' کو ہماری دکھوں بھری زندگی کا احساس کیسے ہو؟......احساس تو تب ہوتا ہے جب اپنا تن سلگتا ہے...... جب اپنا ہی نگر اور اپنا ہی آشیانہ شعلوں کی زد میں آتا ہے......اللہ سے یہی دعا کرتی ہوں کہ وہ ہر گھر کو...... اس کے پھولوں کو......کلیوں کو......بلکہ پورے گلشن کو......گلشن کے باغبان کو......اور گلشن کے نگہبان کو......ہمیشہ اپنی حفاظت میں رکھے۔

ابھی دل تڑپتے ہیں............

ملک عزیز میں حکومتی، عوامی اور نجی سطح پر کتنی ہی رفاہی تنظیمیں وجود میں آ چکی ہیں، تا کہ دکھی اور پریشان حال عوام کے دکھوں کا مداوا کیا جا سکے' لیکن دیکھنے میں آیا ہے کہ عوام کے مسائل اور دکھ درد ہنوز اسی طرح باقی ہیں، کوئی ان کے زخموں پر مرہم رکھنے والا نہیں۔ اگر خلوص دل کے ساتھ لوگوں کے سامنے دکھی انسانیت کے درد رکھے جائیں تو ان میں کتنے ہی ایسے حساس جذبات و احساسات رکھنے والے احباب ہمارے درمیان موجود ہیں کہ جن کے دل اوروں کے غم سے تڑپتے، سلگتے اور کڑھتے ہیں۔ بس ان کو مہمیز چاہئے، نشاندہی و رہنمائی چاہئے' وہ دوسروں کے دکھ دور کرنے کے لیے خود کانٹوں پر لیٹنے کے لئے بھی تیار ہو جاتے ہیں۔

چند دن قبل بندہ ناچیز نے ''عید قربان اور آرزوؤں کی قربانی'' کے عنوان سے کالم لکھا تو ملک بھر سے اہل دل مذکورہ بچے کے درد سے تڑپ اٹھے اور اس کی ہر طرح کی مدد کرنے کے لئے رابطے کرنے لگے۔ مجھے ملک اور بیرون ملک سے درجنوں کالیں موصول ہوئیں' کہ ہم اس بچے سے تعاون کرنا چاہتے ہیں' ہمارا تعاون اس تک پہنچایا جائے۔ کچھ اہل خیر ایڈریس لینے کے بعد اس بچے کے گھر تک پہنچے۔ بہر حال اللہ والوں نے جو عطیات و رقوم بھیجیں' ہم نے بچے کے والدین تک پہنچا دیں۔ بعض لوگوں نے کہا کہ ہمیں ان کا ایڈریس دیا جائے ہم مستقل طور پر ان کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔ اسی طرح ایک کالم ''دکھیاری ماں'' پر سعودی عرب سے ایک بھائی نے امداد بھیجی۔ اس دکھیاری ماں کا ایڈریس ہمارے پاس نہیں تھا، ہم نے غزوہ میں یہ اعلان لگایا کہ ''دکھیاری ماں رابطہ کرے اور اپنی امانت ہم سے لے

لے'' ہری پور سے موصوفہ محرم کے ساتھ تشریف لائیں اور اپنے بچوں کے لئے جاری ہونے والا امدادی چیک وصول کر کے' دعائیں دیتی چلی گئیں۔

گزشتہ ہفتہ ''ڈالی سے ٹوٹے پھول'' شائع ہونے پر بھی ملک و بیرون ملک سے متعدد کالیں موصول ہوئیں۔ ان میں سے ہندوستان میں بہار سے تعلق رکھنے والے سعودیہ میں مقیم بھائیوں نے بھرپور تعاون کا یقین دلایا۔ ملتان کے ایک علاقے سے کسی نیک دل محترمہ نے گلوگیر آواز میں کہا: نقاش بیٹا! اپنی ہمت و بساط کے مطابق اس بچے کے کھلونوں اور تعلیم کے اخراجات میں برداشت کروں گی۔'' لاہور کی ایک بہن نے فون پر اپنے نیک جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا: ''میں اس ننھے پھول کو اپنا بیٹا بنانا چاہتی ہوں، اس کی رہائش، تعلیم اور خورد و نوش وغیرہ کے اخراجات کی ذمہ دار ہوں گی۔ اس کو پڑھا لکھا کر جوان کروں گی اور اس کی ماں کا سہارا بناؤں گی'' اور پھر یہ عظیم بہن کہنے لگی: میں اس کی والدہ کی مدد کر کے اس کو بھی سہارا دینا چاہتی ہوں۔ اسی طرح کے نیک جذبات اور تڑپتے دلوں کی صدائیں ملک بھر سے میں اپنے فون پر سنتا' اور سوچتا رہا کہ اس قوم میں ابھی خیر اور نیکی کے جذبات سرد نہیں پڑے۔ ہمارے معاشرے میں اللہ کے ایسے پاکباز بندے اور بندیاں ابھی موجود ہیں، جو چاہتے ہیں کہ وہ ایسا نیک کام کر گزریں مگر کسی کو اس کی خبر بھی نہ ہو، بس ان کا رب ان سے راضی ہو جائے۔ ایسے پاک جذبات رکھنے والوں کے لئے جماعت نے باقاعدہ ایک ادارہ قائم کر دیا ہے' جس کا کام دکھی لوگ ڈھونڈ کر ان کی خدمت کرنا ہے۔ ادارے کا نام بھی ''ادارہ خدمت خلق'' ہے۔

مذکورہ معاملات میں تعاون مہیا کرنے کے لئے کی جانے والی درجنوں فون کالیں اس بات کی شاہد ہیں کہ ابھی دوسروں کے درد محسوس کرنے والے لوگ زندہ ہیں۔ ابھی احساس کی شمع روشن ہے۔ دل تڑپتے ہیں...... آنکھیں برستی اور آنسو بہاتی ہیں...... دوسروں کے درد کو اپنا درد سمجھنے والے زندہ ہیں۔ بس انہیں رہنمائی اور اشارے کی ضرورت ہے یعنی ؎

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

امی جان! آپ کہاں ہیں؟

پہلا منظر

اسلام آباد کے ایک پرائیویٹ ہسپتال کے کمرہ میں سوگواری و خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ نرسیں اور ڈاکٹرز پریشانی کے عالم میں مستعد کھڑے ہیں۔ سب کی نظریں سامنے بیڈ پر پڑے معصوم پھول سے بچے پر جمی ہوئی ہیں۔ اس نونہال اور معصوم فرشتے کے خوبصورت‘ نرم و نازک گال زخمی ہیں اور ننھے گلابی ہونٹوں پر خون کا قطرہ جما ہوا ہے۔ آنکھوں اور ماتھے پر سفید سفید پٹیاں بندھی ہوئی ہیں۔ ڈرپ چل رہی ہے اور نرس اس کی نبض چیک کر کے بلڈ پریشر چیک کر رہی ہے۔ دو ڈاکٹر کھڑے آپس میں مشورہ کر کے کاغذ پر کچھ لکھ رہے ہیں، شاید نسخہ تجویز کر رہے ہیں۔

قریب ہی ایک ننھی منی، گول مٹول، کومل اور چھوٹی موئی سی چھ سالہ ’گڑیا‘ جس کا نام کلثوم ہے‘ خون کی طرح سرخ آنکھوں میں آنسو روکے اس معصوم کو ٹکٹکی لگائے دیکھے جا رہی ہے۔ وہ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد گلو گیر آواز میں آہستہ سے آواز دیتی جا رہی ہے: علی بھیا!......علی بھیا جی!......میرے پیارے بھیا! اٹھو......بہت سولیا......اٹھو ناں......اس کے ساتھ ساتھ وہ سفید پٹیوں کے لپٹنے سے بچ رہنے والی پیشانی اور سرخ سرخ گالوں پر لاڈ پیار اور محبت سے ہاتھ پھیرتی جاتی ہے......کبھی فرط محبت میں‘ بیقراری کے عالم میں کائنات کے مقدس رشتہ بہن کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس کے گالوں اور پیشانی پر بوسہ ثبت کر دیتی ہے۔ ڈاکٹر اسے نہایت شفقت سے پکڑ کر اپنی جگہ پر بٹھا دیتے ہیں۔ اس بیچاری کے زخمی بازو پر

تازہ سفید پٹی بندھی ہوئی ہے اور بکھرے بالوں والے سر میں روشن مگر مغموم و محزون آنکھوں کے ساتھ بھی دو پٹیاں لگی ہوئی ہیں، جو اس کے زخمی ہونے کا پتا دے رہی ہیں۔

دوسرا منظر

اچانک معصوم بچے کے جسم میں حرکت ہوتی ہے..... ہونٹ ہلنے لگتے ہیں، لیکن آواز نہیں آ رہی..... سب کی نظریں بچہ پر گڑ گئیں..... آواز سب کے کانوں تک پہنچی..... ماں! ..... ماں! ..... ماں! ..... قریب بیٹھی بچی بیقراری سے اس کے ہاتھ کو پکڑ کر چومنے لگتی ہے ..... اور روتے ہوئے کہتی ہے: علی بھیا! ہوش میں آؤ..... کلثوم یہ تم ہو؟ ہاں ہاں! میں ہوں بھیا!..... بچہ نحیف آواز میں اپنے سر کو ہاتھ سے چھو کر پوچھتا ہے: کلثوم! یہ مجھے نظر کیوں نہیں آ رہا؟..... یہ میرے سر پر کیا باندھا ہوا ہے؟..... یہ میرے سر میں درد کیوں ہو رہا ہے؟..... میں کہاں ہوں؟؟؟..... بھیا! تمہاری آنکھ میں مٹی پڑ گئی تھی، اس لئے تجھے ڈاکٹر کے پاس لائے ہیں۔ بچہ خاموش ہو جاتا ہے اور کچھ دیر بعد بڑبڑاتا ہے..... مٹی؟..... مٹی؟..... مگر کہاں سے اور کیسے؟..... تھوڑی دیر خاموشی رہتی ہے..... پھر آواز ابھرتی ہے..... لیکن کلثوم مجھے تو یاد آ رہا ہے کہ ہم تو سکول گئے تھے۔ جب میں نے سکول پہنچ کر امی کے دیے ہوئے پیسوں سے ٹافیاں خریدنے کی ضد کی تھی..... تو تو میرے ساتھ ہی سکول سے باہر بابا ٹافی والے کے پاس آئی تھی۔ مجھے جاتے ہوئے بلو نے کہا تھا: خود ہی نہ کھا جانا، میرے لئے بھی ٹافی یا چاکلیٹ بچا کر لانا..... ابھی ہم سکول سے باہر آ کر چاکلیٹ نہ خرید سکے تھے کہ بہت بڑا دھماکا ہوا تھا..... زمین ہلنے لگی تھی..... تم خوف سے چیخ مار کر مجھ سے چمٹ گئی تھی ..... ہم نے پہاڑی کے نیچے دیکھا تھا..... مکان اس طرح گرتے جا رہے تھے جیسے..... ہمارے سکول کے باہر (سائیکل سٹینڈ پر) لائن میں کھڑے سائیکلوں میں سے کسی ایک کو..... اگر کوئی دھکا دے کر گرا دے تو باقی خود بخود ایک دوسرے سے ٹکرا کر گرتے جاتے ہیں..... اور پھر اللہ جانے کہ میرے سر پر کون سی چیز لگی تھی اور میں گر گیا تھا۔ بچی روتے ہوئے: ہاں بھیا!..... اس کے بعد ہم آپ کو اٹھا کر ڈاکٹر کے پاس لے آئے تھے۔ اسی وقت تمہاری

آنکھوں میں مٹی پڑ گئی تھی۔

ڈاکٹر بچے کو پیار سے منع کر رہے ہیں کہ وہ زیادہ باتیں نہ کرے اور بچی کو سمجھا رہے ہیں کہ تمہارے بھائی کے سر پر چوٹ لگی ہے' اس سے زیادہ باتیں نہ کرو۔ بچہ چپ ہو جاتا ہے' نرس نیند کا انجکشن لگاتی ہے۔ ایک نرس کی وہاں ڈیوٹی لگا کر سب چلے جاتے ہیں۔

تیسرا منظر

نرس کرسی پر بیٹھی اونگھ رہی ہے...... بچی قریب ہی بیڈ پر لیٹی سو رہی ہے...... بچہ ہوش میں آ رہا ہے...... ہلکا ہلکا کراہ رہا ہے...... اس کا ہاتھ سر پر بندھی پٹیوں کو ٹٹول رہا ہے...... نرس ہوش میں آتے دیکھ کر ڈاکٹر کو اطلاع دینے چلی جاتی ہے۔ بچہ کراہتا ہے: امی!...... امی!...... امی جان!...... کہاں ہو؟...... بولتی کیوں نہیں؟...... جواب کیوں نہیں دیتی؟...... امی جان!...... امی جان!...... بات سنو...... میرے سر میں بہت درد ہو رہا ہے...... اتنے میں نرس کے ساتھ ایک اور نرس اور ڈاکٹر آ جاتا ہے...... اور پوچھتا ہے: بیٹا! کیا بات ہے؟ سر میں بہت درد ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر نرس سے مخاطب ہوتا ہے: پین کلر (Pain Killer) دے دو۔ وہ شام کو بھی دیا تھا، نرس بولی، اور ہم کر ہی کیا سکتے ہیں؟ یہی علاج کیا جا سکتا ہے جو ہم کر رہے ہیں۔ بچے کا کافی گوشت تو اڑ چکا ہے، آپریشن کرنا خطرناک ہے۔ جب تک زخم مندمل نہیں ہو جاتا اسی کا سہارا لینا پڑے گا' ڈاکٹر وضاحت کرتا ہے۔ نرس خاموش ہو جاتی ہے۔ بچے کی آواز دوبارہ ابھرتی ہے، سب باتیں چھوڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگتے ہیں: کلثوم!...... کلثوم!

کلثوم آپی!...... کہاں چلی گئی...... قریب سوئی بچی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتی ہے اور قریب پہنچ کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر، گال پر ہاتھ پھیر کر کہتی ہے: علی بھیا! میں تمہارے ہی پاس ہوں۔ کیا بات ہے؟ امی کہاں ہے؟ وہ مجھ سے بات کیوں نہیں کرتی؟...... ابو جان کو بلاؤ وہ کہاں ہیں؟ بھائی جان اور لبنیٰ باجی کی آواز نہیں آ رہی؟...... ڈاکٹر اور نرسیں فوراً معصوم کلثوم کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں اور اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہیں۔ کلثوم کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں...... وہ زبانِ خاموشی میں آنسوؤں کی

زبان سے باتیں کرتی ہے۔ نرس آگے بڑھ کر کہتی ہے: بیٹا! تمہارے ابو امی، بھائی اور باجی ابھی آتے ہی ہوں گے۔ وہ تمہارے لئے ڈھیر سارے کھلونے لینے گئے ہیں۔ وہ ٹافیوں، بسکٹوں اور چاکلیٹوں کا ڈبہ بھی لائیں گے۔

بچہ پھر بڑبڑاتا ہے:

امی! تو مجھ سے اتنی دیر تو دور نہ رہتی تھی...... امی میرا سر پھٹا جا رہا ہے...... کہاں ہے تو...... مجھے اپنی گود میں بٹھا لے...... آج پھر میرے سر کو اپنے ہاتھوں سے دبا دے...... امی! آج جلدی سے مجھے دم کر دے...... امی کہاں چلی گئی تو؟...... ڈاکٹر جی! میری امی کو بلا دیں...... اسے بتا دیں میں یہاں بیمار ہوں...... وہ مجھے گم پا کر بہت رو رہی ہوگی...... ابو ڈھونڈ رہے ہوں گے...... نانی اماں پہلے کی طرح آج بھی امی کو چپ کروا رہی ہوگی...... ڈاکٹر جی! میری امی میرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی...... وہ مر جائے گی...... اسے بتا دیں اور فوراً یہاں بلا دیں...... پھر...... یہ معصوم سر پر ہاتھ رکھ کر شدت تکلیف سے بلبلاتا ہے: ہائے میں مر گیا...... ہائے میں گیا...... سر میں درد کی ٹیس اٹھی ہے...... سر پھٹ گیا ہے...... کلثوم بہنا! امی کو بلاؤ...... جلدی کرو امی کو بلاؤ...... مجھے پتا نہیں کیا ہو رہا ہے......!!

ننھی گڑیا تڑپ کر لپکتی ہے اور نرس کو پیچھے ہٹا کر سسکی ضبط کر کے کہتی ہے: بھیا! آرام سے سو جاؤ...... دماغ پر زور نہ دو......

چوتھا منظر

ڈاکٹر تیزی سے آگے بڑھتا ہے...... تھرمامیٹر بچے کے منہ میں لگاتا ہے، سٹیتھوسکوپ کانوں سے لگا کر چیک کرتا ہے، ساتھ بلڈ پریشر بھی چیک کر رہا ہے۔ ننھی کلثوم پھٹی پھٹی، ویران ویران اور اجڑی نظروں سے سب کو دیکھے جا رہی ہے۔ نہایت غور سے ان کی باتیں سن رہی ہے...... ڈاکٹر دوسرے معاون ساتھی سے کہتا ہے: آخری وقت آ گیا ہے...... یہ بچہ نہیں بچے گا...... چند پل کا مہمان ہے...... اسے زیادہ تکلیف نہ دو...... علی ایک بار پھر آہستہ سے پکارتا ہے...... امی جان! آ جاؤ...... امی جان!...... امی!...... امی! آ جا...... کلثوم کے کانوں

سے ڈاکٹر کے یہ جملے ٹکرائے تو اس کا معصوم دل پھٹ گیا..... وہ خود کلامی کے انداز میں چیختی ہے..... نہیں نہیں علی بھائی! امی اب نہیں آئے گی، تجھے کیسے بتاؤں امی، پیاری امی اللہ میاں کے پاس جا چکی ہے..... جان سے پیارے ابو جان بھی اللہ کے پاس جا چکے ہیں..... جان نچھاور کرنے والے بھیا اور باجی بھی ابو اور امی جان کے ساتھ..... اللہ میاں کے پاس ہی پہنچ چکے ہیں۔ تم ان کے پاس نہ جانا..... جو وہاں ایک دفعہ چلا جاتا ہے وہ واپس کبھی نہیں آتا..... تم ہی تو رہ گئے ہو، اگر تم بھی ان کے پاس چلے گئے تو بتاؤ میں کہاں جاؤں گی؟..... کون پیار کرے گا مجھے؟..... ننھی کلثوم کے آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ وہ بھائی کی طرف بڑھی لیکن نرسوں نے پیار سے پیچھے کر دیا اور ننھے علی کو ڈرپ لگانے لگیں۔ ننھی کلثوم دوبارہ بلبلائی:..... علی بھیا!..... تو مجھ سے روٹھ کر نہ جانا..... اب ابو اور امی تو نہیں مل سکتے لیکن..... ایک بات بتاؤں، ایک خوشخبری سناؤں..... ہاں سنو! تم خوش ہو جاؤ گے، اللہ نے ہماری ننھی سی دس ماہ کی بہن زینب کو بچا لیا ہے..... وہ ساتھ والے بستر پر لیٹی دودھ پی رہی ہے، نہیں یقین تو اٹھ کر دیکھ لو اسے..... تم اسے گھر میں سب سے زیادہ پیار کرتے ہو ناں' اگر تم چلے گئے تو پھر کون اس کو کھلائے گا' ہنسائے گا، اٹھائے گا اور پیار کرے گا؟..... پھر کلثوم ساتھ والے بیڈ سے شیر خوار بچی کو اٹھا لاتی ہے، وہ بچی ڈر کے رونا شروع کر دیتی ہے..... علی بھائی! دیکھو!..... زینب آئی ہے، رو رہی ہے، چپ کراؤ..... تم اسے رونے نہیں دیتے تھے ناں..... جو رلاتا تھا اس کے پیچھے پڑ جاتے تھے..... اگر تم بھی امی جان کے پاس چلے گئے تو پھر کون چپ کرائے گا ہمیں؟..... تمہاری بہنیں اکیلی رہ جائیں گی..... بھیا! آنکھیں کھولو! ..... کھولو!..... زینب رو رہی ہے..... نرسوں اور ڈاکٹروں کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگتے ہیں..... اس معصوم کی چیخیں سن کر بھی..... اور اس لئے بھی کہ..... اسی لمحے ننھے علی کی روح پرواز کر کے اس کے امی اور ابو جان کے پاس پہنچ گئی ہے۔

ڈاکٹر ننھے معصوم فرشتے اور کشمیر کے اس پھول پر چادر تان دیتے ہیں..... کلثوم چیخیں مارتی رہ جاتی ہے، زینب مسلسل ماں کے دودھ کے لیے بلک رہی ہے' سسک رہی ہے.....

ایک شخص جو خاندان میں سے زندہ بچ گیا ہے، غالباً کلثوم کا ماموں ہے، آگے بڑھتا ہے، ہاتھ پکڑتا ہے اور دونوں کو روتے ہوئے دیکھ کر خود بھی روتے ہوئے اسے اٹھا کر کمرہ سے باہر لے جاتا ہے۔

اے بچے کو کانٹا چبھ جانے پر تڑپ جانے والی ماؤں!......اے ذرا سی بات پر بچے کے رو دینے پر بے قرار و بے حال ہو جانے والے والدین......اس شدید جان لیوا زلزلہ میں کتنے ہی معصوم علی اور کتنی ہی کلثومیں اور زینبیں اپنے جان سے پیارے والدین کھو بیٹھی ہیں ......کون کرے گا ان کی پرورش؟......کون دے گا ان کو پیار؟......کون لڈائے گا ان کو لاڈ! ......کون قربان کرے گا ان کے لئے اپنا مال؟......کون رکھے گا ان کے سر پر محبت و شفقت اور لاڈ کا ہاتھ؟ کون ان کے لبوں سے سسکیاں دور کر کے، آنکھوں سے آنسو روک کر چہروں پر مسکراہٹیں لائے گا......صرف وہی جو خوش نصیب ہوگا......جس سے اللہ پیار کرتا ہوگا' وہ اسی کو توفیق دے گا، ایسا کرنے کی......اور پھر ایسا کرنے والے کو کیا ملے گا؟ اس کے اس عمل کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ ترس کھا کر اس کے بچوں کو ان زلزلوں سے محفوظ کر دے گا، اس کے بچوں کو دنیا کے غم و اندوہ، مصیبتوں، پریشانیوں سے بچا لے گا اور قیامت کے دن اللہ اس کو کیا دے گا؟ یہ آپ سلطان مدینہ، سرور قلب و سینہ، ساقی کوثر، شافع امم، محمد رسول اللہ ﷺ کی زبان حق بیان سے سن لیں۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ آقائے دو جہاں ؐ نے فرمایا: یتیم کی کفالت کرنے والا (وہ یتیم) اس کا (رشتہ دار) ہو یا غیر کا، میں اور وہ جنت میں ان دو انگلیوں کی طرح ہوں گے۔ (صحیح مسلم) یعنی جس طرح میری یہ دو انگلیاں ساتھ ساتھ ہیں اس طرح یتیم کی کفالت کرنے والا، آخرت میں، جنت میں میرے اس قدر قریب ہوگا۔ اور یہ معمولی انعام نہیں' بلکہ......

یہ بڑے کرم کے ہیں فیصلے
یہ بڑے نصیب کی بات ہے

مجھے بیٹا چاہئے بس!

یہ میاں منشی ہسپتال لاہور کا گائنی وارڈ ہے۔ ایک بیڈ پر کمزور ونحیف، پژمردہ و بے جان بہن یوں بے ہوش پڑی ہے گویا کفن اوڑھے ہڈیوں کا ڈھانچہ پڑا ہو۔ پہلو میں ایک معصوم، کمزور سی ننھی منی خوبصورت گڑیا ہمک رہی ہے۔ ایک دن قبل دنیا میں آئی یہ ننھی جان کمرے کی چھت کو تکے جا رہی ہے' گویا نئی دنیا کے نظارے نے اسے حیران کر دیا ہو۔ جیسے یہ کمرہ اور اس کی چھت ہی اس کی کل کائنات ہو اور بہت جلد وہ اس کا مشاہدہ کر لینا چاہتی ہو۔ اچانک یہ ننھی کلی بھوک پیاس کے باعث پورے زور سے رونے لگتی ہے۔ ایک بوڑھی اماں کانپتے ہوئے جسم کے ساتھ آگے بڑھتی ہے۔ اس کی آنکھیں بڑھاپے کی بنا پر اندر کو دھنس چکی ہیں، چہرے پر جھریاں، ہاتھوں میں رعشہ، قدموں میں ڈگمگاہٹ اور آواز میں کپکپاہٹ ہے۔ وہ آگے بڑھ کر نوزائیدہ بچی کے پاس آتی ہے اور لرزتے ہونٹ اس کے رخساروں پر رکھ کر کانپتی آواز میں کہتی ہے:

> اللہ خیر کرے، تیرے نصیب اچھے ہوں، ہمیشہ نیک و فرمانبردار بن کر جیئو، اللہ کرے تیری ماں کو ہوش آ جائے اور وہ تجھے دودھ پلائے، اللہ تیرے باپ کو ہدایت دے اور تیرا رزق آسمانوں سے بھیج دے۔ پھر وہ اس کے منہ میں چوسنی دے دیتی ہے۔

بوڑھی اماں کی یہ باتیں سن کر ساتھ کھڑی اپنی عزیزہ سے جب میں نے پوچھا کہ یہ پیار و محبت کے جذبوں سے معمور بوڑھی اماں جان کیا کہہ رہی ہیں؟ تو مجھے بتایا گیا کہ یہ اس بیڈ پر لیٹی لڑکی کی والدہ ہے۔ آپریشن کے بعد یہ مہکتی کلی اس دنیا میں آئی ہے اور اس کی ماں

ابھی تک نیم بے ہوشی میں ہے۔ کوئی علاج کروانے والا بھی نہیں۔ اگرچہ بچی کا باپ زندہ ہے لیکن اس نے روپیہ خرچ کرنے سے یہ کہتے ہوئے صاف انکار کر دیا ہے کہ اگر بیٹا ہوتا تو میں خزانے لٹا دیتا لیکن اب چونکہ بیٹی ہوئی ہے اس لئے جو ہوتا ہے ہو جائے، میں کسی طرح ایک روپیہ بھی خرچ نہ کروں گا۔ اب یہ اس کی نانی ہے جو ضعیف و ناتواں ہونے کی بنا پر چلنے پھرنے سے بھی معذر ہے لیکن اس کے باوجود یہ روزانہ باغات میں گرتی پڑتی جاتی ہے...... اپنے لرزتے ہاتھوں سے فالسہ توڑ کر ٹوکریاں بھرنے کی مزدوری کرتی ہے، تھک ہار کر سر پکڑ کر بیٹھ جاتی ہے، جون جیسے مہینے میں شدت پیاس کی بنا پر جب زبان سوکھ کر لکڑی ہو جاتی ہے تو پانی کا گھونٹ پی کر پھر اپنے کام میں مشغول ہو جاتی ہے۔ یوں جان پر کھیل کر یہ دن بھر مزدوری کرتی ہے اور شام کو مزدوری سے ملنے والے پیسوں کے ساتھ ہسپتال آ جاتی ہے لیکن اس کی دن بھر کی کمائی سے پوری ادویات بھی نہیں آتیں اور پیسے ختم ہو جاتے ہیں۔ یوں ان کے دن گزر رہے ہیں، اس میں بچی کا، اس کی ماں کا اور بوڑھی اماں کسی کا کچھ قصور نہیں لیکن اس کے باوجود اس کلی کے باپ کی طرف سے سزا تینوں کو دی جا رہی ہے۔

اماں جان کے متعلق اس روح فرسا خبر نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ میرے دماغ کے پردہ سکرین پر ماضی کی ایک بدنصیب ماں کی دکھ بھری داستان کی فلم چل پڑی۔ چشم تصور سے میں دیکھ رہا تھا کہ کتنی بے قراری سے وہ ڈاکٹر کے پاس کھڑی ہے، الٹرا ساؤنڈ کروا چکی ہے، نہایت مشتاقانہ لہجے میں ڈاکٹر سے دریافت کر رہی ہے: ڈاکٹر صاحب کیا ہے؟ بتایئے نا!'' ڈاکٹر کو غلطی لگی اور کہنے لگا: بی بی! بیٹی ہے'' ... یہ سن کر شکیلہ کا رنگ اڑ گیا۔ عجلت و پریشانی میں گھر پہنچی اور اگلے ہی دن ایک پرائیوٹ ہسپتال پہنچ گئی۔

اس نے ڈاکٹر کو اپنی آمد کا مقصد بتایا کہ'' وہ پیٹ میں موجود بچہ ضائع کروانا چاہتی ہے، وہ کہنے لگی: دو کلموہیاں، منحوس اور کم ذات پہلے ہی گھر میں پڑی ہیں۔ اب یہ اور آ جائے گی۔ میں اسے اپنے گھر میں نہ آنے دوں گی۔ ڈاکٹر صاحب! میں نے تو اسے بیٹا سمجھ رکھا تھا، اسی لئے لمبا عرصہ اس کو اپنا خون پلاتی رہی، اگر مجھے پہلے پتا چل جاتا تو کبھی کی اس کو ختم

کروا چکی ہوتی، آپ اس کو ختم کر دیں یعنی میرا حمل گرا دیں، مجھے صرف بیٹا چاہئے! بس اور کچھ نہیں۔'' لیڈی ڈاکٹر کانوں کو ہاتھ لگاتے اور حیرت وخوف سے آنکھوں کو پھیلاتے ہوئے گویا کہ ابھی پھٹ پڑے گی، بولی: نہ بابا نہ، میں ایسا نہ کرسکوں گی، اس لیے کہ آٹھ ماہ مکمل ہیں، اگلے ماہ یہ جان دنیا میں آنے والی ہے، میں اس کو نہیں مار سکتی''...... ''ڈاکٹر میں جو کہتی ہوں کہ میں راضی ہوں، خود ایسا چاہتی ہوں، پھر آپ کو کیا اعتراض ہے؟ آپ نے جتنی فیس لینی ہے لے لیں اور یہ کام کریں، مجھے مولویوں کی طرح وعظ ونصیحت نہ کریں۔'' شکیلہ نے لیڈی ڈاکٹر کو غصے سے کہا۔ طوعاً وکرہاً لیڈی ڈاکٹر اس کو آپریشن تھیٹر میں لے گئی اور بے ہوش کرنے کے بعد اس ننھی معصوم جان کو تیز نشتروں سے چیر پھاڑ دیا گیا، ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا۔ دوران آپریشن یہ اذیت ناک اور ہولناک انکشاف ہوا کہ جسے کاٹ دیا گیا وہ بیٹی نہیں...... بلکہ خوبصورت بیٹا تھا...... لیکن اب کیا ہوسکتا تھا؟ جو ہونا تھا ہو چکا تھا، رب کریم کے عذاب کا کوڑا برس چکا تھا...... اس سے جاری رکھی گئی جنگ کا عبرتناک انجام وقوع پذیر ہو چکا تھا۔

آپریشن تھیٹر سے باہر کھڑے شکیلہ کی ضد اور ہٹ دھرمی کے سامنے بے بس ومجبور عزیز واقارب کو اس المناک اور روح فرسا خبر کا پتا چلتا ہے تو سب سر پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ سسکیاں لیتے ہوئے آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑیاں لگانا شروع کر دیتے ہیں۔ لمحات بیتے، آپریشن مکمل ہوا، شکیلہ کو ہوش آیا، وہ کافی کمزور اور زرد نظر آ رہی تھی کیونکہ اس کا کافی خون ضائع ہو چکا تھا۔ اب اس کو خون کی بوتل لگی ہوئی تھی۔ اس کی غیر تسلی بخش صحت اور اس کو پہنچنے والے ممکنہ دکھ اور صدمے کے پیش نظر کوئی اس کو اصل حقیقت نہیں بتا رہا تھا......
یوں چند دن مزید بیت گئے اب شکیلہ نہایت ہشاش بشاش، مطمئن اور پرسکون نظر آ رہی تھی، گویا وہ فخر کر رہی ہو۔ جیسے اس نے بہت بڑی چوٹی سر کر لی ہو یا بڑا معرکہ مار لیا ہو۔ جیسے وہ اپنے مقصد میں کامیاب وکامران ہوگئی ہو۔ وہ اپنی مزعومہ کامیابی پر زیرلب شرمندہ سی ہنسی بھی ہنس رہی تھی کہ اس موقعہ پر خاندان کے نجانے کس فرد نے...... اس کے کان میں......

اصل حقیقت بتا دی...... اس کو اس کے لخت جگر کے کٹنے کی تمام تکلیف دہ تفصیلات بتا دیں کہ......تم نے جس کو بیٹی سمجھ کر قتل کروا دیا ہے وہ بیٹی نہ تھی...... الٹرا ساؤنڈ کرنے والے ڈاکٹر کو غلطی لگ گئی تھی...... وہ اصل میں تمہارا خوبصورت چاند سا بیٹا تھا......!!......!!......پھر کیا تھا...... یہ سن کر اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا...... گویا اس کے اعصاب پر آسمانی بجلی گر پڑی ہو...... جس نے اس کے خرمن کو جلا کر راکھ کر دیا...... اس کے دل و دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں...... آتش فشاں پھٹ رہے تھے...... غم و ملال کے سیلاب امڈے چلے آ رہے تھے...... اس کے اندر ٹوٹ پھوٹ جاری تھی...... شدت غم کے باعث وہ پوری قوت سے چیخنا اور چلانا چاہتی تھی...... لیکن اس کی شاید قوت گویائی سلب ہو چکی تھی...... اس پر سکتہ کا عالم طاری تھا...... وہ اپنے ہونٹوں کو شدت سے کاٹ رہی تھی، مٹھیوں کو بھینچ رہی تھی...... اور اپنے سر کو دائیں بائیں زور زور سے مار رہی تھی...... جیسے کسی استفسار کا انکار اور رد کر رہی ہو، نفی کر رہی ہو۔ پھر اس کی ٹانگیں اس کا وزن برداشت نہ کر سکیں...... اور وہ دھڑام سے زمین پر گر گئی۔ عزیز و اقارب نے جلدی سے اسے پانی پلایا، دبایا، فرسٹ ایڈ دی، اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے، حواس بحال ہوتے ہی وہ بجلی کی سی سرعت سے اٹھ کر بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھ فضا میں بلند کر کے چیختے ہوئے پکاری:

"اے میرے بچے!......اے میرے لعل...... اے میرے راج دلارے...... میری آنکھوں کے تارے...... میری امیدوں اور آرزوؤں کے سہارے...... میرے ان کھلے پھول!......تو کہاں ہے؟ کہاں چلا گیا تو...... جلدی میرے پاس آ...... اور آ کر میرے تڑپتے ہوئے بے قرار سینے سے لگ جا...... تو تو میرے خوابوں کا شہزادہ ہے...... میں نے دنیا میں آنے سے پہلے ہی تیرا نام ندیم عرف نومی رکھ دیا تھا......"

پھر وہ زار و قطار رونے لگی۔ بین کرنے لگی۔ آہ و بکا اور نالہ و فریاد کرنے لگی۔ آنسو تھے کہ اس کی آنکھوں سے برسات کی طرح رم جھم، رم جھم برس رہے تھے...... ہاتھ تھے کہ کانپ رہے تھے...... بال تھے کہ بکھرے تھے...... ایک دفعہ پھر وہ اپنے بچے کو فضاؤں میں

تلاش کرتے ہوئے پکارنے لگی:

تجھے کس بے دردی سے ظالموں نے کاٹا ہو گا، میرے لعل!...... تیرے خوبصورت نرم و نازک گال کیسے کٹے ہوں گے؟ ...... تیری پرنم، سرمگیں اور روشن آنکھیں کیسے کٹی ہوں گی...؟ تیرے نازک گلابی ننھے سرخ ہونٹ کیسے چیرے گئے ہوں گے...... تیری نرم و نازک گردن پر نشتر کیسے چلا ہو گا؟...... ہاں ہاں! میرے معصوم و مظلوم لعل!...... تیری ننھی ننھی معصوم انگلیاں کہ میں جن کو چھو کر بھی نہ دیکھ سکی...... کٹتے ہوئے کیسے پھڑکی ہوں گی!...... تیرے نازک و حساس اور معصوم دھڑکتے دل پر جب...... نشتر کا گھاؤ لگا ہو گا...... وہ پھٹا ہو گا...... کٹا ہو گا...... خون کا فوارہ کس تیزی سے ابلا ہو گا...... تیری چھوٹی سی دنیا میں ہر طرف چھینٹے گرے ہوں گے...... تو کیسے تڑپا ہو گا؟...... سسکا ہو گا؟...... بلکا ہو گا...... چیخا چلایا ہو گا...... مجھ بدنصیب ظالم کو...... تو نے کیسے پکارا ہو گا؟ شاید یوں کہ:

...... اے میری غافل ماں!...... اے اپنے بچے پر اپنا آپ، اپنی آن بان شان، سب کچھ نچھاور کر کے، اس کو زندگی کی رونقیں بخشنے والی ماں! اپنی جان لٹا کر اپنے لخت جگر کو سانسیں بخشنے والی ہستی ماں...... اے ماں!...... مجھ کو بچا لے...... میں کٹ رہا ہوں، میرا خون بہہ رہا ہے...... مجھے چیرا جا رہا ہے...... میرا انگ انگ کاٹا جا رہا ہے...... یہ ظالم مجھے قتل کر رہے ہیں...... میری بوٹی بوٹی کر رہے ہیں...... میں خون میں لت پت ہو کر...... مچھلی کی طرح...... تیری محبت اور آغوش کو تڑپ رہا ہوں۔ اے کائنات میں سب سے زیادہ محبت کرنے والی ہستی...... ماں!...... مجھ پر اپنے پیار کی برکھا برسا...... میرے زخموں پر اپنی مدھر اور پرسوز لوریوں کا مدہوش کرنے والا مرہم لگا...... تاکہ میں اپنے زخموں سے بیگانہ ہو کر آرام سے سو جاؤں...... کیوں...... اس لئے کہ...... تیرے پیار میں...... تیرے ایثار میں...... تیری چھکار اور پچکار میں...... طاقت ہی ایسی ہے کہ جو ہر زخم کا مرہم اور علاج و تریاق ثابت ہوتی ہے۔

لیکن میرے بچے! تجھے کیا معلوم؟ کہ جس بے ایمان سے تو نے اپنی ننھی زبان سے توتلی فریاد کی تھی...... وہی سنگدل ہی تو تیری قاتل تھی ...... تجھے آغوش میں کیا لیتی' وہی تو

تیری چیر پھاڑ کی ذمہ دار تھی...... وہی تو تیرے خون کے چھینٹے اڑوا رہی تھی...... میرے نومی!...... میرے لعل!...... تو میری آغوش کی تڑپ میں، طلب میں...... اور تلاش میں تڑپتے تڑپتے ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا...... بوٹی بوٹی ہوگیا...... میں ظالم بدقسمت...... اللہ کی نافرمان اور باغی تجھے اپنی آغوش مہیا نہ کرسکی...... جنت کی حوریں تجھے آغوش دیں، غلمان تجھے جنتوں کی سیر کرائیں...... تجھے جھولا جھلائیں، جنت کے چرند پرند سے تو کھیلے...... دودھ کی نہروں سے دودھ پیئے اور لذیذ و شیریں میوے کھائے۔ یہی میرے رب سے میری دعا ہے...... لیکن ہاں...... میں تیری قاتلہ ہوں، مجھے معاف کر دینا، قیامت کے دن رب کریم کے دربار میں...... میرا گریبان نہ پکڑنا اور یہ نہ کہنا:

﴿بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ﴾ (تکویر: ۸۱۔ ۹)

''کہ مجھے بتایا جائے کہ مجھے کس جرم کی پاداش میں قتل کر دیا گیا؟''

اس جبار و قہار کی عدالت میں اپنا مقدمہ دائر نہ کرنا...... میں جہنم کا ایندھن نہیں بننا چاہتی...... اے ننھی جان! مجھے معاف کر دینا، میں آئندہ یہ جرم ہرگز نہ کروں گی۔ اس جرم کی پاداش میں شاید نیلی چھت والا میری گود اب کبھی ہری نہ کرے، میں اس سے پناہ مانگتی ہوں۔ کیا وہ مجھے معاف کر دے گا؟ میں قتل کے سنگین جرم کی مرتکب ہوئی ہوں۔ یوں وہ شدت جذبات میں چیختی چلاتی بین کرتی جا رہی تھی، اپنا سر پیٹتی جا رہی تھی جبکہ ارد گرد کھڑے عزیز و اقارب ٹپ ٹپ آنسو بہا رہے تھے۔

سچ کہا اس ننھی معصوم جان کی قاتلہ نے' کیونکہ اللہ رب العزت نے قرآن میں فیصلہ کر دیا ہے کہ وہ جسے چاہے بیٹے دے، جسے چاہے صرف بیٹیاں دے، جسے چاہے بیٹے اور بیٹیاں دونوں دے اور جسے چاہے دونوں میں سے کچھ بھی نہ دے کہ وہ بے نام و نشان ہی دنیا سے قبروں میں پہنچا کر ان کا نام و نشان ہی مٹا دے۔ شاید شکیلہ بھی کسی ایسے خاوند سے خوفزدہ ہو جو بیٹیوں کی پیدائش پر اس سے لاتعلق ہونے کی دھمکی دیتا ہو، لہٰذا ایسے خاوندوں کو بھی ڈرنا چاہیے جو بیٹیوں کی پیدائش پر اللہ تعالیٰ کے خلاف جنگ کا اعلان کرتے ہیں اور

کہتے ہیں کہ ہمیں تو بیٹا چاہئے بس! ایسا نہ ہو اللہ کریم ان کو بیٹا دینے کی بجائے بیٹی سے بھی محروم کر دے اور وہ بے نام ونشان ہی دنیا سے دُم کٹے ہو کر مر جائیں' کوئی ان کے لئے بخشش کی دعا کرنے والا بھی نہ ہو اور وہ یہ سوچیں کہ ان کی والدہ اگر جنم نہ لیتی تو آج وہ بھی دنیا میں عیش نہ کر رہے ہوتے..... اور ان کی والدہ نے بھی تو کسی کے گھر بیٹی کی حیثیت ہی سے جنم لیا تھا' جبکہ آج وہ اپنے گھر میں بیٹی کے وجود سے متنفر ہیں۔

پہلی ہی رات...........!!

گزشتہ ہفتے مولانا مبشر احمد ربانی ﷾ کے کالم میں کراچی کی ایک دکھیاری بہن کی بپتا پڑھی۔اس نے بتایا کہ شادی کی پہلی ہی رات اس کے خاوند نے اس کے پاس آتے ہی کسی بات پر اختلاف کی وجہ سے اسے..... طلاق ..... دے دی۔ یوں اس نے میری خوشیوں کو دکھوں میں بدل کر میری زندگی برباد کر دی..... آخر میں اس نے پوچھا کہ میں اب کدھر جاؤں اور کیا کروں؟ میں اس بہن کی المناک داستان غم پڑھ کر تڑپ اٹھا۔ کام چھوڑ کر لیٹ گیا اور سوچنے لگا کہ ایسے سفاک جاہل اور درندہ صفت انسان بھی ہوتے ہیں اس جہاں میں؟ جنہیں کسی کے احساسات و جذبات کی ذرہ بھر قدر نہیں ہوتی۔ یہ سوچتے سوچتے فجر کا وقت ہو گیا تو میں اٹھ کر اپنے احساسات قلم کے سپرد کرنے لگا:

شادی کے بعد یہ وہ لمحات ہوتے ہیں جن کے متعلق ہر بچی نے بہت سے سہانے سپنے دیکھے ہوتے ہیں، وہ اپنے سرتاج کا سامنا کرنے سے پہلے مسلسل سوچوں کے گرداب میں پھنسی رہتی ہے کہ اللہ جانے وہ کیسا ہو گا کہ جس کو میرے والدین نے میری قسمت کا مالک بنا دیا ہے، ایسا نہ ہو کہ وہ غصے والا ہو اور ہر وقت ہاتھ میں ڈنڈا پکڑے یا لٹھ اٹھائے پیچھے پڑا رہے، یا محبت کرنے والا، خیال رکھنے والا، دھیمے مزاج کا مالک، غمگسار جیون ساتھی ہو گا!!؟ انہی سوچوں اور اندیشوں میں غلطاں و پیچاں وہ لمحہ آن پہنچتا ہے کہ جس سے نئی زندگی کی شروعات ہونی ہوتی ہیں۔ ایسے موقعہ پر اگر اس سے محبت کی چار باتیں، ہمدردی کے چند بول اور روشن مستقبل سے متعلق میٹھی بااخلاق گفتگو کر لی جائے تو وہ اپنے کو ہواؤں میں اڑتی محسوس کرتی ہے۔ اگر بداخلاقی کا رویہ اختیار کیا جائے، اس کو احساس دلایا جائے

کہ تم مرد کے پاؤں کی جوتی ہو، یا کسی مسئلہ میں اس کے دل کو جلا کر رکھ دیا جائے تو وہ اپنی قسمت کو کوستی ہے اور اپنے آپ کو دنیا کی سب سے بدنصیب دوشیزہ تصور کرتی ہے۔ ایسا اس وقت بھی ہوتا ہے جب کوئی جاہل، عورت پر اپنا رعب و دبدبہ جمانے کے لئے اس پر تشدد کرتا ہے یا اسے ایک طلاق دے دیتا ہے۔

میرے اس کالم میں میرا مخاطب ایسا ہی شخص ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے کہ ایسے موقعہ پر اسے وعظ و نصیحت کی جائے، قرآن وسنت کی روشنی میں اپنی آئندہ زندگی گزارنے کا لائحہ عمل طے کیا جائے اور نیک جذبات و خواہشات کا اظہار کیا جائے، اس لئے کہ...... ! پہلی رات ...... گلابی تمناؤں ...... خوش رنگ آرزوؤں امنگوں اور ترنگوں کی رات ہوتی ہے...... سہانے سپنوں ...... مہکتے جذبوں...... سلگتے ارمانوں ...... وفاؤں کی موجوں کا طوفان ہوتی ہے...... نئی زندگی کی حسین بنیاد ہوتی ہے...... سرشاری وفاداری کے عہد و پیمان کے استوار ہونے کا لمحہ ہوتا ہے...... محبتوں کی فراوانیوں' طغیانیوں اور جولانیوں کی پیامبر ہوتی ہے...... ایک حساس دھڑکتے دل کے لئے مچلتے ارمانوں کے سائے تلے حسین و دلفریب زندگی کا پہلا زینہ ہوتا ہے...... مرتے دم تک ایک دوسرے کے ہو جانے اور ایک دوسرے پر قربان ہو جانے کے عہد و پیمان باندھنے کی رات ہوتی ہے۔

اللہ کے نیک بندوں میں یہ رات (لمحہ) زندگی کے طویل سفر میں صرف ایک دفعہ آتا ہے...... وہ اس میں خوشیوں کے شادیانے بجاتے ہوئے اپنے رب کے حضور سجدہ ریزیاں کر کے اسے مناتے ہیں...... اور آسمانوں پر ان کے اس جوڑے کو قائم کرنے کے ربانی فیصلے کی قدر کرتے ہوئے' اس کا شکر اس کے دربار میں سر سجدے میں رکھ کر' جبین نیاز مند کو خاک آلود کر کے' اپنی عاجزی و انکساری کے جذبات و احساسات کا اظہار کرتے ہیں...... لیکن ایسے لمحات میں اگر کوئی پھولوں بھرے گلشن کو آگ لگا دے...... ہوا میں جھولتے آشیانے کو ہی جلا کر خاکستر کر دے...... کوئی سنسناتا...... زہر میں بجھا ہوا...... آگ کی بھٹی میں تپایا ہوا ...... تیر...... مار کر جگر خون خون کر دے...... ٹکڑے ٹکڑے کر دے...... حساس اور آرزوؤں

......امنگوں بھرے نازک دل میں پیوست کر دے......اگرچہ دل پھٹ نہ جائے، لیکن گھائل ہو کر زخمی زخمی ہو جائے...... پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے بچ تو جائے لیکن اس میں ایسی ٹیسیں اٹھنے لگیں جو مجروح و محزون کو جاں بلب کر دیں...... مرغ بسمل کی طرح تڑپا تڑپا دیں......تو پھر زندگی جیتے جی موت کی شکل اختیار کر لیتی ہے...... باحیاء بچی مرمر کے جیتی ہے اور جی جی کے مرتی ہے...... وہ جان لیوا چبھن کا...... کسک کا...... سسک کا...... بلک کا......تڑپ کا...... ٹیس و درد اور کرب کا...... دائمی مریض بن جاتی ہے۔ شرم وحیاء کی متوالی پاکباز بچیوں کی ذرا ذرا سی بات پر طلاق کی چھری سے ذبح کرنے والا یہ سفاک قاتل نہیں سوچتا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ اے ظالم! اگر تجھے سمجھ نہیں آتی تو ایسے سمجھ کہ اگر اس بدنصیب کی جگہ تیری پیاری بہن ہوتی، اس کے ارمانوں کا خون ہوتا، اس کی گلابی تمناؤں اور آرزوؤں کو کچلا جاتا......اور تجھے پتہ چلتا کہ تمہاری بہن کو پہلی ہی رات حجلہ عروسی میں داخل ہوتے ہی طلاق کی تلوار سے ذبح کر دیا گیا ہے!! تو پھر تیرا کیا حال ہوتا؟ تو کیا کرتا؟...... یقیناً تو گن اٹھا کر ایسے سفاک کے پرخچے اڑانے کی تدبیر کرنے کے لئے آگے بڑھتا...... لیکن...... پھر یہ سوچ کر رک جاتا کہ میری مغموم و محزون اور محروم تمنا بہن کو......کسی طرح سے مزید کوئی نقصان وصدمہ نہ اٹھانا پڑ جائے۔

اگر بچی کو باپ نے یا بھائی نے ماں اور باپ بن کر پالا ہو اور پھر کوئی اتنے لمبے سفر کو طے کرنے کے بعد منزل پر پہنچنے کے وقت سینے میں طلاق کا تیر مار دے......تو ان رشتوں کے دل پر کیا گزرتی ہے۔ رحمت کائنات ﷺ کو ابولہب کے بیٹے عتیبہ نے جب مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اے محمد (ﷺ)! میں تیری بیٹی کلثوم کو طلاق دیتا ہوں، تو آپ کا دل تڑپ کر رہ گیا۔ آپ نے اپنی بیٹی پر جب طلاق کا تیر لگتے دیکھا تو اس وقت اللہ کریم سے یوں دعا کی:

اے اللہ اس پر اپنے کتوں میں سے ایک کتا (درندہ) مسلط کر دے۔

جنگل سے گزرتے ہوئے اب سب قافلے والے اس کی حفاظت کرنے لگے لیکن پھر

بھی ایک درندہ آیا اور اس کو چیر پھاڑ کر چلتا بنا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ والدین پر اور ان بھائیوں پر جنہوں نے بچی کو ماں اور باپ بن کر پالا ہو بیٹیوں کی طلاق کی خبر کیسے بجلی بن کر گرتی ہے۔

اے طلاق دینے والے سوچ! تیرے اس اقدام کے بعد اس بچی کی والدہ کا کیا حال ہوا ہوگا؟ کہ جس کی دودھ وشہد کی طرح پاک صاف بیٹی پہلی ہی رات اپنی عفت وعصمت کی سفید چادر پر بہت بڑا دھبہ لگوا کر گھر لوٹی ہو...... اس کا کلیجہ پھٹ نہ گیا ہوگا...... اس کا دماغ بھنا نہ گیا ہوگا...... سوچوں کی سوئیاں حرکت کرنے سے یک دم رک نہ گئی ہوں گی...... اس کی سوچوں کے صحرا میں طوفان نہ اٹھ رہے ہوں گے...... منہ زور آندھیاں نہ گردش کر رہی ہوں گی...... کتنے ہی ایسے مواقع پر موت کی پرزور آندھی جس دم اس سال خوردہ کمزور و ضعیف بوسیدہ وشکستہ عمارت سے ٹکراتی ہے تو اس عمارت کو توڑ پھوڑ کر خاک میں ملا دیتی ہے۔ عمارت زمین بوس ہو کر ہمیشہ کے لئے اپنی کہانی ختم کر جاتی ہے' جبکہ اب نوتعمیر شدہ عمارت (بیٹی) آندھیوں کی زد میں ہوتی ہے، جسے اگر سنبھالا نہ گیا تو کسی بھی لمحے پیوند خاک ہوسکتی ہے۔

تو نے ماں کے حساس دل کو کس قدر دکھوں اور تکلیفوں کے کانٹوں سے بھر دیا ہے ہاں بچی کی ماں (ساس) بھی تو ماں ہی ہوتی ہے، جو ہمیشہ اپنے بیٹے (داماد) پر قربان ہونے کے لئے تیار رہتی ہے۔ تمہارے لگائے گئے چرکوں اور نشتروں کی شدت تکلیف سے وہ روتی ہے...... آہیں بھرتی ہے...... چیختی چلاتی ہے...... نیلے آسمان والے کے سامنے اپنی جھولیاں پھیلاتی ہے کہ ہائے کیا ہوگیا!!...... میری بیٹی کو خوشیوں کی خیرات دینے کی بجائے اس کے دامن کو غموں دکھوں کے تیز دھار نوکیلے کانٹوں سے بھر دیا گیا۔ ماں باپ کے متعلق تو کہا جاتا ہے کہ ان کے سامنے اُف تک نہ کرو لیکن تم نے تو اُف کرنے کی بجائے ان پر تُف کر دیا...... بلکہ ان کو سرعام ذلیل و رسوا کر دیا، بدنام کر کے ان کے نام کو گالی بنا دیا...... تو اب ماں کی شفاعتوں وشفقتوں کا کیسے حقدار ہوسکتا ہے!؟...... تم نے تو اس ہستی کو ناراض کر کے

خالق ارض و سماء کو غضبناک کر دیا کیونکہ اس کے آخری محبوب رسول ﷺ نے اپنی زبان مبارک سے فرمایا ہے: ابغض الحلال الی اللہ الطلاق (بلاوجہ) طلاق دینے کو اللہ کریم بہت زیادہ ناپسند کرتا ہے اور اس بندے سے ناراض ہو جاتا ہے۔

اس موقعہ پر مجھے ایک بدنصیب و نادان شوہر یاد آ رہا ہے جو ناراضی کے وقت اپنی بیوی کو دھمکی دیتے ہوئے کہتا کہ چپ ہو جاؤ ورنہ مجھے باب طلق یطلق..... طلاق بھی آتا ہے (یعنی میں تجھے طلاق دے دوں گا) ..... ایک دفعہ طلاق دیئے جانے کے بعد اگر کہہ کہلا کر، بھاگ دوڑ کر کے گھر بسا بھی دیا جائے، ایک چھت کے نیچے ان کو اکٹھا کر بھی دیا جائے تو باہمی دائمی محبت کے حصول کا گوہر مقصود کبھی حاصل نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ محبت کے آئینے میں ایک دفعہ آ جانے والی دراڑ کبھی نہیں مٹتی۔ محبت کی فراوانی..... طغیانی..... جولانی..... اور طوفانی کیفیت کے آگے ہمیشہ کے لئے ایک مضبوط بند بندھ جاتا ہے۔ اب سہمی ہوئی بچی اس مرد سے ہمیشہ..... ڈری ڈری..... سہمی سہمی..... جھکی جھکی..... جھجکی جھجکی..... دبی دبی..... خوفزدہ..... پریشان، اندیشوں کے بھنور میں پھنسی..... کہیں ایسے نہ ہو جائے..... کہیں ویسے نہ ہو جائے..... کہیں اس مسئلہ سے غصہ میں آ کر..... کہیں اس بات سے ناراض ہو کر ..... کہیں میرے اس کام کو ناپسند کر کے مجھے..... پھر طلاق کا زہریلا تیر نہ مار دیں۔ ہر وقت خدشہ..... اندیشہ..... ڈر..... خوف..... پریشانی..... الجھن..... پھونک پھونک کر قدم رکھنا..... اس بات سے ڈر..... اس سے بھی ڈر..... کہیں یوں نہ ہو جائے..... کہیں توں..... لاحول ولاقوۃ الا باللہ..... تف ہے ایسی زندگی پر..... یہ زندگی کوئی زندگی ہے..... یہ جینا کوئی جینا ہے..... یہ تو قسطوں میں موت ہے..... یہ زندگی تو مسلسل انگاروں پر لیٹنے کے مترادف عذاب الیم ہے۔ یہ تو ایسے مردے کی زندگی ہے جو چلتا پھرتا بھی ہے اور سانس بھی لیتا ہے..... یہ تو ایک قیدی زندگی ہے، مگر سزائے موت کے قیدی کی زندگی بھی اتنی خوفناک نہیں ہوتی۔

اے نادان، اے ناعاقبت اندیش! کبھی تو نے اس تلخ حقیقت کا ادراک کیا ہے کہ

ہمارے ہندو تہذیب سے متاثر معاشرے میں طلاق یافتہ عورت کی زندگی طلاق کے بعد کس قدر المناک ہوتی ہے، یہ مظلوم بھابھی کے پلے پڑ جائے تو برتن مانج کر...... بچوں کی پوٹیاں اٹھا کر...... کپڑے دھو کر...... اس کی باندی بن کر...... جھڑکیاں سہنے پر مجبور۔

اگر بھائیوں کی کفالت میں آ جائے تو ان کی طرف سے اس قسمت کی ماری، نصیبوں جلی کو مشکوک و مجرم اور قصور وار سمجھ کر ہمیشہ جھڑکیوں، سرزنشوں، دبکوں، لعن طعن اور پھٹکار کا سامنا کرنا پڑتا ہے......

اگر ماں کے پاس آخری سہارا سمجھ کر آ جائے تو اڑوس پڑوس کے لوگوں کی آگ کی طرح جلتی باتیں، طعنے، الزام، اسی کو قصور وار ٹھہرایا جانا، جرائم کی مرتکب قرار دیا جانا، وغیرہ جیسے سلگتے مسائل اس کو اندر ہی اندر زندہ درگور کرتے جاتے ہیں۔ یوں وہ ایک زندہ لاش بن کر ایک ذلیلانہ وحقیرانہ زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

کون اس بیچاری کی ہنستی بستی زندگی میں آنسوؤں کی رم جھم برپا کر گیا ہے...... کون اس کی زندگی کو جہنم بنا گیا ہے!...... کون اس غموں کی ماری کو آہیں اور سسکیاں دے گیا ہے...... کون اس کی نیندیں چرا کر دل کا چین چھین لے گیا ہے...... کون اس کی جھولی میں گلاب، موتیے، چنبیلی اور نرگس کے مہکتے پھول اور کھلی کلیاں ڈالنے کی بجائے...... انگارے ڈال گیا ہے...... کہ جنہوں نے اس کے دامن کو جلا ڈالا ہے!!؟؟؟...... یقیناً یہی اللہ رب ذوالجلال اور اس کے رسول رحمت ﷺ کے احکامات سے غافل، جاہل اور سفاک قاتل اس کا مجرم ہے، جس نے طلاق کے زہر سے اسے ہلکان و ویران کر دیا ہے۔ اب یہ ہر وقت سلگتے انگاروں کے ساتھ خود بھی سلگتی رہتی ہے اور اپنی زیست کے سفر کو ختم کرتی جاتی ہے......

کیا اس کی یہ...... بے بسیاں...... یہ آہیں...... جھولیاں اٹھا اٹھا کر مانگی گئی التجائیں...... آسمان کو ہلا کر نہ رکھ دیتی ہوں گی!!؟...... کیا نیلی چھت والا، خالق ارض و سماء جبار وقہار ذات اس کو انصاف سے محروم رکھے گا...... کیا اس کی آہوں اور سسکیوں کو نہ سنے گا؟؟...... جب وہ عدالت لگائے گا تو مجرم کون ہوگا...... تُو...... ہاں ہاں تُو...... یہ جرم کرنے سے پہلے خوب

سوچ کہ اس وقت رب کے دردناک عذاب سے تجھے کون بچا سکے گا؟...... ذرا سوچ تو سہی کون ہے اس کے سامنے پر مارنے کی مجال رکھنے والا...... اور...... یہ بھی سوچ...... اس حساس دل بچی کی جگہ...... تیری اپنی بہن بھی تو اس ظلم کا شکار ہوسکتی ہے...... اگر تو اپنی پیاری، راج دلاری بہن کو ہنستا، مسکراتا، گنگناتا دیکھنا چاہتا ہے تو پھر کسی دوسرے کی بہن کو یہ تیر مارنے کی بجائے خوش وخرم رکھ اور یہ غلطی کبھی بھول کر بھی نہ کر۔ اس سے بدنصیب اور بدقسمت انسان کون ہوسکتا ہے جو اپنے جیون ساتھی کو خوشیوں کی مالا پہنانے کی بجائے طلاق کا طوق اس کے گلے میں ڈال دیتا ہے اور اسے ہلکان کر دیتا ہے۔

اگر کوئی چھوٹی موٹی غلطی کا سرزد ہو جانا اس کا قصور ہے تو پھر خود کو کٹہرے میں کھڑا کر کے سوچ لے کہ ایسی کتنی ہی غلطیاں تو تم سے روزانہ ہوتی ہیں...... اس کا علاج تو طلاق کی تلوار ٹھہرا...... لیکن تیرا کیا علاج کیا جائے؟ تجھ پر صرف اس لئے ہاتھ نہیں ڈالا جا سکتا کہ تو مرد ہے...... اور وہ اس لئے قابو آ جاتی ہے کہ کمزور اور محکوم و مغلوب ذات ''عورت'' ہے۔ عورت ہونا اس کا اصل جرم ٹھہرا ہے...... سوچ لے آج تو تیرے ماتحت کر دینے کی وجہ سے یہ کمزور ہے لیکن کل روز محشر یہ جس ذات کے حکم کی بجا آوری میں تیری ماتحت ہے وہی اس مظلومہ کا حامی و ناصر ہوگا تو تُو کمزور و بے سہارا ہو جائے گا اور یہ طاقتور و توانا ہوگی۔ پھر اس ظلم کے بدلے میں تیرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا؟ آج ہی سوچ لے!!

6 دن کی دلہن

رب کائنات نے عورت کو مرد کی نسبت کمزور، حساس اور ضعیف و ناتواں مخلوق بنایا ہے لیکن کمزور ہونے کے باوجود اللہ نے اس کو ہمت و حوصلہ اور عزم کی قوت ایسی عطا کی ہے کہ وہ بہت بڑے بڑے اور مشکل کام خندہ پیشانی سے سرانجام دیتی ہے۔ عورت حساس، نازک دل اور نازک جذبات کی مالک ہوتی ہے۔ ذرا سی خوشی پر مسرت سے پھول کر پہاڑ ہو جاتی ہے اور ہلکی سی دل آزاری اور ہلکی سی آنچ سے کانچ کے برتن کی طرح، ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو جاتی ہے، اس کا دل حساس و شفاف آئینہ ہوتا ہے۔

یہی عورت جب بیٹی کے روپ میں ہو تو اور بھی نازک ہوتی ہے۔ والدین اسے بہت ناز و نعم میں پالتے پوستے، تعلیم دلاتے، کھلاتے پلاتے اور طرح طرح کے پہناوے پہناتے ہیں' اس کی فرمائشیں پوری کر کے ہر طرح سے اس کو خوش و خرم رکھتے ہیں۔ باپ جب کبھی کسی مسئلہ میں ناراض ہو کر اصلاح کے لئے یا سرزنش کے لئے اسے مارنے لگتا ہے تو ماں فوراً کہتی ہے: اللہ کے بندے! اسے کچھ نہ کہنا، پرایا دھن ہے' اللہ جانے بیچاری کے نصیب میں دوسرے گھر جا کر کیا بنتا ہے۔ اگر سوئی ہو تو ماں جگاتی نہیں کہ میری بیٹی جی بھر کے سوئے' دوسرے گھر جا کر سکون کی نیند نصیب ہو گی کہ نہیں۔ انہی جذبات کے تحت یہ نازک بیٹیاں والدین کی چہیتیاں لاڈلیاں اور آنکھوں کے تارے دل کے سہارے ہوتی ہیں۔

دوسرے گھر سدھار جانے کے بعد اگر بیٹیاں سکھ میں ہیں تو والدین سکون و چین کی نیند سوتے ہیں اور اگر تنگی میں ہوں تو ان کے شب و روز کے پل پل گویا کانٹوں اور انگاروں پر گزرتے ہیں۔ انہیں ایک لمحہ چین نہیں آتا' وہ ہر وقت غموں، دکھوں، پریشانیوں اور سوچوں

کے سمندر میں غرق نظر آتے ہیں۔

ایسا ہی ایک بدنصیب باپ اور اس کی بیٹی بھی ابھی دنیا کے سمندر میں زندہ ہیں۔ اس بچی کی ماں دنیا پر اسے اکیلا چھوڑ کر چلی گئی تو مسکین ہو جانے والی اپنی بچیوں کو باپ نے باپ نہیں ماں بن کر پالا۔ آج اس کی بڑی بیٹی کی شادی تھی۔ وہ بہت خوش تھا، سوچ رہا تھا کہ آج اگر بچی کی ماں یعنی اس کی بیوی زندہ ہوتی تو اپنی بیٹی کو سہاگن کے سرخ جوڑے میں ملبوس دیکھ کر کس قدر خوش ہوتی۔ بہرحال انہی محرومیوں میں ماں کے پیار اور نصیحت کے بغیر ہی بیٹی کی رخصتی ہوگئی۔ رخصت ہوتے وقت ہر بیٹی کے کتنے رنگین ارمان ہوتے ہیں کہ اس کا گھر ایسا ہوگا، چاہنے والے قدردان سسرال ایسے ہوں گے، میاں خوب محبت کرنے والا ہوگا۔ اس کے خوب ٹھاٹ باٹھ ہوں گے۔ وہ گھر کو اس طرح سجا کر جنت کا نمونہ بنائے گی۔ سسرال کی اس اس طریقہ سے خدمت کر کے اپنے آپ کو فنا کر کے دل جیت لے گی۔ سب اس کی محبت کے گیت گائیں گے وغیرہ وغیرہ۔

ایسے ہی خیالات و جذبات کے تحت یہ حرماں نصیب بہن پہلی رات ہی حجلہ عروسی میں بیٹھی اپنے نئے ہم سفر، سرتاج، روح و جسم اور سوچ و جذبات کے مالک کا انتظار کر رہی تھی۔ اور محبت کی شیرینی سے بھرپور چند بول سننے کے لئے اس کے کان بے قرار تھے۔ آخر وہ لمحہ آ ہی گیا۔ میاں خاموشی سے آیا۔ پاس بیٹھا اور چھوٹتے ہی کہنے لگا:

> تمہارے باپ کنجر نے مجھے لوٹ لیا ہے، وہ میری جائداد پر قبضہ کرنا چاہتا ہے لیکن میں اسے کبھی بھی کامیاب نہ ہونے دوں گا۔

یہ وہ اس لئے کہہ رہا تھا کہ شادی سے پہلے اس عجیب شخص نے تین مرلے کا مکان اپنی ہونے والی بیوی کے نام لگا دیا تھا۔ اب اس کے نفس نے بہکایا کہ وہ کیا کر بیٹھا!!؟ اس لئے وہ ایسی باتیں کر رہا تھا۔ پھر اس کے باپ کو گالی دے کر کہنے لگا: صبح اپنے باپ کے پاس جانا اور رجسٹری لا کر مجھے واپس کر دینا۔ میں یہ تین مرلے دوبارہ اپنے نام کرواؤں گا۔ لڑکی کہنے لگی: میرے سرتاج! میں آپ کی، میرا سب کچھ آپ کا ہے، مجھے اس سے کوئی دلچسپی

نہیں، یہ تین مرلے کل بھی آپ ہی کے تھے آج بھی آپ کے، میں نے رجسٹری نہ لانے کی ضد کر کے اپنے گھر کو نہیں اجاڑنا، میں لے آؤں گی، لیکن ایک بات کا خیال رکھیں میرے شفیق و کریم اور عظیم باپ کو گالیاں مت دیں، ذرا سوچیں اگر آپ میری جگہ ہوں اور کوئی آپ کے باپ کو آپ کے سامنے ننگی گالیاں دے تو آپ برداشت کر سکیں گے؟ یہی صورتحال میری ہے، مجھ سے اپنے باپ کو پہلی ہی رات گالیاں نہیں سنی جا رہیں، لہٰذا آپ مہربانی فرما کر ایسا نہ کریں۔

''بڑی تیز زبان ہے تیری، قینچی کی طرح چلتی ہے۔'' یہ کہہ کر اس کا ہاتھ اٹھا اور پے در پے زناٹے دار تھپڑ اسے پڑنے لگے...... نازک کانچ کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا، محبت کے جذبات ہوا ہو گئے، امیدوں پر پانی پھر گیا، امنگیں دم توڑ گئیں، آرزوئیں درگور ہو گئیں، پھر ناز و نعم میں پلی بیٹی یہ تشدد برداشت نہ کر سکی لہٰذا اس کی چیخیں بلند ہونے لگیں۔ اس نابکار نے اس کا حل یہ نکالا کہ اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا' تاکہ چیخیں باہر نہ نکل سکیں، نہ کوئی سن سکے اور نہ مدد کے لئے آ سکے...... پھر مزید یہ کہ بے دست و پا کرنے کے لئے ہاتھ دوپٹے سے باندھ دیئے...... اور پھر...... ظلم کا دریا کنارے توڑ گیا...... تشدد کی طغیانی سب کچھ بہا کر لے گئی...... یہ مشق ستم جاری رہی...... جان وفا ہی...... جان جفا ہو گیا...... اوروں پہ کرم کرنے والا اپنوں پہ، دنیا والوں کے بقول دل کی مالکہ پر ستم کے پہاڑ توڑ رہا تھا...... اور یہ مظلوم مسکین بیٹی تھوڑی دیر قبل نئی زندگی کے حسین آغاز کی منتظر...... پر ساری رات ظلم کے اولے برستے رہے، آندھیاں اور طوفان آتے رہے، وہ تختہ مشق بن کر ان کا مقابلہ کرتی رہی...... اور دعا کرتی رہی یا اللہ! اس درندے سے میری جان بچا لے، اگر مر گئی تو باپ بھی صدمے سے مر جائے گا اور باقی تین یتیم بہنیں ماں کے بعد باپ کے سہارے سے بھی محروم ہو جائیں گی۔

رات تھی کہ ختم نہ ہو رہی تھی...... جیسے وقت تھم گیا ہو...... اللہ اللہ کر کے صبح کا سپیدہ نمودار ہوا اور جب یہ بیٹی گرتی پڑتی اپنے باپ کے سامنے گئی تو باپ بیٹی کے جسم پر خاص طور

پر چہرے پر پڑے نیل اور زخموں کے نشان دیکھ کر غش کھا گیا۔ اس کا دل ڈوبتا چلا گیا۔ اب اگرچہ باپ زندہ ہے لیکن بیٹی کے صدمے میں شاک کا شکار ہو کر نہ مردوں میں ہے نہ زندوں میں۔ کتنے ہی باپوں کو بیٹیوں کے غم وقت سے پہلے ہی بوڑھا کر دیتے اور پھر ہڈیوں کا ڈھانچہ بنا کر قبر میں اتار دیتے ہیں اور کتنی ماؤں کو بستر مرگ پر لٹا دیتے ہیں۔

ایسے صدمے کتنی ہی سنہرے مستقبل کے سہانے سپنے اور آئیڈیل کے خواب کھلی آنکھوں سے دیکھنے والی بیٹیوں کو ذہنی مریض بنا دیتے ہیں اور مرد ذات سے نفرت کا باعث بنتے ہیں۔ ایسی بچیوں کی دوبارہ شادی کے نام ہی سے جان نکل جاتی ہے جبکہ والدین گھر بیٹھی بچی کے دوبارہ گھر نہ بسنے کے غم میں اندر ہی اندر گھلتے رہتے ہیں۔

یہ بہن کہہ رہی تھی کہ میں ایسے مرد کے ساتھ کیسے باقی زندگی گزار سکتی ہوں کہ جس نے پہلی رات ہی میرے ساتھ یہ سفاکانہ سلوک کیا۔ 9 اپریل 2006ء کو میری شادی ہوئی تھی اور آج چھ دن ہونے کو ہیں، میں باپ کی چوکھٹ پر بیٹھی ہوں اور طلاق مانگ رہی ہوں۔ میں نے اپنی اس دکھیاری بہن کو کہا کہ بہن! تیرے لئے بہتر یہ ہوگا کہ تو طلاق کا مطالبہ نہ کرے، یہ ملن بار بار نہیں ہوتے اور جب عورت مطلقہ ہو جائے تو ہمارے معاشرے میں اسے کوئی قبول نہیں کرتا، اس کی حیثیت ہیرو سے زیرو ہو جاتی ہے۔ ہر ممکن کوشش کر کہ تیرے سرتاج کو اپنی غلطی کا احساس ہو جائے اور وہ اس پر شرمندگی اور معذرت کا اظہار کر کے تجھے اپنا لے اور اجڑا ہوا آشیانہ پھر سے بس جائے، خزاں رسیدہ گلشن میں پھر سے بلبل اور کوئل چہچہانے لگیں...... ٹھنڈی اور معطر ہوا کے جھونکے قرب و جوار کو مسحور کرنے لگیں۔ یہ بھی یاد رکھ! تمہارے پیچھے تمہاری تین مسکین یتیم بہنیں بھی ہیں، اگر تمہارے گھرانے پر طلاق کا دھبہ لگ گیا تو ان بیچاریوں کا مستقبل مخدوش ہو جائے گا' باپ پاگل ہو جائے گا، باغباں نہ رہے گا تو کلیاں مرجھا جائیں گی، میں نہیں کہتا کہ تم دوسروں کی بہتری کے لئے قربانی کا بکرا بنو، لیکن یہ ضرور کہتا ہوں کہ اپنی بہتری کے لئے عورت بن کر سوچو، طلاق بہتری کے راستے مسدود کر دیتی ہے۔ اس دکھیاری بہن نے وعدہ کیا کہ وہ اب طلاق کا مطالبہ نہ کرے گی بلکہ

ہر ممکن کوشش کرے گی کہ اس کا آنگن پھر سے مہک اٹھے۔ اس مقصد کے لئے وہ دلوں کو پھیرنے والی ذات سے بھی رات کے وقت تہجد کے ذریعہ رابطہ کرے گی۔

اے نوجوانان ملت!..... میں سمجھتا ہوں اس مسئلہ میں جہاں اور بہت سے عوامل ہیں وہاں آپ بھی اس کے ذمہ دار ہیں۔ آپ ایک عورت کو صرف عورت ہی نہ سمجھیں، ایک محکوم، مغلوب، غلام اور باندی کی حیثیت سے نہ دیکھیں۔.... کیونکہ یہ عورت اگرچہ آپ کی بیوی ہے..... لیکن..... کسی کی بیٹی بھی ہے۔ کل عورت ہی آپ کی بیٹی ہوگی اور کسی دوسرے کی شریک حیات..... یہ سلسلہ چلتا آیا ہے اور چلتا رہے گا.....

آپ کبھی بھی یہ برداشت نہ کریں گے کہ آپ کی راج دلاری، آپ کی شہزادی، آپ کی لخت جگر..... آپ کی کلی اور آپ کی نازک حساس شرم و حیاء کی پیکر بیٹی کو..... کوئی کانٹا بھی چبھوئے۔ اگر آپ اپنی بیٹی کا مستقبل محفوظ و مامون دیکھنا چاہتے ہیں..... تو آج کسی دوسرے کی بیٹی..... جو آپ کی شریک سفر بنا دی گئی ہے..... کا مستقبل محفوظ بنا دیں۔

ہیرو ہوتا تو ؟؟

ٹھک ...... ٹھک ..... ٹھک ..... دروازے پر دستک ہوئی ...... بچے سے کہا گیا کہ کوئی آیا ہے دروازہ کھولو...... بچہ اپنی مصروفیت میں لگا رہا..... اتنے میں دوبارہ دستک ہوئی..... تو فوری طور پر دروازہ کھول دیا گیا...... سامنے پردہ میں ایک خاتون کھڑی تھیں، جونہی دروازہ بند کیا گیا تو اس کی آنکھوں نے چھم چھم آنسو بہانے شروع کر دیے۔ ایسے لگتا تھا کہ ایک سیلاب تھا کہ جس کو صبر کا بند باندھ کر روکا گیا تھا...... اب جبکہ صبر و ہمت کے تمام بندھن ایک ایک کر کے ٹوٹتے جا رہے تھے..... تو آنسوؤں کا سیل رواں تمام رکاوٹیں توڑ کر پوری طغیانی، بھرپور جولانی اور شدت کی روانی سے بہتا چلا آ رہا تھا...... موٹے موٹے گرم گرم آنسو تیزی سے اس خاتون کی آنکھوں کا حصار توڑ کر چہرے پر بہتے ہوئے نیچے قدموں میں گرتے جا رہے تھے، ان کی رفتار میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا..... پھر یہ بہن دھاڑیں مار مار کر رونے لگی...... ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے ابھی آتش فشاں پھٹ پڑے گا۔ سینہ ابل رہا تھا...... سانسیں بے ترتیب...... جسم پر رعشہ کی کیفیت ...... آنسوؤں کی جھڑیاں...... آہوں اور سسکیوں کے نالے...... میری اہلیہ کہتی جا رہی تھی: باجی! کیا بات ہے؟ کچھ بتاؤ بھی تو؟...... لیکن اس بیچاری کو تو شاید دل کا غبار نکالنے کے لئے ابھی تک کوئی مخلص و ہمدرد نہ ملا تھا۔ ایسے لگتا تھا کہ وہ خوب جی بھر کر رونا چاہتی ہے۔ اب وہ مزید شدت سے دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ایک عرصے سے سینے میں بند ارمانوں کا نوحہ کرنے کا موقعہ مشکل سے ابھی میسر آیا ہو اور پہلے اسے جی بھر کر رونے کا موقعہ بھی نہ ملا ہو۔ جی ہاں...... یہ بہن یہ خاتون...... ایک ماں ہے، جس کے دل میں اٹھنے والے جذبات کی

لہروں کا مقابلہ دریاؤں اور سمندروں کی موجیں کبھی نہیں کر سکتیں...... تھوڑی دیر بعد جب سانس درست کرنے کا موقعہ ملا تو کہنے لگی:

میں ایک بدنصیب ماں ہوں، میں نہیں چاہتی کہ جیسے میری زندگی کانٹوں پہ گزری ہے ایسے ہی میری بیٹی کی بھی گزرے۔ میری بیٹی تباہ ہو جائے گی، میں کیا کروں؟؟......

میری اہلیہ کہنے لگی: باجی کچھ بتاؤ تو پتا چلے کہ ہوا کیا ہے؟ اس نے روتے ہوئے کہا: بڑے ارمانوں سے والدین نے میری شادی کی لیکن میرا شوہر نشئی نکلا، میں نے مشرقی عورت ہوتے ہوئے اسے ہی اپنا مقدر اور نصیب سمجھ کر قبول کیا اور اس کی خدمت کرتے ہوئے زندگی گزار دی، کسی دوسری طرف منہ نہیں اٹھایا، مجھے اللہ کریم نے ایک بیٹی سے نوازا تھا، اب میری تمام تر توجہات اور سوچوں کا محور و مرکز میری بیٹی تھی۔ میں نے اس کو پالنے کے لئے دوسرے لوگوں کے گھر کی نوکرانی بن جانا گوارا کیا، اس کے مستقبل کو روشن کرنے کے لئے اپنا حال تاریک کر دیا اور ہر طرح کی قربانی دینے کے لئے تیار ہوگئی۔ میں نے لوگوں کے گھروں میں کپڑے و برتن دھوئے، صفائیاں کیں، ہر طرح کی محنت مزدوری کر کے اس کو پالا پوسا اور پڑھایا۔ جب یہ بچی جوان ہوئی تو میں اللہ کے حضور اکثر دعا کرتی: یا اللہ! میں نے تو تیری رضا کے مطابق صبر شکر کر کے (ایک نشئی کے ساتھ) زندگی گزار دی۔ اے مولا کریم! میری بچی کا نصیب اچھا کرنا، اسے اچھا پیار کرنے والا نیک جیون ساتھی دینا۔

میری دعائیں بارگاہ رب العزت میں قبولیت کا درجہ پا گئیں۔ ایک خوبصورت، خوب سیرت جوان سامنے آیا۔ ہم نے اللہ کا شکر ادا کر کے اس کے ساتھ بچی کا رشتہ کر دیا۔ بچہ بہت خوبصورت ہے، نیک ہے، پانچوں وقت کا نمازی ہے، میری بیٹی کا بہت خیال رکھتا ہے، مجاہدین کا ساتھی اور الدعوۃ والوں میں سے ہے، ان کا اتنا بڑا اور خوبصورت گھر ہے کہ میری بیٹی نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھا ہوگا' ہر طرح کا آرام سکون ہے، میں ایسا رشتہ ملنے پر اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتی ہوں...... تو پھر اتنے اچھے انتخاب پر آپ کو تو خوش ہونا چاہئے لیکن آپ ہیں کہ روتی چلی جا رہی ہیں، آخر کیوں؟...... وہ سرد آہ بھر کر بولی: یہی تو بات ہے،

یہاں سے ہی تو اصل کہانی شروع ہوتی ہے، میری بیٹی نے ایک ہی رٹ لگا رکھی ہے کہ میں نے وہاں نہیں رہنا، میں نے اپنی ماں کے گھر جانا ہے، وہ وہاں نہیں رہتی، میرے پاس آ جاتی ہے، ابھی چند دن پہلے بھی آئی ہوئی تھی۔ مجھے کہتی تھی کہ میں نے کبھی بھی اس گھر میں نہیں جانا، بلکہ ہمیشہ یہیں رہوں گی، میں نے صاف صاف کہہ دیا: میں تمہاری ماں ضرور ہوں لیکن اس مسئلہ میں تمہاری حمایت و پشت پناہی ہرگز نہ کروں گی۔ تمہارا اب وہی اصل گھر ہے، وہاں جاؤ، وہیں رہو، مجھ سے ملنے کے لئے ایک آدھ دن کے لئے آ سکتی ہو لیکن اصل گھر تمہارا وہی ہے' اب تمہارا جنازہ بھی وہیں سے نکلے گا، لیکن وہ وہاں ایک منٹ کے لئے رکنے کو تیار نہیں۔ آج اس کے سسرال سے فون آیا ہے کہ اس نے تین دن سے کھانا پینا چھوڑ رکھا ہے بس ایک ہی رٹ لگائے ہوئے ہے کہ میں نے اپنی امی کے گھر جانا ہے یہاں نہیں رہنا۔ جب اس بہن سے پوچھا گیا کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے؟ کہیں اس کا رابطہ کسی اور کے ساتھ تو نہیں کہ وہاں اس کی شادی ہو جائے؟؟...... تو وہ کہنے لگی: نہیں ایسا ہرگز نہیں، اس کا کہیں اور طرف دھیان نہیں ہے...... تو پھر وہ کیوں ایسا کر رہی ہے؟ یہ سن کر یہ ماں سرد آہ بھر کر کہنے لگی: اس کا کہنا ہے کہ:

> یہ لڑکا اگرچہ خوبصورت ہے، نیک ہے، نمازی ہے، گھر اچھا ہے، خوبصورت ہے...... اس نے داڑھی رکھی ہوئی ہے اور ایک مولوی ہے جبکہ میری خواہش تھی کہ میری شادی کسی فلمی ہیرو جیسے لڑکے کے ساتھ ہوتی...... ہم فلمیں دیکھتے...... گھومتے پھرتے...... وہ میرے ساتھ (فلمی) ڈائیلاگ بولتا...... وغیرہ وغیرہ لیکن یہاں تو ایسا کچھ بھی نہیں...... لہٰذا میں ایسی جگہ نہیں رہ سکتی۔

وہ سسرال چھوڑ کر گھر آنا چاہ رہی ہے، دوسرے لفظوں میں اپنا گھر برباد کرنا چاہتی ہے، مجھے کوئی ایسا وظیفہ یا ذکر بتائیں کہ میری بیٹی کا گھر اجڑنے سے بچ جائے۔ یوں وہ ایک مسنون ذکر لے کر روتی ہوئی چلی گئی۔

مجھے علم ہوا تو میں سوچوں میں گم ہو گیا کہ ایسا کیوں ہے؟ یہاں قصور کس کا ہے؟

بچیوں کے حساس و نازک اور دماغ کے کورے اور شفاف کاغذ پر یہ آتشی لکیریں، یہ جلتے خاکے کس نے بنا دیئے..... یہ بچیاں تو زرخیز زمین سے پھوٹنے والی نازک کونپلیں ہوتی ہیں..... ان کو بہترین معطر، معتدل، پرفضاء ماحول اور آب و ہوا کا مہیا کرنا..... والدین اور خاندان والوں کی ذمہ داری ہے، بلکہ ان سب سے زیادہ ذمہ داری ماں اور پھر باپ کی ہوتی ہے، جیسے لوگ ایک نرم و نازک شاخ کو یا پودے کو کمزور ہونے کی بنا پر کسی سیدھی لکڑی یا رسی سے باندھ کر سہارا دیتے ہیں' یہ رسی یا لکڑی جس طرف جھکاؤ پر مبنی ہوگی، یہ بیل، یہ کونپل، یا یہ پودا اسی سمت پروان چڑھے گا..... حتیٰ کہ تناور درخت بن جائے گا۔ ایک عرصہ بعد اگر آپ کو محسوس ہوا کہ اس کی سمت غلط مقرر ہوگئی ہے لہٰذا اب اسے کسی طرح سے سیدھا کر دیا جائے تو یہ بالکل ناممکن ہوگا..... بالکل یہی حال ان کونپلوں کا ہے' آپ کا فرض ہے کہ بچپن میں ہی ان کی ذہنی و روحانی تربیت کا رخ متعین کریں۔ ''فیملی فلمیں'' دیکھنے والوں، ٹی وی' وی سی آر، ڈش، کیبل وغیرہ کے حامل گھرانوں اور خاندانوں کو آج ہی سوچ لینا چاہئے کہ انہوں نے اپنی بچیوں کی تربیت کیسے کرنی ہے اور ان کو کون سی سوچ دینی ہے کہ جس پر وہ عمل کر کے اپنی دنیا و آخرت دونوں سنوار لیں اور والدین کے مرنے کے بعد ان کے لئے صدقہ جاریہ بن جائیں۔

میری نادان بہنو!..... فلم، ڈرامے اور پھر رسالوں اور لچر ڈائجسٹوں سے ہمیشہ اپنے دامن کو بچائے رکھیں۔ یہ ایک کڑوی حقیقت ہے کہ پردہ سکرین پر ظاہری طور پر پرکشش نظر آنے والے ''ہیرو'' اپنی عملی زندگی میں ہمیشہ ''زیرو'' ثابت ہوتے ہیں۔ آئے روز اخبارات ان حقائق سے بھری ہوتی ہیں۔ ناکامی کی صورت میں الزام تراشیاں، بدنامیاں اور پھر طلاقیں دینا ان کا روز مرہ کا معمول ہوتا ہے۔ ان ہیرو اور ہیروئن کا کوئی بھی جوڑا کبھی کامیاب زندگی گزار کر آخر دم تک جیون کا ہم سفر ثابت نہیں ہوسکتا۔ بلکہ یہ تو ہمارے معاشرے کا ذلیل خبیث اور بے حمیت و دیوث طبقہ ہے۔ اگر تو ان جیسے لوگوں کو اپنا آئیڈیل بنائے گی تو دنیا بھی روتے گزارے گی اور آخرت بھی سڑتے ہوئے۔

اس بہن پر لچر فلموں نے ایسا رنگ جمایا اور وہ ایک ہیرو ڈھونڈنے دنیا کی دوڑ میں نکل کھڑی ہوئی۔ آخر اس دنیا کی بھیڑ میں گم ہوگئی اور نہ مٹنے اور نہ بھرنے والا گہرا زخم کھا کر گھائل ہوئی۔ اب اس بہن کو اس کے سسرال والوں نے طلاق دے دی ہے کہ جاؤ اور ہیرو تلاش کرو۔ اب وہ ماری ماری پھر رہی ہے' ہوس پرستوں اور بدکاروں کے علاوہ کوئی اس کی طرف توجہ نہیں کر رہا۔ زندگی کا دھارا بہتا جا رہا ہے۔ عمر گزرتی اور بالوں میں چاندی آتی جا رہی ہے۔ ماں بستر سے لگ چکی ہے۔ شاید اسی کشمکش میں دونوں کی زندگی کی شام ہو جائے۔

خزانہ

کیا آپ کو معلوم ہے کہ سب سے بہتر انسان کون سا ہے؟ اگر نہیں تو ...... ہم ابھی آپ کو بتائے دیتے ہیں، لیکن اس سے قبل یہ بتاتے چلیں کہ کچھ لوگوں کو دنیا والے ''بہت اچھے انسان'' کا سرٹیفکیٹ دیتے ہیں۔ یہ لوگ جب گھر سے نکل کر اپنے ادارے، دفتر، محکمے، دکان، ریڑھی خوانچہ وغیرہ پر آتے ہیں تو ملنے والوں پر مسکراہٹوں کے پھول برساتے ہیں۔ ان کی آؤ بھگت، سیوا و خدمت، نوکری و چاکری کرتے ہیں۔ ان کے ناز نخرے برداشت کرتے ہیں۔ ان سے نہایت خلیقانہ انداز و اطوار سے پیش آتے ہیں۔ نرم، میٹھے اور مسکراتے لہجے میں بات کرتے ہیں۔ صرف اس لیے کہ دنیا والے میرے متعلق کہیں کہ یہ تو بہت اچھا انسان ہے اور واقعی دنیا ان کو ایسا ہی کہہ دیتی ہے ...... لیکن یہی افراد جب اپنے گھر میں بچوں کے پاس آتے ہیں تو دروازہ کی دہلیز پار کرتے ہی ...... ان کا خوشگوار ہشاش بشاش موڈ اچانک آف ہو جاتا ہے ...... نتھنے پھول جاتے ہیں ...... رگیں تن جاتی ہیں ...... مٹھیاں بھنچ جاتی ہیں ...... وہ گلا پھاڑ کر کرخت آواز میں ...... مار دھاڑ ...... چیخ پکار ...... لعن طعن سب وشتم اور گالی گلوچ کرنے لگتے ہیں ...... توڑ پھوڑ اور واہی تباہی کا دلیرانہ مظاہرہ کرنے لگتے ہیں ...... ان کی تیوریاں چڑھ جاتی ہیں ...... جبین نیاز پر سلوٹیں بسیرا کر لیتی ہیں ...... مسکراہٹیں، محبتیں، الفتیں اور اپنا پن، سب ہوا ہو جاتے ہیں ...... یہ کیوں ہے؟ یہاں کیوں ہے؟ وہاں کیوں نہیں؟ یہ ایسے کیوں ہوا؟ جیسے میں نے کہا تھا ویسے کیوں نہیں ہوا؟ وغیرہ جیسی کرخت آوازیں ابھرتی ہیں۔ یہ سارا مظاہرہ اس کے سامنے کیا جا رہا ہوتا ہے کہ جس کو زبان رسالت سے ''آبگینے'' کہا گیا ہے۔ جو اتنے نازک ہوتے ہیں کہ ذرا سی ٹھیس لگنے

سے ان کے ٹوٹنے کا اندیشہ ہوتا ہے ..... پھر ان آبگینوں کے دل کتنے نازک ہوتے ہوں گے؟ خود اندازہ لگا لیں۔ ہاں تو اب آپ کو بتائے دیتے ہیں کہ سب سے بہتر انسان کون ہے؟ محبوب کائناتؐ کی زبان حق بیان سے سنیں، آپ ﷺ نے فرمایا:

''تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لیے بہتر ہو اور میں اپنے گھر والوں کے ساتھ بہترین سلوک کرنے والا ہوں۔''

یعنی تم میں سب سے بہتر انسان وہ ہے جو اپنے بیوی بچوں کے ساتھ شاندار اخلاق کے ساتھ پیش آتا ہو۔ ان کے لیے خیر ہی خیر، بھلائی ہی بھلائی' بہتری ہی بہتری کی سبیل ہو۔ پھر آپ ﷺ نے یہ بھی بتا دیا کہ میں خود اپنے گھر والوں کے ساتھ بہترین حسن سلوک سے پیش آنے والا ہوں۔

ثابت ہوتا ہے کہ کسی کے اچھا ہونے کے لیے جو معیار دنیا نے قائم کیا ہے وہ مکمل و معتبر نہیں بلکہ وہی معیار بہتر ہے جو دو جہانوں کے سردار' فخر امم، سرکار دو عالم، سلطان مدینہ، سرور قلب و سینہ نے مقرر کیا ہے۔ آج ہم اس قائم کئے گئے معیار کو یکسر بھول چکے ہیں۔ میری اپنے ایک محترم دوست سے اس مسئلہ پر گفتگو ہوئی تو وہ کہنے لگا:

طاہر بھائی! میں نے اپنی بیوی پر کبھی تشدد تو نہیں کیا۔ بس مجھے اس وقت غصہ آتا ہے کہ جب وہ میرے بچوں کو مارتی ہے یا کسی وجہ سے توجہ نہیں کرتی اور بچے رو پڑتے ہیں، تو یہ دیکھ کر مجھے غصہ چڑھ جاتا ہے ..... میں صرف اتنا کرتا ہوں کہ اٹھ کر اس کی گردن پر ہاتھ ڈال کر دبوچتا ہوں اور اس کو زمین سے اوپر ہوا میں اٹھا دیتا ہوں ..... بس میں اتنا ہی کرتا ہوں' اس سے زیادہ کوئی تشدد وغیرہ نہیں ..... واہ کیا سادہ پن ہے! پتھر جیسا من ہے ..... اور کیا بھولا پن ہے!!

عورت بھی انسان ہے، غلطی اس سے بھی سرزد ہوتی ہے۔ سارا دن بچوں نے اس کی مت ماری ہوتی ہے۔ اگر بہترین سلجھے اور نرم انداز میں مطلوبہ رویے کی نشاندہی کر دی جائے تو معاملہ فوری درست ہو جاتا ہے۔ میں نے ایسے ہی اپنے کئی جاننے والوں اور دوستوں کو

بتایا ہے کہ اس معاملے میں محترم امیر حمزہ صاحب (چیف ایڈیٹر غزوہ) کا اور میرا طریقہ کار ملتا جلتا ہے۔ وہ کہتے ہیں: جب مجھے احساس ہوتا ہے کہ اس مسئلہ میں میری طرف سے بیگم کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے تو میں فوراً اس سے معافی مانگ لیتا ہوں کہ اللہ کی نیک بندی! اس معاملہ میں مجھ سے تمہارے ساتھ زیادتی ہوگئی ہے' لہٰذا اللہ کے لیے مجھے معاف کر دے۔

محترم حمزہ صاحب کی طرح اگر میں بھی اپنی ہم سفر کے ساتھ بولنے چالنے پہ کسی مسئلہ میں زیادتی کر کے دفتر پہنچ بھی جاؤں تو ضمیر کچوکے لگاتا ہے کہ تمہاری طرف سے زیادتی ہوئی ہے، صرف اس لیے کہ تم مرد ہو اور وہ بیچاری عورت ...... یہ سوچ جب ستاتی ہے تو دفتر میں کام نہیں ہوتا۔ فکر پرواز نہیں کرتی ...... قلم حرکت نہیں کرتا ...... میں بھی فوری گھر کا نمبر ڈائل کر کے اپنے جیون کے سفر سے اللہ کی رضا اور اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کے لیے معافی مانگ لیتا ہوں۔ وہ حوا کی بیٹی بیچاری بہت کہتی ہے کہ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں کون ہوتی ہوں آپ کو معافی دینے والی ...... میرے تو ذہن میں ایسی کوئی ناراضی والی بات اور سوچ بھی نہیں' لہٰذا آپ شرمندہ نہ کیا کریں، ہم بھی انسان ہیں، کمیاں اور کوتاہیاں ہم سے ہوتی ہیں تو آپ کو غصہ آتا ہے۔ میں آئندہ سے کوشش کروں گی کہ اللہ کی توفیق سے دوبارہ آپ کو اس مسئلہ میں شکایت کا موقعہ نہ ملے۔

میرے بھائی! ...... آدمی اس سے' کہ جو ساری دنیا کو (سہیلیوں، ہمجولیوں' عزیزوں حتیٰ کہ والدین بہن بھائیوں کو) بھی تیرے لیے چھوڑ کر آگئی ہے' صرف تیری ہی باندی، غلام' لونڈی اور خادمہ بن کر رہ گئی ہے' اس سے اپنی غلطی کی معذرت کر لینے سے انسان چھوٹا نہیں بن جاتا بلکہ یہ چیز اسے بڑا بناتی ہے' اس کی عزت دوسروں کی نظروں میں اور بڑھا دیتی ہے۔

میرا ایک جاننے والا بھائی محمد ارشد اپنے ایک ریٹائرڈ فوجی دوست کو بتا رہا تھا کہ میری بیوی ناراض ہو کر میکے چلی گئی ہے' بتاؤ اب میں کیا کروں؟ وہ اللہ کا نادان بندہ کہنے لگا: بس! ٹھیک ہے، اب بیٹھی رہنے دو اسے وہیں۔ اگر لینے چلے گئے تو خراب ہو جائے گی۔

دوبارہ بھی یہ ناٹک کرے گی۔ بالکل اس کی خبر بھی نہ لینا ...... وغیرہ وغیرہ۔ اب یہ بھی ازدواجی محبت سے ناآشنا بھائی اپنی چھوٹی چھوٹی مونچھوں کو تاؤ دے کر کہنے لگا: ''بالکل جی! میں نہ جاؤں اب اس کو لینے اور منانے، وہ خود ہی ناک کے ساتھ لکیریں نکال کر واپس آئے گی۔ یا اس کے پچھلے اسے یہاں پھینک کر جائیں گے۔ یہ گفتگو سنتے ہی میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا...... استغفراللہ ...... لاحول ولاقوۃ الا باللہ...... افسوس ہے آپ بھائیوں پر ......'' یہ سنتے ہی وہ دوست بولا:

طاہر بھائی! اس میں افسوس والی اور یہ کلمات کہنے کی کیا بات ہے؟

میں سوچوں میں غلطاں تھا کہ اس بھائی نے اپنی مردانگی کا غلط موقعہ پر اظہار کیا ہے ...... اپنی مردانگی کی طاقت کو نامناسب جگہ استعمال کیا ہے ...... یہ مردانگی تو تب مردانگی ہوتی جب یہ میدان جہاد میں ہندوؤں صلیبیوں کے خلاف لڑ کر غیرت کھاتی ...... اور ان اسلام دشمنوں کی لاشوں کے ڈھیر لگاتی ...... اسلام اور اہل اسلام کو اس کا فائدہ بھی ہوتا ...... یہاں تو وہ اس کا ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے ...... اس لیے کہ عورت پر مردانگی دکھانا مردانگی نہیں دیوانگی ہے ...... میں سوچوں میں گم تھا کہ وہ بھائی بولے: کیوں طاہر صاحب! بتاتے نہیں، آپ نے لاحول اور استغفراللہ کیوں پڑھا؟ مجھے آواز سنائی دی تو میں اس سے مخاطب ہوا: ارشد بھائی! چھوڑو اسے اور یہ بتاؤ کہ کیا تمہیں پتا ہے کہ کسی کے ساتھ روٹھتا وہی ہے جسے اس سے کوئی تعلق واسطہ یا رشتہ ہو۔ ورنہ اگر کوئی کسی کو جانتا ہی نہیں تو وہ اس سے روٹھے کیوں؟ اور آپ کو پتا ہے کوئی کسی سے روٹھتا کیوں ہے؟ تاکہ اسے منایا جائے ...... اور یہ توقع کسی ایرے غیرے سے نہیں رکھی جاتی ...... بلکہ صرف اس سے رکھی جاتی ہے جس سے پیار کیا جائے' جس کو دل دے دیا جائے' جس کے ساتھ ٹوٹ کر محبت کی جائے ...... اور یہ سمجھا جائے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے ...... نہ ہی جدائی برداشت کر سکتے ہیں ...... دو محبت کرنے والے انتہائی محبت کے اظہار کے لیے روٹھتے بھی ہیں۔ کبھی ایک روٹھتا ہے تو دوسرا اس کو محبت بھرے انداز اپنا کر راضی کرتا ہے' مناتا ہے اور پھر کبھی کبھی فخر یہ انداز میں اپنی اس

محبت اور منائے جانے کا اپنے قریبی دوستوں میں تذکرہ کر کے خوش ہوتا ہے ...... اور یہی حال دوسرے فریق کا بھی ہوتا ہے۔ کبھی روٹھنا کبھی منانا ...... کبھی شکوے کبھی شکایتیں ...... کبھی مزے مزے کی حکایتیں ...... یہ سب انتہائی پیار اور محبت کے انداز ہیں، جن کو صرف اللہ کیلئے محبت کرنے والے ہی سمجھ سکتے ہیں۔ تم کتنے بدنصیب ہو کہ تمہیں پیار کرنے والی بیوی ملی ہے۔ ابھی نئی نئی شادی ہوئی ہے ...... وہ تمہاری محبت پر آس لگائے ایک مان ہے، ایک فخر ہے، ایک امنگ، ایک ترنگ اور چاہتوں کے رنگ اور سنگ کے ساتھ تمہارا انتظار کر رہی ہے، کہ کب میرا راجا آئے اور مجھے منا کر اپنے سنگ لے جائے ...... اور تم ہو کہ جاہلوں، ان پڑھوں اور جنگلیوں کا سا مظاہرہ کر رہے ہو۔ جانتے ہو اس جہان میں ایسی قسمت کی ماری بھی ہیں کہ جن کو علم ہے کہ ان کے خاوندوں کے سینے میں دل نام کی کوئی چیز نہیں۔ اگر ہم محبت و چاہت کے حصول کے لیے تھوڑی دیر کے لیے بھی ناراض ہو کر والدین کے گھر چلی جائیں گی تو ہمیں منانے نہیں آئیں گے ...... بلکہ یہیں پڑی سڑتی رہنے دیں گے۔ ایسی عورتیں تو کسی مرگ پر بھی نہیں جاتیں کہ ان کے خاوند بہت مصروف ہیں اور لانے لے جانے کا ان کے پاس وقت نہیں، لہٰذا وہ ایک زندہ مردے کی طرح زندگی کے کولہو میں جتی رہتی ہیں۔ نہ کسی سے ناراض ہوتی ہیں نہ کسی کو مناتی ہیں اور زندگی کے دن پورے کرتی ہیں۔ ہاں تمہاری تو ایک بیٹی بھی ہے، جو ماں کے ساتھ ہی اب تک تم سے دور ہے۔ کیا تم چاہو گے کہ کل کلاں اسے ایسا جیون ساتھی ملے جو اسے ہنسائے، بسائے، اس کے ناز اٹھائے؟ اگر روٹھ جائے تو پیار و محبت سے اسے منائے ...... یا اپنی ہی طرح کا کہ جو ...... رلائے، بھگائے ...... اور نفرت کے بیج اگائے ...... ہوش کرو! جس طرح تم اپنی نام نہاد مردانگی کی ضد پر اڑے بیٹھے ہو ایسے ہی اس بیچاری کے جاہل والدین بھی شاید اپنی انا کا مسئلہ بنائے بیٹھے ہوں ...... کبھی یہ غلط فہمیاں ...... یہ رنجشیں ...... یہ کلفتیں ...... گھروں کی بربادی کا باعث بھی بن جاتی ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ ......

کچھ وہ کھچے کھچے رہے، کچھ ہم تنے تنے

اسی کشمکش میں ٹوٹ گیا رشتہ چاہ کا

یہ سن کر وہ بھائی کہنے لگا: طاہر بھائی! مجھے میری بچی بہت یاد آتی ہے، میں ضرور ان کو منانے بسانے ...... اور ہنسانے کے لیے پہنچے جاؤں گا۔

پیارے بھائی! ...... امام کائنات اور محبوب کائنات ﷺ نے فرمایا ہے کہ انسان دنیا میں جو خزانے جمع کرتا ہے ان میں سے سب سے بہتر خزانہ صالح و نیک شریک حیات ہے۔ پھر فرمایا جب اس کا سرتاج اس کی طرف دیکھے تو وہ اسے (اپنے پیار بھرے رویے سے) خوش کردے، یعنی اس کے دل کو خوشیوں سے بھر دے۔ لہٰذا اس پر عمل کرتے ہوئے اپنی آنکھوں کو حرام جگہ استعمال کرنے کی بجائے اپنے ساتھی کو گھر لا، اسے محبت سے دیکھ اور اللہ کریم نے اس کی شکل میں امام کائنات کے فرمان کے مطابق جو ''خزانہ'' تجھے عطا کیا ہے اس کی حفاظت کر۔ ایسا نہ ہو کہ یہ ''خزانہ'' تم سے چھن جائے یا تم اس سے محروم ہو جاؤ ...... اے بہن! اگر تیرا جیون ساتھی تم سے روٹھ جائے تو اکھڑ پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے ''میں نے کون سی غلطی کی ہے جس کی معذرت کروں'' والے گمراہ کن اور محبت دشمن دعوے پر قائم نہ رہ، بلکہ آگے بڑھ کر اسے منالے، راضی کرلے کہ اسی جذبے سے گلشن میں بہاریں آتی ہیں۔

اور وہ دلہن بن نہ سکی

یہ ماہ جون ۱۹۸۴ء کی ایک تپتی، جھلستی دوپہر تھی۔ ایک آدمی صف اٹھائے گھوم رہا تھا کہ کوئی اسے خرید لے اور یوں اس کا واپسی کا کرایہ اور روٹی کا بندوبست ہو جائے۔ جب وہ ہر طرح سے صف فروخت کرنے میں ناکام ہو گیا تو حکیم عبدالعزیز صاحب فیروز پوری سے کہنے لگا: آپ یہ صف خرید لیں' مجھے ۴۰ روپے کی ضرورت ہے۔ اللہ آپ کو اس کا اجر دے گا۔ حکیم صاحب نے ۴۰ روپے اسے دیتے ہوئے کہا کہ یہاں رکھ دو' کوئی اس پر نماز ہی پڑھ لیا کرے گا۔ نہ قیمت پر بحث نہ ٹال مٹول اور نہ بحث مباحثہ' فوراً ۴۰ روپے ملنے پر وہ بہت متاثر ہوا اور دعائیں دیتا ہوا چلا گیا۔

اس کے بعد وہ آتے جاتے اور ادھر سے گزرتے ہوئے ضرور مل کر جاتا۔ ایک دن جب اس سے پوچھا کہ تم نے کوئی مستقل کام کیوں نہیں کیا؟ اس نے بتایا کہ خاندانی دشمنی کی بنا پر مجھے ایک عرصہ جیل میں گزارنا پڑا' ابھی کچھ عرصہ پہلے رہائی ملی ہے تو جیل سے باہر آنے کے بعد میں نے یہی کام شروع کیا ہے اور زندگی کی گاڑی کو دھکا لگا رہا ہوں۔ پھر وہ جیل میں ایک ۷۰ سالہ بوڑھے بابا کا واقعہ سناتے ہوئے کہنے لگا: میں نے وہاں ایک ضعیف العمر بابا کو دیکھا کہ جس کی عمر تقریباً ۷۰ سال تھی۔ وہ ہر وقت روتا رہتا تھا۔ اس کا سینہ آگ پر پکنے والی ہنڈیا کی طرح ابلتا رہتا۔ وہ آہیں بھرتا اور سسکیاں لیتا رہتا تھا۔ مسلسل رونے کی بنا پر اس کی آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں اور آنکھوں کے گرد حلقے نمایاں تھے۔ چہرے پر گہری جھریاں' ہاتھ کپکپاتے اور نظر کمزور ہو چکی تھی۔ ایک دن میں نے بابا کو رونے سے روکنے کی بھرپور کوشش کی اور اس سے ہنسی مذاق کی خوشگوار باتیں کیں لیکن بابا پر کچھ اثر نہ

ہوا' ایسے لگا جیسے بابا اندر سے بالکل ٹوٹ پھوٹ چکا ہو' اس کے ہونٹوں پر آہوں' سسکیوں اور آنسوؤں نے بسیرا کرلیا ہو۔

میں نے ناکام ہوکر کہا: بابا جی! کبھی ہنسا ہنسایا بھی کرو یا اپنے خول سے باہر بھی نکلا کرو' یہ کیا بات ہوئی کہ ہر وقت بچوں کی طرح کانپتے لرزتے روتے رہے' آنسو بہاتے رہے' اگر کوئی ایسا معاملہ ہے تو ہمیں بھی تو پتا چلے کہ تم نے ہر وقت رونے دھونے کو اوڑھنا بچھونا کیوں بنا رکھا ہے اور مسکراہٹوں کو کیوں رخصت کر رکھا ہے؟ تاکہ ہم تمہاری مدد کر سکیں ... بابا نے کچھ دیر سوچنے کے بعد سر اوپر اٹھایا اور ڈھلکی ہوئی پلکوں کو سکیڑتے ہوئے کہنے لگا: میرے ساتھ سانحہ ہی ایسا پیش آیا ہے کہ جسے بیان نہیں کیا جا سکتا' اس سانحے نے میری زندگی کو دہکتا کوئلہ بنادیا ہے' جو آہستہ آہستہ ٹھنڈا ہوکر راکھ بن کر ختم ہو جائے گا۔ میں نے تفصیلات جاننے کے لیے لاکھ جتن کیے لیکن بابا نے اپنے ہونٹوں پر قفل خاموشی چڑھالیا کہ جو ٹوٹنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ ایک ہفتہ کی مسلسل منت سماجت اور اصرار کے بعد ایک دن بابا نے ہتھیار ڈال دیے اور یوں اپنے دل کی ویران و سنسان کوٹھڑی میں مدفون راز افشا کر دیا۔ اس کی آواز میرے کانوں سے یوں ٹکرائی جیسے کسی گہرے کنویں سے آرہی ہو اور پھر جلد ہی ڈوب جاتی ہو۔ بابا ماضی کی پگڈنڈیوں پر دوڑ رہا تھا اور گویا تھا:

میں اپنے گاؤں کا باعزت' بارعب اور لوگوں کے مسائل اور جھگڑوں کا فیصلہ کرنے والا چوہدری تھا۔ تھوڑی سی میری زمین تھی۔ دو کمسن بچیاں چھوڑ کر بیوی فوت ہوگئی۔ وقت پر لگا کر گزر گیا اور بچیاں جوان ہوگئیں تو ان کی شادی کی فکر دامن گیر ہوئی۔ اس دوران ایک لڑائی جھگڑے میں اکلوتا بیٹا قتل ہوگیا تو میری کمر ٹوٹ گئی۔ جوان بچیوں کو دیکھ کر میں سوچ میں پڑ گیا کہ اگر میں انتقام لیتا ہوں تو جیل چلا جاؤں گا تو پھر ان پھول سی بیٹیوں کا کیا بنے گا؟..... کہ جنھوں نے زندگی ماں کی محبت کو ترستے گزار دی' وہ یوں باپ کی محبت اور سائے سے بھی محروم ہوجائیں گی۔ یوں میں نے بچیوں کا گھر بنانے کی خاطر اور ان کے ہاتھ پیلے کرنے کی خاطر بیٹے کی ہلاکت و جدائی کا غم اندر ہی اندر پی لیا اور اس کے قاتلوں سے کوئی

باز پرس نہ کی۔

اب میں نے بچیوں کے لیے رشتہ ڈھونڈنے کے لیے بھرپور جدوجہد شروع کر دی۔ لوگ میرا نام سن کر خوشی خوشی بچیوں کو دیکھنے آتے۔ میری بچیاں جہاں صحت مند، خوبصورت اور چاند کا ٹکڑا تھیں وہیں شرم وحیا کا حسن بھی ان کو اللہ تعالیٰ نے بھرپور عطا کر رکھا تھا۔ ہر کوئی پہلی ہی نظر میں بچیوں کو پسند کر کے ان کے محاسن کے گن گانے لگتا، لیکن جب دیکھتے کہ اتنے نامی گرامی چوہدری کی بیٹیاں ہیں، خوبصورت اور خوب سیرت ہیں، لیکن جہیز کا کہیں دور تک نام ونشان نظر نہیں آتا تو کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے جواب دے کر گھر سے چلے جاتے۔ لوگوں سے کہتے کہ بچیاں تو پسند ہیں لیکن ان کے پاس جہیز میں دینے کے لیے کچھ نہیں۔ چوہدری اسلم نے دوسرے گاؤں کے چوہدری یوسف خاں کے ہاں رشتہ کی بات چلائی' کہ جس کے دو جوان بیٹے شادی کے قابل تھے۔ چوہدری فیملی سمیت آیا اور بچیاں پسند کر کے بات پکی کر گیا لیکن پھر چند ہی دنوں بعد اپنے موقف سے پھر گیا کہ آپ کے ساتھ ہمارا رشتہ قائم نہیں ہوسکتا۔ میں نے اس کی منت سماجت کی کہ میری بچیوں کو صرف جہیز نہ ہونے کی بنا پر ٹھکرا کر نہ جاؤ' تمہارے دو بیٹے میری دو بیٹیاں ہیں۔ دونوں بہنیں ایک جگہ رہ کر بہت خوش رہیں گی۔ رہی جہیز کی بات تو میں اس کا انتظام کرلوں گا۔ یوں بات رفع دفع ہوگئی اور شادی کی تاریخ پکی ہوگئی۔ یہ صورتحال دیکھ کر میں نے کچھ قرض پکڑ کر ضروریات زندگی پر مشتمل زمانے کے اعتبار سے ایک مختصر سا جہیز تیار کیا۔

آخر گن گن کر دن کٹے۔ میری بچیاں کہ جنھوں نے ماں کے مرنے کے بعد خوشی کے دن نہ دیکھے تھے' اپنے گھر بستے دیکھ کر نہایت شاداں وفرحاں تھیں' خوشی ان کی باتوں اور آنکھوں سے جھلک رہی تھی۔ گاؤں کی بوڑھیاں ان ماں کے سائے سے محروم بچیوں کے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھ کر صدا سہاگن رہنے کی دعائیں دے رہی تھیں جبکہ ہجولی بچیاں اور سہیلیاں مبارکبادیں دے رہی تھیں۔ انہی مسحور کن اور خوشگوار لمحات میں دن گزرنے کا پتا نہ چلا اور شادی کا دن آ گیا۔ اب میری بچیاں بنی سنوری، شرم وحیا کے زیور میں ملبوس' ایسے

پر مسرت موقعہ پر ماں کی عدم موجودگی اور جدائی کا گھاؤ دل پہ لگائے' شادی کا سرخ جوڑا پہنے مستقبل کے سہانے سپنوں میں کھوئی بیٹھی تھیں کہ اچانک مولوی صاحب رجسٹر لیے پہنچ گئے اور دونوں بچیوں سے ایجاب وقبول اور دستخط کروانے کے بعد باہر چلے گئے۔ نکاح کی کارروائی مکمل ہو چکی تھی۔ چھوہارے اور بتاشے تقسیم کیے جارہے تھے۔ چوہدری اسلم نے اتنی بڑی بارات کی خدمت اور کھانے کا بندوبست اپنی زمین کا ایک قطعہ بیچ کر کیا تھا۔ کھانے سے فارغ ہوکر لوگ چوہدری یوسف کو مبارکباد دے رہے تھے کہ تجھے شریف، باعزت اور وضع دار خاندان کی دو خوبصورت اور خوب سیرت شرم وحیا کی متوالی، پردہ دار، پڑھی لکھی اور پابند صوم وصلوٰۃ نیک بچیاں ملی ہیں۔ چوہدری! تمہارے بیٹوں کے نصیب جاگ اٹھے' دیکھنا بچیاں تمہارے گھر کو جنت کا نمونہ بنادیں گی۔ لوگ تیرے گھر پر رشک کریں گے اور اس کی مثال دیا کریں گے۔ جاتے ہی گاؤں میں صدقہ خیرات ضرور کرنا ورنہ نظر لگنے کا اندیشہ ہے...... بس سمجھو دو چاند کے ٹکڑے اس آنگن کو ویران کرکے مگر اپنی خوشبو یہاں چھوڑ کر تیرے محلات کو رونق بخشتے ہوئے روشن کردیں گے' ان کے نور سے تمہارے جہان کا آسمان جگمگا اٹھے گا۔ یہ باتیں زنان خانے میں بھی کسی نہ کسی طرح پہنچ رہی تھیں۔

ایسے موقعہ پر بچیوں کے دل خون کے آنسو رو رہے تھے' ان کی آنکھیں ویران تھیں' آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں' دل اداس تھا' پورا جہاں سونا سونا اور ویران نظر آرہا تھا۔ دماغ جہاں مسلسل کرب کی ٹیسیں برداشت کررہا تھا وہاں کچھ سوچ بھی رہا تھا۔ یہی سوچ تھی جس نے خوشی کے اس موقعہ پر باپ کے گلشن کے ان پھولوں کو پژمردہ اور مرجھا دیا تھا۔ وہ سوچ رہی تھیں کہ ایسے موقعہ پر پرائی امانت بچیوں کی غمگسار، جاں نثار، محبتیں نچھاور کرنے والی' جھونپڑی پھیلا کر نیلی چھت والے سے کامیابی کی التجائیں کرنے والی، دعائیں دینے والی اور اپنے محبت وپیار کے جذبات سے جوش مارتے سینے کے ساتھ لگا کر ان کو دولہا تک لے جانے والی...... سینے سے چمٹا کر دوسرے گھر رخصت کرنے والی اور پھر اپنا شفقت بھرا لرزتا ہاتھ بیٹی کے سر پر رکھ کر لرزتی زبان سے کہنے والی کہ جاؤ بیٹی! اب یہی لوگ تیرے ماں

باپ بہن بھائی اور سب کچھ یہی ہیں ... اللہ تجھے ہمیشہ خوشیوں میں رکھے' تیرے آنگن کو پھولوں اور کلیوں سے بھر دے۔ جا بیٹی! تیرا اللہ حافظ' ہاں نئے گھر جا کر ہمیں بھی کبھی یاد کر لیا کرنا' بالکل بھلا ہی نہ دینا ہم کو ... ہم تیرے بغیر رہ تو نہیں سکتے، لیکن کیا کریں یہ دنیا کی ریت ہے' نبھائی پڑتی ہے' اللہ اور رسول کا بھی یہی فرمان ہے۔ ہاں تیرے بابا بہن بھائی اور ہم صبح و شام تیری باتیں اور یادیں تازہ کر کر کے تجھے یاد کرتے رہیں گے ... ایسی ہستی کائنات میں صرف ایک ہی ہے کہ جسے دنیا والے ''ماں'' کے نام سے پکارتے ہیں لیکن اس موقعہ پر جب خوشیوں کے شادیانے گونج رہے ہیں ہمیں الوداع کرنے والی ہماری ماں کہاں ہے؟ ... ہمیں کون دعائیں دے گا ... ؟ کون ہمیں سینے سے لگا کر سر پر شفقت بھرا ہاتھ رکھ کر رخصت کرے گا؟ ماں تو بچپن ہی کی قبرستان کی باسی بن چکی ہے ... یہ سوچ کر ان کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے ... سہیلیاں ان کو دلاسا دے رہی تھیں اور سمجھا رہی تھیں کہ ایسے موقعہ پر یہ رونا دھونا اچھا نہیں ہوتا ... ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ بچیوں کے باپ چوہدری اسلم کے رونے کی آواز اندر آئی ... لڑکیوں کا دھیان فوری بدنصیب مرحوم ماں سے ہٹ کر باپ کی طرف چلا گیا ... ان کا کلیجہ کٹ کر رہ گیا ... کہ ہمارے باپ کے رونے اور چیخنے کی آواز کیوں آئی؟ فوراً تمام عورتوں کو خاموش کروایا اور وہ باہر شامیانوں سے آنے والی گفتگو کان لگا کر سننے لگیں۔

ان کا باپ چوہدری اسلم گڑگڑا کر چوہدری یوسف سے مخاطب تھا: چوہدری یہ ظلم مت کرو! اب تو میری دونوں بچیوں کا تمہارے بیٹوں کے ساتھ نکاح بھی ہو چکا ہے' اب ان بے چاریوں ... کو چھوڑ کر نہ جاؤ' ان کو ڈولی میں بٹھا کر اپنے گھر لے جاؤ، یہ تمہارا مجھ پر احسان ہوگا۔ اگر تو آج نکاح کر کے گھنٹے بعد ہی نکاح فسخ کر کے ان کو چھوڑ جاتا ہے تو میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں گا۔ میری بچیاں اس صدمے سے جی نہ پائیں گی۔ اللہ کے لیے کچھ رحم کرو۔ لو! یہ میری چودھراہٹ کی عزت' میری پگڑی میں نے تمہارے قدموں میں رکھ دی ہے' ایک چوہدری ہونے کے ناتے اس کی ہی لاج رکھ لو اور میری بچیاں چھوڑ کر

نہ جاؤ' یہ لو میں تمہارے پاؤں پڑتا ہوں' تمہارے پاؤں کو چھوتا ہوں ..... میری بچیوں پر یہ ظلم نہ کرنا' ان کو یوں داغدار نہ کرنا ..... کچھ دیر بعد چوہدری یوسف کی گرجدار اور غصے بھری آواز آئی: ہم نے جہیز کا سامان دیکھا تو ہمیں پتا چلا کہ تم انسان کی بچی نہیں بلی کی بچی رخصت کر رہے ہو' یہ دیکھ کر تیری اوقات معلوم ہوئی کہ تم اصل میں بے غیرت اور کنجر انسان ہو اور بنے چوہدری پھرتے ہو' تجھے تو بوڑھا ہو کر بھی پتا نہیں چلا کہ جہیز کیا چیز ہوتی ہے اور لڑکیوں کو کس انداز سے رخصت کیا جاتا ہے؟ میں چوہدری تھا' سمجھا چوہدری سے رشتہ کروں گا تو میری پگ کو مزید عزت ملے گی لیکن اب مجھے پتا چلا ہے کہ تمہارے ساتھ رشتہ کرنے کے بعد تو میں کسی کو منہ دکھانے کے بھی قابل نہ رہوں گا۔ کان کھول کر سن لو! اگرچہ نکاح ہو چکا ہے لیکن میں تیری بچیوں کو لے کر ہرگز نہ جاؤں گا' میں اپنے بچوں کا کہیں اور رشتہ کرلوں گا۔ اتنے سستے معمولی بیٹے نہیں ہیں میرے۔ اگر میں تمہاری باتوں میں آ کر ان کو لے بھی گیا تو جب لوگ جہیز دیکھنے آئیں گے اور وری (بری) کی نمائش کا مطالبہ کریں گے تو بتا! میں ان کو کیا جواب دوں گا اور کیا منہ دکھاؤں گا!؟؟ کہ چوہدری کا کس کمی کمین سے واسطہ پڑا ہے؟ لوگ کیا کیا باتیں بنائیں گے ہمارے متعلق؟

یہ گفتگو سن کر بچیوں کے ہوش اڑ گئے۔ دل بیٹھتے اور سانسیں رکتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ ایسے محسوس ہوا کہ یکدم ہوا ختم ہو گئی ہے اور ابھی وہ گھٹ کر مر جائیں گی ..... چھوٹی بہن عابدہ کے منہ سے حیرانی کے عالم میں صرف اتنا نکلا: باجی کلثوم یہ کیا ہے؟ پھر ان کی قوت سماعت سے آواز ٹکرائی' ان کا چوہدری باپ دوبارہ گڑگڑا رہا تھا اور کہہ رہا تھا: چوہدری میں تمہارے پاؤں پڑتا ہوں اور ایک بار پھر اپنی پگ تمہارے قدموں میں رکھتا ہوں' میں صرف تم سے اپنی بچیوں کی خوشیوں کی بھیک مانگتا ہوں' ان کو چھوڑ کر نہ جاؤ' بلکہ اپنے ساتھ ہی دلہن بنا کر لے جاؤ' دیکھ چوہدری! ان بیچاریوں نے آج تک کوئی خوشی نہیں دیکھی' محرومیاں ہی دیکھی ہیں' اس لئے کہ بچپن ہی میں ان کی ماں ان کو چھوڑ کر دوسرے جہان چلی گئی تھی' میں نے ماں اور باپ بن کر ان کو پالا ہے کہ جب ان کے گھر بس جائیں گے تو میں بھی سکون سے ان

کی ماں کے پاس چلا جاؤں گا۔ مجھے کوئی پریشانی نہ ہوگی۔ بس میری اتنی درخواست مان لے کہ میری ان لاڈ پیار اور شفقت کی بھوکی بچیوں کو چھوڑ کر نہ جانا..... رہی جہیز کی بات تو میں اپنی تھوڑی سی زمین بیچ کر مزید بنا دوں گا' کیونکہ مجھے دنیا کی ہر چیز سے یہ کلیاں زیادہ عزیز ہیں' ان کی مسکراہٹوں کے لیے مجھے اپنا آپ بھی بیچنا پڑا یا فنا کرنا پڑا تو پیچھے نہ ہٹوں گا۔ پتھروں کو پگھلا دینے والی' جذبات سے معمور اس گفتگو سے چاہیے تھا کہ چوہدری یوسف کا دل نرم ہو جاتا' وہ اپنے فیصلہ میں تبدیلی کر لیتا' بچیوں کے سروں پر باپ کی حیثیت سے ہاتھ رکھتا ..... لیکن وہاں کیا تھا..... چوہدری ایک اعلان کر رہا تھا..... باراتیوں اور اپنے دلہا بنے بیٹوں کو مخاطب کر کے کہہ رہا تھا کہ اپنا سامان اٹھاؤ اور فوراً گاؤں واپس چلو!..... جبکہ بچیوں کا باپ ہاتھ باندھے روتا جا رہا تھا..... اپنے شفیق باپ کی یہ بے عزتی، توہین، تحقیر اور تذلیل دیکھ کر دونوں دلہنوں کے دل چھلنی ہو گئے' دل و دماغ میں آندھیاں اور طوفان اٹھ آئے..... آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا..... ہاتھ پاؤں شدت جذبات سے شل ہو گئے، آنکھیں پتھرا گئیں..... اور دماغ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ابھی پھٹ پڑے گا.....

اچانک..... وضع دار چوہدری کی دلہن بنی سرخ جوڑا پہنے بڑی بیٹی کلثوم..... اٹھی اور بجلی کی سی تیزی سے الماری سے خنجر نکال لائی..... اور چھوٹی دلہن عابدہ کے پاس آ کر آنکھوں میں آنسو بھر کر کہنے لگی: ''اچھا گڑیا! اللہ حافظ! میں امی جان کے پاس جا رہی ہوں' وہیں ملاقات ہوگی''..... اور پھر..... ہاتھ اوپر اٹھا..... نیچے آیا..... اور خنجر سمیت..... سیدھا سینے کی پسلیاں کاٹتے ہوئے..... اندر گھس گیا۔ خون کا فوارہ ابلا..... چیخیں بلند ہوئیں..... چند لمحات کی دلہن..... اپنے سرخ سرخ خون سے سرخ جوڑے کو مزید سرخ کرتی ہوئی زمین پر دھڑام سے آ رہی..... عورتیں چیختی ہوئی باہر بھاگیں' ایک ہی سانس میں باپ کو ساری بات بتا دی' چوہدری ننگے پاؤں' ننگے سر بھاگتے ہوئے زنان خانے پہنچا..... کیا دیکھتا ہے کہ اس کے دل کا ٹکڑا کٹا پڑا ہے ''ہائے بیٹی! یہ تو نے کیا کیا؟'' کہتے ہوئے اس کا سر اپنی گود میں رکھا..... دھاڑیں مارتے ہوئے اپنی بیٹی کو چومنے لگا۔ اچانک کلثوم نے نحیف سی آواز نکالی: بابا جان!

اور آنکھیں کھول دیں اور وہ آہستہ آہستہ اپنے ہونٹوں کو جنبش دینے کی کوشش کرنے لگی، لکڑی بنی زبان کو تر کر کے بولی:

بابا جان!...... ہم نے سوچا تھا کہ جس گھر میں دلہن بن کر جائیں گے' کچھ ایسے انداز سے زندگی بسر کریں گے کہ..... آپ کی عزت وتوقیر کو چار چاند لگ جائیں لیکن بابا! ہم نہ تیرے گھر پیدا ہوتیں اور نہ یہ دن آپ کو دیکھنا پڑتا...... اور نہ ذلتیں اٹھانی پڑتیں...... یہ سب کچھ ہماری وجہ سے ہوا...... کہ آپ کی پگڑی زمین پر جوتوں پر رکھی گئی اور...... اسے حقارت سے ٹھوکریں ماری گئیں...... ' اس کے مجرم ہم ہیں' اس کی قصوروار ہم ہی تو ہیں کہ جن کی وجہ سے بابا زمانے میں بنی ہوئی اپنی عزت اور شان وشوکت کی عظیم الشان عمارت کو بھی تو قائم نہ رکھ سکا...... وہ ریزہ ریزہ اور ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی، چونکہ اس ذلت بھرے سانحے کی ذمہ دار ہم ہیں' اس لئے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ مجھے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں' میں آپ کے لیے مزید ذلت ورسوائی کا باعث نہیں بننا چاہتی تھی اس لیے میں نے اپنی پیاری امی جان کے پاس جانے کا فیصلہ کیا ہے۔ اب میں وہاں جا کر اپنی ماں سے پیار لوں گی' اپنی شفقت کی پیاس بجھاؤں گی۔

نہیں میری لاڈلی! میری دلہن بیٹی! اس طرح تو تو حرام موت مر جائے گی۔ میں تجھے کہاں ڈھونڈوں گا؟ ابھی ڈاکٹر کو بلواتا ہوں۔ چند لمحات بعد دلہن رخصت ہوگئی۔ باپ کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا' دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ غصہ' انتقام اور جوش غالب آ گیا...... پھر اس نے بندوق نکال لی...... اور اپنی چھوٹی بیٹی عابدہ...... دلہن کے لباس میں سرخ جوڑے میں ملبوس چند لمحات قبل بننے والی دلہن کی طرف تان دی...... بیٹی نے مہندی لگے اور چوڑیاں پہنے ہاتھ بے یقینی میں فوراً اوپر اٹھائے اور ابھی اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ: بابا جان یہ......!! کہ اتنی دیر میں سنسناتی گولی بیرل سے نکلی اور پھر وہ مہندی لگے ہاتھوں کی چوڑیاں توڑتے ہوئے سر میں پیوست ہوگئی۔ بدنصیب دلہن مستقبل کے سہانے سپنے سمیت

زمین بوس ہوگئی اور چوہدری کی آنکھوں پر خون سوار ہوگیا۔ اس نے کہا او میری بیٹی کی خوشیوں کے دشمنو! میری بچیوں کے قاتلو! ٹھہرو! میں اب تجھے وہ کچھ دے کر بھیجتا ہوں کہ جس کا تم لوگوں نے کبھی گمان بھی نہ کیا ہوگا۔ پھر وہ گھر سے باہر نکلا اور سیدھا شامیانوں اور جہاں بارات ٹھہری تھی وہاں پہنچا' لڑکوں کا باپ چوہدری اپنے بیٹوں سمیت وہاں گردن اکڑائے کھڑا واپسی کی تیاریوں کی نگرانی کر رہا تھا۔ اتنے میں چوہدری اسلم نے بندوق اس کی کنپٹی پر رکھی اور اسے وہیں ڈھیر کر دیا' پھر وہ اس کے لڑکوں کی طرف یہ کہتے ہوئے بڑھا کہ تم میرے ہونے والے داماد تھے' میں تمہارا باپ تھا' تم اسے اپنی طرف سے مطمئن کر کے نہ روک سکے بلکہ تم بھی باپ کے ساتھ نخوت و تکبر کا بت بن کر تماشا دیکھتے رہے' ایک دفعہ بھی باپ کو نہ روکا اور جہیز کے لالچ میں دنیا کے سامنے میری ذلت کا تماشا دیکھتے رہے حتیٰ کہ میری بیٹیاں کٹ گئیں..... پھر اس نے ان دونوں کو بھی گولیوں سے بھون ڈالا..... اور اب!

جہاں بجتی ہیں شہنائیاں
وہاں ماتم بھی ہوتے ہیں

کے مصداق پانچ لاشیں پڑی تھیں' جو بیٹیوں کے باپ کی مظلومیت اور غلط رسموں کا نوحہ کرتے ہوئے بچیوں کے باپ کی اس چیخ پکار کی نشاندہی کر رہی تھیں بقول باپ کہ اگر انہوں نے میرے گھر کو برباد کر دیا تو میں ان کا گھر بھی تباہ کر کے رہوں گا۔

پھر بابا نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا: بیٹا! یہ ہے میری بربادیوں کی داستان' ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے اپنی بچیوں کی لاڈلی پیاری شکلیں گھومتی رہتی ہیں۔ ان کی یاد مجھے تڑپاتی ہے' ستاتی ہے' رلاتی ہے' دل چاہتا ہے کہ وہ صرف ایک دفعہ آ کر کوئی بات کریں' اپنی چہکار سنائیں' ماضی کی طرح چھوٹی بڑی کی اور بڑی چھوٹی کی شکایت لگائے' مجھ سے مطالبہ کریں' مجھ سے ناراض ہوں' میں ان کو مناؤں' میں ناراض ہوں تو وہ میرے پاؤں دبا کر اور ہنسا کر..... گلے میں معصومیت سے بازو ڈال کر..... مسکراتی شرارتی آنکھوں سے

دیکھ کر" جانے دیں بابا' اب بس بھی کریں' بہت ہوگئی ناراضی' اب مان بھی جائیں ... نہیں تو ہم آپ سے روٹھ جائیں گی" کہہ کر منائیں ... اور میں خوش ہو جاؤں' مان جاؤں کہ کہیں واقعی روٹھ نہ جائیں ... لیکن ... اب تو روٹھ گئے ہیں دن بہار کے ... لمحات خوشیوں کے ... اور اب میری بیٹیاں بھی ہمیشہ کے لیے روٹھ چکی ہیں ... تو ایسے حالات میں میں نہ مر رہا ہوں نہ جی رہا ہوں۔ اپنی بچیوں کی یاد میں روؤں نہ تو اور کیا کروں؟ رشتہ دار تو کوئی تھا نہیں، برادری نے بھی میری نہ تو کبھی خبر لی ہے اور نہ کسی نے جیل آنے کے بعد میرے کیس کی پیروی کی۔ اب یہ آنسو، یہ سسکیاں اور یہ آہیں جو ان نہ بن سکنے والی دلہنوں کے لیے نکلتی ہیں' یہی میرا اوڑھنا بچھونا ہے۔

اے جوان بیٹوں کے مالکو ... ! مقامِ غور ہے آپ کے لیے' اللہ نے امانت بنا کر بیٹے آپ کو دیے ... آپ نے شکر ادا کرنے کی بجائے ان کو مالِ تجارت بنا چھوڑا ... سوچیں! غور و فکر کریں۔ آپ کے ایسے غلط رویوں کی بنا پر کتنی بیٹیاں دلہن بننے سے پہلے ہی زندہ درگور ہو جاتی ہیں ... اور یہ بھی تو سوچیں کہ اللہ آپ کو بھی پیاری سی بیٹی دے کر آزمائش میں ڈال سکتا ہے ... اے بیٹوں کے والدین! ... اے قوم کی تقدیر کے مالک بننے والے حکمرانو! قائدین و لیڈرو! اے راہبرانِ ملک و ملت! ... ان بیچاریوں' دکھیاریوں اور قسمت کی ماریوں اور معاشرے کی دھتکاری کلیوں کی بھی سنیں ... یہ تمہارا گریبان پکڑ کر زبانِ حال سے یہ کہہ رہی ہیں کہ یہ رسم و رواج' پرم پرا' کلچر و ثقافت، تہذیب و تمدن کے یہ غیر شرعی اور غیر عقلی گورکھ دھندے تو آپ لوگوں نے چلا رکھے ہیں' بلکہ چلوا رکھے ہیں' اپنی حکومتی چھتری کے نیچے ... لیکن ہمیں یہ تو بتائیں کہ آخر ہمارا کیا قصور ہے؟ ہم نے کیا جرم کیا ہے؟ کسی کے گھر بطور بیٹی پیدا ہونے کا قصور ہم نے نہیں کیا' یہ اوپر والے کی دین ہے وہ جس کو جو چاہتا ہے دیتا ہے' پھر ظلم ہم پر ہی کیوں روا رکھا جا رہا ہے ... یہ ظلم ہم کب تک سہتی رہیں گی؟ ... آپ اپنی کرسی اور اپنی حکومتیں بچانے کے لیے دن چڑھنے سے قبل ہی قانون بنا دیتے ہیں اور سورج نکلنے کے بعد اس پر عمل درآمد کروا دیتے ہو ... لیکن آپ ہمیں

سولی پر چڑھتے اور لٹکتے ایک عرصہ سے دیکھتے چلے آرہے ہیں... ہماری آہیں، چیخیں، سسکیاں، نالے، فریادیں، التجائیں سن کر آپ لوگ کیوں ٹس سے مس نہیں ہوتے؟ کیا تمہارے سینوں میں گوشت پوست کا دھڑکنے والا دل نہیں... یا وہ پتھر کا بن چکا ہے کہ... جو اپنی بیٹیوں کا درد محسوس کرنے سے بھی قاصر ہے... ہمیں ہمارا قصور اور جرم کون بتائے گا؟ اور یہ سلسلہ کب تک چلتا رہے گا؟ کیا آپ نے ساری زندگی خدمت واطاعت کرنے والی بیٹیوں کی تابعداریوں اور وفاؤں کا یہی صلہ دیا ہے!!؟ جواب دیں!

معصوم مسکراہٹوں کے قاتل

یہ تقریباً دس سال پہلے کی بات ہے، میں اسلام آباد کے سرکاری ہسپتال میں ایک بیمار بھائی کی تیمارداری کے بعد پلٹ رہا تھا کہ وہیل چیئر پر بیٹھی ایک لڑکی کو دیکھا۔ لڑکی خوبصورت وصحت مند اور توانا تھی۔ ایک خاتون اس کی چیئر دھکیل رہی تھی اور اس پر بیٹھی لڑکی ...... پھٹی پھٹی ...... افسردہ ...... غمزدہ ...... اور اداس ...... نگاہوں سے آتے جاتے لوگوں کو دیکھ رہی تھی ...... ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اس پر ایک قیامت ٹوٹ چکی ہے ...... کہ جس کی بناء پر وہ ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئی ہے ...... اس سے اس کا دل کرچی کرچی اور دماغ صدمے سے اڑ چکا ہے...... میں نے ذرا غور سے اسے دیکھا تو میرے جسم کا رواں رواں کھڑا ہو گیا ...... اور میں کانپ اٹھا ...... اس لیے کہ اس کا سر پھٹا ہوا تھا ...... آنکھیں سوزش زدہ اور سرخ تھیں ...... ہونٹ کٹے ہوئے تھے ...... گالوں پر اور آنکھوں کے گرد گہری چوٹ سے نیلے حلقے پڑ چکے تھے۔ بعض جگہ پر جلد پھٹنے کی وجہ سے خون جسم پر جم چکا تھا ...... مجموعی طور پر چہرہ ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے جھلس چکا ہو ...... جسم پر جگہ جگہ شدید ضربوں کے نشانات تھے ...... بازو شل ہو کر وہیل چیئر کی سائیڈوں پر ڈھلکے ہوئے تھے ...... جبکہ ٹانگوں پر سفید سفید پٹیاں کس کر مضبوطی سے باندھ دی گئی تھیں ...... شاید ٹانگ کی ہڈی کو نقصان پہنچا ہو۔ زخمی ہونے والے جسم کے حصوں اور خون رسنے والے جسمانی اعضاء پر سرخ رنگ کا ٹنکچر لگایا گیا تھا ...... جو عجیب ہیبت ناک منظر پیش کر رہا تھا۔

میری حساس طبیعت یہ برداشت نہ کر سکی اور میں نے آگے بڑھ کر وہیل چیئر دھکیلنے والی ضعیف اماں جان کو جو شاید اس لڑکی کی والدہ تھیں، سے دریافت کر لیا: اماں جان! بہن کو

کیا ہوا ہے؟ اس کو یہ شدید چوٹیں کیسے آئی ہیں؟ اماں یہ سن کر تڑپ اٹھی اور میری آواز کا پیچھا کرتے ہوئے اس کی نظریں میرے چہرے پر آ کر ٹھہر گئیں' اس نے مجھے دیکھا' وہ وہیل چیئر دھکیلنا بھول گئی۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی:

''بیٹا! میری اس پھول سی بچی کو ایک درندے نے نوچ کھایا ہے'' اور پھر رونے لگی اور ٹپ ٹپ آنسو بہانے لگی۔ اس دوران لڑکی نے بڑی مشکل سے گردن کو ماں کی طرف موڑا اور نہایت تکلیف سے صرف اتنا کہہ پائی: اماں جان! صبر کریں ناں' آپ کو کچھ ہو گیا تو پھر مجھے کون پوچھے گا یہاں۔ !! میں دوبارہ گویا ہوا: اماں جان! میں سمجھ نہیں سکا' درندہ بہن کو کیسے نوچ گیا اور اس کا یہ قابل ترس حال کر گیا تو وہ دوبارہ سنبھل کر بولی: بیٹا۔ اس کی شادی ہوئے تھوڑی ہی دیر ہوئی ہے۔ اس کو اس کے خاوند نے ناراضی کی بنا پر مارا پیٹا ہے۔ اور اس کا یہ حشر کر دیا ہے۔ اگر ہم وقت پر پہنچ کر اسے ہسپتال نہ پہنچاتے تو یہ کبھی کی مر چکی ہوتی۔ یہ کہہ کر وہ پھر رونے لگی۔ میں سوچ میں پڑ گیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ جس نے بھی اس بہن کا یہ حال کیا ہے وہ واقعی ''درندہ'' ہی ہو سکتا ہے۔

میں اسلام آباد سے واپس گوجرانوالہ آ گیا اور اپنے ہوسٹل میں رہتے ہوئے مجھے ہر وقت یہی واقعہ غمگین کیے رکھتا کہ ایسے بھی لوگ ہیں اس جہاں میں!! ہم اپنے ہوسٹل کے قریب ایک کریانے والی دکان پر آتے جاتے رہتے تھے۔ وہاں ایک بھائی محمد شفیق دکان چلاتے تھے اور ہمارے کافی دوست بن چکے تھے۔ ان کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ ایک دن میں نے اچانک مذاق میں کہہ دیا کہ بھائی سناؤ کیسا رہا شادی کا تجربہ اور کیا بھابھی آپ کی طبیعت کے موافق ملی ہیں اور کیسی ہیں؟ وہ کہنے لگا: کچھ تو میری طبیعت کے موافق تھی' باقی میں نے خود کر لیا۔ بڑی چیز سمجھتی تھی اپنے آپ کو سیدھا کر کے رکھ دیا اس کو تیر کی طرح سیدھا کر دیا۔ میں نے کہا کہ بھئی وہ کوئی جلیبی تھوڑی تھی جس کو تم نے تیر کی طرح سیدھا کر دیا' کیا کہنا چاہتے ہو! صاف کہو میری سمجھ میں تمہاری بات ہرگز نہیں آئی۔ تو وہ بڑے فخر سے قمیص کا کالر سیدھا کر کے اپنا کارنامہ سنانے لگا' کہنے لگا: بڑے ناز اور نخرے

کرتی تھی، بڑی شو دکھاتی تھی، میری باتوں کو ہنسی میں اڑا دیتی تھی۔ میں نے سوچ لیا کہ کبھی موقعہ ہاتھ آیا تو تجھے سیدھا کروں گا۔

پچھلے ہی دنوں مجھے پتہ چلا کہ سب گھر والے ایک شادی پر جا رہے ہیں۔ میں گھر میں ہی رک گیا شادی پر نہ گیا۔ اس دوران میں نے پرین (بیلوں اور بھینسوں کو مارنے کے لیے استعمال ہونے والی لوہے کی کیل لگی سخت چھڑی) کو تیل لگا کر دیوار پر ٹانک دیا۔ تمام لوگ شادی پر چلے گئے، گھر میں، میں اور میری دلہن رہ گئے۔ میری دلہن قریبی لڑکیوں کے جامعہ سے گلاب کے پھول اور موتیے کی کلیاں اکٹھی کر کے لائی اور گھر میں پہنچ کر مہندی لگے ہاتھوں میں رکھ کر مجھے بڑے نخرے سے دکھانے لگی کہ میں یہ تمہارے لیے پیار کا تحفہ لائی ہوں، گلابوں کا اور کلیوں کا۔ میں نے آواز دی اور کہا: ان کو ایک طرف رکھو اور صحن سے میرے کمرے میں آؤ، جب وہ خراماں خراماں چلتی میرے پاس پہنچ گئی تو میں انگلی سے دیوار پر لٹکی پرین کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا: وہ دیکھ رہی ہو کیا ہے؟ کہنے لگی: ہاں! ڈنگروں (جانوروں) کو مارنے والا ڈنڈا ہے۔ میں نے کہا: ذرا اتار کر میرے پاس لاؤ نا اسے۔ ''اس وقت اس کی کیا ضرورت پڑ گئی ہے؟'' اس نے استفسار کیا۔ میں نے کہا: زیادہ بکواس نہ کرو اور فوراً اتار کر لاؤ۔ وہ فوری طور پر خاموشی و تیزی سے گئی اور ڈنڈا لا کر میرے حوالے کر دیا۔ ڈنڈا ہاتھ میں آتے ہی میں نے کہا: سیدھی ہو جاؤ اور پھر ایک دو تین چار ..... اور پھر چل سو چل، پرین برسنی شروع ہوگئی، کبھی سر میں، کبھی بازوؤں پر، کبھی ٹانگوں پاؤں اور کبھی ہاتھوں پر اور کبھی پورے زور سے کمر پر پرین تابڑ توڑ برس رہی تھی۔ وہ آگے سے پوچھتی جاتی تھی ''ہوا کیا ہے؟ مجھے کیوں مار رہے ہیں۔ میرا قصور کیا ہے، مجھے بھی تو پتہ چلے..... میری جان! بتاؤ تو سہی میں نے کیا قصور کیا ہے؟ میں اس کی معافی مانگ لیتی ہوں..... پھر تھوڑی دیر ہی مار پڑی تھی کہ ہاتھ جوڑنے لگی..... پاؤں کو ہاتھ لگانے لگی..... مجھے معاف کردو سرتاج میری خطا بتادو، میں پاؤں پڑ کر معافی مانگ لیتی ہوں۔ آئندہ ایسا نہ کروں گی۔ مگر مجھے کچھ بتاؤ تو سہی کہ میرا جرم کیا ہے؟ میں اللہ کا واسطہ دیتی ہوں مجھے

مت مارو" ... سب شادی پر جا چکے تھے اس لیے کوئی چھڑانے والا بھی نہ تھا ... اور پھر میں نے .... اس کو خوب ... پھینٹی لگائی ... چرخے کے تکلے کی طرح ... بلکہ تیر کی طرح سیدھا کر کے رکھ دیا ... وہ دن ہے اور آج کا دن ... یہ خاموش رہتی ہے .... نازنخرے ختم ہو چکے ہیں ... بالکل سیدھی ہو گئی ہے بلکہ اب تو مجھے زبان سے کچھ کہنا نہیں پڑتا ... میں صرف آنکھ کا اشارہ کرتا ہوں جسے وہ سمجھتی ہے اور فوری اس پر عمل کرتی ہے ...

وہ بولے جا رہا تھا ... اللہ جانے بعد میں اس نے کیا کیا کہا ... لیکن اس کی اتنی بات سن کر ہی میرے حواس کام کرنا چھوڑ گئے تھے۔ میری قوت سماعت جواب دے چکی تھی۔ قوت گویائی سلب اور روح کانپ رہی تھی۔ دل تھا کہ شدت جذبات سے سینہ پھاڑ کر باہر نکل آنا چاہتا تھا۔ دماغ سن (ماؤف) تھا۔ پھر بھی یہ سوچ رہا تھا کہ انا کی تسکین کے لیے جہالت کے رسیا لوگ وحشی درندے بن کر کیا سے کیا کر جاتے ہیں۔

اس جہاں میں صنف نازک تو حسین وجمیل کائنات کی رنگ و بو ہے ... اس جہان کی رونق، دلکشی اور دلربائی تو اسی کے دم سے زندہ ہے ... اس کی مسکراہٹیں کائنات کا حسن ہیں کہ کلیاں جس سے چٹخنے کا سلیقہ سیکھتی ہیں، غزال جس سے چوکڑیاں بھرنا سیکھتے ہیں، دریاؤں اور سمندروں کی روانی جس سے پرسکون انداز میں بہنا سیکھتی ہے ... صنف نازک تو وہ پھول ہیں کہ جن کو تیز دھوپ سے بچانا بھی ضروری ہے ... یہ تو وہ (قواریر) آبگینے ہیں کہ بدی خواں کی ذرہ برابر غفلت کی بنا پر اور کاروان کی ذرا سی تیز رفتاری سے جن کے ٹوٹنے کا خدشہ ہمیشہ لگا رہتا ہے ... یہ تو سیپ میں بند وہ موتی ہیں کہ جن کی قدر جوہری کی قدر کی طرح کی جاتی ہے ... کہ یہ موتی خود بھی روشن ہوتے ہیں اور اپنے گردونواح کو بھی روشن و تاباں کر دیتے ہیں۔ یہ تو پہلی رات کا چاند ہے کہ جس کی روشنی ہر روز پہلے سے زیادہ ہوتی جاتی ہے اور عالم کو بقعہ نور کرتی چلی جاتی ہے۔

ایسے پھولوں سے خوشبوؤں کی چھینیں لے اور پھر ان کو مسل دے ... ایسی کرنوں

سے روشنی حاصل کرے اور پھر ان کو بجھانے کے درپے ہو ایسے موتیوں اور ہیروں کی قدر کرنے کی بجائے ان کو توڑ دیا جائے یہ کہاں کا انصاف ہے کہاں کی عقلمندی اور دانش مندی ہے۔

اے میرے بھائی' نادان و جاہل بھائی! کبھی تو نے غور کیا ہے کہ یہ مظلومہ سارا ظلم سہہ کر بھی لبوں پہ قفل خاموشی لگائے رہتی ہیں تو کیوں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر دوسروں کو تمہاری اس حرکت اور تمہاری اصلیت کے متعلق بتائے گی تو یوں اس کے سرتاج اور دل کے سہارے کی عزت میں فرق آئے گا۔ وہ اپنی عزت تو گنوا یتی ہے لیکن تمہارے وقار پر ذرہ برابر حرف نہیں آنے دیتی۔ اس لیے جس بہن کو ایک دفعہ اپنے جیون ساتھی سے مار پڑ جائے وہ کبھی خاندان کی دوسری عورتوں کے درمیان سر اٹھا کر چلنے کے قابل نہیں رہتی۔ یہی حال مرد کا بھی برادری میں ہوتا ہے۔ عورت خود ظلم سہتی جاتی ہے تمہارے ظلم و جبر اور دغا و بے وفائی کی بنا پر اور دل پر شدید چپہ کے لگانے کی بنا پر درد کی کسک سے ''سی'' تک نہیں کرتی۔ یاد رکھ! اگر یہ کسی معاملہ میں تیرے خیال کے مطابق ٹیڑھی ہے تو پھر یہ قوت بازو سے کبھی سیدھی نہ ہو سکے گی یہی ہمارے آقا ﷺ کا فرمان اور ہدایت ہے۔ تجھے اس قدر زور لگانے کی ضرورت ہی نہیں۔ اس کا حل تو بہت آسان ہے اس کو تو بس ذرہ سی پیار کی آنچ چاہیے نگاہ ناز کا مسکراتا ہوا اشارہ چاہیے پیار و محبت کی تھوڑی سی خوشبو چاہیے کہ جس میں یہ مدہوش ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ:

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر

ایسے بھائی جو صرف اپنے مرد ہونے کے نشے میں عورتوں پر ظلم کرتے ہیں' اللہ کے غصے سے ڈر جائیں کیونکہ مظلوم کی آہ اللہ کے دربار میں فوری سنی جاتی ہے۔ عورت اس لیے بھی خاموش رہتی ہے کہ اللہ نے تجھے اس پر حکمرانی کا حق دیا ہے۔ اب تو اس کا غلط استعمال کرتے ہوئے اسے طلاق کے چھرے سے ذبح کرنے کی دھمکی دیتا رہتا ہے اور وہ مظلوم سہمی ہوئی تمہارا ظلم سہنے پر مجبور ہوتی ہے۔ میرا ایک دوست بتایا کرتا تھا کہ جب میری

بیوی ذرا سی بھی چوں چرا کرتی ہے تو میں اسے سنا دیتا ہوں مجھے باب طلق یطلق بھی آتا ہے (یعنی خاموش ہو جاؤ ورنہ تجھے طلاق دے دوں گا)

اپنی بیویوں پر ظلم کرنے والو! اپنی بیٹیوں کہ جن کو پھول کی پنکھڑیوں کی طرح نرم نازک سمجھتے اور پالتے پوستے ہو پر بھی ظلم کرنے سے رک جاؤ۔ اس لیے کہ کسی دوسرے کی بیٹی یعنی آپ کی بیوی پر ظلم حقیقت میں آپ کی اپنی بیٹی پر ظلم کا باعث بن جاتا ہے۔ اس لیے کہ مکافات عمل کے تحت جب ان کی بچیاں بیاہ کر دوسرے گھر جاتی ہیں اور ان کو تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے تو اس وقت ایسے باپ کا دل مٹھی میں آ جاتا ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی بچیاں رانی بن کر سکون و چین سے دوسرے گھر میں راج کر سکیں تو آج ہی اپنی شریک حیات' جیون ساتھی پر ہاتھ اٹھاتے وقت غور کر لیں کہ کہیں آپ کے ان گناہوں کی سزا آپ کی اولاد کو تو نہ بھگتنا پڑے گی!!!؟؟

آخری پیپسی

''رک جائیے بھائی جان!'' مانوس آواز میں یہ جملہ سن کر ٹھنڈے مشروب کی جانب بڑھتا ہوا میرا ہاتھ رک گیا۔ یہ انارکلی لاہور کا بازار تھا۔ میں نے دفعتہً پیچھے مڑ کر دیکھا، میرے سامنے میرا بہترین دوست عرفان صدیقی کھڑا مسکرا رہا تھا۔

یہ کیا انداز تخاطب ہوا؟ نہ سلام نہ دعا، نہ مصافحہ نہ معانقہ، ''رک جائیے!'' بھئی اس شدید گرمی میں اس قدر شدت کی پیاس محسوس ہو رہی ہے، اسی بنا پر میں یہ ٹھنڈی بوتل اپنے جلے بھنے اور خشک حلق سے اتارنے ہی والا تھا کہ تم نے ''رک جائیے! رک جائیے!'' کی رٹ لگا دی۔ عرفان نے حیرانی سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا: ''آپ کو واقعی کچھ معلوم نہیں؟'' ''بھئی کس چیز کے متعلق؟ کچھ پتا بھی تو چلے؟'' میں نے پیشانی سے پسینا صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''اس بوتل کے متعلق جو آپ نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ہے، میری مراد ''پیپسی کولا'' کی بوتل ہے۔'' میں نے بوتل کو گھور کر دیکھتے ہوئے کہا: ''نہیں تو، مجھے کچھ معلوم نہیں! '' عرفان کہنے لگا: ''تو میں بتاتا ہوں۔''

میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کاٹ دی اور کہا: ''ٹھہرو! میرے پیٹ میں آگ لگی ہے، پہلے مجھے بوتل پی لینے دو پھر تسلی سے بات کریں گے۔'' عرفان کو جیسے کرنٹ لگا، فوراً کہنے لگا: ''نہیں نہیں! ایسا نہ کرنا...... اور پھر پاس پڑے کولر سے ٹھنڈے پانی کا گلاس بھر کے مجھے دیتے ہوئے کہنے لگا: ''یہ لو پیو'' اور ساتھ ہی بوتل میرے ہاتھ سے لے کر ایک طرف رکھ دی، پانی پینے کے بعد میں نے کہا: ''ہاں اب بتاؤ! میں کیا نہیں جانتا جو تم

جانتے ہو، ذرا مجھے بھی تو پتا چلے۔" وہ کہنے لگا: "نقاش بھائی! اس پیپسی کولا میں خنزیر کے جسم کے اجزاء کا محلول ڈالا جاتا ہے کہ جس کو تم ابھی ابھی غٹا غٹ پینے والے تھے۔" میں حیرانی سے اچھلا! ایسا نہیں ہوسکتا، تم ہوش میں تو ہو، تم جانتے ہو کہ کیا کہہ رہے ہو؟ اتنا تو مجھے بھی علم ہے کہ اس میں الکوحل ملایا جاتا ہے' لیکن خنزیر کے اجزاء کی بات کس دلیل کی بنا پر کہہ سکتے ہو؟ ایسا نہیں ہوسکتا، میں کہتا چلا گیا۔ عرفان جواب میں کچھ نہ بولا' بلکہ اس نے اپنے بیگ سے ایک کتاب کھول کر میرے سامنے رکھ دی اور ایک جگہ انگلی رکھ کر کہنے لگا: "مجھے پتا تھا تم نہیں مانو گے، لو خود ہی پڑھ لو۔" یہ کتاب 'المورد 1989ء' عالم عرب کی مشہور عربی انگلش ڈکشنری تھی، اس کا صفحہ نمبر 672 میرے سامنے کھلا پڑا تھا جس پر یہ عبارت غیرت مند مسلمانوں کو جھنجھوڑ رہی تھی:

البیبسین Pepsin

خَمِيْرَةُ الهَضْمِ فِي المِعْدَةِ (تَحُوْلُ البَرُوْتِينَ اِلَى بِبتُوْنَ) مُسْتَحْضَرٌ مُحْتَوٍ عَلى بَبسِينٍ مُسْتَخْرجٌ مِنْ مِعْدَةِ الخَنزِيْرِ خَصُوصًا وَيُسْتَعْمَلُ لِتَسهِيلِ الهَضْمِ (المورد دار العلوم الملايين)

"پیپسن ایسا مادہ ہے جو خاص طور پر خنزیر کے معدہ سے نکالا جاتا ہے اور جلد ہاضمہ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔"

عرفان جو مجھے غور سے دیکھ رہا تھا، بولا: کچھ آئی بات سمجھ میں؟ اسی بنا پر میں آپ کو یہودیوں کا یہ مشروب پیپسی پینے سے روک رہا تھا' کہ بھائی جان رک جایئے، آپ نے مشاہدہ کیا ہوگا کہ پیٹ بھر کر گوشت یا کھانا کھالیں اور اوپر سے ایک دو پیپسی پی لیں' سب کچھ ڈکار کے ساتھ ہضم ہو جاتا ہے۔ یہ اسی پیپسن مادے کا کمال ہے جو خنزیر کے معدے سے اخذ کیا جاتا ہے اور پھر اس مشروب میں ملا دیا جاتا ہے۔ ذرا غور کریں کہ ان بدبختوں نے اسی غلیظ مادے Pepsin کے نام پر ہی اس مشروب کا نام بھی پیپسی

Pepsi رکھ دیا ہے۔

سؤر کے معدے اور اس کی جھلی سے حاصل کردہ یہ مادہ حد درجہ ہاضم ہوتا ہے۔ اس کا ثبوت آپ کو ہمارے ہاں پائے جانے والے مرغ کی پوٹ پر جو جھلی ہے' جس کو پوٹ سے علیحدہ کر کے پھینک دیا جاتا ہے، سے ملے گا۔ اس جھلی کو اگر دھو کر خشک کر کے پیس کر ڈبیہ میں بند کر کے رکھ لیا جائے اور بوقت ضرورت ایک آدھ چمچ پھانک لیا جائے تو آپ دیکھیں گے کہ یہ کس زبردست حد تک ہاضم ہے۔ اس کو سنگ دانہ مرغ بھی کہتے ہیں، جو حکیموں کی دکانوں پر فروخت ہوتا ہے اور حکیم و طبیب حضرات اسے دواؤں میں استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح ہمدرد کا ایک مشہور ہاضم سفوف معجون سنگ دانہ مرغ ہے، جو قوت ہاضمہ بڑھانے کے لیے ہے۔ اس سے ہزار گنا بڑھ کر ہاضمی قوت خنزیر سے حاصل کیے جانے والے اس مادے PEPSIN میں پائی جاتی ہے۔ جو پیپسی کا اصل اور لازمی جزو' بلکہ پیپسی کی جان ہے اور نیو یارک سے ہر ملک کی پیپسی کولا کی فیکٹری میں محلول کی صورت میں ٹین کے مضبوط ڈبوں میں بھیجا جاتا ہے' ہر ملک میں باقی سب مراحل مقامی فیکٹری میں انجام پذیر ہوتے ہیں' بس یہ فارمولا باہر سے بھیجا جاتا ہے' جو بوتلوں میں ملا دیا جاتا ہے۔ پھر اس فارمولے کے صحیح استعمال کو باقاعدہ انسپکٹر آ کر چیک کرتے ہیں کہ کہیں کوئی گڑ بڑ تو نہیں؟ ہمارے بیجھے گئے فارمولے سے اتنی ہی بوتلیں تیار کی جا رہی ہیں کہ جتنی طے شدہ مقدار کے مطابق ہے یا کہ زیادہ۔ یعنی بوتلیں زیادہ بھری جائیں اور ہمیں کم کی رپورٹ دی جائے۔

بھائی جان! آپ کو معلوم ہے خنزیر ایک بے شرم بے حیا اور بے غیرت جانور ہے۔ قرآن پاک میں بھی اس کا ذکر مذمت کے پیرائے میں آیا ہے اور اس کو حرام قرار دیا گیا ہے، خنزیر ملے مشروبات و ماکولات کے وسیع استعمال کا نتیجہ ہے کہ آج امت مسلمہ سے حیا غیرت، حمیت رخصت ہوتی جا رہی ہے۔ جہاد کی جگہ جمود نے لے لی ہے۔ ایسے ہی خنزیری مشروبات و ماکولات کا نتیجہ ہے کہ مہلک بیماریاں بنی نوع انسان پر حملہ آور ہو چکی ہیں۔ ان

کی صحت خراب، معدے تباہ، افکار پراگندہ ہیں۔ وھن اور بزدلی ان پر چھائی ہوئی، دین سے دوری، مغربی تہذیب سے محبت، حلال رزق کے لیے جستجو اور تگ و دوختم ہو چکی ہے۔ باہمی اخوت ومحبت اور بھائی چارے کے جذبات سرد پڑ چکے ہیں۔ دیکھیں ناں افغانستان میں آ کر صلیبی اور یہودی اللہ کے دشمن مسلمانوں کو کس بے دردی سے ظلم و سربریت اور درندگی کا نشانہ بنا رہے ہیں' لیکن ہمارے معمولات میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ہم اتنے بے حس ہو چکے ہیں کہ ان مظلوموں کے حق میں آواز جہاد بھی بلند نہیں کر سکتے۔ دیکھیں اگر محلے کے دکاندار سے لین دین کے معاملے میں ہمارا جھگڑا ہو جائے تو ہم کیا کرتے ہیں؟ یہی نا کہ اس سے سودا سلف لینا بند کر دیتے ہیں۔ اگر ان یہودی وصلیبی مصنوعات میں یہ مضر صحت اور غلیظ چیزوں کی ملاوٹ نہ بھی ہوتی تو بھی ہم کم از کم یہ تو کر سکتے تھے کہ ان کو خریدنا بند کر دیتے۔ اس لیے کہ ہم ہی ان ظالموں کی اشیاء خرید کر ڈھیروں منافع فراہم کر کے ان کو معاشی طور پر مضبوط کرتے ہیں اور وہ اس پیسہ سے اسلحہ بارود ٹینک، توپ، جہاز، ہیلی کاپٹر اور میزائل بنا کر ہم مسلمانوں ہی پر چلاتے ہیں۔ یہ ظلم ساری دنیا میں جاری ہے۔ اب تو سعودیہ نے بھی کوکا کولا اور پیپسی کے ساتھ ساتھ ایران سے زم زم کولا منگوانا شروع کر دیا ہے۔ جب ہم یہودیوں کی اشیاء خرید کر ان کو سرمایہ فراہم کرتے ہیں تو گویا ہم ان کی قبلہ اول بیت المقدس، فلسطین، چیچنیا، عراق کشمیر، آسام وغیرہ کے مسلمانوں پر نہ صرف ظلم کرنے میں مدد کرتے ہیں بلکہ ہم نے انھیں ان ظالموں کے حوالے کر دیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، وہ نہ خود اس پر ظلم کرے اور نہ ظلم کرنے کے لیے اسے کسی دوسرے کے حوالے کرے۔'' (صحیح بخاری)

ہم دنیا بھر کے مظلوم مسلمانوں کو اس طرح یہودیوں صلیبیوں کے حوالے کر رہے ہیں ہم ان کی اس قدر مصنوعات خریدتے ہیں کہ جس سے وہ بے انتہا منافع کماتے ہیں۔ اس کا اندازہ اس سے لگائیں کہ صرف پیپسی کولا اور کوکا کولا کمپنی سالانہ دس ارب ڈالر امداد اسرائیل

کو دیتی ہے۔

اب آپ خود فیصلہ کرلیں کہ ایک طرف اللہ کریم کا نام لینے والے اور محمد عربی ﷺ کا کلمہ پڑھنے والے مظلوم و مقہور مسلمان ہیں اور دوسری طرف ظالم، جابر، سازشی، یہودی اور صلیبی ہیں...... آپ نے کن سے تعاون کرنا ہے؟ کن کو مضبوط کرنا ہے؟...... کن کا ساتھ دینا ہے؟ میں نے یہ تمام ہوش ربا معلومات و ایمانی جذبات سن کر بھری بوتل کریٹ میں رکھ دی اور دکاندار کو پیسے ادا کر کے سوچوں میں غرق' پلٹنے ہی والا تھا کہ ایک آدمی جو پیپسی کی بوتل تھامے عرفان کی سحر انگیز اور ایمان افروز' سچی تڑپ پر مبنی گفتگو سنتے ہوئے اپنی بوتل پینا بھولا ہوا تھا، عرفان سے مخاطب ہو کر کہنے لگا: بھائی جان! میں نے آپ کی باتیں سنیں اور وہ میرے دل کی گہرائیوں میں اتر گئیں، اب میں نے بھی فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ کبھی یہودی مشروبات و ماکولات نہ خریدوں گا...... بس یہ پیپسی کی بوتل میری زندگی کی ''آخری پیپسی'' ہے، اس کے بعد کبھی بھول کر بھی نہ پیوں گا' بلکہ دوسروں کو بھی روکوں گا...... عرفان بھائی رک گئے اور اس کی بات کاٹ کر کہنے لگے: جب شراب کی ممانعت کا حکم نازل ہوا، گلیوں، بازاروں میں آواز لگانے والے رسول اللہ ﷺ کے قاصد نے با آواز بلند صدا لگائی کہ آج سے شراب کو اللہ تعالیٰ نے منع فرما دیا ہے' کسی نے یہ نہیں کہا کہ یہ پیالہ، یہ گلاس، یہ گھونٹ میرا آخری گھونٹ ہے' بلکہ حکم سنتے ہی مٹکے توڑ دیے بازاروں میں شراب ایسے بہہ رہی تھی جیسے سیلاب آ گیا ہو۔ اگر تم نے بھی عمل کرنا ہے تو ابھی سے ابتدا کرو۔ اس شخص نے فوری بوتل کریٹ میں رکھ دی...... اب خالی کریٹ میں دو بھری بوتلیں پڑی زبان حال سے یہ کہہ رہی تھیں کہ اے امت محمد (ﷺ) کے رکھوالو!...... ہے کوئی جو اس طرز عمل کو اپنائے......

دکاندار کو حیران و ششدر کھڑا چھوڑ کر میں سوچوں میں گم چل پڑا' کہ اگر ہماری قوم کا ہر فرد عرفان بھائی والی سوچ اپنا لے تو مسلمان فکری طور پر بھی اور معاشی و سیاسی طور پر بھی آزاد ہو جائیں' خوشحال ہو جائیں اور خوشحال ہو کر جہاد کی تلوار تھام کر نکل کھڑے ہوں تو پھر کسی کو ظلم کرنے کی جرأت بھی نہ ہو۔

اسے معاف کر دو

پچھلے دنوں ایک پرانا جاننے والا ساتھی ملا۔ میں اس کا چہرہ دیکھتے ہی حیران رہ گیا، کیونکہ اس سے قبل اس کا چہرہ مکمل طور پر سنت رسول سے مزین تھا۔ چہرے پر شادابیاں اور رونقیں تھیں۔ ایک متانت، وقار اور جرأت تھی جبکہ اب مسکنت اور پژمردگی نے ڈیرے جما رکھے تھے۔ وہ باتوں میں عموماً نظریں چرا رہے تھے۔ پہلے ان کی داڑھی مکمل تھی مگر اب کٹ چکی تھی ...... ایک مشت بھی نہیں بلکہ اس سے بھی کم نظر آ رہی تھی۔ میں بہت حیران و پریشان تھا کہ ایسا کیوں ہوا؟ کس چیز نے ان کو ایسا کرنے پر مجبور کر دیا؟ میں نے ایک دوسرے دوست سے سوال کیا تو انہوں نے یہ عقدہ حل کیا، کہنے لگے: حضرت صاحب نے دوسری شادی حال ہی میں کی ہے۔ یہ سب اسی کا کیا دھرا ہے، یعنی انہوں نے بظاہر جوان اور ''مُنڈا کھُنڈا'' نظر آنے کے لیے کافی حد تک داڑھی کٹوا ڈالی ہے۔ مجھے اس بات کا بہت صدمہ ہوا۔

میں حضرت صاحب کے پاس پہنچا اور دریافت احوال کے بعد پوچھا: حضرت! میں نے سنا ہے کہ آپ نے دوسری شادی فرمالی ہے؟ کہنے لگے: ہاں، الحمدللہ! سنت جو ہوئی۔ میں نے اس دور میں مردہ سنت پر عمل کر کے اس کو زندہ کیا ہے۔ سو شہیدوں کا ثواب بھی لوٹا ہے اور ساتھ ساتھ ...... میں نے کہا: واہ! ماشاء اللہ کیا ذوق پایا ہے آپ نے سنت کو زندہ کرنے کا۔ آپ نے ایک لڑکی کی خاطر سنت رسول کا اس بے دردی اور سفا کی سے مثلہ کر دیا اور مزید یہ کہ اس سنت کے قتل پر شرمندگی کی بجائے سنت کے احیاء پر سو شہیدوں کے ثواب کا چکر بھی چلا رہے ہیں۔ سنت کے مثلہ پر مطمئن کرنے کے لیے شیطان نے آپ کو کس

فلسفہ کی پٹی پڑھا دی ہے کہ جس پر عمل کرتے ہوئے آپ لوگ سنتوں کو زندہ کرنے کے نام پر فرضوں کا قتل کرتے جا رہے ہو۔ اس لئے کہ داڑھی رکھنا جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے، سنت نہیں، بلکہ ہر مسلمان پر فرض ہے۔

ہمارے ہاں جیسے بعض لوگ کتاب کی چوری کو چوری نہیں سمجھتے ایسے ہی داڑھی جو محبوب کائناتؐ سے محبت کی بھی نشانی ہے، کی چوری بھی چوری نہیں سمجھی جاتی۔ داڑھی کی چوری کرتے ہوئے وہ اس کو مسلسل قتل کرتے رہتے ہیں اور ان کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کے اس قبیح و شنیع عمل کا کسی کو علم بھی نہ ہو۔ داڑھی کی چوری کے لیے لوگوں نے مختلف طریقے اختیار کر رکھے ہیں' کچھ تو خفیہ ہیں' کچھ ظاہری اور کچھ ظاہری مگر تاویلانہ!

مذکورہ بھائی کا عمل دیکھ کر مجھے اپنے ہوسٹل کے اس باورچی کا واقعہ یاد آ گیا کہ جس کو ایک صبح ہم نے دیکھا تو دیکھتے ہی رہ گئے۔ ہم ہی نہیں جو بھی اسے دیکھ رہا تھا انگشت بدنداں کھڑا دیکھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ سورج کی روشنی آہستہ آہستہ پھیل رہی تھی اور جمگھٹا تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا، ہر ایک کے ہونٹوں پر سوال تھا کہ یہ ہم کیا دیکھ رہے ہیں؟ اور یہ کیسے ہو گیا؟ جبکہ باورچی روٹیاں لگانے میں ہمہ تن مصروف تھا۔ یہ خبر سارے ہوسٹل میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ حضرت باورچی صاحب کی داڑھی ایک ہی رات میں تقریباً تمام کی تمام غائب ہو گئی ہے۔

معاملہ یہ تھا کہ ان حضرت کی داڑھی بہت بارُعب اور لمبی تھی۔ شیطان نے ان کو کئی دن سے ورغلا رکھا تھا، لیکن داڑھی صاف کرنے کی جرأت نہ ہو رہی تھی' اور نہ کوئی ایسا طریقہ سوجھ رہا تھا کہ جسے اپنا کر نہ صرف وہ لوگوں کی لعنت ملامت سے بچ جاتے بلکہ اپنے لیے لوگوں میں ہمدردی کے جذبات بھی پیدا کر لیتے۔ آخر شیطان نے ان کے دماغ میں ایک پرفریب آئیڈیا ڈال ہی دیا۔ یہ ابھی آپ ان کے منہ سے سنیں گے۔ لڑکوں کے ہجوم نے جب ان سے دریافت کیا کہ حضرت یہ ہم کیا دیکھ رہے ہیں؟ رات گیارہ بجے تک آپ کی داڑھی صحیح سالم تھی جبکہ اب تھوڑی سی باقی ہے۔ باقی تمام کی تمام غائب۔ ماجرا کیا ہے؟

آپ نے یہ ظلم کیوں کیا؟ تو حضرت باورچی فرمانے لگے: ساتھیو! کیا بتاؤں آپ لوگوں کی دعائیں تھیں کہ میں بچ گیا ورنہ آپ یہاں میری جلی ہوئی لاش دیکھتے۔ ہوا یوں کہ میں جب تندور کے نچلے حصے میں روٹی لگانے کے لیے جھکا تو داڑھی بھی ساتھ ہی نیچے گئی۔ آگ نے اسے دبوچ لیا۔ مجھے تکلیف محسوس ہوئی تو میں برق رفتاری سے اوپر اٹھا اور آگ میں جلتی داڑھی کو پکڑا اور گوندھے ہوئے آٹے پر ڈالے جانے والے گیلے کپڑے کو اس کے اوپر لپیٹ دیا۔ اگر ذرا سی دیر ہو جاتی تو آگ سر تک پہنچ ہی گئی تھی۔ پھر کپڑوں کو لگتی اور میں جل کر راکھ ہو جاتا۔ اب جتنی تھوڑی سی داڑھی آپ دیکھ رہے ہیں اللہ کے فضل سے اس کو میں جان پر کھیل کر بمشکل بچانے میں کامیاب ہوا ہوں۔

بعد میں اس کے ایک ہم پیالہ و ہم نوالہ سے پتا چلا کہ اس ظالم نے آدھی رات کے وقت جب سب لوگ سو گئے تو کمرہ بند کر کے داڑھی کو ایک مٹھی میں پکڑ کر مٹھی سے باہر ساری داڑھی کو دیا سلائی دکھا دی۔ جب داڑھی جلتے ہوئے ہاتھ تک پہنچی تو گیلی صافی جو پہلے سے تیار رکھی تھی، میں لپیٹ دیا۔ اب تھوڑی سی داڑھی بچ گئی تھی باقی جل کر شہید ہو چکی تھی۔ میں نے سوچا کہ ان دلہا صاحب نے تو ایسا کوئی جواز گھڑنے کی بھی کوشش نہیں کی، یہ تو کسی کے سامنے کوئی بہانہ بھی نہیں بنا سکتے' اللہ کو کیا جواب دیں گے؟

بعض لوگ اس مبارک سنت کی چوری میں شیطان کے پیچھے لگ جاتے ہیں اور ایسے ایسے مفروضے گھڑتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ پچھلے دنوں مجھے ایک جوان راوی پل پر لفٹ کے لیے کہنے لگا' میں نے بٹھا لیا۔ دوران سفر اس نے انکشاف کیا کہ میں نے دورہ خاصہ کیا ہوا ہے۔ داڑھی میں نے نصر جاوید بھائی کے کہنے پر کٹائی ہے۔ میں حیران ہو گیا اور دل میں کہنے لگا جماعۃ الدعوۃ کے کارکنان اور قائدین کی یہ ایک خاص خوبی اور پہچان ہے کہ وہ کسی بھی حالت میں داڑھی کاٹنے کی اجازت نہیں دیتے۔ مشکل سے مشکل مشن سر کرتے ہیں، لیکن داڑھی کبھی ان کے راستے میں رکاوٹ نہیں بنی اور نہ انہوں نے کٹائی ہے۔ وہ تو داڑھی منڈوانے والوں سے نہیں بلکہ کٹوانے والوں سے بھی بے حد بیزار ہوتے

ہیں، نفرت کرتے ہیں لیکن پھر اپنی نفرت کو چھپاتے ہوئے ان تک دعوت دین پہنچاتے ہیں اور وہ لوگ دعوت قبول کر کے اپنے چہروں کو سنت کے نور سے سجا لیتے ہیں، لیکن یہ بھائی کہہ رہے تھے کہ چند سال قبل مجھے ایک خاص مقصد کے تحت داڑھی کٹوانے کے لیے کہا گیا، اس پر عمل کر کے میں آج تک اس حکم پر عمل پیرا ہوں۔ یقیناً یہ ایک بہانہ تھا، حقائق سے قطعی دور!

ایک آدمی ملا جس کی کبھی خوبصورت داڑھی ہوتی تھی لیکن اب چہرہ داڑھی سے محروم تھا۔ حیرانی سے پوچھا: بھائی آپ کی داڑھی ...... ؟ کہنے لگے: کیا بتاؤں، گھر والوں کا بڑا پریشر تھا، میں مسلسل اَڑا ہوا تھا۔ میں نے برملا ان کو کہہ دیا تھا کہ گردن کٹ جائے گی مگر داڑھی نہ کٹ سکے گی۔ وہ پھر بھی باز نہ آئے، ایک دن انہوں نے منصوبہ بنایا اور مجھے پکڑ لیا۔ پکڑنے کے بعد زبردستی زمین پر لٹایا۔ کچھ نے ٹانگیں پکڑیں' کچھ نے بازو، ایک نے سر کے بالوں سے پکڑ کر جکڑ لیا اور زبردستی میری داڑھی مونڈ دی۔ میں چیختا چلاتا اور روتا پیٹتا رہ گیا، لیکن میری کسی نے نہ سنی۔ میں نے ساری داستان سننے کے بعد پوچھا: یہ سانحہ کب رونما ہوا؟ کہنے لگے: تقریباً ٦ ماہ کی بات ہے۔ میں نے یہ سنتے ہی کہا: واہ! کیا خوب ہے کہانی آپ کی!...... لیکن چور جاتے جاتے کمال صفائی کے باوجود بھی اپنا کوئی نہ کوئی نشان چھوڑ ہی جاتا ہے...... یقیناً چھ ماہ سے اب تک آپ کے خاندان والے آپ کو کم از کم ہفتہ میں ایک بار زمین پر بکرے کی طرح لٹاتے اور داڑھی مونڈتے ہوں گے؟ کہنے لگے: نہیں' اس کے بعد تو انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ میں نے فوراً کہا: اس کے بعد آج تک آپ خود روزانہ نائی کے پاس آئینے کے سامنے بصد شوق بیٹھتے اور اس کو گویا حکم دیتے ہو کہ "کاٹ ڈالو سنت رسول کو اور پھینک دو"...... نعوذ باللہ من ذالک ...... یہ سن کر وہ بہت شرمندہ ہوا اور گردن جھکا کر خاموش ہو گیا۔

اس کے برعکس کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں کہ جو داڑھی کے دفاع کے لیے ہر طرح کی قربانی دیتے ہیں۔ مجھے اپنے سیالکوٹ کے دوست ایاز کا واقعہ یاد ہے۔ اس کے بھائی نے کہا کہ کوریا کا ویزہ تمہارے لئے تیار ہے۔ اتنے لاکھ تنخواہ ہے، فلاں فلاں سہولتیں ہیں،

تمہیں نوکری ڈھونڈنے کی تکلیف نہ کرنی پڑے گی، اس کا بندوبست پاکستان سے روانگی سے قبل ہی ہوگیا ہے۔ یہاں تم نے مجاہدین کے پاس جا کر جو یہ چند بھورے بھورے بال (داڑھی) رکھ لئے ہیں انہیں انٹرنیشنل سطح پر پسند نہیں کیا جاتا۔ اس لئے انہیں منڈوا دو۔ اس اللہ کے بندے نے ساری گفتگو سننے کے بعد کہا کہ میں ایسی نوکری پر تھوکتا ہوں، اس نوکری کو جوتے کی نوک پہ رکھتا ہوں کہ جس کے لئے مجھے محبوب کائنات، سلطان مدینہ، سرور قلب وسینہ ﷺ کی پیاری سنت کو قربان کرنا پڑے۔ میں انکار کرتا ہوں کوریا جانے سے۔ اس کے بڑے بھائی کو بہت غصہ آیا۔ وہ کہنے لگا: ایسی نوکری کے لیے لوگ مارے مارے پھرتے ہیں' ترستے ہیں' جوتے چاٹتے اور منتیں کرتے ہیں' سفارشیں کراتے ہیں اور تم ہو کہ مولوی اور داڑھی میجر بن کر اس کو ٹھکرا رہے ہو۔ یاد رکھو! ساری زندگی یونہی پاکستان میں ٹھوکریں کھاتے رہو گے' نہ تمہیں آج تک نوکری ملی ہے اور نہ ملے گی' یونہی زندگی برباد کر بیٹھو گے اور ترقی کا چانس گنوا بیٹھو گے۔ اس نے کہا: مجھے یہ سب منظور ہے لیکن میں اپنے محبوب ﷺ کی ادا پر، ان کی سنت پر استرا نہیں چلوا سکتا۔ ان کی محبت کے بدلے میں مجھے دنیا کی ہر ترقی، نوکری اور دولت نامنظور ہے۔ اس کے بھائی نے یہ ضد دیکھ کر اس کی خوب پٹائی کی' زدوکوب کیا اور مارا پیٹا۔ یہ بھائی بڑے بھائی کی اس تکلیف دہ مار کو سہتا رہا لیکن استقامت سے ڈٹا رہا کہ دنیا کی مار کے مقابلے میں آخرت کی مار یقیناً ناقابل برداشت ہے۔

اسی طرح تحریک آزادی ہند کے ہیرو مولانا یحییٰ علی کو جب انگریز نے پھانسی کی سزا سنائی تو وہ بہت خوش ہوئے۔ انگریز نے دریافت کیا کہ اسے تو پھانسی کی سزا سن کر رونا چاہئے تھا مگر یہ خوش ہو رہا ہے۔ بتانے والے نے بتایا کہ یہی تو ان مسلمانوں میں سب سے بڑا اعزاز ہے کہ جس کے لئے وہ ہر طرح کی قربانی دیتے ہیں، یعنی شہادت! اور پھانسی پا کر' وہ شہادت کا رتبہ پانے کی خوشی میں نہال ہو رہا ہے۔ انگریز کو بہت صدمہ پہنچا' اس نے دریافت کیا: اس کو دکھ کیسے پہنچایا جا سکتا ہے؟ اس کی یہ خوشی کیسے ختم کی جا سکتی ہے؟ اسے اس کا طریقہ بتایا گیا، لہٰذا اس نے اس پر عمل کرتے ہوئے حکم جاری کیا: یحییٰ علی کی پھانسی کی

سزا ختم کر کے قید میں بدلی جاتی ہے اور اس کی داڑھی مونڈنے کا حکم دیا جاتا ہے، لہٰذا داڑھی فوج کی نگرانی میں زبردستی مونڈ دی جاتی ہے۔ چشم کائنات نے دیکھا کہ وہی چہرہ جو پھانسی کی سزا سن کر خوشیاں منا رہا تھا' خوشی سے تمتما رہا تھا' چک و دمک رہا تھا' اب زار و قطار آنسو بہا رہا ہے۔ ٹپ ٹپ آنسو گر رہے ہیں۔ ہچکی بندھ چکی ہے۔ وہ داڑھی کے کٹے ہوئے بالوں کو اٹھا اٹھا کر مخاطب کر رہا ہے اور کہہ رہا ہے: میں کتنا بدنصیب ہوں کہ اللہ کی راہ میں گردن نہ کٹوا سکا، یعنی پھانسی نہ پا سکا اور تو کتنی خوش نصیب ہے کہ مجھ سے بھی پہلے درجہ شہادت پا گئی۔ یوں مولانا یحییٰ علی داڑھی کے کٹنے پر زار و قطار روتے رہے اور انگریز ان کے اس دکھ اور رونے پر خوش ہوتا رہا۔

دارالاندلس کے مدیر بھائی سیف اللہ قصوری صاحب کو پچھلے دنوں بیروت جانا تھا۔ کسی نے کہا کہ آپ کی داڑھی مکمل ہے ایسی حالت میں انٹرنیشنل ذرائع سے بیروت جانا مشکل ہے۔ شاید آپ کو داڑھی ہلکی کروانی پڑے۔ یہ سن کر انہوں نے پروگرام میں تبدیلی کر دی اور کہا کہ یہ ایک دنیا کا مقصد ہے؟ اس کو چھوڑ سکتا ہوں سنت رسول ﷺ سے محروم نہیں ہو سکتا۔ اور کہنے لگے کہ مجھے بیروت نہ جانا منظور ہے لیکن میں داڑھی کی کبھی بھی تراش خراش نہ کروں گا...... ہماری تو بعض مائیں بھی ایسی ہیں کہ جو داڑھی رکھنے پر اپنے بیٹے سے کہتی ہیں کہ بیٹا! ابھی تمہاری داڑھی رکھنے کی عمر نہیں' بوڑھے ہو گئے تو رکھ لینا' اب منڈوا دو۔

کتنے ہی جوان ہیں جو صرف اس لئے داڑھی کو قتل کر دیتے ہیں کہ اس طرح ہمیں کوئی رشتہ نہ دے گا۔ کچھ دفتری ماحول کا اور کچھ نوکری کا بہانہ کرتے ہیں، کچھ کہتے ہیں کہ صرف ٹھوڑی پر بال آئے تو لوگوں نے ''کوچی'' کہہ کر چھیڑنا شروع کر دیا۔ اس لئے لوگوں کے مذاق سے تنگ آ کر منڈوا دی۔ نہیں جانتے کہ اگر کسی نے سنت اختیار کرنے پر مذاق کیا اور آپ نے برداشت کیا تو اس پر کتنا اجر ہے؟ ایک آدمی جس کو محلّہ کے بچے اور لوگ کوچی کہتے تھے' وہ مسکرا کر چلا جاتا تھا۔ جس دن کوئی یہ نہ کہتا وہ پریشان ہو جاتا اور لوگوں سے نہ کہنے کی وجہ دریافت کرتا۔ یوں لوگوں نے دیکھا کہ یہ تو چڑتا ہی نہیں، غصہ ہی نہیں کرتا تو

تنگ آ کر اپنی حرکت سے باز آ گئے۔ ایک دن کسی نے پوچھا کہ جب لوگ آپ کو استہزاء نہیں کرتے تھے تو آپ ان کے پاس کیوں پہنچ جاتے تھے اور نہ چھیڑنے کی وجہ دریافت کیوں کرتے تھے؟ گویا آپ ان کے چھیڑنے سے خوش ہوتے تھے۔ اس اللہ کے بندے نے کہا: اس لئے کہ ان کی وجہ سے روزانہ سنت اختیار کرنے پر مذاق اور تحقیر و تذلیل کا نشانہ بنائے جانے کی بنا پر صبر کرنے کے نتیجے میں میرے درجات میں اضافہ ہوتا، مجھے بہت زیادہ ثواب اسی بہانے مل جاتا۔ فرشتے لکھتے جاتے اور میں خوش ہوتا جاتا۔ میرے دل میں یہ بات تھی کہ کل جب قیامت کا دن ہو گا، اللہ کا دربار لگا ہو گا تو میں اللہ کریم سے کہوں گا کہ اے رب کائنات! میں نے دنیا میں تیرے نبی کی سنت اپنانے پر جو ذلت و حقارت سہی، جو مذاق و استہزاء برداشت کیا، جو بے عزتی کروائی، یہ سب کچھ تیری رضا کی خاطر تھا اور تیرے پیارے رسول کی محبت کی خاطر تھا۔ تو مجھے اپنے پیارے رب پر یہ یقین و بھروسا ہے کہ وہ مجھے فرمائے گا: جاؤ خالد! میری جنتوں میں داخل ہو جاؤ، لہٰذا اس نیت سے میں لوگوں سے دریافت کرتا کہ آج تم میرا مذاق اڑانا کیوں بھول گئے ہو؟

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے داڑھی صرف اس لئے منڈوائی ہے کہ چہرے کی بعض جگہوں سے اکا دکا بال نکلے تھے، ہم چاہتے ہیں کہ پورے چہرے پر بھرپور طریقہ سے داڑھی نکلے، جو خوبصورت بھی لگے گی۔

بعض لوگ داڑھی کلیتاً کٹواتے تو نہیں بلکہ داڑھی کو بڑھنے سے روکنے کے لیے ایسے ایسے ''سائنٹیفک'' طریقے اپناتے ہیں کہ کوئی پہچان نہیں سکتا۔ بعض لوگ تو کنڈیالے چوہے کی طرح داڑھی کے بالوں کو دانتوں سے کاٹتے رہتے ہیں۔ ان کی داڑھی ہمیشہ ایک ہی جگہ قائم رہتی ہے' آگے نہیں بڑھتی۔ بعض لوگ بڑے بالوں کو پکڑ کر چھوٹے بالوں کے اندر لے جا کر کاٹ دیتے ہیں۔ یوں یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ بعض لوگ داڑھی پر ہاتھوں اور تولیے کی خوب رگڑ لگاتے ہیں اور یوں داڑھی کو کھردرا بنا کر کاٹتے اور مسلتے رہتے ہیں۔ بعض داڑھی کے بالوں کو جڑوں سے اکھاڑتے رہتے ہیں۔ بعض لوگ گچھی بنا کر لپیٹ لیتے ہیں

یوں ان کی داڑھی چھوٹی سی نظر آتی ہے۔ ہمارے جامعہ کے ہاسٹل میں ایک بابا جان نائی کا کام کرتے تھے' جو اکثر یہ پنجابی نظم پڑھا کرتے تھے:

تیری چلدی چلدی سیکل نوں
پے جانی پھڑ ز اوّلی اے

یعنی تیری اس رواں دواں خوبصورت زندگی کی آبشار نے کسی دن اچانک خشک ہو جانا ہے۔ تیری رعنائیوں برنائیوں اور دلربائیوں سے بھرپور اس گنگناتی زندگی کو کسی دن اچانک موت نے اپنے آہنی، ظالم اور ہلاکت خیز شکنجے میں لے کر ختم کر دینا ہے۔ یہ بابا جان جن کا نام بابا بلال تھا' ہوسٹل کے طلبہ کے بال کاٹتے تھے اور ساتھ ساتھ داڑھی کے دشمنوں کے وہ خفیہ طریقے بھی بتاتے تھے کہ جن کو اپنا کر وہ داڑھی کا مثلہ بھی کرتے تھے اور لوگوں کو پتا بھی نہ چلتا تھا۔

یہ تو وہ لوگ ہیں کہ جو داڑھی مونڈھنے کو حرام کہتے ہیں اور سنت سے پیار کے دعویدار ہیں۔ ان میں ایک مشت داڑھی کے قائلین و فاعلین بھی شامل ہیں، لیکن جو لوگ سرے سے داڑھی کو مونڈتے ہیں، استرا پھراتے ہیں اور دندناتے ہیں' ان کا تذکرہ ان شاء اللہ آئندہ ہفتے کروں گا۔ اس وقت جب صلیبی یہودی اور ہندو داڑھی کی سنت کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں' پوری دنیا کی مشینری داڑھی اور داڑھی والوں کے تعاقب میں متحرک ہے' چاہئے تو یہ تھا کہ سنت کے علمبردار ثابت قدمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایمان کا ثبوت دیتے، لیکن دیکھنے میں آ رہا ہے کہ کتنے ہی لوگ کفار کے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر ان کی نظروں میں قابل قبول بننے کے چکر میں پھنس گئے ہیں۔ وہ معتدل اور روشن خیال کہلوانا چاہتے ہیں۔ یاد رکھیں وہ محبوب کائنات ﷺ کی پیاری سنت پر جتنا دل چاہے ظلم کر لیں، اس کو زخمی کر لیں، اس کی ہیئت بگاڑ دیں' سنت کو فیشن کے رنگ میں ڈھال لیں' وہ کبھی بھی کفار کے ہاں قابل قبول نہ ٹھہریں گے۔ ان کے نزدیک وہ ہمیشہ مجرم اور قابل مواخذہ ہی رہیں گے، اس لئے کہ ان کا سب سے بڑا جرم ''مسلمان ہونا'' اور ''کلمہ پڑھنا'' ہے۔

مسلمان سوچ لیں کہ کہیں وہ کافروں کے لیے قابل قبول بنتے بنتے اللہ کے دربار میں ہی ناقابل قبول اور مردود و مقہور نہ ٹھہر جائیں۔ اگر ایسا ہوگیا تو پھر دنیا میں بھی ان کے لئے ذلتیں ہیں اور آخرت میں بھی ذلتیں ہی ذلتیں ہیں۔ ابھی سوچ لیں کہ انہوں نے کس کا منظور نظر بننا ہے' امریکہ و کفار کا یا اللہ اور اس کے رسول کا؟

''آپ بہت اچھے ہیں''

جب روس افغانستان میں پھنسا ہوا تھا، ہم بھی اس کے خلاف برسر پیکار مجاہدین کے ساتھ 'شیطان پوسٹ' کے سامنے 'حطین پوسٹ' جلال آباد کے محاذ پر موجود تھے۔ ہمارے سامنے پہاڑی پر واقع روسیوں کی پوسٹ کو ''شیطان پوسٹ'' اس لئے کہا جاتا تھا کہ اس پر عموماً بنی سنوری نوجوان لڑکیاں پھرتی دکھائی دیتیں، جو شاید مجاہدین کو گمراہ کرنے کے لئے روسیوں کی ناکام اور بودی کوشش تھی۔ اس پوسٹ پر ہمارا امیر ایک عرب دیہاتی نوجوان تھا۔ وہ نہایت کرخت اور سخت طبیعت کا مالک تھا۔ آسانی سے کوئی بھی اس کو اپنی بات نہیں منوا سکتا تھا، لیکن ہمارے ساتھ ایک پاکستانی نوجوان تھا وہ اس سے ہر بات منوا لیتا۔ اس کے پاس فن ہی ایسا تھا، جب اس کا دل چاہتا کہ کوئی مزیدار چیز کھائی جائے' وہ امیر کے پاس جاتا اور نہایت لجاجت، فرمانبرداری اور محبت بھرے انداز میں' میٹھی زبان سے ایک خاص فقرہ بولتا۔ یہ فقرہ جب امیر سنتا تو ''رام'' ہو جاتا اور سٹور کی چابی اس کو دے دیتا۔ وہ وہاں سے پھل، بالائی، دودھ، مکھن، پنیر، بسکٹ، شہد، کھجور، دیگر میوہ جات اور طرح طرح کی مزیدار اشیاء نکال کر کھاتا اور ہم دیکھتے رہ جاتے۔ کبھی کبھی وہی فقرہ بعض ساتھی بول کر اس کے ساتھ کھانے میں شریک ہو جاتے اور یوں خوب موج کرتے۔ مخصوص انداز سے میٹھی زبان میں بولا جانے والا وہ فقرہ کیا تھا؟ یہ میں آپ کو کچھ دیر بعد بتاؤں گا۔

بعض لوگ نااہل و ناہنجار ہوتے ہیں، نہ ان کا تجربہ و قابلیت ہوتی ہے اور نہ دور اندیشی اور معاملہ فہمی کی صلاحیت' لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ وہ بہت بڑی پوسٹ پر براجمان ہوتے ہیں۔ وہ اس پوسٹ اور عہدے کے تقاضوں، ضرورتوں وغیرہ کی سدھ بدھ سے یکسر

غافل و بے خبر ہوتے ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ اس منصب تک کیسے پہنچ گئے؟ تو عرض ہے کہ بعض لوگ کئی فنون جانتے ہیں لیکن وہ کمال کسی ایک میں بھی نہیں رکھتے جیسا کہ کسی نے کہا:

He is jack of all trade but master of none.

''وہ ہر فن مولا تو ہے لیکن ماہر کسی میں بھی نہیں۔''

یہ لوگ اور فنون جانیں یا نہ جانیں مگر ایک فن میں ضرور ماہر ہوتے ہیں اور وہ ہے چاپلوسی اور خوشامد کا فن۔ عرف عام میں ایسے لوگوں کو خوشامدی، چمچہ، ٹیسر، چولی چک، لفافہ وغیرہ کہتے ہیں اور اس فن کو ٹی سی، چاپلوسی، مکھن لگانا، تلوے چاٹنا، پی آر بنانا وغیرہ کے ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ یہی فن ہے کہ جس کو اپنا کر ایسے لوگ بڑی بڑی پوسٹوں تک پہنچ جاتے ہیں۔

میں ایک دفعہ اپنے دوست شبیر حسن کے ساتھ ایک نئے جاری ہونے والے اخبار ''بادل'' کے دفتر گیا کہ اس اخبار میں کالم لکھوں۔ اخبار کا مالک کرسی پر ڈھیر تھا۔ ایک شخص اس کے سامنے بیٹھا تھا جبکہ ایک اخبار میں کام کرنے کا متمنی آنے والے کو مالک کا تعارف کچھ یوں کروا رہا تھا...... ''جناب! آپ سمجھ لیں یہ میرے باپ ہی ہیں...... یہ میرا سب کچھ ہیں، انہی کے سہارے اور دم قدم سے ہم چل رہے ہیں...... آپ دیکھیں گے کہ اخبار جب منظر عام پر آئے گا تو...... میں نے شبیر بھائی سے کہا: واپس چلیں' میں ایسے نامعقول بندوں کے درمیان کام نہیں کر سکتا۔

اکثر نااہل لوگ اپنی نااہلی چھپانے کے لئے اس ''فن'' کا سہارا لیتے ہیں اور خوب فائدہ اٹھاتے ہیں۔ طالب علمی کے دور میں، میں نے ایک مذہبی شخصیت سے گوجرانوالہ میں ملاقات کی۔ وہ اس وقت ملک کی صف اول کی لیڈر شپ میں شامل ہے۔ میرے ساتھ دو جوان اور بھی تھے۔ انہوں نے اس شخصیت سے اپنا کوئی کام نکلوانا تھا، ان میں سے ایک بولا:

سرکار! دل چاہتا ہے کہ آپ ہر وقت میرے سامنے بیٹھے رہیں اور میں آپ کو دیکھتا

رہوں۔

خوشامد و چاپلوسی نااہل، کاہل، کام چور اور نکمے افراد کی نشانی ہوتی ہے۔ باضمیر اور قابل شخص کبھی بھی اس کا سہارا نہیں لیتا۔ وہ اس کو اپنے لئے عار اور بے عزتی سمجھتا ہے۔ وہ اپنے کام سے کام رکھتا ہے۔ وہ اپنے بہترین کام کی بنا پر اپنے آپ کو عزت کے قابل سمجھتا ہے۔ اس لئے وہ خوشامد و چاپلوسی کا راستہ اختیار نہیں کرتا۔ نتیجے میں کئی دفعہ ایسا بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ وہ خوشامد پسند لوگوں کے عتاب کا شکار ہو جاتا ہے اور ترقی نہیں کر پاتا' بلکہ ہمیشہ انتقامی کارروائیوں کا شکار ہو کر اپنی اس پوسٹ کی کرسی سے چپک کر رہ جاتا ہے۔

اس مرض کا تذکرہ تاریخ کے اوراق میں ملتا ہے۔ کتنی ہی حکومتیں اس مہلک مرض کے اثرات کا شکار ہو کر تہ و بالا ہو گئیں۔ خاص طور پر برصغیر میں مسلمان حکومتوں کے زوال کے اسباب میں سے یہ ایک بنیادی سبب بنا۔ میراثی، گویے، بھانڈ، ڈوم، سازندے' لونڈیاں، ناچنے والیاں اور اس قماش کے دیگر لوگ اس ''خوشامد و چاپلوسی'' کے ہتھیار کو استعمال کر کے سازشیں کرتے رہے۔' مملکتیں برباد کرتے رہے' ایک دوسرے کو نیچا دکھانے میں لگے رہے اور یوں بادشاہ وقت کو بے وقوف بنا کر اپنا الو سیدھا کرتے رہے۔

جدید تہذیب اور مہذب سائنسی دنیا کے اس دور میں یہ مرض ختم نہیں ہوا، نہ سائنس کی لیبارٹریاں' تجربہ گاہیں اور سائنسدان اس کی کوئی ویکسین تیار کر سکے ہیں۔ یہ مرض آج ہمارے معاشرے میں پہلے سے بڑھ کر پھل پھول رہا ہے اور بڑی بڑی تباہیاں پھیلا رہا ہے۔ معاشرے کا قابل و ہنرمند اور ذہین وفطین طبقہ اس مرض کے مریضوں سے بہت پریشان ہے' کیونکہ وہ زندگی بھر محنت مزدوری کر کے تعلیم حاصل کرنے کے بعد اسناد اور ڈگریاں بغل میں تھامے پھرتا ہے مگر ان کو کوئی پوچھتا نہیں۔ میٹھی زبان والے فیل ہو کر بھی آجائیں تو بلند منصب پر فائز کر دیئے جاتے ہیں۔ بعض اوقات تو اس کے حاملین بڑی بڑی انہونیاں کر گزرتے ہیں۔ ایک دفعہ ایک کلیدی عہدے پر فائز آفیسر سے ایک سیکرٹ فائل نہیں نکل رہی تھی۔ اس کے یمین و یسار اور خود اس کو اس کے عوض بہت بھاری اور پرکشش

پیشکشیں بھی کی جا چکی تھیں، لیکن ہر بار ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ آخر کار ایک ٹاؤٹ قسم کے عام سے آدمی نے معلوم ہونے پر کہا: صاحب! فکر نہ کریں، میں یہ کام کردوں گا۔ ایک ہزار روپیہ خدمت کرنا ہو گی۔ پریشان لوگوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں کہ صرف ایک ہزار میں!!...... انہوں نے بتایا کہ ہم ہر طرح سے ناکام ہو چکے ہیں' تم کیسے کرو گے؟ اس نے کہا: یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں، لیکن چند دن کا انتظار کرنا پڑے گا' تاکہ اس شخصیت کے ذہن سے بات ذرا نکل جائے۔ چند دن بعد وہ آدمی آیا اور بتایا کہ آپ کی فائل کلیریکل سٹاف تک 'تھرو دا پراپر چینل' پہنچ چکی ہے۔ تصدیق کریں اور مجھے میری محنت کا ''صلہ'' دیں۔ جب لوگوں نے تصدیق کے بعد اس کی بات کو سچ پایا تو ہزار کی بجائے دو ہزار نذرانہ دیئے اور پوچھا کہ تم نے کون سی گیدڑ سنگھی استعمال کی ہے جو وہ تمہاری مٹھی میں آ گیا۔ وہ کہنے لگا: صاحب! چھوڑیں، یہ ہمارا کام ہے اور ہمارا طریقہ ہے' آپ نہیں سمجھ سکتے۔ اصرار کرنے پر اس نے اتنا کہا کہ باؤ جی! تعریف کے سب بھوکے ہیں، یہ انسان کی کمزوری ہے، میں نے بھی اس کی اس دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا ہے۔ میں نے اس انداز سے بات کی کہ جیسے اس وقت وہ ساری دنیا کا مالک ہو، میری کامیابی و ناکامی صرف اس کے ہاتھ میں ہو، اب وہ چاہے تو مجھے ڈبو دے اور چاہے تو تار دے۔ میں نے اس سے کہا: میں آپ کے رحم و کرم پر ہوں وغیرہ وغیرہ۔

ساسوں سے بہو کے لیے کام نکلوانا بہت مشکل بلکہ جان جوکھوں کا کام ہوتا ہے' لیکن دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض ہوشیار لڑکیاں اپنی ساسوں کو مکھن لگا کر وہ وہ کام کروا لیتی ہیں کہ جو اگرچہ ان کا شوہر بھی ان کے لئے کرنا چاہتا تو نہ کرسکتا۔ وہ اس ''گر'' سے اپنی ساسوں کو قابو میں رکھنے کی کوشش میں لگی رہتی ہیں۔

خوشامدی افراد اس رویے سے معاشرے میں اپنی عزت کھو بیٹھتے ہیں۔ لوگ انہیں طرح طرح کے مذموم ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ لوگ اس کو حقیر اور نچلے درجے کا فرد سمجھتے ہیں۔ جس کی وہ خوشامد کرتا ہے وہ بھی اس کو اپنا پالتو کتا سمجھتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ وہ جو دل

میں آئے سیاہ یا سفید کرے' یہ اس پر کبھی نہ بھونکے گا، بلکہ یہ تو ان پر غرائے گا جو اس کے خلاف کسی قسم کا اقدام یا بات کریں گے۔ کیوں؟...... اس لئے کہ اس نااہل اور سفید ہاتھی کو میں نے ہی تو اس مقام تک پہنچایا ہے۔ جہاں تک خوشامد پسند لوگوں کا معاملہ ہے تو وہ بھی اس بات کو یاد رکھ لیں کہ چاپلوسی وخوشامد کرنے والے لوگوں کے دل میں بھی ان کی حقیقی عزت نہیں ہوتی بلکہ وہ ان سے نفرت کرتے ہیں۔ ان کو بے وقوف واحمق سمجھتے ہیں کہ جب چاہا اس جانور کو مدح وتعریف اور توصیف کا چارا دکھایا اور دوہ لیا۔ (یعنی دودھ حاصل کرلیا) اس کی کون سی اپنی ذہنی صلاحیت و قابلیت ہے؟ یہ تو بھاڑے کا ٹٹو ہے' جب تک اس کو تعریفوں کا بھاڑا دیتے جاؤ، تانگے میں جوتتے جاؤ۔ وہ ظاہری طور پر اگر اس کی عزت کرتے ہیں یا اس کی کسی بات کا پاس رکھتے ہیں تو صرف اس کے عہدے واختیار کی بنا پر اس کے ''شر'' سے بچنے کے لیے ایسا کرتے ہیں۔ اپنی بے جا تعریف وتوصیف اور مدح وستائش سننے کے خواہش مند کے لئے عبرت کا مقام ہے۔ وہ سوچ لے کہ اس نے اپنی اس جھوٹی انا اور شان وشوکت کے بت کی پرستش اور تسکین کے لیے کتنے ہی حقداروں کے حق غصب کر کے نااہلوں کو نوازا اور مظلومین کی بددعائیں لی ہیں، جو ہر وقت اس کا پیچھا کر رہی ہیں۔ کتنے ہی جلتے چولہے بجھائے ہیں اور کتنے ہی معصوموں، بیواؤں، یتیموں کے منہ سے نوالہ چھین کر ان کو رلایا ہے' کتنے ہی لوگ اس کی وجہ سے برباد ہو گئے...... اس نے یقیناً آج نہیں تو کل مرنا ہے اور قیامت کے دن ایسے تمام لوگوں سے متعلق اللہ کے دربار میں اسے جواب دینا ہے۔

اس مہلک بیماری کی مضرت رسانی اور ہلاکت سے بچنے کے لئے رسول اللہ ﷺ نے ہمیں بہترین طریقہ یہ بتایا ہے کہ جب کوئی آپ کے منہ پر آپ کی تعریف کرے تو مٹی کا لپ بھر کر اس کے منہ میں ڈال دیں (تاکہ وہ اس کے بعد بھول کر بھی ایسا نہ کر سکے)

ہاں تو قارئین! بات ہو رہی تھی شیطان پوسٹ پر ایک بھائی کی جو سریع الاثر فقرہ کہتا تھا۔ آپ یقیناً بے تاب ہوں گے کہ وہ ''کھل جا سم سم'' والا فقرہ کیا تھا، تو سنئے: وہ نہایت

میٹھے لہجے میں کہتا:

یَا شَیْخَ اَنْتَ جَیِّد

”شیخ صاحب! آپ بہت اچھے ہیں۔“

میرے بھائیو! آپ بھی بہت اچھے ہیں ..... اگر اس خوشامدی و چاپلوسی کی بیماری سے محفوظ ہیں تو!!

بھائی نے بہن کو گولیوں سے اڑا دیا

کالج سے چھٹی ہو چکی ہے، لڑکیاں واپس گھروں کو جانے کے لئے گیٹ کی طرف بڑھ رہی ہیں' کالج کی کینٹین کے پاس سے گزرتے ہوئے' لڑکیوں کے ایک گروپ میں سے ایک طالبہ اپنی سہیلیوں سے گفتگو میں اپنی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے کہتی ہے: ''میرا دل چاہتا ہے کوئی کراری چٹپٹی چیز کھاؤں۔'' کینٹین کی طرف دیکھتے ہوئے: ''اچھا! سموسہ ٹھیک رہے گا۔'' پھر وہ سہیلیوں کو یہ کہتے ہوئے کہ ''رک جاؤ! میں کینٹین سے سموسہ لے آؤں'' آگے بڑھ جاتی ہے۔ کینٹین پر آ کر وہاں کھڑے آدمی سے کہتی ہے: ''بھائی جان! مجھے دو سموسے دے دیں۔'' لڑکی کو دیکھتے ہی اس خبیث کی آنکھوں میں ایک شیطانی چمک ابھرتی ہے اور وہ کہتا ہے کہ میں کینٹین بند کر رہا ہوں تم پچھلے دروازے سے آ کر لے لو۔'' یہ بیچاری معصوم کینٹین کے جونہی پچھلے دروازے پر پہنچتی ہے تو وہ آدمی اس کا بازو پکڑ کر اس کو زبردستی اندر کھینچ لیتا ہے اور اندر سے دروازہ بند کر دیتا ہے۔ لڑکیاں یہ منظر دیکھ کر دم بخود رہ جاتی ہیں اور بھاگتی ہوئی آتی ہیں' دروازہ پیٹتی ہیں' آوازے لگاتی ہیں' منتیں سماجتیں کرتی ہیں، واسطے دیتی ہیں کہ بھائی جان! دروازہ کھولیں' ہماری بہن، ہماری سہیلی، ہماری طالبہ کو باہر نکالیں' لیکن اندر سے کوئی جواب آنے کی بجائے بے چاری طالبہ کی چیخیں بلند ہو رہی ہیں' آہ و زاریاں اور نالے ہیں...... اور پھر سسکیاں آہیں بن جاتی ہیں۔ باقی لڑکیاں بے بسی کے عالم میں کینٹین کے باہر کھڑی ہیں۔

تماشا دیکھا جا رہا ہے، کس کا؟...... حوا کی بیٹی کا...... امت محمد ﷺ کی متاع کا...... اپنی حقیقی نہ سہی...... اسلامی ناتے سے بہن کا...... آپ سمجھ رہے ہوں گے کہ شاید میں آپ کو

کشمیر کی کسی مسلم بیٹی کے لٹنے کی داستان سنا رہا ہوں یا چیچنیا، بوسنیا اور فلسطین کی کسی ستم زدہ بہن کی روداد الم سنا رہا ہوں۔ نہیں نہیں! میرے بھائی..... یہ کوئی ہندو فوجی نہیں، نہ امریکی، روسی اور یہودی و صلیبی فوجی ہے جو معصوم مسلم بہن پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ رہا ہے اور وہ مدد کے لئے فریاد کناں ہے، چیخ رہی ہے اور مسلمان سنگینوں کے پہرے میں بے حس ہو کر مجبور و مقہور کھڑے ہیں..... نہیں نہیں..... یہ پاکستان ہے..... اسلام کے قلعہ کی سرزمین کا دل یعنی لاہور ہے..... اور پھر لاہور کا گورنمنٹ کالج ہے..... جہاں یہ ظلم کی داستان الم رقم ہو رہی ہے..... اور کان والے بہرے بن کر کھڑے ہیں۔ آنکھوں والے بینائی سے محروم ہو چکے ہیں۔ ہاتھوں والے بے دست و پا بن چکے ہیں۔ زبان رکھنے والے خاموش ہیں کہ زبان بے زبانی سے بھی کچھ کہنے کو تیار نہیں..... کسی نے فون پر پولیس کو اطلاع دے دی۔ آدھ گھنٹہ بعد پولیس پہنچی..... کسی نہ کسی طریقہ سے دروازہ کھلوایا گیا۔ درندے نے نہایت بے شرمی و بے حیائی سے، جیسے اسے اپنے کیے پر کوئی شرمندگی نہیں بلکہ فخر ہو، اپنے آپ کو ایک ہیرو کی حیثیت سے پولیس کے حوالے کیا..... اب یہ معصوم طالبہ لاہور ہی کی نہیں پورے پاکستان کی بیٹی، درندگی و سفاکی کا شکار ہو کر مجروح تھی کہ جیسے اسے کسی جنگلی وحشی درندے نے کاٹ کھایا ہو..... اس کی عفت کا موتی، جو عورت کا سب سے قیمتی سرمایہ ہوتا ہے، لٹ چکا تھا..... نہایت تشویشناک حالت میں اس کو ہسپتال لے جایا جاتا ہے۔ جیو ٹی وی چینل پر بھی اس کی غمزدہ داستان نشر ہو جاتی ہے۔ اب وہ ہسپتال میں ہے، جہاں کوئی اس بے چاری کا غمگسار نہ تھا۔ دلاسہ و حوصلہ دینے والا، دل و دماغ پر لگے چرکوں پر مرہم رکھنے والا، کوئی نہیں تھا۔

اسی حالت میں ڈاکٹروں کی مسلسل دو دن کی سرتوڑ کوشش کے بعد اس مظلومہ بہن کی جان بچ جاتی ہے اور اس کی زندگی ظاہری خطرے سے نکل آتی ہے۔ ڈاکٹروں نے اس کو گھر میں رکھنے کو کہا کہ وہاں رکھ کر اس کا باقی علاج ہوتا رہے گا۔ آخر دو دن بعد ہسپتال سے اسے گھر بھیج دیا جاتا ہے، اس گھر میں کہ جہاں اس کے خون کے رشتے ہیں، اس کے حقیقی غمگسار و

دم ساز ہیں ...... اور وہاں وہ ہیں کہ جن پر بچیاں فخر و ناز کرتی ہیں اور اگر کوئی ان پر ظلم و زیادتی کرنے لگے تو فخر سے کہتی ہیں کہ میرا ایک بھائی ہے' میرے دو بھائی ہیں' یعنی میں کوئی بے سہارا نہیں۔ میرا بدلہ لینے والے موجود ہیں۔ ایسے ہی خونی رشتوں کے درمیان یہ بیچاری گھر میں آ گئی۔ جب گھر میں اس مظلومہ کو بھائیوں نے دیکھا تو مٹھیاں بھنچنے لگیں رگیں پھڑکنے لگیں ...... آنکھیں انگارے برسانے لگیں ...... جسم میں لرزہ پیدا ہونے لگا ...... ایک کے منہ سے نکلا کہ ہم بے غیرت نہیں ہیں۔ بہن نے سمجھا کہ بھائی اس کی محبت میں کس قدر جذباتی ہو رہے ہیں۔ اس شیطان، بدبخت اور ذلیل انسان کو کہ جس نے میری عصمت کے موتی کو چکنا چور کیا ہے، ضرور انجام کو پہنچائے گا۔ پھر ایک بھائی نے ریوالور نکال لیا۔ بہن شاید روکنا چاہتی ہوگی کہ ...... بھائی جان! اسے قتل کر کے خود پھانسی نہ چڑھ جائیں ...... میں تو جیسے بھی ہوگا، مرتی جیتی کسی نہ کسی طرح زندگی گزار ہی لوں گی ...... لیکن آپ اپنی زندگی کو کیوں پریشانیوں اور مقدمات کے بھنور میں پھنسائیں؟ لیکن اس کے کچھ کہنے سے قبل ہی ریوالور کا ٹریگر دب چکا تھا۔ گولیاں نکلیں اور سیدھی جا کر سینے میں پیوست ہو گئیں، کس کے سینے میں ...... اس بیچاری کے سینے میں کہ جو پہلے ہی ہمدردی و غمگساری محبت و توجہ کی حقدار تھی۔ جس کی عصمت لٹ چکی تھی، دنیا اندھیر اور مستقبل تباہ ہو چکا تھا ......

جونہی گولیاں سینے میں لگیں، ہلکی سی دردبھری چیخ ابھری ...... خون کا فوارہ ابلا ...... چہرہ اور ہاتھ خون سے رنگین ہو گئے۔ ایک چکر آیا اور لرزتے ہوئے بہن زمین پر گری۔ خون ہے کہ ابل ابل کر نکلتا جا رہا ہے ...... اور پھر بہن ناقابل یقین نگاہوں اور حیران کن نظروں سے دیکھتی ہوئی' پتھرائی آنکھوں کے ساتھ' ہمیشہ کے لئے اس دنیا سے بہت دور، کبھی واپس نہ آنے کے لئے چلی جاتی ہے۔ بھائی' ہاں! اپنے ہی بھائی کے ہاتھوں کہ جن پر وہ بڑا مان و فخر کرتی تھی، منوں مٹی کے نیچے چلی جاتی ہے۔ ہمیں یہ پیغام دے جاتی ہے کہ اپنی بچیوں کی تربیت اسی نہج پر کریں کہ ان کا انجام میرے جیسا نہ ہو ...... اور وہ میرے جیسے دیوث بھائیوں کا شکار نہ ہو جائیں۔ ہاں ہاں سچ کہا اس بہن نے کہ دیوث ہے اس کا بھائی، اب

جب اس کی جھوٹی غیرت جاگی تو وہ اگر کچھ کرنا چاہتا تھا' تو اس ظالم عزتوں کے لٹیرے کو کڑی سے کڑی سزا دیتا یا دلواتا' تاکہ اس کی بہن کا دل بھی ٹھنڈا ہوتا اور آئندہ کبھی کسی کو ایسا کرنے کی جرأت نہ ہوتی۔ گویا اس کی مرنے والی بہن زبان حال سے کہہ رہی تھی: ''اب یہ جھوٹی غیرت جاگنے کا کیا فائدہ؟ کہ ظالم کو سزا دینے کی بجائے مظلوم ہی کو تڑپا دیا۔ اس انجام کا حقدار تو تو خود ہے کہ تیری غیرت اس وقت نہ جاگی جب تو نے اپنی بہن کو بے پردہ ہونے کی اجازت دی۔ جب تو نے اس کو پردہ وحجاب اختیار نہ کرنے پر روکا ہی نہیں کہ جدید تہذیب میں پردہ جیسی کلفتوں کا کوئی مقام وجگہ نہیں۔ مغربی تعلیم کے ساتھ ساتھ تو نے اسے اسلام کی تعلیمات سے روشناس نہ کروایا۔ پردہ کو دقیانوسی قرار دے کر نفرت اختیار کی۔ یہی تو تیری دیوثیت تھی۔ دیوث اور بے حمیت تو تو تھا کہ تو اپنی بہن کو کھلے عام بے پردہ گھماتا...... اس لئے سزا کا حقدار تو تو ہے نہ کہ میں مظلومہ......

جدید تہذیب کے پھندے میں پھنس کر ...... **مغربی تعلیم** کے نرغے میں آ کر...... **اسلامی ثقافت** سے بیزاری اختیار کر کے ...... جب اللہ تعالیٰ کے احکامات سے بغاوت کی جاتی ہے تو پھر نتائج ایسے ہی نکلتے ہیں اور نکلتے رہیں گے۔ وہ سندھ میں کاروکاری اور قرآن سے شادی کی شکل میں ہو یا ملک کے کسی دوسرے حصے میں نام نہاد ''غیرت'' کے نام پر...... جب تک کہ دوبارہ اسلام کے فراہم کردہ دستور پر زندگی کی گاڑی کو نہ چلایا جائے، ایسا ہوتا رہے گا۔

اپنی بہن کا محافظ مگر......

''شاید بازو ٹوٹ چکا ہے...... نہیں، موچ آ گئی ہو گی...... ہوسکتا ہے ہڈی ٹھک گئی ہو'' چوک میں لوگ مجمع بنائے کھڑے تھے اور اپنے اپنے خیال کا اظہار کر رہے تھے' جبکہ ایک جوان اپنے بازو کو سینے سے لگائے کھڑا تھا اور درد و تکلیف سے دہرا ہوئے جا رہا تھا۔ دوسرا سامنے کھڑا اپنی آستینیں چڑھا رہا تھا اور غصے میں لال پیلا ہو کر کہتا جا رہا تھا کہ نہیں چھوڑوں گا اسے، اس کی تمام ہڈیاں توڑ دوں گا اور اسے قتل کر دوں گا' اس نے سمجھ کیا رکھا ہے اپنے آپ کو! ...... یہ کہتے ہوئے وہ مارنے کے لئے آگے بڑھ رہا تھا جبکہ لوگ اسے روک رہے تھے کہ یار بس کرو، پہلے ہی تم نے اس کے بازو کی ہڈی توڑ دی ہے۔ اب تم چاہتے کیا ہو؟ وہ لوگوں کے بگڑے تیور بھانپ کر مجمع کی ایک جانب کھسکنے لگا۔ لوگوں نے مار کھانے والے لڑکے سے پوچھا کہ وہ اس بدتمیز لڑکے سے کیوں الجھا اور لڑا ہے اور کیوں اس نے تمہارے بازو کی ہڈی توڑ دی ہے۔ ہمیں بتاؤ تاکہ اس سے نبٹ سکیں؟ مار کھانے والے لڑکے نے کہا: ابھی ابھی سکول سے چھٹی ہوئی ہے اور میری بہن سکول سے واپس گھر جا رہی تھی۔ اس شیطان نے میری بہن کو چھیڑا اور گندا مذاق کیا ہے۔ میں نے اسے شرم دلائی، روکا اور لعن طعن کی تو یہ غنڈہ گردی پر اتر آیا اور مجھ پر حملہ کرتے ہوئے اس نے میرے بازو کی ہڈی توڑ دی ہے۔ پھر وہ ''ہائے مر گیا'' کہہ کر کراہا تو لوگوں نے حملہ آور لڑکے کو مجمع میں دیکھا' لیکن وہ رفو چکر ہو چکا تھا۔

میں اپنے دوست ضیا کے ساتھ کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا' لیکن جونہی کراہتے لڑکے نے اپنا بازو سینے سے لگائے ہوئے اپنا رخ ہماری طرف کیا تو میں اس کا چہرہ دیکھ کر حیران د

ششدر رہ گیا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اپنے دوست ضیا کی طرف دیکھا کہ یہ ہم کیا دیکھ رہے ہیں؟ اس کی بھی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں کیونکہ وہ اس کا جاننے والا بلکہ دوست تھا۔ ہم فوراً مجمع چیرتے ہوئے آگے بڑھے اور سب کچھ جاننے کے باوجود انجان بن کر پوچھنے لگے: مبین کیا ہوا؟ یہ بازو سینے سے لگائے کیوں کراہ رہے ہو؟ جونہی مبین نے ہمیں دیکھا تو شرم سے اس کی آنکھیں جھک گئیں۔ اب وہ اپنے پاؤں کو گھورے جا رہا تھا اور آہستہ آواز میں ہائے ہائے کرتا جا رہا تھا۔ میں نے ضیا سے کہا: ضیا بھائی! اس کا انجام اور اندرونی کہانی لوگوں کے سامنے بیان کرو۔ یہ دعوت دینے کا موقعہ ہے اور ان کو برائی سے روکنے کا بہترین لمحہ ہے۔ اس طرح لوگوں کو اس لڑائی کی حقیقت کا بھی پتا چلے گا، لہٰذا اس نے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا:

اے بھائیو! تم سب یقیناً بہنوں والے ہو۔ ہر غیرت مند بھائی پر اپنی بہن کا دفاع کرنا، اس کی عفت وعصمت کا تحفظ کرنا فرض ہے۔ اگر وہ اپنے اس فرض کو نہ نبھائے تو وہ بے غیرت اور دیوث کہلائے گا۔ مار کھانے والے آپ کے سامنے کھڑے اس بھائی نے بھی اپنے سکول سے گھر جانے والی سگی وحقیقی بہن کا دفاع کیا ہے۔ بدمعاش لڑکے کو اسے چھیڑنے، ہوٹنگ کرنے اور فحش مذاق کرنے سے روکا ہے...... لیکن اس بدبخت نے حملہ کر کے اس کا بازو توڑ دیا ہے۔ بازو ٹوٹنے کی اصل کہانی یہ نہیں بلکہ کچھ اور ہے......

سب لوگ تجسس سے میری طرف دیکھ رہے تھے...... کچھ بول پڑے: تو پھر اصل معاملہ کیا ہے؟ ہمیں بھی بتائیں۔ میرے دوست ضیا نے کہا:

ہاں ہاں! سنو! وہی بتانے لگا ہوں۔ جس سبزی منڈی والے چوک میں ہم کھڑے ہیں اس سے پچھلے بخاری چوک میں یہ لڑکا ٹھیک پندرہ منٹ قبل بھی ایک لڑکے سے لڑ رہا تھا۔ ہم نے وہاں سے اس کو سمجھا کر اور جان چھڑوا کر بھیجا تو اب یہ اس چوک میں بھی لڑ رہا ہے بلکہ بازو تڑوا بیٹھا ہے۔

لوگوں میں سے چند ایک نے پوچھا: وہاں کس سے لڑا اور کیوں لڑا؟...... تو ضیا نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا:

وہاں یہ پندرہ منٹ قبل ایک جوان سے دست و گریبان تھا اور ان کی ہاتھا پائی ہو رہی تھی۔ ہم نے پہنچ کر اپنے دوست مبین کی حمایت میں اس لڑکے کو ڈانٹا اور کہا کہ بدمعاشی نہیں چلنے دیں گے۔ وہ لڑکا رو دینے والے انداز میں بولا: بھائی جان! آپ شریف آدمی لگتے ہیں' آپ ہی فیصلہ کریں۔ آپ جو فیصلہ کریں گے مجھے قبول ہوگا۔ ہم نے کہا: بتاؤ کیا بات ہے؟ وہ کہنے لگا: میری بہن سکول سے واپس آ رہی تھی، میں کچھ فاصلے پر اس کے پیچھے چلا آ رہا تھا کہ یہ میری بہن کے پیچھے لگ گیا، اسے چھیڑنے لگا، فلمی گانے گنگناتے ہوئے فحش مذاق کرنے لگا۔ میں جلدی سے آگے بڑھا اور اس کو روکا تو یہ مجھ سے الجھ پڑا اور کہنے لگا کہ تم بھائی نہیں ہو بلکہ رقیب ہو اور کباب میں ہڈی بن رہے ہو...... ہم بہت شرمندہ ہوئے ...... ہم نے کہا: بھائی! پریشان مت ہو، تمہاری بہن ہماری چھوٹی بہنوں کی طرح ہے۔ اس انسان کو ہم مزہ چکھاتے ہیں' آپ شور نہ کریں۔ لوگ اکٹھے ہوں گے، بات پھیلے گی اور آپ کی بہن کی بدنامی ہوگی' لہٰذا آپ خاموشی سے چلے جائیں اس کو ہم سنبھالتے ہیں۔ جب ہم نے اسے اعتماد میں لے لیا تو وہ چلا گیا اور ہم اس ذلیل کے پاس آئے اور اس کو لعن طعن کی اور کہا کہ تجھے پتا ہے تمہاری اپنی ایک بہن اسی گرلز ہائی سکول میں زیر تعلیم ہے' اگر کوئی اس کے ساتھ یہ رویہ اپنائے تو تم برداشت کرو گے؟ شرم کرو، بہنوں والا ہو کر دلالوں اور بے غیرتوں دیوثوں کا کردار ادا کر رہے ہو۔ ہم نے اس کو ایک چپت بھی رسید کی۔ چونکہ ہمارا دوست تھا اس لئے اس کو کچھ کہا نہیں اور چلتا کیا۔ اس کے پیچھے پیچھے ہم اس چوک یعنی بالکل اگلے چوک میں پہنچے ہیں تو یہ معاملہ دیکھا ہے کہ کوئی لڑکا اس کی چھٹی کے بعد سکول سے آنے والی بہن کے ساتھ بدتمیزی کر رہا تھا۔ یہ اس سے

الجھا اور بازو تڑوا بیٹھا۔ یہ اصل میں اللہ کے قانون مکافات عمل کا نتیجہ ہے۔ اس کو اس کے کیے کی سزا ملی ہے کہ اگر تیرے ہاتھ سے کسی کی بہن محفوظ نہیں تو تیری بہن بھی کسی کے ہاتھ سے محفوظ نہیں رہ سکتی۔

اے لوگو! آپ جو یہاں مجمع کیے کھڑے ہیں اور یہ عبرت ناک واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں' اس سے سبق سیکھیں اور اپنی پیاری بہنوں کی حفاظت کریں۔ حفاظت اس طرح کریں کہ آپ کسی دوسرے کی بہن کے متعلق پاکیزہ جذبات رکھتے ہوئے اس کی حفاظت کریں' اللہ آپ کی بہنوں کی حفاظت کا بندوبست کر دے گا۔

وہی لوگ جو مبین کو مظلوم کی حیثیت سے دیکھ رہے تھے اور اس کی خاطر دوسرے فریق سے لڑنے مرنے کے لیے تیار تھے، وہ مبین کو نفرت بھری نظروں سے دیکھنے لگے اور اس پر طرح طرح کے فقرے کستے ہوئے وہاں سے جانے لگے۔ جاتے ہوئے کہتے جاتے: ''ایسے ذلیل انسان کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہئے تھا۔''

اب ہم دونوں دوست اور مبین کھڑے رہ گئے۔ اس کو جلد از جلد ڈاکٹر یا حکیم کے پاس پہنچانے کے لئے بیقرار لوگ چلتے بنے تھے۔ ہم نے درد سے کراہتے مبین کو نصیحت کرتے ہوئے مخاطب کیا: مبین صاحب! اللہ نے اصول بنا رکھا ہے کہ جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔ اس اصول کے تحت تم نے جیسا کسی دوسرے کی بہن کے متعلق سوچا کسی نے تمہاری بہن کے متعلق سوچ لیا، بلکہ تمہاری طرح اس پر عمل پیرا ہو گیا۔ یقیناً جب سے آپ اس بری عادت کا شکار ہیں، آپ کو ایسا کرتے ہوئے دیکھنے والے بھی آپ کی بہن کے ساتھ ایسا ہی رویہ اختیار کیے ہوئے ہوں گے' اس کو ستا رہے ہوں گے۔ اگر تم واقعی اپنی بہن کی حفاظت چاہتے ہو تو آج ہی سے اپنے اس قبیح طرز عمل سے توبہ کر لو۔ تم ہر لڑکی کو اپنی بہن کا درجہ دو۔ ہر کوئی تمہاری بہن کو اپنی بہن کا درجہ دے گا۔ اپنی نظریں اس کے پاؤں سے بھی نیچے رکھے گا۔ بھائی تو بہنوں کے لیے فخر اور مان ہوتے ہیں، بہنیں ان پر بھروسا کرتی ہیں، ان کو اپنی

ڈھال سمجھتی ہیں۔ اگر کوئی کہیں بھی اونچی نیچی بات کرے تو اسے بڑے فخر سے ڈراتی ہیں کہ دھیان سے بات کرو میرا ایک غیور بھائی بھی ہے' اگر اس کو پتا چل گیا تو پھر جان بچانا مشکل ہو جائے گی۔ بہنیں تو پرائے گھر جا کر بھی بھائی کو اپنا رکھوالا سمجھتی ہیں۔ تم کیسے بھائی ہو کہ جو اپنی ہی بہن کے راستے میں کانٹے بو رہے ہو' اس کو بدنام کر رہے ہو۔ وہ تمہاری اس قدر عزت کرتی ہے کہ تمہارے یہ سارے کرتوت جانتے ہوئے بھی کسی سے ذکر نہیں کرتی کہ کہیں تمہاری عزت میں فرق نہ آ جائے۔ معاشرے میں کہیں تمہارے وقار میں کمی نہ آ جائے۔ تمہارے کردار پر معمولی سا دھبہ نہ آ جائے ...... اور ایک تم ہو کہ ایسی بہن کو گلی گلی رسوا کرتے پھر رہے ہو۔ تمہارے جیسے بھائی کے لیے بہتر تھا کہ پیدا ہی نہ ہوتا۔ اسے شرمندگی سے اپنا منہ تو نہ چھپانا پڑتا۔ اپنی سہیلیوں میں گلی محلّہ میں تضحیک و تذلیل کا نشانہ تو بننا پڑتا ...... ایسے جینے سے بہتر تھا مر جاتے تم ...... کوئی بہن تجھے اپنا بھائی کہنے کا رسک تو نہ لیتی ...... ہماری باتیں سن کر مبین بازو کا درد بھول گیا ...... بلکہ اس کے اندر کا درد جاگ اٹھا ...... مردہ ضمیر انگڑائی لے کر جاگ پڑا تھا ...... اس کی آنکھوں سے گرم گرم آنسو بہنے لگے، وہ لرزتے لہجے میں گویا ہوا:

اے اللہ! مجھے معاف کر دے، میں ہوش میں آ گیا ہوں۔ میری بہن کو اور مجھے بری شہرت اور ذلت کے عذاب سے بچا ...... اور پھر اس کی ہچکی بندھ گئی۔

ہم نے اس کو سہارا دے کر تانگے میں بٹھایا اور ہڈیوں کے ماہر کی طرف چل پڑے ...... اس لئے کہ ...... صبح کا بھولا شام کو گھر واپس آ چکا تھا۔

حسد کے شرارے

''تم آج دفتر اتنے منٹ لیٹ کیوں پہنچے ہو؟ آج تمہاری کلاس سے شکایت آئی ہے کہ تم طلباء سے سختی سے پیش آتے ہو..... آج تم نے کلاس کی حاضری نہیں لگائی..... تمہاری پڑھائی کی رپورٹ درست نہیں آرہی..... عملہ کی طرف سے تمہاری شکایات مسلسل موصول ہو رہی ہیں......'' ایسے ہی تکلیف دہ فقرے احمد کو روزانہ سننا پڑتے تھے۔ دراصل ادارہ میں اس کے بہت سے حاسد پیدا ہو چکے تھے' جو ہر وقت اس فکر میں سرگرداں رہتے کہ کب کوئی بہانہ ہاتھ آئے کہ جس کو بنیاد بنا کر احمد کی ادارہ سے ہمیشہ کے لیے چھٹی کروا دی جائے۔ وہ اب احمد کو یہ باور کروا رہے تھے کہ وہ ادارہ پر بوجھ ہے اور ادارہ اس کو ماہانہ تین ہزار روپیہ تنخواہ دے کر اس پر احسان کر رہا ہے۔ اس کو ذمہ داری دیتے وقت اس سے یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ اس کے بچوں کی رہائش کے لیے اسے مکان بھی دیا جائے گا لیکن ایک عرصہ گزر جانے کے بعد آج تک یہ وعدہ پورا نہ کیا گیا تھا بلکہ اب تو ایسے بہانے تلاش کیے جا رہے تھے کہ اس کو مستقل طور پر فارغ کر دیا جائے۔ یہ سب کچھ اس سے متعلق ادارہ میں پیدا ہو جانے والے چند حاسدوں کی وجہ سے ہوا تھا۔ ان کی طرف سے اڑنے والے حسد کے شرارے دن رات اس کے خرمن سکون وچین اور وقار کو جلاتے چلے جا رہے تھے۔ وہ خود تو نااہل تھے ہی لیکن احمد کی قابلیت وشہرت اور ہر دلعزیزی سے خوش ہونے اور اس کی قدر کرنے کی بجائے اس کو نیچا دکھانے اور بے عزت کرنے کے لیے نت نئی سازشوں کے تانے بانے بننے میں مصروف تھے۔ شاعر کے اس شعر کے مصداق:

اپنی محرومی کے احساس سے شرمندہ ہیں!
خود نہیں رکھتے تو اوروں کے بجھاتے ہیں چراغ

ایک دن احمد نے سوچا کہ یہاں تو میرے حاسد مجھے ٹکنے نہ دیں گے کیوں نہ اس حصار سے باہر نکل کر قسمت آزمائی کر دیکھوں۔ یہ سوچتے ہی اس نے اس تعلیمی ادارہ کو چھوڑ دیا اور اللہ سے دعا کی: اے اللہ کریم! میں حاسدوں کے شر سے بچنے کے لیے اس ادارہ کو چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ مجھے تیرے سوا کسی کا سہارا نہیں۔ میری التجا ہے کہ مجھے رسوا نہ ہونے دینا کہ کل حاسد تالیاں بجائیں اور آوازے کسیں کہ دیکھا! ہم نے ہی تجھے سفید ہاتھی کی طرح پال رکھا تھا، تو اس قابل نہیں کہ کہیں فٹ ہو سکے۔ اے اللہ! تو رازق ہے میری روزی کا مہربانی فرما کر حلال ذریعہ سے اس سے بہتر بندوبست کر دے۔

اب وہ اسلام آباد چلا آیا۔ یہاں اس کی ملاقات ایک میڈیسن کمپنی کے مالک سے ہوئی۔ مالک کو جب پتا چلا کہ جاب کا طلب گار قرآن پاک مع تفسیر جانتا ہے تو اس نے کہا کہ آپ میری کمپنی میں کام کریں۔ آپ کو دس ہزار روپیہ تنخواہ دوں گا لیکن ایک شرط ہے! ...... وہ کیا؟ وہ یہ کہ مجھے اپنا شاگرد بنا لیں اور روزانہ قرآن کی تفسیر کا سبق دیں، میں آپ سے پڑھوں گا۔ یوں روزانہ استادی شاگردی کا سلسلہ چل پڑا۔ اللہ کریم نے احمد کو کمپنی میں سب سے زیادہ عزت دی۔ وہ چند ماہ میں ہی مالک کے بہت قریب پہنچ گیا۔ اب مالک ہر اہم کام اس سے مشورہ لے کر کرتا۔ یہ بات وہاں کے کچھ پرانے کام کرنے والوں کو محسوس ہوئی۔ وہ آپس میں کہنے لگے: یہ مولوی کل آیا اور آج اس نے بغیر کسی سپورٹ (Support) اور سورس (Source) کے مالک تک رسائی حاصل کر لی۔ ہم آج تک اس سے محروم ہیں۔

اب مالک نے احمد سے درخواست کی کہ مہربانی فرما کر اگر ہو سکے تو کچھ وقت نکال کر کمپنی کے اکاؤنٹس پر ایک نظر ڈال لیا کریں تو میں آپ کا ممنون ہوں گا۔ احمد نے ایک دن بتایا کہ ریکارڈ میں ایک ۷۹ ہزار روپیہ کے چیک کا اندراج نہیں۔ اللہ جانے وہ کون لے گیا؟ مالک نے جب اکاؤنٹس کے انچارج سے پوچھا تو اس نے بڑے رازدارانہ انداز میں کہا کہ

جو نیا مولوی آیا ہے اور بڑا پارسا و متقی بنا پھرتا ہے، یہ اسی کا کارنامہ ہوگا۔ اس نے چیک اڑا کر کیش کروا لیا ہوگا۔ مالک نے احمد کو کچھ نہ بتایا البتہ اتنا کہا کہ اس چیک کا کھوج لگائیں۔ احمد بینک گیا تو پتا چلا کہ یہ چیک شعبہ اکاؤنٹس کا انچارج خود کیش کروا چکا ہے۔ بینک کے ریکارڈ میں اس کے دستخط موجود ہیں۔ احمد نے مالک کو رپورٹ دی۔ جب اکاؤنٹس انچارج کو پتا چلا تو یہ حاسد نوکری چھوڑ کر بھاگ گیا اور بعد میں چند قسطوں میں چیک کی رقم کمپنی کو واپس کی اور جان چھڑائی۔ اس کے بعد مالک کا اعتماد احمد پر مزید بڑھ گیا۔

ایک ماہ بعد ہی مالک نے کہا کہ احمد بھائی! میری خواہش ہے کہ ہم سالانہ کی بجائے ہر ماہ جو ایک لاکھ پچیس ہزار روپیہ ٹیکس کی قسط ادا کرتے ہیں وہ آپ اپنے ہاتھوں ادا کر دیا کریں۔ احمد بینک چلا جاتا اور قسط جمع کرواتا۔ ایک دفعہ بینک کے ایک ذمہ دار نے اسے اشارہ کر کے بلایا اور کہا کہ آپ ہر ماہ آ کر لائن میں لگے ہوتے ہیں' آپ کو ایک منافع والا سودا بتاؤں؟ احمد نے کہا ''بتائیں'' اس نے کہا کہ آپ صرف پچیس ہزار روپیہ مجھے دیا کریں باقی رقم ہر ماہ اپنے پاس رکھیں جبکہ میں آپ کو ٹیکس وصولی کی رسید ایک لاکھ پچیس ہزار ہی کی جینوئن بنا کر دیا کروں گا۔ احمد بھائی نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ اس کا مجھے فائدہ نہیں بلکہ نقصان ہے، اس لئے کہ یہ بے ایمانی ہے اور یوں میں دنیا میں تو چند دنوں میں امیر ہو جاؤں گا لیکن قیامت میں غریب ہو کر جہنم کا ایندھن بن جاؤں گا، لہٰذا میں ایسا نہ کروں گا۔ میرے لئے یہ سودا نفع کی بجائے نقصان کا باعث ہے۔

مالک کو جب اس کارروائی کا علم ہوا تو وہ احمد کا والا وشیدا اور مزید گرویدہ ہو گیا۔ اس کے حکم سے احمد کو موٹر سائیکل لے کر دے دی گئی۔ اب موٹر سائیکل کی میٹر ریڈنگ چیک کی جاتی اور رننگ کے مطابق پٹرول کا بل دے دیا جاتا۔ ایک دفعہ میٹر ریڈنگ چیک کی گئی تو ۶۰۰ روپے کا پٹرول استعمال ہوا تھا جبکہ احمد صرف ۲۰۰ روپے طلب کر رہا تھا۔ مالک کو پتا چلا وجہ دریافت کی گئی تو احمد نے کہا: بات دراصل یہ ہے کہ دفتر کے کام کے لیے میں نے صرف ۲۰۰ روپے کا پٹرول استعمال کیا جبکہ باقی میرے گھریلو اور ذاتی کاموں اور بچوں کو سکول

وغیرہ چھوڑ کر آنے کے لیے استعمال ہوا۔ چونکہ میرا حق دفتر کے لیے استعمال کیے گئے پٹرول پر بنتا ہے۔ باقی میرا ذاتی معاملہ ہے۔ اس بنا پر میں نے ۲۰۰ روپے طلب کیے۔ مالک نے اس کی ایمانداری سے متاثر ہو کر اپنے عملے کو حکم دیا کہ اب احمد بھائی جتنا بھی پٹرول استعمال کریں ان سے حساب نہیں لینا اور نہ میٹر ریڈنگ ہی چیک کرنی ہے۔ دفتر کے یا ذاتی کاموں کے لیے جتنا بھی پٹرول استعمال کریں اس کا بل دفتر دے گا۔

یہ اللہ کی رحمتیں تھیں جو احمد پر سایہ فگن تھیں اور وہ روزانہ اللہ کا شکر ادا کرتا کہ اس نے حاسدوں کی کارروائیوں سے بچا کر اسے عزتوں کی بلندیوں پر سرفراز کیا ہے۔ ایک دن مالک نے کہا کہ احمد بھائی اسلام آباد میں فلاں مقام پر ہمارا ایک پلازہ تعمیر ہو رہا ہے۔ کنسٹرکشن منیجر چھٹی پر ہے۔ مہربانی کر کے دو دن کے لیے آپ وہاں چکر لگا آیا کریں۔ گاڑی اور ڈرائیور آپ کو لے جانے اور واپس لانے کے لیے حاضر ہے۔ احمد جب وہاں پہنچا، کام چیک کیا تو ایک پلاٹ جس میں گڑھے پڑے ہوئے تھے اسے ہموار کرنے کا کام تھا۔ آدھا ہو چکا تھے، آدھا باقی تھا۔ آدھے پلاٹ کی ہمواری پر ۴ ہزار روپے صرف ہو چکے تھے اور آج کام بند تھا۔ احمد نے اندازہ لگایا کہ اس کام پر مزدوروں کو لگانے کی بجائے دیہاتی طریقے سے سستا اور جلدی کام ہوسکتا ہے، لہٰذا اس نے ایک ٹریکٹر والے کو بلایا۔ اس نے کام کرنے کے فی گھنٹہ تین سو روپے مانگے تو اسے کام پر لگا دیا گیا۔ یوں دو گھنٹوں میں اس نے ٹریکٹر کے ساتھ ساری زمین ہموار کر دی اور چھ سو روپیہ لے کر چلتا بنا۔ مالک کو پتا چلا تو بہت خوش ہوا کہ احمد کی وجہ سے اس کا وہ کام جو کئی دنوں میں ہونا تھا اور اس پر پیسہ بھی خوب خرچ ہونا تھا، صرف دو گھنٹے میں چھ سو روپے میں ہو گیا۔

اب وہ ہر طرح سے احمد کی امانت، دیانت، صداقت، شرافت اور لیاقت و قابلیت کا معترف ہو چکا تھا۔ اس نے سارے عملے کو بہتر بنانے کے لیے احمد بھائی سے کہا کہ وہ ان کو روزانہ ایک حدیث کا درس دے دیا کریں تو مہربانی ہوگی۔ یوں صبح وہ خود تفسیر قرآن کا سبق پڑھتا اور پھر سارا عملہ احمد کا شاگرد بن جاتا۔ مالک نے اس کی تنخواہ بڑھا کر ۱۰ سے ۱۲ اور پھر

۱۲ سے ۱۶ ہزار کر دی اور اب آخری اطلاعات کے مطابق مالک نے اس کی تنخواہ ۲۵ ہزار کر دی ہے اور اس کو ایک نئی گاڑی لے کر دے دی ہے۔ ساتھ ایک ڈرائیور بھی ہے۔ اس کو ہر طرح سے اجازت دی گئی ہے کہ وہ گاڑی کو اپنے ذاتی اور دفتری امور کی انجام دہی کے لیے بھی استعمال میں لائے۔ کمپنی کی طرف سے بہترین گھر کا بندوبست بھی کر دیا گیا ہے۔ اب کمپنی میں نئے عملے کی بھرتی اور اہم فیصلے اس کے مشورے سے کیے جا رہے ہیں۔ اللہ کریم نے اپنے اس بندے کو وہ شان و شوکت دی ہے کہ دیکھنے والے دیکھتے رہ جاتے ہیں اور اس کی قسمت پر رشک کرتے ہیں۔ یہ وہی جوان ہے کہ لاہور میں جسے اس کے حاسد کھوٹا سکہ اور سفید ہاتھی کہا کرتے تھے۔

قارئین! ساری تفصیلات بتانے کا مقصد یہ ہے کہ اس دنیا میں رحمانی و شیطانی سوچ و فکر اور عمل کے حامل افراد ہمہ وقت برسر پیکار ہیں۔ اگر آپ کے ارد گرد بھی کوئی حاسد ہے تو گھبرایئے مت، عملی جدوجہد کیجئے، آگے بڑھیے اور اللہ سے رابطہ مضبوط بنایئے۔ اللہ کریم آپ کو کبھی بھی رسوا نہ کرے گا۔ آپ حاسدوں کے شراروں سے بھسم ہونے سے بھی بچ جائیں گے اور بلند مقام و مرتبہ بھی پا لیں گے۔ پچھلے دنوں میری احمد بھائی سے ملاقات ہوئی تو میں نے ان سے پوچھا: احمد بھائی! آپ تو حاسدوں کے چنگل میں پھنسے ہوئے تھے۔ آپ نے ان کے وار سے اپنے آپ کو کیسے محفوظ کیا اور یہ بلند مقام و مرتبہ اور عزت کیسے حاصل کی؟ وہ مسکرا کر کہنے لگے کہ میں نے حاسدوں کے حملوں کی طرف توجہ دینے کی بجائے مالک کائنات' خالق کائنات سے رابطہ کیا۔ ہر مشکل و پریشانی اور حاسدوں کی ہر کارروائی پر اسے ہی پکارا اور دعا کی کہ یا اللہ! مجھے ان کے شر سے اور ضائع ہونے سے بھی بچا۔ میرے لئے کوئی بہتر متبادل ذریعہ پیدا فرما دے۔ اللہ کریم نے میری آہ سحر گاہی کو سنا اور شرف قبولیت بخشا اور مجھ گناہگار کو اپنی رحمتوں سے نواز دیا۔ میں نے کہا: احمد بھائی! کوئی خاص ترکیب جس سے آپ نے حاسدوں کے شر سے اپنا دفاع کیا ہو؟ کہنے لگے: ہاں! ایک خاص طریقہ کار ہے جو میں نے اپنایا تو کامیاب ہو گیا۔ وہ میں نے ابھی تک آپ کو نہیں

بتایا۔

قارئین! ممکن ہے آپ بھی حاسدوں کے شر سے جان بلب ہوں تو اس سے تحفظ کے لیے احمد بھائی کا بتایا ہوا طریقہ یقیناً تیر بہدف ہے۔ اب میں آپ کو وہ طریقہ و ترکیب بتا دوں گا، آپ بھی نوٹ کرلیں۔ عمل کریں اور سکون و راحت کے جھولے جھولیں۔ احمد بھائی بتانے لگے کہ:

(۱) میں نے حاسدوں سے بچنے کے لیے سلطان مدینہ، سرور قلب و سینہ کی سیرت و تعلیمات کو سامنے رکھتے ہوئے سب سے پہلے آسمان و زمین کے مالک سے استعاذہ کیا یعنی حاسدوں کے شر سے اللہ کی پناہ طلب کرنے کی دعائیں اور اذکار صبح و شام کرنے لگا۔

(۲) حاسدوں کے ہر وار اور ہر کارروائی پر میں واویلا، شور وغوغا اور آہ و بکا اور شکوہ و شکایت کرنے کی بجائے کامل طور پر صبر کرنے لگا۔ ان کے خلاف ہر طرح کی انتقامی کارروائی کرنے سے اپنے آپ کو روکے رکھا۔

(۳) میں نے اپنے آپ کو اپنے کاموں میں مصروف کرلیا، میں اپنے حاسدوں کی کسی بھی حرکت اور کارروائی پر ان کے اس طرز عمل کو اپنے اوپر سوار نہ کرتا بلکہ کسی طرح ان کے متعلق سوچتا بھی نہ تھا کہ وہ کہاں ہیں؟ کیا کررہے ہیں یا کیا نہیں کررہے؟ وغیرہ۔

(۴) میں تمام آمدہ پریشانیوں کے متعلق اللہ کریم پر ہی بھروسا و توکل کرتا۔ یہ توکل علی اللہ مجھے تمام پریشانیوں اور ذہنی فکروں سے نجات دے دیتا۔ میں اللہ سے فریاد کرتا کہ میرے مولا! میرا صرف تجھ پر توکل ہے تیرے علم اور قدرت سے باہر ہوکر کسی کی طرف سے کسی کو نفع و نقصان نہیں پہنچ سکتا لہٰذا تو ہی مجھے بچا اور میری حفاظت کر۔

(۵) میں کسی بھی سرزد ہونے والے چھوٹے سے چھوٹے گناہ پر اپنے رب سے فوراً استغفار کرتا، معافی مانگتا اور یوں اس کو منانے لگ جاتا اور آئندہ اس غلطی کے ارتکاب سے رک جاتا۔

(۶) صدقہ بلاؤں کو ٹالتا ہے اس لئے میں ہر ماہ اپنی استطاعت کے مطابق مستحقین

میں صدقہ و خیرات کرتا اور اس کے حیرت انگیز اثرات ظاہر ہوتے دیکھتا۔

(۷) میں اپنے سے حسد کرنے والوں سے نفرت کرنے کی بجائے ان سے ہمدردی کے جذبات رکھتا اور ان کو ایک موذی مرض کے مریض سمجھ کر اللہ کے حضور ان کی شفاء و صحت یابی کے لیے دعا کرتا اور ان کے حسد کے مہلک شراروں کو احسان کے ٹھنڈے پانیوں سے بجھانے کی کوشش کرتا۔ میں ان سے نہایت حسن سلوک اور خوش اخلاقی و خوش طبیعت سے ملتا، اگر کسی کو میری مدد درکار ہوتی تو اس کی مدد (فقط رضائے الٰہی کے لیے) کرتا اور بعض حاسدوں کو تحفے تحائف بھی دیتا۔ ایسا کرتے ہوئے اگرچہ طبیعت پر بہت گراں گزرتا، بہت مشکل محسوس ہوتا' زہر ہلاہل پینے کے مترادف محسوس ہوتا...... لیکن جب رضائے الٰہی کے حصول کا جذبہ پروان چڑھتا تو انا پرستی کے سب بت ٹوٹ جاتے' دل آمادہ ہو جاتا اور میں اپنے ان احسان وسلوک کے کاموں میں لگ جاتا۔

اس سنہری لائحہ عمل پر عمل پیرا ہونے سے اللہ نے میری جان حاسدوں سے چھڑوائی، مجھے بلند مقام و مرتبہ اور عزت سے نوازا۔ بہت سارے میرے حاسد اپنے حاسدانہ رویوں سے باز آ گئے، چند ایک ابھی بھی باقی ہیں۔ وہ میری موجودہ مضبوط پوزیشن دیکھ کر پہلے سے بھی زیادہ شدت سے حسد کی آگ کے شعلوں پر لوٹ پوٹ ہو رہے ہیں' ہاتھوں پر کاٹ رہے ہیں، سڑ رہے ہیں اور سڑ سڑ کر مر رہے ہیں' اپنے اعمال بھی برباد کر رہے ہیں لیکن پھر بھی اپنی ڈگر سے نہیں ہٹ رہے۔ شاید ان کی قسمت میں ہی جلنا، بھننا، سڑنا ہے۔ جیسا کہ ایک شاعر نے کہا ہے:

قسمت میں کیا قسام ازل نے
جس چیز کے جو شخص قابل نظر آیا

میرے پیارے اسلامی بھائیو اور بہنو!

اگر آپ بھی کسی بدنصیب حاسد دوست یا سہیلی کے حسد اور نظر بد کا شکار ہیں...... مضطرب و پریشان ہیں...... بے کل و بیقرار ہیں...... تو گھبرائیے نہیں...... احمد بھائی نے

آپ کو اپنا تجربہ شدہ خفیہ طریقہ وترکیب بتا دی ہے..... اس کو اپنائیے، اس پر آج ہی عمل کیجئے اور اپنی زندگی کو پرسکون، پرراحت اور پررونق بنائیے......

کہ..... اسی میں ہی حاسدوں کی موت ہے۔ اسی میں آپ کی حیات ہے۔ ان شاء اللہ۔

❀❀❀❀

ان کا قصور کیا ہے؟......

یہ گوجرانوالہ کا مین روڈ ہے' دونوں طرف سے ٹریفک تیزی سے رواں دواں ہے۔ گاڑیوں' موٹر سائیکلوں' ویگنوں' بسوں' کاروں' جیپوں اور رکشوں کا شور اس قدر ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ اچانک ایک غیر معمولی آواز ابھرتی ہے...... دھڑام...... اور پھر یک دم گاڑیاں بریکیں لگاتی ہیں اور ایک دوسرے سے ٹکراتے ٹکراتے بچتی ہیں اور پھر رک جاتی ہیں۔ ٹریفک کیوں رک گئی...... کیا ہوگیا ہے!؟؟ کتنی ہی استفہامیہ اور سوالیہ آوازیں ابھریں...... کچھ دیر بعد گاڑیوں والے اپنی سواریاں چھوڑ کر وجہ دریافت کرنے کے لیے آگے ہی آگے سڑک پر بڑھے کہ اچانک ایک ہجوم دیکھا...... لوگ دائرے کی شکل میں گم سم کھڑے ہیں...... آگے بڑھ کر دیکھا تو ایک رونگٹے کھڑے کر دینے والا منظر کلیجہ پھاڑ رہا تھا۔ ایک ادھیڑ عمر شخص...... کسی کا بھائی...... کسی کا بیٹا...... کسی کا باپ...... خاک وخون میں لت پت آخری سانسیں لے رہا تھا...... ہر طرف خون لائنوں میں پھیل کر جم رہا تھا...... کس کی دنیا اندھیر ہوگئی...... کس کا سہاگ اجڑ گیا...... کس کی امنگوں' آرزوؤں اور تمناؤں کی دنیا لٹ گئی...... یہ کسی کو معلوم نہیں تھا...... خون سے لت پت لاشے کو تھوڑی دیر بعد رسمی کارروائی کے بعد اٹھا لیا گیا۔ زندگی کا کارواں پھر چل پڑا...... اسی سڑک پر جہاں چند لمحے قبل لوگ افسردہ تھے...... ساکن تھے...... اب چل چلاؤ تھا...... بھاگ دوڑ تھی...... ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی ریس لگی ہوئی تھی...... ہر طرف ہارنوں کے شور اور ٹائروں کی گھسٹ کا راج تھا......
چند لمحات بعد...... کسی کو کچھ پتہ نہ تھا...... کہ...... یہاں کچھ ہوا ہے...... لیکن اس چہل پہل میں...... رونق میں...... بھاگ دوڑ میں زندگی کے رواں دواں سفر میں...... غرض

کی دنیا کی نفسا نفسی کے عالم میں کلثوم کی دنیا لٹ چکی تھی۔ اس کے ارمان بکھر چکے تھے۔ مستقبل تاریک و اندھیر ہو چکا تھا۔ خوشیاں غموں میں بدل چکی تھیں...... کہ اس کا پیار کرنے والا...... لاڈ کرنے والا...... چھوٹے ننھے منے بچوں کی سی شفقت کرنے والا...... جلدی ہی اس کے ہاتھ پیلے کرنے کی خواہش میں...... رات دن کوشاں، فرحاں شاداں رہنے والا...... سر کا سایہ...... مونس وغمگسار اس پر نثار وقربان ہونے والا...... اس کا...... شفیق باپ...... اس سے روٹھ کر...... ہمیشہ ہمیشہ کے لیے، منوں مٹی کے نیچے جا سویا تھا۔ چند گھنٹوں تک دنیا والوں نے اس کے سر پر رسمی طور پر ہاتھ رکھا...... اور پھر اپنے اپنے کاموں کا بہانہ کر کے چلتے بنے، اور شام تک وہ بھری دنیا میں نیلی چھت کے نیچے اپنی غمزدہ بے ہوش ماں کے ساتھ اکیلی رہ گئی۔ غموں، پریشانیوں، مصیبتوں، کلفتوں، رنجشوں کے موقعوں پر اس کو حوصلہ دینے والا اور ڈھارس بندھوانے والا باپ تو اللہ کے پاس جا چکا تھا...... اب وہ کس سے ہمدردی کے بول سنتی...... اکیلی بالکل اکیلی رہ گئی تھی وہ......

دن بیت گئے...... ایک دن ماموں کو لوگوں کے کہنے پر خیال آیا کہ اب باپ کے بعد اس کی ذمہ داری ہے، اس کے ہاتھ پیلے کردوں۔ اس نے اپنا فرض یوں نبھایا...... کہ اپنے پہلے سے شادی شدہ بیٹے اور چند افراد کو ساتھ لے کر ان کے غریب خانہ پر آیا اور کلثوم کا نکاح اپنے بیٹے کے ساتھ پڑھوانے کے بعد اپنے گھر لے گیا۔ گھر جاتے ہی بیٹے نے بد نصیب دلہن سے بات کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ نہ اس کی شکل دیکھی...... کہ جو اس کو اللہ نے چاند کو شرما دینے والی باحیاء صورت عطا کر رکھی تھی...... بہترین صحت، بیماری و لاغری کا دور تک نام ونشان نہیں۔ ماموں کے بیٹے (خاوند) نے گھر سے بھاگ کر کہیں ڈیرہ لگا لیا اور کہا کہ اس وقت گھر آؤں گا جب اس (دلہن) کو گھر سے نکالو گے۔ باپ نے کہا کہ تم دلہن بیٹی کو بساؤ تو سہی اس کا خرچہ میں برداشت کروں گا، اس کی تم فکر نہ کرو۔ بیٹا پھر بھی اپنی بات پر اڑا رہا حتی کہ اس کو...... یتیم کو...... غموں کی ماری، دکھیاری...... اور بیچاری کو...... اس کی والدہ کے گھر بھیج دیا گیا...... یہیں پر بس نہیں بلکہ اس کے پیچھے طلاق نامہ بھی بھیج دیا۔ باپ کے حادثے کے بعد یہ اس کے اپنے ساتھ اندوہناک حادثہ تھا...... کہ جس نے اس کو

غموں' دکھوں اور طعنوں کی سولی پر لٹکا دیا۔ پہلی بات تو یہ کہ اگر اس کو یوں ہی داغدار کرنا تھا ..... رسوا اور برباد کرنا تھا ..... اور طلاق جیسا بدنما داغ اس کی سفید چادر پر لگانا تھا ..... تو اس کو دلہن بنا کر ..... کیوں لے گئے تھے ..... اس یتیم کے غموں پر مرہم رکھنے کی بجائے اس کو مزید زخمی کیوں کر دیا ..... !؟؟

دن پر لگا کر گزرنے لگے ..... اور اپنے مرحوم خاوند کے پاس جانے کے بلاوے کی منتظر' اس کی غمزدہ بیوہ ماں کے لرزتے ہاتھ ..... اللہ کے دربار میں لحہ بہ لحہ اٹھنے لگے کہ ..... اے مالک کائنات! میری بچی کا گھر بسا دے ..... ایک دن گجرات سے ایک رشتہ آیا۔ بڑے بڑے قد آور لوگوں نے حامی بھری کہ یہ ہماری بیٹی ہے' گجرات جا کر خوش رہے گی' اسے کوئی غم نہ آئے گا ..... ہم اس کے ذمہ دار ہیں۔ ان بڑوں کی یقین دہانی اور ضمانت پر کلثوم ڈرتی ڈرتی ایک بار پھر دلہن بن کر گجرات چلی گئی۔

اب وہ ہر وقت خوشیوں کی آمد کی منتظر رہتی کہ کب اس صحن میں مسکراہٹوں کے پھول کھلیں گے۔ بچوں کی کلکاریوں کی شرارتی آوازیں گونجیں گی ..... شور شرابہ' مار کٹائی' لڑائی وشکوے شکایتیں' پڑھنے پڑھانے سکول جانے اور ان کے واپس آنے کا انتظار' بچوں کے کپڑوں کے ڈیزائن' ان کا رنگ' میچنگ اور یونیوں کا انتخاب وغیرہ کے مناظر اس کے ذہن کے پردہ سکرین پر گھومتے رہتے ..... کبھی وہ سوچتی اللہ مجھے اولاد کی نعمت سے نوازے گا تو بچوں اور بچیوں کو بڑا کر کے کیا بناؤں گی' کیا سکھاؤں گی !!؟؟ وغیرہ وغیرہ۔ انہی خوشگوار سوچوں میں اس کے تین سال گزر گئے لیکن ہر سال ایک نئی آزمائش کا مرحلہ اس وقت آتا جب اسے یہ خبر سنائی جاتی کہ اس کا بچہ گر گیا ہے' حمل ساقط ہو گیا ہے .....

آخر ایک دن اس غموں کی ماری بہن کے حواس پر اس وقت بجلی گری جب اس کو لیڈی ڈاکٹر نے سب کے سامنے یہ خبر دی کہ طبی نقطہ نظر سے ایک ایسی بیماری اس کو لاحق ہو چکی ہے جس کی بنا پر وہ کبھی بھی ماں نہ بن سکے گی' اس سے آگے اللہ بہتر جانتا ہے۔ یہ سن کر اس کا سر گھوم رہا تھا، اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ پہاڑ کی چوٹی سے گہری کھائی میں گر کر ریزہ ریزہ ہو گئی ہے' جیسے بھری دنیا میں وہ اکیلی کسی سنسان جنگل میں میں کھڑی ہو۔

اب بے اختیار اس کی آنکھوں سے چھم چھم آنسو گر رہے تھے...... اور وہ پھوٹ پھوٹ کر بچوں کی طرح رو دی۔ اس کے سہانے سپنے ٹوٹ چکے تھے...... اس کے مچلے ارمان محرومیوں میں بہہ گئے تھے...... وہ ساحل پر پہنچ کر بھی سیرابیوں کے لیے تڑپ رہی تھی...... تقدیر کے لکھے کو کون ٹال سکتا ہے۔ اب اس خبر کے بعد گھر میں اس کی رہی سہی حیثیت بھی ختم ہونے لگی۔ ماں کو خبر پہنچی تو اس نے فراخدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے' سینہ پر پتھر رکھ کر اپنے داماد کو کہا: اگر اللہ تعالیٰ کی یہی مرضی ہے کہ کلثوم کو اولاد سے محروم رکھ کر آزمائے تو ہم تجھے اجازت دیتے ہیں کہ تم دوسری شادی کر لو۔ اس جذبہ کے بعد تو اس اللہ کے بندے کو چاہیے تھا کہ وہ اپنی رفیقہ حیات اور جیون ساتھی کو حوصلہ دیتا' ڈھارس بندھاتا کہ صبر کرو میں تمہارا ہر ممکن علاج کرواؤں گا' ہر طرح سے تمہارا خیال کروں گا' تم آنسو نہ بہاؤ' دل چھوٹا نہ کرو' اللہ کریم تمہیں آرام دے گا اور وہ تیری گود ضرور ہری بھری کر دے گا۔ ان شاء اللہ۔

لیکن اس نے دکھوں کی ماری ماں کے پہلے سے زخمی اور کرچی کرچی دل پر پہلی ہی چوٹ یہ کہہ کر لگائی کہ: میں دوسری شادی ضرور کروں گا لیکن کلثوم کو طلاق دینے کے بعد۔ اس کے گھر میں موجود ہوتے ہوئے میں دوسری بیوی ہرگز نہ لاؤں گا۔

ماں نے ہاتھ جوڑ کر کہا: بیٹا! میری بچی دوبارہ زخم کھانے کی متحمل نہیں...... تم اس بدنصیب کو طلاق نہ دینا...... یہ ساری زندگی اس چھت کے نیچے تیرے نام کے ساتھ...... ایک نوکرانی کی حیثیت سے گزار دے گی...... بدلے میں تم اسے صرف دو روٹیاں صبح و شام دے دینا...... بس اور کچھ نہیں...... لیکن انور نے صاف صاف جواب دیا کہ اماں ایسا نہیں ہو سکتا، یہ اس گھر سے جائے گی تو ہی دوسری لاؤں گا۔

اب حالت یہ ہے کہ انور اور اس کے گھر والے کلثوم پر بہت زور دے رہے ہیں کہ تم اپنی ماں کے پاس چلی جاؤ' لیکن وہ نہیں جا رہی۔ کسی نے جب اس سے کہا کہ تم چند دن اپنی ماں کے پاس گوجرانوالہ گزار آؤ تو اس نے روتے ہوئے کہا: ''یہی تو یہ چاہتے ہیں کہ میں چلی جاؤں اور یہ پیچھے سے طلاق نامہ بھیج دیں' سو میں نہیں جاتی۔''

اب تو یہی آثار نظر آ رہے ہیں کہ اگر کلثوم وہاں سے نہ نکلی تو یہ زبردستی نکال دیں گے

اور زبردستی طلاق دے دیں گے۔ کلثوم ہے کہ رات دن دکھوں کی سیج پر جینے اور مرنے کی کیفیت کے درمیان سولی پر لٹکی ہے۔ اب گجرات کے وہ بااثر افراد کہ جنھوں نے رشتہ کروایا تھا' چپ سادھے بیٹھے ہیں۔ کلثوم نے کہا ہے کہ اگر طلاق کی غلاظت سے میرے دامن کو داغدار کیا گیا تو میں خودکشی کرلوں گی۔

میری بہن! شاید تو ہمارا پیغام پڑھ رہی ہو، جان لے کہ انسان عارضی طور پر دکھوں، مصیبتوں سے نجات اور سکون کی تلاش میں خودکشی کا راستہ اختیار تو کر لیتا ہے' لیکن اس سے ہمارے رب اور اس کے آخری رسول ﷺ نے منع کیا ہے۔ اس لئے یہ حرام فعل سکون کا باعث نہیں بلکہ اس دنیاوی پریشانی والے عذاب سے بھی بڑا عذاب ہے، ایسا کرنے کا مطلب تو دنیا کے ساتھ ساتھ عاقبت برباد کرنے کے مترادف ہے۔ بھلا سوچیے ......

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کر بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے؟

قارئین محترم! سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسے حالات پیدا ہو جانے میں ان بے چاری بہنوں اور بیٹیوں کا قصور کیا ہے؟ وہ تو مجبور محض ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ جب بیٹیاں پیدا ہوتی ہیں تو ''رحمت'' سمجھی جاتی ہیں۔ ان ننھے منے پھولوں اور کلیوں ہی سے ہمارے گھروں کا گلشن مہکتا ہے۔ باپ بھائی ان کو ہنستا کھیلتا، مسکراتا اور خوش ہوتا دیکھ کر ہمیشہ دل میں یہی دعا دیتا ہے کہ...... اے پیاری بیٹی! ...... اے پیاری بہنا! ...... اللہ تجھے ہمیشہ ایسے ہی خوش رکھے۔ ان کی خوشیاں ماں باپ کو نہال اور ان کے غم انہیں نڈھال اور بے حال کر دیتے ہیں۔ ان غموں سے وہ قبروں میں جا پہنچتے ہیں۔ کیا ان سے بہانے بنا کر برا سلوک روا رکھنا، ان کو اذیت دینا، ستانا اور پھر دلہا کی بہنوں اور ماؤں کا بھائی اور بیٹے کو ذرا ذرا سی بات پر اکسا کر معاملہ طلاق تک پہنچا دینا کہاں کا انصاف ہے؟...... کہ یہ طلاق ایک بہن کے لیے سب سے زیادہ اذیت ناک زخم ہے...... اللہ کے رسول ﷺ نے اس کو اس حد تک ناپسند کیا کہ جب ان کی بیٹی کو طلاق دی گئی تو آپ کے رحمت و مروت بھرے دل کو درد کی ایسی ٹھیس پہنچی کہ بے اختیار آپ کے ہاتھ اٹھ گئے اور آپ نے زبان نبوت سے اللہ کے حضور اپنی

مظلوم بیٹی کے حق میں یہ فرمایا:

''اے اللہ!...... میری بیٹی کو طلاق دینے والے ظالم پر اپنے درندوں میں سے کوئی درندہ مسلط کر دے جو اسے چیر پھاڑ کر رکھ دے۔''

پھر ایسا ہی ہوا کہ آپ کی بیٹی کو طلاق دینے والے کو ایک شیر نے چیر پھاڑ کر رکھ دیا۔

میری بہنو اور بھائیو!...... آپ بھی کسی کو طلاق کا تیر مارنے سے پہلے سوچ لیں کہ کہیں مکافات عمل کا کوڑا آپ پر ہی نہ برس پڑے...... کہیں آپ کے اس فعل کی وجہ سے آپ کی بیٹی...... آپ کی بہن...... کو بھی ایسی ہی صورت حال کا سامنا نہ کرنا پڑ جائے...... سوچیں تو سہی...... یہ اللہ کی بندی پہلے لڑکپن میں گھر بار سنبھالتی ہے...... ماں کی مدد کرتی ہے...... پھر بھائیوں کی خدمت کرتی ہے...... اس کے بعد باپ کی بھی...... شادی سے پہلے سارے خاندان کی...... اور جب شادی ہو جاتی ہے تو...... پھر خاوند کی، خادمہ و نوکرانی اور کنیز بن جاتی ہے...... اس کے خاندان کی غلام بن جاتی ہے...... سب کی خدمت کرتی ہے...... دیور، جیٹھ، بھابیوں، جٹھانیوں، نندوں وغیرہ کو ہر طرح سے خوش رکھنے کے لیے ہزار جتن کرتی ہے...... بغیر کسی لالچ کے...... پھر اپنے بچوں بچیوں کی...... ان کی شادی کرتی ہے...... پھر بچوں بچیوں کی اولاد کی خادمہ بن جاتی ہے...... اتنی دیر میں اوپر سے بلاوا آنے کا وقت ہو جاتا ہے۔ ذرا سوچیں...... اس بے چاری کو زندگی بھر سکون اور سکھ کا سانس لینا کہاں نصیب ہوا؟...... سب کی خدمت کے بعد اس قابلِ احترام ہستی کو آرام و سکون اور کچھ انعام و احترام دینے کی بجائے آپ بدلے میں...... اسے طلاق کا،...... جدائی...... اور ہمیشہ کی جدائی کا زہریلا تیر ماریں...... زخمی کریں، مرغ بسمل کی طرح تڑپائیں...... یہ کہاں کا انصاف ہے۔ فیصلہ خود کر لیں، اس کو سکون کس نے دینا ہے؟ کیا کائنات کی رونق، اس قابل احترام ہستی کو...... آرام و چین اور سکون...... قبر کی مٹی ہی دے سکتی ہے؟

پرائی امانت

مسئولیت، ذمہ داری اور فرض کی ادائیگی کے احساس کا تقاضا ہے کہ آدمی ہمیشہ اپنی ذاتی اور ملکیتی چیز کی اتنی فکر نہیں کرتا، اگر اس کی چیز نقصان کا شکار ہو جائے یا ضائع ہو جائے تو تب بھی وہ اس قدر فکرمند و پریشان نہیں ہوتا کہ جتنی کسی دوسرے کی امانت رکھی گئی چیز کے تلف ہونے یا خراب ہونے پر اسے تکلیف ہوتی ہے، اس لیے کہ اپنی چیز کے متعلق اسے پتا ہوتا ہے کہ کون سا کسی نے پوچھنا ہے، سرزنش کرنی یا ڈانٹ ڈپٹ کرنی ہے۔ وہ یہ سوچ کر صبر کر لیتا ہے کہ اپنی چیز ہی تھی، ضائع ہوگئی یا اس میں کسی طرح کا اگر نقص آ گیا تو کوئی بات نہیں، اللہ اور دے دے گا۔ لیکن یہی معاملہ اگر کسی کی اس کے پاس رکھی ہوئی امانت کے ساتھ پیش آ جائے یا کسی کی امانت میں ذرہ برابر کی کمی بیشی آ جائے تو وہ نہایت فکرمند و پریشان ہو جاتا ہے کہ اب کیا جواب دوں گا۔

یاد رکھیں! ہر انسان کے ساتھ بیٹیوں کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے، وہ پرائی امانت ہیں، ایک دن انہوں نے آپ کے گلشن کو، آپ کے آنگن کو، آپ کی محفل کو چھوڑ کر پرائے دیس چلے جانا ہے۔ یوں جن کے پاس اس نے ہمیشہ مرتے دم تک کے لیے جانا ہے، آپ کی بیٹی اگرچہ آپ کی لخت جگر نور نظر ہے، لیکن اصل امانت ان کی ہے، اس لیے اس امانت کا آپ کو اپنی چیز سے بڑھ کر خیال رکھنا ہوگا۔ کہیں کوئی جھول، کوئی ٹیڑھ اور کمزوری واقع نہ ہو جائے، کیونکہ جو آپ نے ان کو سکھانا ہے، اس کے بل بوتے پر انہوں نے وہاں جا کر اپنی زندگی گزارنی ہے اور آخرت بنانی ہے۔ اگر آپ ان کو امانت سمجھ کر ان کے گلشن کی آبیاری کریں گے تو مرنے کے بعد اس گلشن کی مہکتی خوشبو کے جھونکے آپ کو آخری آرام گاہ میں پہنچتے رہیں

گے ورنہ کانٹوں کے بستر پر آگ کا اوڑھنا نصیب میں ہوگا۔

چند دن قبل ہمارے گھر ایک خاتون تشریف لائی اور ہمارے گھر والوں کو کہنے لگی کہ میں نے شرک و بدعت کی پرخار راہ کو الوداع کہہ کر قرآن و سنت کی شاہراہ کو چن لیا ہے اور اب میں نے اپنی بڑی بیٹی کا رشتہ بھی اہل توحید گھرانہ میں کیا ہے، وہ مذہبی لوگ ہیں، بہت کم ہمارے گھر آتے ہیں، کٹے سے اور کھچے کھچے سے رہتے ہیں۔ پھر خود ہی کہنے لگی "شاید میری چھوٹی بیٹی کی وجہ سے۔" میرے گھر والوں نے پوچھا "وہ کیوں؟" تو کہنے لگی: میری بیٹی میٹرک میں پڑھتی ہے' باہر نکلتے ہوئے پردہ بھی کرتی ہے۔ میرے ساتھ جمعہ بھی پڑھنے جاتی ہے، نماز بھی پڑھتی ہے...... لیکن...... پوچھا گیا "لیکن" کیا...... کہنے لگی...... لیکن ہر وقت اپنے کمرے میں گھسی رہتی ہے...... باہر نکلتی ہی نہیں...... کھانے پینے کا ہوش بھی نہیں رہتا...... اس لیے کہ...... ہر وقت کیبل لگا کر دیکھتی رہتی ہے۔ ہم نے کئی بار منع کیا لیکن باز نہیں آتی، کیبل کنکشن ختم کرنے لگتے ہیں لیکن آڑے آجاتی ہے اور ہمیں ایسا کرنے نہیں دیتی۔ باپ چونکہ فوت ہو چکا ہے، اس لئے کون اس کو ڈرائے دھمکائے، مطلب یہ ہے کہ شاید ہمارے نئے رشتہ دار اسی وجہ سے ہمارے گھر آتے جاتے نہیں۔

اتفاق سے اسی ہفتہ ایک دوسری عورت آئی، اس نے بھی اپنی بیٹی کا واقعہ سنایا جو اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ امانت کی حفاظت اور دیکھ بھال کس طرح کی جاتی ہے۔ کہنے لگی: ساری برادری سے مخالفت مول لے کر میں نے اپنی بیٹی کا رشتہ برادری سے باہر اہل توحید گھرانہ میں کیا، جب نکاح کے وقت حق مہر باندھنے کی باری آئی تو میری خواہش تھی کہ اگرچہ ہم اس کو اہمیت نہیں دیتے، نہ اس کا ہمیں لالچ ہے، لیکن حق مہر اتنا باندھا جانا چاہیے کہ برادری والے طعنے نہ دے سکیں اور کوئی الٹی سیدھی باتیں نہ بنا سکیں، لیکن اچانک خبر پہنچی کہ دلہن اپنا حق مہر خود مقرر کرنا چاہتی ہے۔ سب لوگ حیران تھے کہ یہ بھی کیا دستور ہوا، بڑے بزرگ مر گئے ہیں کیا؟ لیکن پھر بھی وہ کوئی گائے، بکری اور بھینس تو نہیں، اس کی بات بھی سننی چاہیے وہ کیا چاہتی ہے؟ بعض لوگوں کی یہ رائے ٹھہری، دلہن کے پاس جا کر اس کی

چاہت و آرزو پوچھی گئی تو وہ شرم وحیا کی پتلی، نیک بخت و نیک چلن، خوبصورت و خوب سیرت قرآن مجید فرقان حمید کی قاریہ و حافظہ یوں گویا ہوئی:

مجھے حق مہر سے کوئی غرض نہیں ..... مجھے مروجہ حق مہر کی نہ ضرورت ہے نہ میں اس کو اہمیت دیتی ہوں ..... میری خواہش ہے کہ میرے حق مہر کے خانے میں یہ طے کر کے لکھا جائے کہ میرا خاوند کامل و مکمل پانچ سال تک روزانہ بلاناغہ میری ایک سپارہ قرآن کی منزل سنا کرے گا (دوسرے لفظوں میں میرے ساتھ دور کرے گا۔)

میں چونکہ اللہ کی آخری کتاب کی حافظہ ہوں. اس لیے میں نہیں چاہتی کہ میں اس سعادت کو گنوا بیٹھوں اور اس قرآن کو جو میرے سینے میں محفوظ ہے، بھلا دوں، بلکہ میں چاہتی ہوں کہ ساری زندگی مرتے دم تک یہ میرے سینے میں نور بن کر موجزن رہے اور زبان اس کے نغمے الاپتی رہے۔

ایسے ہی لوگوں کے متعلق اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کہیں گے: قرآن کے حافظو! آج قرآن پڑھتے جاؤ اور جنت کے درجات چڑھتے جاؤ۔ یوں جس کو جتنا قرآن حفظ ہو گا وہ جنت کے اتنے ہی درجے چڑھتا جائے گا اور جنتیوں سے شان اور مرتبے اور مکان میں بلند ہوتا جائے گا، لیکن جن کو پورا قرآن حفظ ہو گا، وہ تو مسلسل چڑھتے ہی جائیں گے۔ ان کی شان کے کیا کہنے!! یوں قرآن کی امانت اپنے سینے میں رکھنے والا جنت کے سو کے سو درجے چڑھ کر اعلیٰ ترین جنت (الفردوس) میں پہنچ جائے گا۔ لوگ گردنیں اٹھا اٹھا کر اس کو بلند مرتبہ میں یوں دیکھیں گے گویا چاند یا سورج کو دیکھ رہے ہوں۔

یاد رکھیں ..... بیٹیاں اللہ کی رحمت ہیں، آپ ان کی دیکھ بھال کر کے، ان کی اچھے انداز سے پرورش کر کے ان کو مہذب و سلیقہ شعار، معاش کی نہیں معاد کی متلاشی بنا کر، رحمت ہی رہنے دیں۔ ان سے غفلت برت کر ان کو زحمت نہ بنائیں، کیونکہ آپ ہی کی تربیت کی بنا پر یہ اپنا دوسرا گھر کہ جن کی یہ امانت ہیں، مہکتا گلشن بنائیں گی۔ اپنا وقار بنائیں گی، آپ کی

عزت اور نیک نامی کا باعث بنیں گی۔ ورنہ اپنی دوسری زندگی میں ناکامی و پریشانی کی بنا پر خود بھی دکھوں اور کانٹوں کی سیج پر لیٹیں گی اور آپ کو بھی نہ ختم ہونے والے غموں کے سمندر میں ڈبو دیں گی۔ بہترین اسلامی سانچے میں ڈھالی گئیں یہ کونپلیں ...... اور نرم و نازک شاخیں ...... دوسروں کے لیے سایہ کا باعث بنیں گی' اور نیکیوں بھری سعادت مند زندگی گزار کر لحد میں آپ کے لیے بھی ٹھنڈے اور معطر جھونکوں کا باعث بنیں گی۔ (ان شاء اللہ) بصورت دیگر وہی صورت حال ہوگی جو چند برس پہلے لاہور سے نکلنے والے ایک میگزین ایجوکیشن ٹائمز نے لکھی تھی کہ ایک آدمی نے اپنے بیٹے کو دینی تعلیم سے دور رکھ کر یورپ بھیج کر قانون کی اعلیٰ تعلیم دلائی۔ اس دوران وہ فوت ہو گیا۔ جب اس کے بیٹے کو لندن میں باپ کی وفات کی اطلاع دی گئی تو وہ پاکستان میں افسوس کے لیے آیا۔ لوگوں نے رسماً اس کو کہا کہ باپ کے ایصال ثواب کے لیے قرآن پڑھ کر اس کو بخشو! تو اس نے بلا جھجک جواب دیا: میں یہ رسم پوری تو ضرور کر دوں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ والد حضور نے قرآن تو مجھ کو پڑھایا ہی نہیں تھا، لہٰذا میں کیسے اس کا ایصال ثواب کر سکتا ہوں، ہاں! البتہ لاء (قانون) کی کتابیں خوب پڑھائیں تھیں' ان میں سے ایک کتاب پڑھ دیتا ہوں، تا کہ ان کی روح کو سکون ملے۔

محرومِ محبت

چودھری شدید غصے کے عالم میں مٹھیاں بھینچتے ہوئے بے قراری سے کمرے میں چکر لگا رہا تھا، اس کے سامنے ایک عورت بوڑھی اماں کے ساتھ سہمی و دبکی، نظریں جھکائے، شرمندگی اور پریشانی کے عالم میں خوفزدہ کھڑی تھی۔ اچانک چودھری کی گرجدار آواز گونجی: اچھا تو تم چلی آئی ہو جائداد میں سے اپنا حصہ لینے...... مجھے پتا ہے تجھے یہ سبق کس کمینے نے پڑھایا ہے...... میں اس کا بھی بندوبست کر لوں گا...... تمہارے بعد دوسری سوانیاں (خواتین) بھی آ دھمکیں گی کہ ہمیں بھی حصہ دو، تم چاہتی ہو کہ میں باپ کی چھوڑی ہوئی جائداد کا بٹوارہ کر دوں؟ ٹکڑے ٹکڑے کر دوں اس کو؟ میری زندگی میں ایسا نہ ہو سکے گا' اس کے لیے تم لوگوں کو میری لاش پر سے گزرنا پڑے گا۔

گھبرائی ہوئی لڑکی نے بات کاٹتے ہوئے کہا: بھیا! میں تیری بہن نسرین ہوں، جسے تم بہت پیار کرتے تھے، تم چودھری بننے کے بعد ذرا سی بات پر بگڑ بیٹھے، حصہ میں آنے والی میری زمین و جائداد تو کروڑ روپے کے برابر ہے، میں تو ایک ناگہانی آفت آ پڑنے کی بنا پر تیرے در پر صرف دو لاکھ روپے کے لیے سوالی اور منگتی بن کر آئی ہوں' مجھے خالی نہ لوٹانا۔

''اچھا تو تو حساب کتاب لگا کر آئی ہے کہ جائداد سے تیرے کتنے کروڑ بنتے ہیں...... تو مجھے کنگال کرنے آ گئی ہے...... باپ نے تیری شادی کی اور جہیز کی صورت میں تجھے تیرا حصہ دے دیا...... اب میرے پاس کچھ نہیں تیرے لیے...... دفع ہو جاؤ یہاں سے...... آج سے ہمارا تیرے ساتھ جینے مرنے پہ آنا جانا ختم...... میرے مرنے پر بھی نہ آنا...... جب بھی میرے پاس دو لاکھ کا بندوبست ہو جائے گا یکمشت یا دو چار قسطوں میں تجھے بھیج دوں گا

لیکن ...... اس کے بعد سمجھ لینا کہ ...... تم ہمارے لیے اور ہم تمہارے لیے مر گئے‘‘ ...... بھائی کیا کہہ رہے ہو!؟ ...... میں تمہارا خون، تمہاری بہن، تمہاری ماں جائی ہوں، اس طرح دھکے تو نہ دو ...... اگر تم نے ہی دھتکار دیا تو پھر کس کی چوکھٹ سے میرا جنازہ اٹھے گا؟

مر گیا تیرا بھائی ...... زیادہ باتیں نہ بناؤ اور چلتی بنو یہاں سے ...... آ گئی میری شریک بن کر ...... ہونہہ!

’’چودھری اتنا ظلم نہ کرو، مت بھولو کہ مظلوم کی فریاد اللہ کے عرش تک پہنچ جاتی ہے۔ اگر تو اس مسکین کو دھکے دے گا، ذلیل کرے گا اور اس کی زمین پر غاصبانہ قبضہ کر کے مرے گا تو نبی پاکؐ کے فرمان کے مطابق جہنم کا ایندھن بنے گا۔ سوہنے رسول ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو کسی کی ایک بالشت زمین پر ناجائز قبضہ کر کے اس سے ہتھیا لے گا، قیامت کے دن اس زمین کا نہایت وزنی طوق بنا کر اس کے گلے میں ڈال دیا جائے گا۔ سوچ لے کہ مرنے کے بعد اس قدر وزن اٹھانے کی طاقت رکھتا ہے تُو؟‘‘

قریب کھڑی بوڑھی اماں نے کانپتے، لرزتے، ہانپتے ہوئے اور آنسو بہاتے ہوئے بات کی۔

چودھری غضبناک انداز میں دھاڑا ’’ہمارا نمک کھا کر ہم سے غداری کرتی ہے ...... ہماری نوکرانی ہو کر ہماری شریک کا ساتھ دیتی ہے ...... میں آج ہی تجھے نوکری سے فارغ کرتا ہوں‘‘ ...... نسرین یہ المناک منظر دیکھ کر چکرا گئی اور گرتے گرتے بچی، پھر ٹوٹے ہوئے کرچی کرچی دل کے ساتھ اماں کو پکڑ کر آہستہ آہستہ حویلی سے باہر نکلی اور روتی ہوئی گاڑی پر سوار ہو کر لاہور پہنچ گئی۔ آج کون اسے چپ کرواتا کہ ماں باپ تو اسے اکیلا چھوڑ کر منوں مٹی کے نیچے جا سوئے تھے۔

اصل حقیقت یہ تھی کہ نسرین کو دل کے دو دورے پڑے تو ڈاکٹروں نے کہا کہ تم 2 لاکھ کا انتظام کرو اور فوری طور پر اپنے دل کا بائی پاس آپریشن کرواؤ، اسی مقصد کے لیے وہ لاہور سے سرگودھا اپنے بھائی کے پاس جا پہنچی تھی۔ اب واپس آ کر وہ ماں جائے بھائی کی

طرف سے اس تذلیل پر اندر ہی اندر ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئی۔ ہر وقت خاموش، غموں اور دکھوں کے چرکوں سے نڈھال رہتی۔ آخر گھٹ گھٹ کر ایک دن ہمیشہ کے لیے اس دنیا کو چھوڑ گئی، بھائی کو خبر ہوئی، فوری لاہور پہنچا اور آتے ہی برادری کے سامنے نعرہ لگایا کہ جنازے کے تمام اخراجات میں برداشت کروں گا۔ بیٹوں نے ماں کی میت سے ماموں کو پیچھے ہٹا دیا، اور کہا کہ تم ہی تو ہماری ماں کے قاتل ہو، وہ دل کے مرض سے تو شاید اس قدر جلد نہ مرتی جتنی جلدی تم نے اس کو قبر میں پہنچا دیا۔ پھر جب لوگوں کو حقیقت کا علم ہوا تو سب توبہ توبہ کرنے لگے۔

دولت کے پجاری، دین سے دور لوگ ماں باپ کے آنکھیں بند کرتے ہی چپکے چپکے غیر محسوس انداز میں بہنوں کا ذہن بنانا شروع کر دیتے ہیں کہ وہ اپنے بھائیوں سے اپنا حصہ نہ لیں بلکہ ان کو معاف کر دیں اور ان کے سامنے سنا کر کہتے ہیں: بہنیں بھائی کی شریک تھوڑا بنیں گی بلکہ وہ اپنے بھائی کا ساتھ دیں گی، اس کی مدد کریں گی اور اس کے ہاتھ مضبوط کر کے اس کی ترقی و خوشحالی کا باعث بنیں گی، وہ جائیداد کے سر اٹھانے والے دوسرے دعویداروں (حقداروں) کو سمجھائیں گی۔ یوں وہ اپنی بہنوں کا وہ حق غصب کر لیتے ہیں جو ان کو اللہ کے قرآن نے عطا کیا ہے۔ قرآن کے بہنوں کو حق دینے کے حکم کی خلاف ورزی اللہ تعالیٰ کے احکامات سے بغاوت ہے اور باغیوں کا ٹھکانا یقیناً جہنم ہے۔

میرے ایک جاننے والے کے والد صاحب جب فوت ہوئے تو اس کی والدہ اور بہن نے حصہ لینے سے انکار کر دیا لیکن اس نے کہا کہ میں ایسا نہیں کر سکتا، کل قیامت کے دن میں نے خالق کائنات کے دربار میں جواب دینا ہے، لہٰذا اس نے شہر کے نیشنل بنک میں اپنی بہن اور والدہ کے نام کا اکاؤنٹ کھلوا کر ساری رقم ان کے نام جمع کروا دی اور بنک کی کاپیاں لا کر احترام سے ان کے ہاتھ میں تھما دیں، ساتھ ہی 25,25 ہزار روپے اپنی طرف سے مزید نقد دے کر کہا: امی جان! وہ تو ابو کی جائداد کا حصہ تھا، ان روپوں کو جیسے دل چاہے خرچ کریں یہ میری طرف سے ہیں۔

ایسے ہی میرے دوست ابراہیم ظہیر کے والد صاحب جب فوت ہوئے تو انہوں نے بہنوں کو بلایا، جائداد تقسیم کی، بہنوں نے لینے سے انکار کیا تو وہ کہنے لگے: میں کوئی احسان نہیں کر رہا' یہ حق تو تم کو اللہ نے دیا ہے' اگر میں روکوں گا تو گنہگار ہوں گا لہٰذا یہ ہر صورت لینا پڑے گا' معاف کرنے والا کوئی چکر نہ چلے گا۔ ویسے بھی تم میری دوسری والدہ سے ہو اس لیے میں سمجھتا ہوں تمہارا حق میری سگی بہنوں سے بھی زیادہ بنتا ہے، یہ جو میں تمہیں دے رہا ہوں یہ تو تمہارے باپ کا حصہ ہے، البتہ میں اپنی طرف سے تمہیں علیحدہ دوں گا' تاکہ حقیقی محبت و احترام کا عملی اظہار ہو سکے۔ یوں اس اللہ کے بندے نے حق معاف نہ کروایا بلکہ ان کو اصل سے بھی زیادہ دے کر چھوڑا۔

پیارے بھائیو! ...... یہ بہنیں، یہ بیٹیاں پرایا دھن ہوتی ہیں، ان کو جہیز دے کر ہندوؤں کی طرح یہ نہ سمجھ لیا کریں کہ ہم نے جائداد سے ان کا حق ادا کر دیا ہے' اگر اس کو دلیل بنایا جائے تو پھر باپ لڑکوں کی تعلیم کے ضمن میں جہیز کے تخمینے سے کہیں زیادہ خرچ کر دیتے ہیں، وہ پھر بھی جائداد کے حقدار رہتے ہیں۔ یاد رکھیں! بھائی تو بہنوں کا مان، ان کی آن بان اور شان ہوتے ہیں، ان کے پشتیبان، نگہبان اور پاسبان ہوتے ہیں، ان پر مہربان ہوتے ہیں، یہ بیچاریاں بھائیوں ہی پر تو مان اور بھروسا کر کے زندگی کے دن گزارتی ہیں، سسرال میں تمہاری عزت بنا کر اپنا سر فخر سے اونچا رکھتی ہیں۔ اگر کہیں پریشانی آن پڑے تو بے اختیار کہتی ہیں: کوئی بات نہیں، میرا ویر جو ہے، وہ سنبھال لے گا سارے مسئلے کو۔ یہ جب گھر آئیں تو ان کو آنکھوں پہ بٹھائیں، کبھی بہن کی اس بات میں نہ آئیں کہ ویرا میں نے اپنا جائداد کا حق تمہیں معاف کیا بلکہ اسے ہر صورت اس کا حق دیں۔ اس سے اللہ اور اس کا رسول خوش ہوں گے اور آپ جہنم کا ایندھن بننے سے بچ جائیں گے۔ ایسا نہ ہو کہ ان کو اپنا حق مانگنا پڑے بلکہ ان کے مانگنے سے قبل ہی ان کو دے دیں، کبھی بھی معاف کروانے کی غلطی نہ کریں، ان کے حصہ مانگنے پر کبھی بھی ان کو اپنی محبتوں سے محروم نہ کریں، نہ اپنی چوکھٹ پر آنے سے روکیں بلکہ ہمیشہ ان پر اپنی محبتوں کی برکھا برساتے رہیں، تمہاری

ماں کی وفات کے بعد اور پہلے یہ بھی تمہارے لیے نیک دعاؤں کے خزانے ہیں، آپ کو علم ہونا چاہیے کہ اس خوابدان ارضی پر بہنیں بھائیوں کی آنکھوں کی روشنی ہوتی ہیں، جب کوئی بھائی بہن کو دھتکار کر اپنی آنکھیں خود ہی پھوڑنا چاہے تو اسے اندھیروں میں بھٹکنے اور آگ کے کنویں میں گرنے سے کون روک سکتا ہے؟

اللہ کی محبت نہ ہو تو موت کو گلے لگا لیں

''بیٹی'' والدین کے آنگن میں کھلنے والا ایک مہکتا، چہکتا ٹہکتا، مسکراتا ہوا پھول ہے..... ہر سو خوشبو بکھیرنے والی ایک کلی ہے..... جس کی مہک سے سُونا، اجڑا اور ویران آنگن بہاروں کا مسکن اور راحتوں کا خزینہ بن جاتا ہے۔ نئی کھلنے والی کونپل سوکھے، خمیدہ بوسیدہ اور عمر رسیدہ پیڑوں کے لئے جینے کا سہارا بن جاتی ہے۔ گلشن کو آباد اور شاد کرنے والی اسی کلی کے متعلق رحمت عالم، شاہ امم، سلطان مدینہ، سرور قلب وسینہ نے عظیم خوشخبری اور بشارت سناتے ہوئے فرمایا:

جس کی تین بیٹیاں یا تین بہنیں ہوں وہ اللہ سے ڈرا اور ان کی دیکھ بھال (کفالت) کرتا رہا، تو وہ میرے ساتھ جنت میں اس طرح ہو گا۔

پھر آپ نے شہادت کی اور درمیانی انگلی کی طرف اشارہ کیا۔ مزید فرمایا:

جس کو بیٹیوں کے معاملے میں کوئی بھی آزمائش پڑ گئی اور اس نے ان سے اچھا سلوک کیا (تو وہ بیٹیاں کل قیامت کے دن) اس کے لئے جہنم سے پردہ ہوں گی (یعنی جہنم سے بچنے اور جنت میں داخلہ کا باعث بن جائیں گی۔)

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جس کی تین بیٹیاں ہوں، وہ انہیں باعزت طریقے سے رہنے کے لئے جگہ دیتا ہو، ان پر رحم کرتا ہو (حلال ذرائع سے) ان کی کفالت کرتا ہو اس کے لئے یقیناً جنت واجب ہو گی۔ عرض کیا گیا: اے اللہ کے رسول! اگر دو بیٹیاں ہوں؟ فرمایا: اور اگر دو ہوں تو پھر بھی۔ تو بعض لوگوں نے خیال کیا کاش کہ وہ (اصحاب

رسول) آپ سے ایک بیٹی کے بھی متعلق پوچھ لیتے تو...... آپ فرما دیتے: خواہ ایک بیٹی بھی ہو۔ (مسند امام احمد)

یعنی جیسے یہ دونوں انگلیاں قریب قریب ہیں ایسے ہی بیٹیوں کی بہترین تربیت کرنے والا اور میں دونوں جنت میں قریب قریب ہوں گے۔ کتنا خوش نصیب ہوگا وہ کہ جس کو جنت میں آقائے دو جہاںؐ کی قربت اور ہم نشینی کا شرف حاصل ہو!!

راقم کے ایک سابقہ کالم ''محروم محبت'' کے ردعمل میں ملک بھر سے جس طرح کا ردعمل سامنے آیا اس کی ترجمانی بندہ کے نام آنے والے اس رلا دینے اور تڑپا دینے والے خط سے ہوتی ہے۔ اس ہفتہ اسی خط کو میرا کالم اور میرے دل کی آواز سمجھیں، ایک محترم دکھیاری بہن لکھتی ہے:

محترم ومکرم بھائی......

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

میں غزوہ اور مجلّۃ الدعوۃ کی پرانی قاری ہوں، جب میں گیارہ بارہ سال کی تھی تب سے مجلّہ پڑھ رہی ہوں۔ آج تقریباً آٹھ سال ہو چکے ہیں مجھے انہیں پڑھتے ہوئے، مجلّہ اور غزوہ کی کوئی تحریر ایسی نہیں جو میں نہ پڑھوں اور میری تربیت کرنے میں اور میری زندگی کو صحیح رخ پر ڈالنے میں ان دونوں نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ مجھے نہ صرف اسلام بلکہ ساری دنیا کے حالات کی خبریں انہیں سے ملتی ہیں۔ میں یہ نہیں کہتی کہ مجھے اللہ تعالیٰ سے بہت زیادہ محبت ہے مگر اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں کہ مجھے ان سے جتنی محبت ہے اس محبت نے مجھے الحمدللہ شرک سے محفوظ کیا اور دوسروں کو بھی میں شرک سے بچنے کی تلقین کرتی ہوں۔ اگرچہ میں حقوق اللہ مکمل طور پر پورے نہیں کر پا رہی مگر الحمدللہ حقوق العباد پورے کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہوں۔ اگر آج اللہ تعالیٰ کی محبت میرے دل میں نہ ہوتی تو میں اپنے گھر کے حالات سے مجبور ہو کر کب کا موت کو گلے لگا چکی ہوتی۔ مگر میں آپ لوگوں کی بے حد شکرگزار ہوں جنہوں نے مجھے دین کے بارے روشناس کروایا۔ میں یہ خط اپنے گھر کے

حالات کے بارے میں ہی لکھ رہی ہوں اور چاہتی ہوں کہ آپ غزوہ میں کوئی ایسا مضمون لکھیں کہ جسے پڑھ کر شاید میرے والد صاحب کے دل میں بیٹیوں کے لئے کچھ محبت پیدا ہو جائے۔

میرے گھر میں والدین نے کبھی انصاف سے کام نہیں لیا، بیٹوں کے مقابلے میں بیٹیوں کو ذرا بھی حیثیت نہ دی، ہمارا بچپن تو جیسے تیسے گزر گیا' جب شعور آیا تو دبی دبی زبان میں والدین کو انصاف کرنے کا کہا، بیٹیوں کے حقوق مانگے مگر وہ اس پر سیخ پا ہو گئے، ہماری پرورش کے طعنے ملنے لگے۔ (جوان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرض ہے۔ اگر بہترین پرورش نہ کریں تو اللہ کے ہاں مجرم ٹھہرتے ہیں) وہ کبھی اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ انہوں نے ناانصافی کی ہے۔ بیٹوں نے غلط کام کیے، بری سوسائٹی میں پھنس گئے، صرف ماں باپ کے بے جا لاڈ پیار کی وجہ سے ایسا ہوا، اس بات کا بھی ہمیں دکھ ہوتا ہے کہ اب جب بیٹے والدین کے ساتھ بدتمیزی کرتے ہیں پھر والدین روتے ہیں تو ہم بیٹیاں ہی انہیں دلاسا دیتی ہیں مگر چند دن بعد پھر سے وہی ہماری شامت اعمال شروع ہو جاتی ہے۔

الحمدللہ! میرے والدین نہایت مذہبی ہیں...... تہجد کی نماز بھی باقاعدگی سے ادا کرتے ہیں...... مگر...... بیٹوں کی محبت میں وہ اس قدر ناانصافیاں کر جاتے ہیں کہ...... وقتی طور پر ہمارے دل میں یہ خیال ابھرتا ہے کہ...... موت کو ہی گلے لگا لیں...... مگر پھر اللہ تعالیٰ کی محبت حاوی ہو جاتی ہے اور پھر...... ہم اپنے اس طرح سوچنے پر اللہ تعالیٰ سے توبہ بھی کرتے ہیں۔

میرے والدین خطبات بھی سنتے ہیں مگر ان پر عمل نہیں کرتے، اب سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ میرے والد صاحب کو اللہ تعالیٰ نے کافی جائیداد سے نوازا ہے' فللّٰہ الحمد' جس میں سے وہ راہ جہاد میں اور ضرورت مندوں کو بھی دیتے رہتے ہیں اور تھوڑی سی جائیداد چھوڑ کے باقی تمام بیٹوں کے نام لگا رکھی ہے۔ میری ایک سسٹر شادی شدہ ہیں، انہیں شادی پہ جہیز بہت کم دیا گیا، اسی بناء پر سسرال والوں نے ان پر بے پناہ ظلم کیے اس ظلم کی چکی میں وہ دس سال پستی رہی حتی کہ اس کے سسرال والوں نے اس پر قاتلانہ حملہ بھی کیا مگر میری بہن کی

زندگی اللہ نے بچالی۔ اس کے بعد وہ کرائے کے مکان میں رہنے لگی جو نہ تو اچھے علاقے میں ہے اور نہ ہی مکان اچھا ہے۔ میری بہن گزشتہ کئی سالوں سے میرے والدین اور بھائیوں کی منتیں کر رہی ہیں کہ انہیں چھوٹا سا مکان لے دیں۔ چاہے پھر جائیداد میں سے حصہ بھی نہ دیں مگر بھائیوں نے تو یہ کہہ کر دھتکار دیا کہ یہ ہماری جائیداد میں کمی کرے گی، حصے مانگتی پھرتی ہے، والدین کے دل اگر تھوڑے سے نرم بھی ہوئے اور انہوں نے مکان لے کر دینے کا وعدہ بھی کیا مگر بھائیوں کے کہنے پر اپنے وعدے سے مکر گئے اور والد صاحب نے کہا کہ جب تمام بچوں کی شادیاں ہو جائیں گی تب جائیداد بانٹ دوں گا جبکہ ابھی باقی بچوں کی شادیاں ہونے میں تقریباً مزید 10 سال لگیں گے۔ ہمیں لگتا ہے کہ اس طرح سے والد صاحب ہمیں ٹال رہے ہیں۔ میری بہن پہلے ہی بہت دکھی ہے، ہم اس کے لئے اللہ سے دعا کرنے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتیں...... کیونکہ والدین کی ناانصافیوں نے...... ہم ساری بہنوں کو بیمار کر دیا ہے...... اب بھی لگتا ہے کہ انہیں ہم سے بالکل پیار نہیں...... صرف ہماری زندہ لاشوں کو دیکھ کر...... انہیں وقتی طور پر ترس آتا ہے تو...... مہینوں بعد کبھی محبت کے دو بول بول دیئے...... وگرنہ وہ بھی نہیں...... مگر ہمیں اپنے والدین سے بے پناہ محبت ہے...... ہم ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتی ہیں کہ...... اللہ انہیں انصاف کرنے کی توفیق عطا فرمائے...... کیونکہ ہم نہیں چاہتیں کہ ان کی ناانصافیوں پر اللہ تعالیٰ انہیں آخرت میں کوئی سزا دے...... حالانکہ دنیا میں تو سزا مل رہی ہے کہ...... بیٹے ان سے بدتمیزی کرتے ہیں...... گھر میں لڑائی جھگڑا ہوتا رہتا ہے...... ہمیں تو لگتا ہی نہیں کہ ہمارا کوئی بھائی بھی ہے...... آج تک بھائی کا پیار نہیں دیکھا ہم نے...... حالانکہ آج انہی بھائیوں کو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اپنی اولاد سے اور بیویوں سے...... کس قدر ٹوٹ کر پیار کرتے ہیں...... مگر...... ماں باپ کہ جنہوں نے آج تک...... بیٹوں کو آسائشیں اور پیار محبت دیا...... وہی بیٹے ماں باپ کو ذرا بھی پیار اور احترام نہ دے سکے۔

آپ سے گزارش ہے کہ میرے خط کی روشنی میں وراثت کے بارے میں محترم

والدین اور بھائیوں کو بتائیں کہ کیا بچوں کی شادیاں کر کے ہی انہیں (بیٹیوں کو) حصہ مل سکتا ہے یا اگر کوئی بچی ضرورت مند ہو' شدید تکلیف اور مصیبت میں ہو تو اسے پہلے بھی دے سکتے ہیں اور اس کی ضرورت پوری کی جا سکتی ہے حالانکہ بیٹوں کے نام تو بچپن سے ہی جائیداد لگا دی جاتی ہے۔

میری کہانی اللہ جانے کتنے ہی گھروں کی کہانی ہو گی۔ آپ اس کے بارے میں جو مضمون لکھیں گے وہ اگر میرے محترم والدین کے دلوں پر اثر نہ کر سکا تو ہو سکتا ہے کہ کسی اور کے والدین اس کا اثر قبول کرتے ہوئے انصاف سے کام لینا شروع کر دیں مگر آپ اللہ سے دعا کیجئے گا کہ اللہ تعالیٰ میرے محترم والدین کو انصاف کرنے کی توفیق عطا فرمائے (آمین)

میں یہ بتا دوں کہ ہم ...... عدد بہنیں اور ...... عدد بھائی ہیں۔ بھائی ہمارے بچپن سے لے کر آج تک ہم پر مظالم ڈھا رہے ہیں۔ اس پر محترم والدین انہیں منع کرنے کی بجائے ایسے اقدامات کرتے ہیں جو انہیں مظالم پر مزید ترغیب دینے کا باعث بنتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ہم بہنیں جیسے اپنے بھائیوں کے لئے کوئی ''گالی'' ہیں کہ انہیں ہم سے بات کرنا، ہمارے ساتھ اٹھنا بیٹھنا، ہر چیز سے نفرت ہے۔ وہ صرف ہمیں حکم دے سکتے ہیں، گالیاں اور مار پیٹ کر سکتے ہیں یا والدین کو ہمارے خلاف بھڑکاتے رہتے ہیں، اور ہم پر بہتان لگاتے رہتے ہیں اور ہم ان کی اور ان کی بیوی بچوں کی باندیاں بنی ہوئی ہیں۔ میرے والدین اور بھائی چاہتے ہیں کہ ہم خود کمائیں اور اپنا جہیز جمع کریں، ان کی جائیداد میں سے کوئی پیسہ ہم پر خرچ نہ ہو۔

آپ بس جلد از جلد اس خط کی روشنی میں کوئی کالم غزوہ میں لکھیں۔

شکریہ

والسلام (ایک بہن)

اے میری بہنو! ...... میں اس مسئلہ پر کالم لکھ چکا ہوں۔ اب مزید کیا لکھوں؟ اپنے محترم والدین اور بھائیوں کو صرف اتنا کہوں گا کہ ...... پیارے بھائیو اور والدین! ...... آپ

دین سے محبت رکھنے والے ہیں۔ مجھے علم ہے یہ مسئلہ آج کل کے دور میں ہر تیسرے گھر کا مسئلہ بن چکا ہے۔ میں آپ سے امید کرتا ہوں کہ آپ یہ خط پڑھ کر اپنی بچیوں پر غصہ نہیں کریں گے کہ شاید ان میں سے کسی نے ہمیں یہ خط لکھ دیا ہو، بلکہ آپ ضرور غور وفکر کریں گے کہ ہم نے کس طرح اپنے دامن کو اللہ جبار وقہار کی نافرمانی سے داغدار ہونے سے بچا کر آخرت میں سرخرو ہونا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے کہ ہر جاندار نے فنا ہو جانا ہے ماسوائے اللہ کریم کی ذات کے۔ دوسری جگہ فرمایا کہ ہر جاندار کو (چاہتے ہوئے یا ناچاہتے ہوئے) موت کا ذائقہ چکھنا ہے..... ثابت ہوا ہم نے یہاں ہمیشہ بیٹھے نہیں رہنا۔ زبان رسالت کے مطابق آدمی کے مرنے کے بعد باقی نیک اعمال یا پھر وہ نیک اولاد رہ جائے گی جو اپنے شفیق وکریم والدین کے لئے مختلف مواقع پر دعائیں کرے گی، جو اپنی زبان سے بے اختیار رب کریم کے دربار میں التجائیں کرے گی:

﴿رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِي صَغِيْرًا﴾ (الاسراء : ۲۱/ ۲۴)

اے رب کریم!...... ہمارے والدین پر اسی طرح رحم اور شفقت فرما کہ جس طرح انہوں نے ہمارے ساتھ بچپن (اور جوانی میں) محبتوں اور شفقتوں بھرا رویہ اختیار کیے رکھا۔

اللہ کریم نے ہی قرآن میں فرمایا ہے:

"جو قیامت کے دن اپنے رب کے سامنے کھڑا ہو کر اپنے اعمال سے متعلق جواب (احتساب) دینے سے ڈر گیا اس کے لئے (ایک نہیں بلکہ) دو جنتیں ہیں۔"

لہٰذا اے کڑیل جوانو، اے خوبرو بھائیو!...... اپنی جوانی کو جہنم میں جلنے سے بچانے کی فکر کرو۔ اے والدین!...... اپنے پیچھے انصاف کرنے کے بعد دعا کے لئے اٹھنے والے ہاتھ چھوڑ کر جاؤ...... اپنے نیک سلوک کی بنا پر اپنے لئے رب کے دربار میں اپنی مغفرت کے لئے آنسو بہا کر دعائیں کرنے والی آنکھیں چھوڑ کر جاؤ...... تاکہ مرنے کے بعد تمہاری کامیابی کا سامان ہو سکے نہ کہ ایسی اولاد جو آپ کے ظلم کو یاد کر کے آپ کو کوستی اور بددعائیں دیتی رہے۔ بصورت دیگر آپ اللہ کے غضب کو دعوت دے رہے ہیں...... اس لئے کہ اللہ

کریم نے قرآن مجید میں میراث (بیٹیوں کے جائیداد میں حصہ دینے) کو اپنی حدود یعنی حدود اللہ قرار دیا ہے، جو اللہ کی حدود کو توڑے گا...... اللہ تعالیٰ اس کو توڑ کر رکھ دے گا...... جو اللہ جبار و قہار سے...... جنگ کرے گا...... وہ اللہ کے غضب سے کیسے بچ سکے گا۔ وہ کہاں بھاگ سکے گا...... زمین و آسمان کی حدوں کو پھلانگ تو سکتا نہیں...... پھر حدود اللہ کو (بیٹیوں کو جائیداد کے حق سے محروم رکھ کر) کیوں پھلانگتا ہے؟ بھائی بھی اور والدین بھی آج ہی غور کر لیں کہ انہوں نے مرنا بھی ہے...... یا ہمیشہ اس دنیا میں زندہ رہنا ہے...... کہ نہ وہ مریں اور نہ انہیں کوئی پکڑ سکے۔ فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے!

عشقیہ تحریریں...... پاؤں کی زنجیریں!

جان سے پیارے محبوب

سلام محبت!

آپ کے جانے کے بعد نہ جانے مجھے کیا ہو جاتا ہے؟ پتا نہیں آپ نے مجھے کیا کر دیا ہے کہ ہر وقت آپ ہی کے خیالوں میں کھوئی رہتی ہوں۔ ہر وقت آپ کے متعلق سوچتی رہتی ہوں۔ ہواؤں میں اڑتی رہتی ہوں۔ جب آپ ہمارے گھر سے چلے جاتے ہیں تو آپ کے جلد واپس آنے کا انتظار کرتی ہوں۔ آپ شام سے پہلے یعنی سورج ڈھلنے سے پہلے ہی آ جایا کریں۔ آپ سے بات ہو سکے یا نہ ہو سکے لیکن آپ کے موجود رہنے اور آس پاس ہونے سے دل کو سکون ملتا ہے۔ اتنی ملاقاتوں کے بعد بھی آپ کے دوبارہ جلد ملنے کا اشتیاق پہلے سے بڑھ جاتا ہے' اور آپ کے ساتھ مستقبل کے متعلق بنائے گئے سہانے منصوبے پورے ہونے کی شدت سے منتظر رہتی ہوں' کہ جب ہم ایک جان ہو کر ایک علیحدہ گھر میں اپنی جنت بنائیں گے۔ میرے متعلق آپ نے اپنے جن بے قابو ہونے والے جذبات کے متعلق لکھا ہے' میرے جذبات اس سے قدرے زیادہ شدت والے ہیں لیکن میں کھلے عام اظہار نہیں کر سکتی' اس لئے کہ صنف نازک ہوں اور مرد کی نسبت اپنے جذبات کی شدت پر زیادہ کنٹرول اور ضبط رکھتی ہوں۔ فی الحال کھل کر اظہار نہیں کر سکتی۔ اگلی آدھی ملاقات تک کے لئے اللہ حافظ۔

آپ کی جان
M-T

......الامان والحفیظ...... اللہ کی پناہ! یہ خط ایک مذہبی بیک گراؤنڈ رکھنے والی لڑکی کا اپنے محبوب کے نام ہے۔ مجھے ملنے والی معلومات کے مطابق یہ لڑکی بالکل سادہ طبیعت اور کورے اور شفاف دماغ کی مالکہ تھی لیکن جب سے سکول کی تعلیم جاری رکھنے کے لیے اکیڈمی گئی ہے اور چند ہندوستانی فلمیں دیکھی ہیں' اس کے اندر نہ جانے کیوں غیرمحسوس سی عجیب وغریب تبدیلیاں رونما ہوتی چلی گئیں۔ اس کے لکھے گئے خطوط ومکالمات میں سے یہ ایک نارمل اور مہذب خط ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ کورے کاغذ کی طرح صاف شفاف دل ودماغ رکھنے والی لڑکی اس طرح بے باک وبے حیاء ہوجاتی ہے کہ اسے اخلاقیات' شرم وحیاء اور اسلامی اقدار کی پامالی ذرہ بھر نظر نہیں آتی۔ جہاں خوف خدا' صحیح اسلامی تربیت اور اچھے ہم نشینوں کی عدم دستیابی کے فقدان کا عنصر بدرجہ اتم موجود ہے' وہاں بڑے محرکات میں سے مخلوط تعلیمی اداروں کا ماحول' پرنٹ میڈیا' رسائل وجرائد اور اخبارات کی غلط رہنمائی بھی ہے ......لیکن ان سب سے بڑھ کر الیکٹرانک میڈیا پوری قوم میں تباہی کا زہر پھیلا رہا ہے۔ خاندان اور والدین نے جس بچی کی تربیت ۱۶ سال کی لگاتار کوشش اور محنت سے کی ہوتی ہے، ٹی وی کا ڈرامہ اور فلم اس کے اثرات صرف ایک گھنٹہ میں ختم کردیتے ہیں۔

اس کا عملی مشاہدہ مجھے فیصل آباد میں ہوا' جہاں ایک عالم دین کی بیوہ اپنے بیٹے سے ایک عرصہ تک صرف اس لئے ناراض رہی کہ وہ گھر میں ٹیلی ویژن کیوں لایا؟ اس نے گھر میں سب سے گفتگو بند کردی اور کھانا کھانا بھی چھوڑ دیا۔ ایک دن ایک اصلاحی موضوع پر بنایا گیا ڈرامہ نشر ہونے والا تھا کہ اس کے بیٹے نے زبردستی اسے ٹی وی کے سامنے لاکر بٹھادیا اور کہا کہ اماں جان! ایک دفعہ جو ہم دکھانے لگے ہیں یہ دیکھ لو' پھر جو آپ فیصلہ کریں گی ہم ویسا ہی کریں گے۔ بوڑھی اماں نے وہ خاندانی کہانی پر مشتمل ڈرامہ دیکھا تو انہیں اچھا لگا، اور پھر کیا ہوا......؟ تجسس پیدا ہوا......اب کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد حال یہ ہے

کہ بچے ٹی وی کے سامنے بیٹھیں یا نہ بیٹھیں اماں جی سب سے پہلے وہاں موجود ہوتی ہیں...... استغفراللہ۔

بالکل اسی طرح آج کل لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کو ہندو صلیبی تہذیب و ثقافت کے تیزاب میں گھلایا جا رہا ہے۔ ہمارے ذرائع ابلاغ ایسی غیر شرعی اور غیر اخلاقی عشقیہ داستانوں اور کہانیوں وغیرہ کی حوصلہ شکنی کرنے اور ان کی عبرت ناکی اور انجام بد ظاہر کرنے کی بجائے' ایسے لوگوں کو ہیرو بنا کر پیش کرتے ہیں' لوگ جن سے متاثر ہو کر اپنی زندگی کی راہ عمل متعین کرتے ہیں۔ جب سے ٹی وی کی نشریات شروع ہوئی ہیں آج تک کوئی بتا سکتا ہے کہ کوئی ایسا ڈرامہ پیش کیا گیا ہو کہ جس میں لو سٹوری نہیں تھی' یہاں تک کہ تاریخ پر بنائے گئے ڈراموں میں مجاہدین کے ساتھ بھی یہ چیز منسوب کی گئی..... یقیناً انہی فلموں ڈراموں سے تربیت پانے والی دوشیزائیں خط لکھتے وقت یہ بات ذہن میں نہیں لاتیں کہ یہ خطوط کل ان کے گلے کا پھندا بھی بن سکتے ہیں۔ وہ ان تصاویر و خطوط کے ذریعہ بلیک میل اور بدنام کی جا سکتی ہیں۔ یہ عشقیہ تحریریں ان کے پاؤں کی زنجیریں بن سکتی ہیں۔ ان کو ایسی سولی پر لٹکا سکتی ہیں کہ جو نہ ان کو مرنے دے اور نہ زندہ رہنے دے۔

ایسی تحریریں اوباش لڑکے اکثر اپنے دوستوں میں مزے سے پڑھ کر سناتے ہیں کہ دیکھو میں نے پانچواں شکار کر لیا ہے۔ اگر ایسی تحریریں منظر عام پر آ جائیں تو لوگ عبرت پکڑنے کی بجائے ان کو چٹخارے لے لے کر پڑھتے اور ایسے بیہودہ تبصرے کرتے ہیں کہ متاثرہ خاندان کا دل چاہتا ہے کہ زمین پھٹ جائے یا آسمان سروں پر آ گرے اور ہم اس میں دب کر دنیا کی نظروں سے اوجھل ہو جائیں۔ کچھ لڑکیاں ایسی تحریروں کا عبرتناک انجام جانتی بھی ہوتی ہیں لیکن لکھتے وقت وہ اس شیطانی دھوکے میں رہتی ہیں کہ ہمارے ساتھ ایسا نہ ہوگا۔

اب میں اندرون شہر میں ہونے والے ایک دوسرے واقعہ کا تذکرہ کر دوں' شاید! آپ سمجھ جائیں..... چند ماہ قبل کی بات ہے کہ محلے میں جھنڈیاں، قمقمے، شامیانے اور دیگر

ڈیکوریشن کا سامان سج چکا ہے۔ گھر کے ایک کمرے میں سمٹی سمٹائی' شرماتی ہوئی دلہن شرم سے نظریں جھکائے بیٹھی ہے۔ سہیلیاں ڈھولک بجا رہی ہیں۔ دوسرے دن بارات آنی ہے۔ ہر کوئی مناسب اور بہترین ساتھی ملنے پر مبارکباد دے رہا ہے۔ سب لوگ تیاریوں میں مصروف ہیں کہ اچانک اگلے دن آنے والے دلہا کا والد پریشانی کے عالم میں گھر میں داخل ہوتا ہے۔ سب لوگ یکدم حیران و پریشان اور ششدر و متعجب ہیں کہ بزرگ بے وقت کیوں آ گئے ہیں' بارات سے ایک دن پہلے ہی!!...... ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔ سب اس کو تکریم دیتے ہیں' عزت دیتے ہیں' بیٹھک میں بٹھا کر مٹھائی اور چائے پیش کرتے ہیں لیکن وہ نہیں لیتا اور پریشانی و فکرمندی سے کوئی بات کرنے کے لئے قوت جمع کر رہا ہے...... لیکن مٹھیاں بھینچتے ہوئے...... ہونٹ کاٹتے ہوئے...... پہلو بدلتے ہوئے...... وہ یکدم بولتا ہے کہ...... باقی لوگ کمرہ سے باہر چلے جائیں' میں لڑکی کی والدہ اور ماموں سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔ سب کے جانے کے بعد وہ غصے سے چیختا ہے کہ ہمیں یہ رشتہ منظور نہیں...... ہم کل بارات لے کر نہیں آئیں گے...... ہماری طرف سے صاف جواب ہے' ہم شادی نہیں کریں گے...... اپنی بیٹی کے لیے وہی لڑکا ڈھونڈیں جس کے ساتھ اس کا معاشقہ تھا...... بچی کی ماں یہ الفاظ سن کر چکرائی، گرتے گرتے سنبھلی اور ہاتھ جوڑ کر التجا کرنے لگی کہ ہمارا قصور کیا ہے جو آپ ہمیں رسوا کرنے پہ تلے ہوئے ہیں؟...... لڑکے کا والد کہنے لگا: رسوا ہم نہیں بلکہ ہم دونوں خاندانوں کو تمہاری لڑکی کر رہی ہے' یہ لو دیکھ لو اپنی آنکھوں سے...... یہ کہتے ہی اس نے چند خطوط ان کے سامنے پھینک دیے...... اٹھا کر پڑھا گیا تو یہ ان کی لاڈلی کے اپنے محبوب کے نام محبت بھرے' ملاقاتوں کے تذکروں سے بھرے اور اکٹھے جینے مرنے کے پروگراموں پر مشتمل خطوط تھے......

والدہ نے اپنا دوپٹا اتار کر پاؤں میں رکھتے ہوئے آنسوؤں بھری التجا آمیز نگاہوں سے تکتے ہوئے کہا: بھائی جان! ہم آپ سے معافی مانگتے ہیں' اسے معاف کر دیں' اس سے بھول ہو گئی' اپنے گھر جائے گی تو آپ کو کسی بھی قسم کی شکایت کا موقعہ نہ ملے گا...... لڑکے کا

والد غصے اور نفرت سے اٹھا اور یہ کہتے ہوئے دروازے سے باہر نکل گیا کہ اسے اپنے پاس رکھیں یا اس کے عاشق کے حوالے کر دیں، ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔ ہم چچوڑی ہوئی ہڈی کو اپنے دستر خوان تک پہنچنے نہیں دیتے، اگر انجانے میں پہنچ جائے تو اسے باہر پھینک دیتے ہیں۔

لڑکی کا ماموں سر پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے..... ماں چکرا کر گرتی ہے..... اس کا سر پھٹ جاتا ہے اور خون بہنے لگتا ہے..... والد کو باہر سے اصل معاملہ کی اطلاع ملتی ہے..... وہ بھاگم بھاگ لڑکے کے والد کو روکتا ہے اور اپنی پگڑی اس کے پاؤں میں رکھ کر التجا کرتا ہے کہ ہماری عزت و آبرو کا پاس رکھیں..... لیکن کامیاب نہیں ہوتا..... ڈھولک پیٹنے والی سہیلیاں بھی اٹھ کر ایک ایک کر کے نکل جاتی ہیں..... اور یوں سارے محلے میں خبر پھیل جاتی ہے..... اب سارا گھر قبرستان کی تصویر بنا ہے..... ہر کوئی رو رہا ہے..... کوئی گھر سے باہر نہیں نکل رہا کہ کسی کو کیا جواب دیں گے؟..... تھوڑی دیر بعد والد کو دل کا دورہ پڑنے کی خبر آتی ہے..... آج بھی وہ لڑکی ٹی بی کے مریض کی طرح ہڈیوں کا ڈھانچہ بنی کسی جیون ساتھی کا انتظار کر رہی ہے لیکن کوئی اس کا ہاتھ تھامنے والا نہیں۔ اب سنا ہے کہ اس کے گھر والوں نے مکان بیچ کر نقل مکانی کر کے کسی نامعلوم جگہ جا ڈیرا لگایا ہے اور ایسے ہی زندگی کی سانسیں پوری ہو رہی ہیں۔

یوں ایک تو لڑکی والوں کا خاندان برباد ہو جاتا ہے بلکہ اس کے اس عمل سے اس کی باقی بہنوں اور بھائیوں کے لیے بھی مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ کوئی ان کا رشتہ لینے نہیں آتا کہ شاید یہ بھی ایسی ہی ہوں۔ کئی سمجھدار والدین اپنی بیٹی کو یہ باور کروانے کے بعد کہ یہ بیج تم نے بویا ہے اب اس کی فصل بھی تم ہی کاٹو، بدنامی سے بچنے کے لیے اس کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال کر اس کی پسند کی جگہ اس کا رشتہ کر دیتے ہیں۔

یاد رکھیں!..... شریعت سے بغاوت کر کے، قرآن کے حکم کی مخالفت کر کے..... ایسی لڑکیاں کبھی سکھ کا سانس نہیں لے سکتیں۔ اگر خوش قسمتی سے ان کا گھر بس بھی جائے، آنگن

میں خوشیاں بسیرا کر بھی لیں تو ان کا پرانا محبوب ہمیشہ یہ سوچ کر اس کے پیچھے لگا رہتا ہے کہ وہ مجھ سے محبت کرتی تھی لیکن ظالم سماج نے اس کو مجبور کر کے اور جگہ شادی کر کے مجھ سے جدا کر دیا۔ وہ لڑکی کے والدین اور سسرالیوں کے خلاف ایسے جذبات کا شیطانی اظہار کرتے انتقاماً گنگناتے پھرتے ہیں:

زندہ رہیں گے پیار کے دشمن چاہے جہاں بھی جاؤ　　اپنی بولی یہ نہ سمجھیں کیسے انہیں سمجھاؤ
جو کرنا ہے جلدی کر و اے ظلم کے پہرے دارو!　　اپنے زہریلے تیروں کو میرے سینے میں مارو

وہ کسی نہ کسی طرح اس سے ملنے اور اس کو اپنانے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے..... جو آخر تباہی کا باعث بن جاتا ہے اور اس کا ہنستا بستا گھرانہ جہنم زار بن جاتا ہے..... اس صورت حال کے بعد وہ مرنے کی خواہش اور تمنا کرتی ہے تو اس کو موت نہیں آتی..... جینے کی کوشش کرتی ہے تو دنیا اسے جینے نہیں دیتی..... اپنے غموں، دکھوں اور تکلیفوں کو بانٹنے کے لیے کسی کے پاس جاتی ہے تو وہ اس سے دور بھاگتا ہے..... نفرت کرتا ہے..... تھوکتا ہے..... ملتا ہے تو بھی حقارت سے پیش آتا ہے..... لوگ اپنی خواتین، بچوں اور خاص طور پر اپنی بچیوں کو اس کے سائے سے بھی دور رکھتے ہیں..... اگر اس کی اولاد ہو تو وہ بڑی ہو کر نہ صرف اس کی باغی ہوتی ہے بلکہ اس سے نفرت کرتی ہے اور بعض اوقات تو اس کو طعنوں کے تیر مارتی ہے جس سے تنگ آ کر یہ بوڑھی عورت زبان حال سے پکار اٹھتی ہے:

ایسے جینے سے بہتر تھا مر جاتی میں
ایسا جینا تو مجھ کو گوارا نہیں

اور پھر اسی کشمکش میں زندگی گزر جاتی ہے..... سکون کی متلاشی..... دکھوں کی ماری..... زمانے بھر کی ستائی..... یہ جان..... لحد میں سو جاتی ہے۔ دنیا کہتی ہے کہ اب مرنے کے بعد اس کو سکون نصیب ہوا ہے..... ورنہ دنیا والوں نے تو بڑھاپے تک اس کا جینا محال کیے رکھا..... لیکن..... کسے معلوم کہ اب بھی وہ سکون میں ہے یا کہ اپنے کیے کی..... اللہ کے فرامین سے بغاوت کی..... سزا بھگت رہی ہے..... سکون کب ملے گا اسے!!؟..... کب ملے گا؟..... شاید..... روز قیامت..... یا شاید کبھی نہیں!!.....

اللہ تعالیٰ معاف کر چکے' دنیا والے معاف نہیں کر رہے!

آنسوؤں کے دوران لکھی گئی ایک پر درد تحریر

محترم بھائی! ایڈیٹر ہفت روزہ غزوہ

السلام علیکم!

۱۳ اپریل دن دس بجے غزوہ غیر ارادی طور پر میرے ہاتھوں میں آیا' گھر میں غزوہ آتا ضرور تھا' ابو جان اور دادا جان پڑھتے تھے' لیکن میری توجہ سے محروم تھا۔ خیر ۱۳ اپریل کو غزوہ دیکھتے ہوئے میری نگاہیں اس موضوع پر پڑیں ''بن ترے صنم'' (عشقیہ تحریریں پاؤں کی زنجیریں' تعاقب از محمد طاہر نقاش) اس تحریر نے میرے دل و دماغ کو نہ صرف تڑپا اور ہلا کر رکھ دیا' بلکہ میری روح تک کو لرزا دیا۔ چونکہ میں اس خالق کائنات کی اک گناہگار بندی ہوں' کچھ غلطیاں مجھ سے بھی ہوئیں' (میں بھی نادانی کے عالم میں کسی کو ایک دو لیٹر لکھ بیٹھی تھی' یہی میری خطاء تھی) لیکن اللہ گواہ ہے کہ میں بدکردار یا بدکارہ نہیں ہوں' لیکن خطا کار ضرور ہوں۔ دنیاوی بیک گراؤنڈ رکھتے ہوئے میں خود کو وفا کی پیکر سمجھتی اور کہتی تھی کہ آج تک کوئی ایسا گناہ نہیں کیا جو میرے ضمیر کو داغدار کر سکے۔ کیونکہ اسی ''محبت'' کے نام ہی سے اصل دنیا میں زنا کاریاں اور بدکاریاں ہو رہی ہیں...... لیکن اللہ گواہ ہے کہ میں اس قدر بے غیرت اور ذلیل نہ تھی...... البتہ بے پردہ' آزاد خیال اور آزاد ذہن رکھنے والی لڑکی تھی...... مگر آج اخبار میں کالم کے مطالعہ کے بعد اسلام کی دعوت اور اللہ کریم کے احکام پڑھنے کے بعد' مجھے اپنا ضمیر بھی داغدار محسوس ہو رہا ہے اور سابقہ زندگی کے ہر لمحے پر ملال ہو رہا ہے' جو میں

نے غفلت میں گزار دی۔ یوں اس جبار و قہار مولا کریم کا خوف میرے دل پہ بے اختیار چھا گیا اور...... میں بے اختیار رونے لگی اور خشوع و خضوع سے رب العزت کے حضور گڑگڑانے لگی کہ خدایا! میں صدق دل سے معافی چاہتی ہوں' اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مجھے معاف کر دے' آمین!

اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتی ہوں کہ اس نے اپنی رحمت سے میرے مردہ ضمیر کو زندہ کیا۔ میرے سوئے ہوئے ضمیر کو بیدار کیا۔ میرے دل میں دین و ایمان کی شمع روشن کی اور مجھے صراط مستقیم پر چلایا۔ اللہ کریم کا شکر ہے کہ اس دن سے میں نے مسنون پردہ شروع کر دیا ہے۔ ویسے میں پہلے بھی ہر حال میں الحمدللہ! نماز پنج گانہ پابندی سے ادا کرتی تھی' لیکن دل کو یہ ملال ہوا کہ جب ہماری زندگی احکام الٰہی' سنت رسول (ﷺ) اور اسلام کے اصولوں کے خلاف گزر رہی ہے تو اللہ جانے ہماری نمازیں قبول بھی ہوتی ہیں یا نہیں۔

الحمدللہ!...... کالم کے مطالعہ کے بعد اسی روز اپنے رب سے وعدہ کیا کہ آئندہ زندگی ان شاء اللہ العزیز قرآن اور سنت رسول اللہ (ﷺ) کے مطابق بسر کروں گی۔ اللہ نہ صرف مجھے بلکہ ہم سب کو اس کی توفیق بخشے' آمین!...... وہ اپنی رحمتوں کے سائے میں ہمارے تمام صغیرہ کبیرہ گناہوں کو بخش دے اور آئندہ زندگی میں بھی گناہوں سے بچنے اور نیکی کرنے کی توفیق بخشے۔ آمین! ثم آمین!

میری بہنو!...... اس دنیا میں ہم سب خطا کار ہیں، گناہگار ہیں، مانا کہ غلطی انسان سے ہوتی ہے مگر انسانیت یہ نہیں کہ ہم غلطی کر کے بھول جائیں' بلکہ ہم پر واجب ہے کہ ہم اس پر پچھتائیں' اللہ کے حضور ندامت کا اظہار کریں' گڑگڑائیں، بخشش طلب کریں اور آئندہ گناہوں سے اجتناب کریں۔

سوچتی تھی کہ لوگ بیٹیوں کے پیدا نہ ہونے یا پیدا ہوتے ہی مر جانے کی دعائیں کیوں کرتے ہیں' حالانکہ بیٹی تو اللہ کی رحمت ہوتی ہے' لیکن شاید یہی وہ حقیقتیں ہیں' جو ہمارے والدین کو ایسا کہنے اور سوچنے پر مجبور کرتی ہیں کہ جب ہم جیسی بدنصیب بیٹیاں ان کی غیرت

کا جنازہ نکال دیتی ہیں۔

مجاہد بھائی کس کس طرح ماؤں اور بہنوں کی عصمت بچانے کے لیے' گھر بار' والدین' رشتہ دار' عیش و آرام' انسانی جذبات وخواہشات کو چھوڑ کر اپنی جانیں قربان کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے' آمین! لیکن اس کے برعکس ہم کیسی بدنصیب بہنیں ہیں کہ اپنے ہی ہاتھوں' اپنی عزتوں کو پامال کر رہی ہیں' نیلام کر رہی ہیں۔ کیوں نا ہم بھی اپنے کردار کو بہتر بنائیں' والدین کے لیے زحمت نہیں رحمت بنیں' کیونکہ نیک اولاد والدین کے لیے صدقہ جاریہ ہے۔

میری دعا ہے' میرا پیغام میری ہر بہن تک پہنچے اور وہ بہنیں جو اب بھی غفلت میں ہیں' ان سے التجا ہے کہ آپ بھی میری طرح اپنی زندگی کو بدل دیں۔ اے اہل ایمان! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ' اگرچہ فیصلہ کرتے ہوئے اس کے برعکس شیطان خبیث تم کو ضرور اکسائے گا' وسوسے پیدا کرے گا کہ پردہ کرو گی، فحاشی چھوڑ کر ذکر اذکار اور عبادات میں وقت گزارو گی تو لوگ تمہارا مذاق اڑائیں گے' باتیں بنائیں گے کہ ''سوچو ہے کھا کر بلی حج کو چلی''، کبھی یہ کہ رشتہ دار' کزن' بہنوئی' دیور اور جیٹھ وغیرہ ناراض ہوں گے کہ ''چار دن کا بخار ہے جلد ہی اتر جائے گا'' اللہ کی قسم! لعنت ہے جھوٹے پر' جس دن سے ''غزوہ'' پڑھا اپنے گناہوں کی پریشانی و پشیمانی نے سچ مچ بخار چڑھا دیا ہے۔ ابھی تک طبیعت کافی علیل ہے۔ خیر میری بہنو! ساری دنیا کی ناراضیوں کو چھوڑ کر اس مالک کی خفگی کی فکر کرو اور اس کے احکامات پر عمل کرو۔ سارے زمانے کی محبتوں کو ٹھکرا کر اس خالق حقیقی کی محبتوں کو اپناؤ۔ اس کے رحم و کرم کی تمنا اور عذاب کا خوف اپناؤ اور دنیا کی پروا بالکل نہ کرو۔

ہمیں چاہئے کہ ہم والدین کی عزت کا خیال رکھیں۔ اگر ہمارے والدین سے ہماری تربیت میں کوتاہی ہوگئی ہے یا ٹی وی نے ہماری تربیت برباد کر دی ہے تو ہمیں چاہئے کہ ہم توبہ کریں اور اپنے والدین کے لیے بھی دعا کریں۔ ٹی وی کو چھوڑ دیں' بلکہ جو وقت اس فحاشی کو دیکھنے پر برباد کرتے ہیں قرآن مجید کی تلاوت کریں' اللہ کی یاد میں وقت گزاریں۔ میری

بہنو!...... میں نے یہ سوچ کر اپنی زندگی کو بدلا ہے کہ مجھ سے آنے والی نسل' میری ذات سے وابستہ ہر رشتہ' ہر زندگی نیک' باحیا اور باکردار ہو اور میری اللہ سے استدعا ہے کہ وہ میری اس درخواست' دعا اور تمنا کو پایہ تکمیل تک پہنچائے اور میری سوچ کے مطابق اس منصوبے کو تشکیل دے۔ آمین' ثم آمین!

میری بہنو!...... آپ نے دیکھا اور سنا ہوگا کہ ہر کوئی میری طرح...... I Love You ...... کا مریض بنا ہوا ہے' بلکہ بعض اوقات غیر متوقع جگہ سے محبت کی آفرسن کر یہی کہا جاتا ہے نا کہ بھائی کی طرح سمجھا تھا' باپ کی طرح کا تھا' شرم نہیں آئی' لیکن غالباً اس غیر متوقع حالات و خیالات کی وجہ صرف بے پردگی ہے' کیونکہ اگر ہم عورتیں مسنون پردہ کریں' غیر محرم سے بات نہ کریں' اپنی زیب و زینت کو کسی پر ظاہر نہ کریں تو شاید کم ہی ایسے حالات پیدا ہوں اور یہ ٹینشن بھی ختم ہو۔

میری بہنو!...... میں بھی اپنی چند غلطیوں کی وجہ سے اپنا مستقبل برباد کر چکی ہوں اور کچھ سچ بولنے کی سزا مل رہی ہے' کیونکہ جھوٹ بولنا میری فطرت نہیں' ہمیشہ سچ کہتی ہوں اور اپنا ہر جرم تلوار کے سائے تلے بھی تسلیم کرتی ہوں' خواہ کیسا ہی جرم ہو' کبھی اپنی ذاتی غرض کے لیے' اپنی زندگی کی خوشیوں کے لیے' اپنے مستقبل کے لیے جھوٹ نہیں بولا' لیکن شاید سچ کی تو اس دنیا میں صرف سزا ہی ملتی ہے' اگر انسان سے کوئی غلطی ہو جائے تو اللہ تعالیٰ بھی توبہ کے دروازے کھلے رکھتا ہے اور معافی طلب کرنے پر اپنے بندے کو معاف کر دیتا ہے...... لیکن...... یہ دنیا کبھی کسی کو معاف نہیں کرتی...... میرا دل کہتا ہے کہ میرے اللہ کریم نے مجھے معاف کر دیا ہے' لیکن بدنصیبی سے اس دنیا والوں نے ابھی تک مجھے معاف نہیں کیا۔

مجھے کسی سے کوئی شکوہ نہیں' کوئی گلہ نہیں' کیونکہ قصور میرا ہے اور سزا میرا مقدر' میں خود ہی ذمہ دار ہوں اور مجرم' رب کی مجرم ہوں، اپنے والدین کی' اپنے آپ کی' اپنے مستقبل اور اپنے خاندانی وقار کی۔ میں خود ہی قاتل ہوں اپنی خوشیوں کی' اپنی زندگی کی۔ کاش!...... ہم نے قرآن وسنت کے مطابق زندگی گزاری ہوتی تو یہ ذلتیں ہمارا مقدر نہ ہوتیں۔ کاش...... ہم

اسلامی اصولوں کو توڑ کر دنیا کی فحاشی والی آزادی کو نہ اپناتے تو یوں ذلیل و خوار نہ ہوتے۔ شاید اپنا یہ ذلیل مقدر میں نے خود بنایا ہے' جس پر آج مجھے پچھتاوا ہے' دکھ ہے' اللہ کے بعد والدین' ان کے بعد تنہائی و رسوائی ہے اور اپنے آپ سے جنگ ہے اور تنہائی میرا ساتھی ہے۔ انسان متعدد گناہ کر کے بھی اللہ سے معافی کا امیدوار ہوتا ہے کہ اللہ معاف کرے گا' لیکن انسان کو انسان معاف کیوں نہیں کرتا؟ میں تو کہتی ہوں کہ ہر پچھتانے والے انسان کو معاف کر دینا چاہئے' کھلے دل سے' کیونکہ یہی اعلیٰ ظرفی ہے۔

قارئین سے درخواست ہے کہ وہ میرے لئے دعا کریں...... کہ اللہ میرے سابقہ تمام گناہوں کو بخش دے...... اور ان آنسوؤں کی لاج رکھ لے...... جو اس خط کو لکھتے ہوئے ان گناہگار آنکھوں سے بہہ رہے ہیں...... مجھے معاف فرما دے اور رب کریم گنجینہ رحمت سے میرے دل کو تسکین دے...... میرا اللہ مجھے معاف کر دے...... اور کاش...... یہ دنیا والے بھی مجھے معاف کر دیں...... اور دعا کریں کہ اللہ میرے نصیب کا کوئی بہتر فیصلہ کر دے...... اور ایسا مضبوط سہارا عطا کر دے جو میرے بکھرے ہوئے کرچی کرچی ٹکڑوں کو سمیٹ سکے...... جو اس خطا کار اور گناہگار کو معاف بھی کر دے اور اس مظلوم جان کو ہمیشہ کے لیے اپنا لے' تا کہ ۱۸ برس کی یہ جان آئندہ زندگی میں دنیا کی فحاشی میں ڈوبنے سے بچ جائے' بکھرنے سے بچ جائے۔ آمین! یارب العالمین!!

والسلام

اللہ کی رحمت کی طلبگار

ایک بہن' سکھر سٹی سندھ

اس نے قرآن کیوں جلایا......؟

"شام کا وقت تھا...... جونہی مؤذن نے "اللہ اکبر" کی صدا بلند کی ......تو میں نے......قرآن پاک کو آگ لگا دی......اور پھر وہ ورق ورق کر کے...... یکے بعد دیگرے جلتا رہا"

جی ہاں! یہ بیان شاہدرہ لاہور کے ایک جوان عبداللطیف ولد بشیر احمد کا ہے جو عدالت میں کھڑا ہے۔ اس نوجوان نے اللہ کے پاک کلام کے اوراق جلانے کی جسارت کیوں کی؟ یہی سوال میرے ذہن میں کلبلا رہا تھا۔ مجھے مدعی فریق کے صالح و نیک بزرگ بھائی محمد دلشاد آف شاہدرہ نے بتایا کہ ہم بھی اسی ٹوہ میں تھے تو بھاگ دوڑ کرنے پر کچھ محلہ داروں سے مندرجہ ذیل تفصیلات کا علم ہوا:

بے پردگی اور مخلوط ماحول کے اس دور میں اس لڑکے کو کسی لڑکی سے لگاؤ ہو گیا اور یہ لگاؤ دن بدن بڑھتا رہا۔ شیطان آتش شوق کو بڑھاتا رہا اور پیا ملن کی آس میں رات دن کانٹوں کے بستر پر گزرنے لگے۔ حتیٰ کہ یہ حضرت اس سے شادی کرنے پر تیار ہو گئے لیکن کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔ حصول کامیابی کے لیے اس نے مختلف چلے کرنے شروع کر دیئے۔ ورد وظائف کا دور چل پڑا۔ الٹے سیدھے چکروں اور عملوں میں دن گزرنے لگے۔ دریائے راوی میں بھی ایک ٹانگ پر کھڑا ہو کر کوئی مخصوص وظیفہ پڑھتا رہا۔ پھر شاہدرہ لاہور کی ایک نہر میں ٹانگیں ڈال کر قسمت کا ڈول ڈالنے میں ہمہ تن مصروف رہا' لیکن گوہر مقصود کوسوں دور تھا۔

ایسے مواقع پر تقدیر کو بدل دینے اور "محبوب آپ کے قدموں میں" ڈھیر کرنے

کے دعویدار عامل حضرات خصوصی کردار ادا کرتے ہیں۔ وہ ایک مسلمان کو دولت دنیا کے علاوہ دولت ایمان سے بھی محروم کر چھوڑتے ہیں۔ ایسے ہی ایک عیسائی عامل کا یہ جوان بھی مرید ہو گیا اور اس کی ہدایت پر کالا علم سیکھنے لگا۔ بتایا جاتا ہے کہ اس بدقسمت جوان نے قرآن سے بزعم خود بعض تجویز کردہ اذکار وعوامل کو اپنا روز مرہ کا معمول بنا لیا لیکن جب اس لڑکی کے حصول میں کامیابی نہ ہوئی تو غصہ میں آ کر قرآن ہی کو جلا ڈالا (نعوذ باللہ من ذالک) ایسا بھی ممکن ہے کہ ایسا کرنے کا راستہ اس کو عیسائی عامل نے بتایا ہو کیونکہ معاشرے میں کئی ایک ایسے کیس سامنے آتے رہتے ہیں کہ جن میں یہ عیسائی عامل مسلمان عورتوں کو خاص طور پر اولاد کے حصول کے لیے (یا چند دیگر پریشانیوں کے رفع کرنے کے لیے) یہ ہدایت کرتے ہیں کہ قرآن کو نیچے رکھ کر پھر اوپر بیٹھ کر نہاؤ۔ کبھی کبھی یہ عمل قبرستان میں جا کر کرنے کو کہا جاتا ہے۔ راقم بھی بچپن سے ایسے کئی ایک واقعات رونما ہوتے دیکھ چکا ہے۔

ایسے واقعات جہاں معاشرے میں شریعت کے قوانینِ حجاب سے بغاوت کا نتیجہ ہیں وہاں ہی مغربی تہذیب وتمدن' بے پردگی کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیبی وثقافتی یلغار کا نتیجہ بھی ہیں کہ جن کی روشنی میں نئی نسل بھٹک کر پٹڑی سے اتر جاتی ہے اور ایسے عشق ومحبت جیسے سفلی جذبات کا شکار ہو کر چلتی چلتی عشق کے دوراہے سے ایمان کی بربادی تک پہنچ جاتی ہے۔ یوں وہ معاشرے میں بدنامی' خاندان کی ناکامی' بدحالی اور قانونی سزا کے ساتھ ساتھ اپنے دین کی بربادی بھی کروا بیٹھتی ہے۔ ایسے افراد کے عشقیہ جراثیم نکال کر ان کو سخت سے سخت سزا دینی چاہیے تاکہ ہم دین اسلام وقرآن مجید کا مکمل طور پر تحفظ کر سکیں۔

اس کیس میں قرآن فریادی ہے ...... پاکستان کی عدالت میں کیس لگ چکا ہے ...... سیشن کورٹ سے ضمانت کی درخواست مسترد ہونے کے بعد ہائی کورٹ میں دائر کر دی گئی ہے۔ کیس چل رہا ہے...... وکیل بحث کر رہے ہیں ...... جج سن رہا ہے ...... لوگ منتظر و مضطرب ہیں ...... قرآن انصاف کے لیے ان عدالتوں کا رویہ دیکھ رہا ہے ...... کہ میرا درجہ ان کے نزدیک کس قدر ہے ...... قرآن کو فریاد کرتے ہوئے ...... دس ماہ ہو چکے ہیں۔ اب

بھی کیس چل رہا ہے...... کیس مسٹر جسٹس عبدالرشید (ہائی کورٹ) کی عدالت میں چل رہا ہے...... دیکھیں کیا فیصلہ ہوتا ہے ...... نگاہیں منتظر ہیں ...... دل پریشان ہیں ...... اذھان گھائل ہیں...... قلم نتیجہ...... ہاں تاریخی عدالتی فیصلہ رقم کرنے کو بے قرار...... کیونکہ قرآن کو تو جلایا جا رہا ہے...... ستایا جا رہا ہے...... وہ سکردو کے برفیلے علاقے ہوں یا پنجاب کے گرم میدان...... یا سندھ میں قرآن سے شادی ہو...... ہر جگہ کون قرآن کو...... اس کی توہین وتحقیر پر انصاف دلائے گا؟

پردے میں رہنے دو!

ہر انسان کو اپنے ننھیال اور دودھیال سے جبلی طور پر محبت ہوتی ہے۔ ایسے ہی مجھے بھی چک نمبر 143 گ ب (تحصیل سمندری) سے اور اس کے باسیوں سے بہت محبت ہے، کیونکہ یہ میرا ننھیال ہے۔ بچپن میں سمندری شہر سے اس گاؤں کے' سائیکل پر ہفتہ میں دو چکر تو لازمی لگتے تھے۔ کبھی کبھی ڈائسن ڈالے پر بھی جانا پڑتا تھا۔ میں تھوڑی دیر گاؤں میں ٹھہرتا اور نانی جان سے مل کر واپس سمندری آ جاتا۔ ایک دفعہ ایسے ہی ڈالے میں بیٹھا' واپس آ رہا تھا' راستہ میں ایک بے پردہ خاتون سوار ہوئیں۔ ابھی مزید تھوڑا سا سفر کیا تھا کہ ایک لڑکا بھی سواریوں کے ساتھ گاڑی کے پیچھے لٹک گیا۔ ہر سواری کو اپنے سٹاپ نہ گزر جانے کا خوف تھا اور وہ کنڈیکٹر کو اپنا سٹاپ یاد دلا رہے تھے کہ کہیں بھول کر گزار نہ دینا اور ہمیں پھر پیچھے کی طرف اپنی منزل تک پہنچنے کیلئے پیدل سفر کرنا پڑے۔ وہ لڑکا مسلسل ٹکٹکی باندھ کر اس خاتون کو بٹر بٹر اور ٹکر ٹکر دیکھے جا رہا تھا' جو ایک لائن میں اپنی سیٹ پر برقعہ پہنے براجمان تھی۔

عورت حیران ہو کر دیکھ رہی تھی اور شرمندہ ہو کر چھوئی موئی بنتی چلی جا رہی تھی کہ بدمعاش دیدے پھاڑ پھاڑ کر مجھے کیوں دیکھ رہا ہے۔ لڑکا تھا کہ اس کے کبھی کبھار غیرت اور حیرت سے اس دیکھنے کو بھی کچھ اور مطلب و معانی پہنا رہا تھا۔ وہ اس کے دیکھنے پر ہلکا سا مسکرا دیتا اور کبھی کبھار محبت بھرے نغمے اور اشعار اپنی ہی ترنگ میں آہستہ آہستہ گنگنانے لگتا۔ باقی سواریاں یہ سب تماشا اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھیں مگر مسلسل خاموش تھیں۔ کچھ لوگ آپس میں دبے دبے لفظوں میں ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے کہ یہ لڑکا تو اس خاتون

کے پیچھے ہاتھ دھو کر ہی پڑ گیا ہے۔ جب ایک سیٹ خالی ہوئی تو لڑکا فوراً کو اندر لپکا اور سیٹ پر بیٹھ کر اپنے سامنے گھورنے لگا۔ کنڈیکٹر نے یہ منظر دیکھ کر اس سے پوچھا: جوان کہاں جاؤ گے' کون سے سٹاپ پر اتاروں تجھے؟ نوجوان نے بغیر عورت کے چہرے سے نظریں ہٹائے کہا: جب میرا سٹاپ آ جائے گا تو تجھے بتا دوں گا۔ اب وہ اللہ کی بندی خاتون شرمندگی پریشانی اور پشیمانی کی بنا پر پسینے میں بھیگی چلی جا رہی تھی۔

یہ مکروہ کھیل و تماشا چلتا رہا' حتیٰ کہ گوجرہ موڑ کا سٹاپ آیا اور وہ عورت تیزی سے اٹھی تا کہ اپنے سٹاپ پر اتر جائے۔ یہ صورتحال دیکھ کر یہ نوجوان بھی اس کے پیچھے نیچے اتر گیا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس لئے کہ خالق کائنات نے عورت کو عورت بننے کا حکم دیا ہے، عورت کا معنیٰ ہی ایسی چیز ہے جو تمام اطراف سے مکمل طور پر ڈھانپی گئی ہو اور چھپائی گئی ہو۔ جب چھپائی جانے والی چیز کو ظاہر کر دیا جائے اور وہ ظاہر کرنے والی بذات خود عورت ہی ہو تو پھر نتیجے تو ایسے ہی نکلیں گے۔

اسلام نے عورت کو پردہ کا حکم دیا ہے۔ اسے حکم دیا ہے کہ وہ اپنی زینت کو چھپا کر رکھے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ چہرہ عورت کے زینت والے مقامات میں سے سب سے زیادہ اہم ہے۔ اس لئے ہر بہن کو چاہئے تو یہ کہ وہ چہرے کو سب سے پہلے چھپائے۔ وقت کے گزرنے اور جدید ترقی یافتہ دور کی آمد نے شرعی پردے کے بھی جدید اور نت نئے اسلوب اور ڈھنگ متعارف کروائے ہیں۔

ایک گمراہ عورت کا پلکنگ کر کے بھنویں بنا کر، کاجل و سرمہ سجا کر، پھر ابرو پر مختلف شیڈز لگا کر، آنکھوں میں ڈیلوں پر سرخ ڈورے بنا کر' تھریڈنگ کے لوازمات اپنا کر، یہ سارے آنکھوں کی تزئین و آرائش اور حسن و جمال کو چار چاند لگانے والے جتن کر کے گھر سے باہر نکلنا ...... اور پھر چاروں طرف آنکھیں گھما گھما کر ...... مٹکا مٹکا کر دیکھنا ...... مستی اور خرمستی میں ہنس ہنس کر غیر محرموں دکانداروں وغیرہ سے باتیں کرنا ...... اور پھر فتنوں کے آتش فشاں پھٹا کر واپس آنا اور یہ دعویٰ کرنا کہ ''............ میں تو مکمل پردہ میں ہوں'' کیا ایسی عورت کو مندرجہ بالا لوازمات یا اس سے کچھ کم کو اپنانے والی عورت کو ہم ''پردہ دار'' کہہ

سکتے ہیں؟ یہ نادان فتنے کی جڑ ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ بننے سنورنے کے اتنے مرحلے طے کرنے کے بعد ہی کیوں بازار جاتی ہے؟ عورت تو ایسے تباہ کن لوازم کے بغیر بھی مکمل فتنہ ہے۔ ایسی عورتوں کو رسول اللہؐ نے زانیہ کہا ہے۔ آپ نے تین دفعہ فرمایا: جو عورت (دوسروں تک پہنچنے والی) خوشبو لگا کر بازار سے یا چوک سے گزرتی ہے وہ زانیہ ہے، زانیہ ہے، زانیہ ہے۔ لفظ "عورت" کے معنی پر کبھی غور کیا ہے آپ نے؟ اس کا معنی ہے ایسی خاتون جس کے جسم کا کوئی بھی حصہ کوئی غیر محرم مرد نہ دیکھ سکے' حتیٰ کہ اس کے ناخن بھی، وہ ان کا بھی پردہ کرے چہ جائیکہ وہ پورا چہرہ ہی ننگا لئے پھرے یا کچھ جاذب نظر اور پرکشش حصہ بنا سنوار کر اس کی نمائش کرتی پھرے اور فتنے کے دروازے کھولتی پھرے۔ نگاہوں کے فتنے سے کون واقف نہیں؟ نگاہوں کے تصادم سے ہی تو بہنوں کی بدنامی ہوتی ہے۔ ناکامی ہوتی ہے۔ بے باک اور عریاں نگاہوں سے شیطان تیر کا کام لیتا ہے۔ برق شرر بار کا کام لیتا ہے، خنجر پیکار کا کام لیتا ہے۔ نظر کا تیر جب کمان سے نکلتا ہے تو جگر کے پار ہو جاتا ہے، آدمی کو شیطان ورغلاتا ہے اور وہ اللہ کی نافرمانی کر کے کفر کے ارتکاب تک پہنچ جاتا ہے۔

اصل اور شرعی پردے کے تقاضوں کو پورا کرنے والے یا ان کے قریب ترین لباس پہننے سے آج کل نفرت کی جانے لگی ہے۔ جدید دور کے تقاضے بھی جدید ہی سمجھے جانے لگے ہیں۔ ٹوپی برقعہ یا دیگر تسلی بخش حجاب کے لوازمات کو اپنانے والوں کو بنیاد پرست، رجعت پسند، جاہل اور پسماندہ ذہنوں اور عملوں کے مالک سمجھا جاتا ہے اور انہیں حقیر جانا جاتا ہے۔ سر پر علامتی دوپٹہ رکھ کر چہرہ اس لئے ننگا رکھا جاتا ہے کہ بقول بعض الناس اس میں خاتون محترم باوقار، مہذب، سلیقہ شعار، تعلیم یافتہ اور "اچھی" نظر آتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ توانا، صحت مند اور جوان نظر آتی ہے۔ میں نے ایک دفعہ اپنی ایک عزیزہ کو کہا کہ آپ ٹوپی برقعہ اوڑھ کر گھر سے باہر جایا کریں۔ یہ آپ کیلئے زیادہ بہتر اور ساتر ہوگا۔ وہ تڑاخ سے بولی: میں کوئی بوڑھی ہوگئی ہوں جو قبر نما ٹوپی برقعہ پہن کر کارٹون بن جاؤں۔ میں نے فوراً کہا: ہاں!......تو یہی وہ جوان خوبصورت اور کڑی چڑی نظر آنے کی شیطانی خواہش ہے جس نے تمہیں غیر محفوظ کر دیا ہے۔ تمہاری عزت و ناموس کے تحفظ کو مشکوک بنا دیا ہے۔

میرے کلاس فیلو اور دوست ابراہیم ظہیر آف چیچہ وطنی بتاتے ہیں کہ میری بھانجیاں کراچی میں ٹوپی برقعہ پہن کر سکول جاتی ہیں۔ کبھی ان کے ساتھ کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ شاید بوڑھی عورتیں چلی جا رہی ہیں اور توجہ نہیں دیتے۔ یہی تو ہم چاہتے ہیں کہ وہ بحفاظت سکول جائیں اور واپس آئیں۔ ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں کہ کوئی انہیں جوان ہوتے ہوئے بھی بوڑھی سمجھتا ہے' بلکہ اس میں ہی بہتری ہے۔ پردے کے اس انداز سے وہ کسی بدبخت کی شرارت سے تو محفوظ ہوگئیں۔ لیکن آج کل ہماری بچیوں پر تو یہ خبط سوار ہے کہ وہ جوان اور بھرپور نظر آئیں۔ اس شیطانی خواہش کی بارہا ان کو بھاری قیمت چکانی پڑتی ہے۔

ایک معزز و محترم بہن نے ایک دفعہ فون پر پوچھا کہ جب ہم بازار سے گزرتے ہیں تو راستے میں کھڑے اوباش لوگ ہمیں اس انداز سے دیدے پھاڑ کر دیکھتے ہیں جیسے ابھی کچا کھا جائیں گے۔ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ میں نے کہا: بہن! مجھے اس بات کا قطعاً علم نہیں کہ وہ یہ مزموم حرکت کیوں کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ان کی اپنی بیٹیاں یا بہنیں نہ ہوں ...... البتہ میرا ایک اندازہ ہے کہ آپ ضرور رسول اللہؐ کے فرامین اور قرآن کے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہوئے سراپا فتنہ بن کر اللہ کے عذاب کو دعوت دیتی ہوئی باہر نکلتی ہوں گی؟ میری بات کاٹ کر بہن کہنے لگی: یہ عذاب اور فتنے والی بات کیا ہوئی؟ میں نے وضاحت کی کہ ضرور آپ ''ڈاکو پردہ'' کرتی ہوں گی' الو کی طرح آنکھیں گھماتے ہاتھ نچاتے باہر نکلتی ہوں گی' نہ ہاتھوں پر دستانے اور نہ پنڈلیاں ڈھکی وچھپی ہوئی ہوں گی۔ جن کے دل میں غلاظت کے جراثیم ہیں' شیطان ان لوگوں کو اس دین کی باغی اور فتنہ پرور خواتین کے پیچھے لگا دیتا ہے۔ آپ آج ہی قرآن مجید اور احادیث رسول پر عمل کرتے ہوئے ہاتھوں' پاؤں اور آنکھوں کا مکمل پردہ کریں' نگاہیں نیچی کر کے کھلا و کشادہ اور سادہ برقعہ ولباس پہن کر عفت وعصمت کی متوالی' شرم و حیاء کی رکھوالی بن کر نکلیں۔ اللہ آپ کی ذات میں وہ تقدس رکھ دے گا کہ وہی لوگ آپ کو دیکھ کر ادب واحترام سے نظریں جھکا لیں گے اور لوگوں کو راستے سے ہٹائیں گے کہ بہن کو گزرنے دو۔ آپ تجربہ کریں اور اگر پھر ناکامی ہو تو مجھے

اطلاع دیں۔ الحمدللہ! آج تک اس معزز بہن کی شکایت دوبارہ نہیں آئی۔

ایسا پردہ یعنی ڈاکو پردہ جیسا رویہ اختیار کرنا نادان دیندار لوگوں کی مجبوری ہے۔ وہ بھولے بھالے نادان ہیں' نہیں سمجھتے کہ یہ پردہ محمد رسول اللہ ﷺ کے بتائے ہوئے پردہ کے تقاضے پورے نہیں کرتا۔ وہ جدید ماڈرن فیشن ایبل بھی رہنا چاہتے ہیں اور اپنے اوپر کسی قسم کا بے راہ روی دین سے دوری وغیرہ کا الزام بھی نہیں آنے دینا چاہتے۔ لہٰذا وہ اپنی ناقص سمجھ کے مطابق درمیانی راستہ اختیار کرتے ہوئے آنکھوں کی بدکاری و زنا کاری کے مرتکب اس پردے کو اختیار کر لیتے ہیں کہ اس فیشن ایبل ماڈرن پردے سے ہم دونوں طرف چل جائیں گے اور قابل قبول ہوں گے۔ حالانکہ یہ دورخی پالیسی آدمی کو کسی گھاٹ کی نہیں رہنے دیتی۔ ہر مومن مسلمان یک رنگ ہوتا ہے دورنگ نہیں' اسی لیے شاعر نے کہا ہے:

دو رنگی چھوڑ دے یک رنگ ہو جا
یا سراسر موم ہو جا یا سنگ ہو جا

اور اس پردے کے متعلق دوسرے شاعر نے کھل کر یہ بات کہہ دی ہے کہ:

عجب پردہ ہے کہ چلمن میں چھپے بیٹھے ہیں
صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

ماڈرن دینداروں کے ماڈرن پردے کی ایک جھلک ان کے خوشنما' دیدہ زیب' خوبصورت لباسوں سے بھی نظر آتی ہے۔ طرح طرح کے ڈیزائن' بیل بوٹے' نقش و نگار' مختلف تصاویر اور اللہ جانے کیا کیا پرکشش انداز اپناتے ہیں وہ اپنے لباسوں پر' کہ دیکھنے والے کھنچتے چلے آتے ہیں۔ حالانکہ ایک مومنہ بہن کے کپڑے اتنے شفاف بھڑکیلے ڈیزائن دار نہیں ہونے چاہئیں کہ جو دوسروں کے لیے کشش اور توجہ کا باعث بن سکیں' بلکہ ایسے سادہ ہوں کہ ''روشن خیال خواتین وحضرات'' دیکھتے ہی کہہ اٹھیں کہ کوئی دیہاتن' مولون یا دور سے آئی ہوئی خاتون جا رہی ہے۔ لیکن کیا کریں اپنی بچیوں کی تربیت میں رہ جانے والے نقص کی بنا پر جب ہم ان سے اس طرح کی تربیت کے تقاضوں کا مطالبہ کرتے ہیں تو وہ بڑی خوبصورتی سے یہ کہہ کر اللہ اور اس کے رسول کے فرامین کا مذاق اڑاتی ہوئی نظر آتی ہیں کہ

بابا جان' ابا جان' بھائی جان وغیرہ! وہ آپ کا دور اور تھا' یہ دور اور ہے۔ یہ ترقی' تعلیم' جدید تہذیب اور روشنی اور روشن خیالی کا دور ہے' گھٹن اندھیرے' پرانی فکریں اور قدریں دم توڑ چکی ہیں۔ دنیا چاند پر پہنچ چکی ہے اور آپ ہیں کہ پرانی رسموں کو ابھی تک سینے سے لگائے بیٹھے ہیں۔ پردہ آدمی کی فکر و نظر میں ہونا چاہیے' اس کے باطن میں دل و دماغ میں ہونا چاہیے' ظاہر کی کوئی حیثیت نہیں۔

وہ بوڑھے والدین کا اس مسئلہ میں اس طرح مذاق اڑاتی ہیں کہ جس طرح وہ پرانے زمانوں کے غیر تہذیب یافتہ' جاہل' اجڈ بدھو لوگ کوئی احمقانہ و بے وقوفانہ باتیں کر رہے ہوں۔ اب وہ صرف یہ نہیں کہ پاؤں ننگے رکھتی ہیں بلکہ شلوار ٹخنوں سے اتنی اونچی رکھتی ہیں کہ جیسے ابھی دریائے راوی پار کرنا ہو اور بازو آدھے سے زیادہ ننگے رکھتی ہیں...... گریبان کشادہ اور کھلا رکھتی ہیں۔ اوپر سے اس کو ایک لاکٹ سے مزین کر کے سراپا فتنہ بن جاتی ہیں۔ یوں ان کی زینت ظاہر ہوتی ہے' اللہ کے احکام کی خلاف ورزی ہوتی ہے اور اس کے عذاب کا کوڑا برستا ہوا کسی نہ کسی ناخوشگوار واقعہ کی صورت میں سامنے آ جاتا ہے۔

دو ماہ قبل میں نے مکہ مکرمہ سعودیہ میں کچھ معزز و محترم بہنوں کو سڑک پر جاتے دیکھا۔ میں کیا دیکھتا ہوں کہ ان کے برقعے وغیرہ تقریباً 5 یا 6 انچ تک زمین پر گھسٹتے چلے جا رہے ہیں اور گندے ہو رہے ہیں۔ میں نے چونکہ پاکستان کا ماحول دیکھا تھا لہٰذا دیکھ کر سوچنے لگا کہ ٹھیک ہے' مان لیا کہ انہوں نے آنکھوں کا' ہاتھوں اور پاؤں بلکہ پورے جسم کا بھرپور پردہ کر رکھا ہے' ان کا ناخن بھی نظر نہیں آ رہا...... لیکن یہ کوئی مہذب بات تو نہیں کہ اب ان کے برقعے زمین پر مٹی کوڑے وغیرہ میں گھسٹتے جا رہے ہیں۔ شاید یہ جاہل' بدّو یا گنوار عورتیں ہیں!! ...... میں ایسی باتیں سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک میرے دماغ میں ایک جھماکا ہوا' میرے دماغ کے پردہ سکرین پر منظر ابھرا کہ چودہ سو سال قبل صحابیات کو جب رسول اللہؐ نے لباس میں پردے کا حکم دیا تو محمد رسول اللہؐ کی ان صحابیات طیبات نے اس انداز سے پردہ کرنا شروع کر دیا کہ ان کی چادریں اور اوڑھنیاں زمین پر گھسٹنے لگیں۔ وہ محبوب کائنات سرور عالم ﷺ کے پاس آئیں اور پوچھنے لگیں: آقا! ہم جب بازار میں

ضرورت کے تحت نکلتی ہیں تو جس چادر سے ہم نے اپنے پاؤں کو چھپایا ہوتا ہے وہ گندگی میں زمین پر گھسٹ کر گندی و ناپاک ہو جاتی ہے' ہمیں اجازت دیں کہ ہم ان چادروں کو چھوٹا کر لیں یا اوپر اٹھالیں' تا کہ وہ زمین پر گھسٹ کر گندا نہ ہو سکیں۔ تو رسول اللہ نے ان کی یہ شکایت سن کر ان کو سختی سے منع کر دیا اور فرمایا کہ میں اس کی اجازت نہیں دے سکتا' اگر ایک گندی جگہ سے کپڑا رگڑ کھا کر گزرتا ہے تو دوسری صاف جگہ پر رگڑنے سے وہ گندگی صاف ہو جائے گی۔ لہٰذا تم انہی کپڑوں' چادروں اور اوڑھنیوں میں نماز پڑھو' میں ان کو چھوٹا کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔

جب میرے دل و دماغ میں یہ منظر گھوما تو مجھے بہت شرمندگی ہوئی اور میں نے ان پاکباز معزز و محترم بہنوں کے متعلق غلط خیال دل میں لانے پر اللہ سے معافی مانگی...... کیونکہ یہ تو محمد عربی ﷺ کی پاک سرزمین کی رہنے والی پاکیزہ دختران اسلام ہیں...... یہ تو صحابیات طیبات کے پاکیزہ و معطر اسوہ کو عملی طور پر اپنی زندگی میں اپنا رہی تھیں' کہ کوئی ان کے پاؤں ایڑی یا ٹخنے کو بھی نہ دیکھ سکے..... ان کا یوں کپڑا گھسیٹ کر مکہ کے بازاروں میں چلنا تو ان پاکباز صحابیات کی یادوں کو تازہ کرتا ہے جنہوں نے براہ راست آقائے دو جہاں محمد رسول اللہؐ سے رہنمائی حاصل کی تھی...... واللہ! یہ جاہل بدو اور گنوار عورتیں نہیں بلکہ مومنات' طیبات' محسنات و عابدات اور وہ روشن خیال' مہذب پاکیزہ اور معطر و مطہر سیرت کی علمبردار ہیں...... کہ عالم اسلام تو ان پر فخر کرتا ہے۔

میری نادان بہن!...... کبھی تو نے سوچا ہے کہ پردے کا حکم تجھے کس نے دیا ہے؟ اگر علم نہیں تو سن لے' پردے کا حکم تجھے تیرے خالق و مالک رب کائنات نے دیا ہے۔ تو اس کے احکام کی خلاف ورزی کر کے کیا ثابت کر رہی ہے۔ یاد رکھ! اگر تو ڈاکوؤں کے سے رواجی پردے سے جان چھڑا کر اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل پیرا ہوگی تو اسی میں تیری عزت تیری کامیابی و کامرانی ہے۔ تجھے پاکیزہ ماحول میں مکمل پردہ میں جب تیرے بیٹے' تیرے بھائی' تیرے عزیز اور تیرا خاوند دیکھے گا تو سب تیری عزت کریں گے' تجھ پر فخر کریں گے تیری سیرت کو عملی طور پر اپنائیں گے' لوگ دوسروں کے سامنے تیرے پردے کی مثال دیا

کریں گے، زمانہ میں دنیا تیری پاکیزگی کی قسمیں اٹھائے گی، تیری بچیاں بڑے فخر سے تیری پیروی کریں گی ...... دنیا ہی اللہ کو راضی کرنے کی کوشش میں جنت بن جائے گی، آخرت میں کامیابی نصیب ہوگی۔ جنت کی حوریں تجھ پر فخر کریں گی اور تیری سرداری میں جنتوں میں چند ساعتیں گزارنا اپنے لیے سعادت تصور کریں گی، اللہ کی رضا کا سرٹیفکیٹ جو سارے جہانوں کی سب سے بڑی دولت ہے، تجھے مل جائے گا اور اگر تو اللہ تعالیٰ سے جنگ کرے گی، اس کے احکامات کو پس پشت ڈالے گی، فیشن کی دلدادہ بن کر فتنے برپا کرے گی، جدید تہذیب کے تیزاب میں گر کر دوسروں کو بھی برباد کرے گی ...... معاشرے میں لچر غلط بیہودہ فحش افکار اور تبصروں کا باعث بنے گی ...... بدنظری کے زنا کا باعث بنے گی ...... لوگوں کے نیک اعمال سلب ہونے اور برائی میں مبتلا ہونے کا سبب بنے گی ...... تو پھر کان کھول کر سن لے! بدنامیاں، الزام تراشیاں، بہتان، ذلتیں، رسوائیاں، دشنام طرازیاں، تیرا مقدر اور نصیب ٹھہریں گی، بیہودہ آوازے تجھ پر کسے جائیں گے، ہر کوئی تیری طرف دیکھ کر احترام سے آنکھیں نیچی کرنے کی بجائے تجھے کھا جانے کو دوڑے گا ...... فتنے، فساد برپا ہوں گے ...... بدکاریاں جنم لیں گی ...... فحاشی کی بھٹی بھڑکے گی ...... تو پتہ ہے پھر کیا ہوگا ......؟ ......

ہاں تو ایسے لوگوں کے لیے جو امت مسلمہ یعنی اللہ کے مومن بندوں اور بندیوں میں (نظر بازی وغیرہ کے ذریعہ سے) فحاشی پھیلنے کا سبب بنتی ہیں ...... مالک کائنات، خالق کائنات، رازق کائنات، آسمانوں اور زمینوں کے مالک نے ان کے لیے دھکتی ہوئی ...... شعلے مارتی ہوئی ...... بھڑکتی ہوئی ...... سلگتی ہوئی ...... چیر کر دلوں تک پہنچ جانے والی ...... آگ کا دردناک اور اذیت ناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ اب انصاف کا ترازو تیرے ہاتھ میں ہے ...... فیصلہ تو نے کرنا ہے ...... کہ کیا تو حوروں کی معزز و محترم سردار اور جنتوں کی وارث بننا چاہتی ہے یا کہ اللہ کے احکام کی باغی ...... اللہ کی دشمن ...... بھڑکتی جہنموں کی خریدار ...... فیصلہ اپنے عمل کے ذریعے اب تو نے کرنا ہے۔ خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ کر لے:

ابھی تو سانسوں کی آمدورفت جاری ہے
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

ایکسیڈنٹ ہو گیا

ابھی ہم گنگا رام ہسپتال لاہور کے آؤٹ ڈور میں آ کر کھڑے ہوئے ہی تھے کہ سامنے سے کچھ دوشیزائیں آتی دکھائی دیں' ہم دیکھ کر خوش ہوئے اور اپنے ساتھ کھڑے بھائی سے کہنے لگے: دیکھو بھائی! یہ ہیں معاشرے کی مثالی اور قابل فخر خواتین' کہ ان کا پورا جسم چادروں اور برقعوں میں چھپا ہوا ہے' یہاں تک کہ ان کے ہاتھ بھی اون کے دستانوں میں چھپے ہوئے ہیں' نہیں پتا چلتا کہ عمر رسیدہ خواتین ہیں یا نوجوان۔ اسلام ایسے ہی پردے اور حجاب کا تقاضا کرتا ہے۔ اگر تمام خواتین اسلام اپنے آپ کو ایسا بنا لیں' تو فحاشی و عریانی کی بنا پر جنم لینے والے فتنے اور جرائم نظر تک نہ آئیں اور دیکھو یہ بہنیں...... میں اپنا فقرہ مکمل نہ کر پایا تھا کہ انھوں نے میری بات کاٹتے ہوئے حیرانی سے کہا: ارے! وہ تو دیکھو!...... یہ کیا ہے؟ میں نے فوراً اس طرف گردن گھما کر دیکھا تو آنکھیں حیران' دل پریشان، دماغ سنسان اور سوچ و فکر کے خوش خیال میدان ویران ہونے لگے۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا کہ میں کیا دیکھ رہا ہوں' لیکن یہ حقیقت تھی کہ جس سے انکار ممکن نہ تھا۔ ہمارے سامنے وہی باپردہ خواتین کاؤنٹر کے قریب کھڑی' اپنے سروں سے نقاب اتار رہی تھیں۔ اب وہ چادریں...... اب تمام کے تمام برقعے اتار رہی تھیں اور اب دستانوں کی باری تھی...... اور اب ان کے میک اپ سے اٹے چمکتے' دمکتے چہروں کو سب لوگ عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے ہاتھ میں پکڑے پرس سے شاپنگ بیگ نکالا اور سب برقعے اور چادریں اکٹھی کر کے اس میں یوں ٹھونسیں جیسے انہوں نے اپنے سروں کے اوپر سے وزنی گٹھڑی اتار پھینکی ہو۔ انھوں نے اپنے چہرے اور بال وغیرہ درست کیے اور بے پردہ' کھلے

بالوں سے کشادہ گریبان کی تنگ قمیصوں اور پاجاموں میں ملبوس خراماں خراماں ایک طرف کو چل دیں۔ شاپنگ بیگ کے پاس سر پر میلی سی چادر اوڑھے ایک چھوٹی ملازمہ بچی بیٹھی رہ گئی۔ ہم اسلام کے شعار پردے کا یہ مذاق دیکھ کر دم بخود رہ گئے۔

دور جاتی ہوئی ان چڑیلوں کی اونچی ایڑی کی جوتیوں کی آواز ہال میں گونج رہی تھی اور ان کے دلوں کی ترجمانی کرتی ہوئی کہہ رہی تھی کہ...... ایسے دقیانوسی اور رجعت پسند ملاں ٹائپ والدین کے گھر پیدا ہو کر ہماری تو قسمت ہی پھوٹ گئی...... اگر ہمارا اختیار ہوتا تو ہم کبھی ان کے گھر پیدا نہ ہوتیں...... ہم تو یورپ یا پھر ہائی سوسائٹی کے ماڈرن، ترقی پسند، روشن خیال اور مذہب کی غلامیوں سے آزاد لوگوں کے گھر پیدا ہوتیں...... پھر ہم پر یہ مصنوعی، بور اور عارضی قدغنیں اور بندشیں نہ ہوتیں...... جیسے دل چاہتا ہم موج میلا اور موج مستی کرتیں...... خوشیاں مناتیں...... دنیا دیکھتیں...... اس عارضی اور چند دن کی زندگی کو انجوائے کرتیں...... یوں گھٹ گھٹ اور دب دب کے سسکتے ہوئے تو یہ چند صبحیں اور شامیں نہ گزارتیں...... اللہ جانے ہمیں کب تک ان کے زیر سایہ اور زیر کفالت زندگی گزارنا پڑے گی...... لگتا ہے ہماری جان تو تب ہی چھوٹے گی جب ہم "کسی" کی ہو جائیں گی...... ہماری شادی خانہ آبادی ہو جائے گی، پھر ہم آزادانہ زندگی گزاریں گی...... اپنی مرضی سے، اپنے ڈھنگ سے، اپنے رنگ اور اپنی ترنگ میں جئیں گی...... اور کسی کو رنگ میں بھنگ نہ ڈالنے دیں گی...... لیکن کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ...... یہ اللہ کی طرف سے بننے والے ہمارے داروغے سرپرست ہمیں اپنے جیسے...... ملاؤں کے ماننے والوں (یعنی شوہروں) کے گلے مڑھ دیں...... اور ہماری مثال آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا والی ہو جائے۔ ہمیں یہاں دوبارہ مر مر کے' گھٹ گھٹ کے اور سسک سسک کے پابندیوں میں زندگی گزارنی پڑ جائے...... یوں ہم جیتے جی ہی مر جائیں اور ہماری شادی خانہ آبادی کی بجائے خانہ بربادی ہو جائے۔

ان کے جانے کے بعد ہم نے بچی کے قدموں میں شاپنگ بیگ میں بند نقاب' حجاب اور برقعوں کو غور سے دیکھا تو اپنے دل پر دستک سی محسوس ہوئی...... مجھے محسوس ہوا کہ جیسے یہ

نقاب و برقعے پکار پکار کر ان دوشیزاؤں کو زبان حال سے کہہ رہے ہیں...... یعنی پردہ ان سے یوں مخاطب تھا:

اے شریف و عزت دار والدین کی عزت و شہرت کو داغدار کرنے والیو!...... مجھے عزت کی حفاظت کا ضامن سمجھا جاتا ہے...... میرے پیچھے ہی اپنے آپ کو چھپا کر حوا کی بیٹی...... اپنے ناموس کی حفاظت کرتی ہے...... میں شرم و حیا، وقار اور بلندی کا رکھوالا ہوں۔ میں ہی بنت اسلام اور حوا کی بیٹی کی شان و شوکت اور قدر و منزلت کا تاج ہوں کہ...... جسے پہن کر وہ بلند مقام حاصل کرتی ہے...... میں شرافت و پاک دامنی کا نشان اور پہچان ہوں...... اب تمہاری عزت و آبرو اور عفت و عصمت کا اللہ ہی حافظ ہے...... کیونکہ...... دنیا جانتی ہے کہ جس نے مجھ سے منہ موڑا اس نے ہمیشہ منہ کی کھائی...... ہمیشہ اس کی عزت و وقار کی چادر پر بدنامی کی سیاہی کے دھبے پڑے...... وہ زمانے میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہا...... وہ معاشرے میں نہ منہ اٹھا کے جی سکا اور نہ منہ چھپا کے جی سکا۔ سسک سسک کر مرنا اور مر مر کر جینا اس کا مقدر بن گیا۔

ہم تو سمجھ نہیں سکے، آج تک اگر کسی کی سمجھ میں یہ بات آئی ہے تو وہ ہمیں بھی بتائے کہ عام طور پر خواتین گھر میں رہتے ہوئے تو ہمیشہ میلی کچیلی اور گیدڑی بن کر رہتی ہیں۔ جب کسی بہن نے اپنی حالت سدھارنے کی طرف اشارہ کیا تو کام کاج کی زیادتی اور بے انتہا مصروفیت کا بہانہ بنا کر جان چھڑا لی جاتی ہے۔ ماسوائے بہت کم مومنات، طیبات، حافظات اور مجاہدات کے' کہ جن پر اللہ کریم کی خاص رحمت ہوتی ہے' لیکن یہی خواتین جونہی گھر سے باہر قدم نکالتی ہیں' بازار یا عزیز و اقارب یا کسی سہیلی وغیرہ کے پاس جاتی ہیں' خاص طور پر بازار میں دکانوں پر خریداری کے لئے جاتی ہیں تو...... وہی گھر میں چنگڑی بنی ہوئی خاتون اب پری پیکر و پری چہرہ بن جاتی ہے...... ہر قسم کے تقویٰ شکن لوازماتِ زینت سے آراستہ و پیراستہ ہو کر، بن سنور کر، معطر و مہذب ہو کر، پرکشش و جاذب نظر بن کر......

بہتر سے بہتر لباس پہن کر..... زیور و چوڑیاں پہن کر..... پرس ہاتھ میں پکڑ کر..... نہایت نازک اندام انداز میں..... بڑے ناز اور نخرے سے نکلتی ہیں..... اور..... وہ جو بے چارا..... قسمت کا مارا..... بچوں کا پیارا..... چاہتا ہے کہ تجھے بنالے اپنی آنکھوں کا تارا..... تیری نظر التفات کا طلب گارا..... تیرے لئے ہر دم گلی گلی، کوچے کوچے، بستی بستی، دفتر دفتر، محنت مزدوری، نوکری چاکری اور بھاگ دوڑ کرنے والا..... مصیبتوں، پریشانیوں اور ذمہ داریوں کا مارا..... ''تمہارا خاوند'' تمہارا سرتاج..... لوگوں کی نظر میں تمہارے دل کا سہارا..... وہ بھی تمہارے پاس تمہارے گھر ہی میں رہتا ہے۔ وہ تمہارے ان لوازمات حسن و ادا کو ہمیشہ ترستا ہے..... تجھے بار ہا توجہ دلاتا ہے..... آخر تھک ہار کر چپ ہو جاتا ہے..... اور اپنی قسمت سمجھ کر حالات سے سمجھوتہ کر کے..... آہیں بھرتا رہتا ہے..... اس کے لئے کہ جس کے لئے ان سارے لوازمات کا حق اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے مقرر کیا ہے اور ترغیب دی ہے کہ یہ صرف اسی کا حق ہے..... ایسی بن کر تو تو صرف اسی کے سامنے آسکتی ہے..... لیکن وہ تو ہمیشہ تمہاری اس حالت میں دید کے لئے جان بلب رہتا ہے' اس کے سامنے تو میلی کچیلی بھنگن بنی رہتی ہو، اس کو اہمیت نہیں دیتی..... بلکہ اس کو تو نے ایسی بکری سمجھ لیا ہے کہ جس کو جب دل چاہا دوہ لیا، دودھ حاصل کر لیا، پی لیا اور سو لیا.....

اور پھر..... یونہی زندگی کا چکر چلتا رہا..... تمہارے اس غلط رویے، شریعت سے بغاوت اور رسول رحمتﷺ کی ہدایات کو ٹھکرانے نے..... اگر اس کو کسی غلط راستے پر ڈال دیا تو.....؟؟ یوں وہ بھی اپنی آخرت تباہ کر بیٹھے گا اور اس کے یمین و یسار بھی۔ سوچ تو سہی کہ ان تمام برائیوں، گناہوں اور جرائم کا ذمہ دار کون ہے؟ جذبۂ نمائشِ حسن سے سرشار ہو کر تو سمجھتی ہے کہ میں نے بہت بڑا تیر مار لیا ہے۔ شیطان تمہارے اس اقدام پر تمہاری تحسین کرتا ہے اور اس چیز کو مزین کر کے تجھے دکھاتا ہے۔ ذرا غور کر! کیا اس کا نقصان صرف دوسروں کو ہے؟ ایسا نہیں..... اس کے نقصان اور تباہی کی لپیٹ میں تو خود بھی آتی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے ایک گمراہ خاتون کے ساتھ یہ عبرتناک واقعہ پیش آیا، ہوا یوں کہ:

لوازمات حسن سے آراستہ ایک خاتون موٹر سائیکل رکشہ کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی جا رہی ہے۔ شیطان نے اسے گمراہ کیا۔ میک اپ کے ساتھ ساتھ وہ ایسے ملعون لباس میں ملبوس ہے کہ جس کے متعلق رسول رحمتؐ نے فرمایا: ''کتنی ہی ایسی عورتیں ہیں کہ جو لباس پہننے کے باوجود برہنہ ہوتی ہیں۔'' ادھر شیطان لعین نے اس عاقبت نااندیش کو بہکایا تو ادھر نوجوانوں کو انگیخت دی۔ لہٰذا کچھ موٹر سائیکلوں والے اس کو دیکھتے ہی اس کے پیچھے لگ گئے...... کوئی اوباش اگر موٹر سائیکل پر رکشہ سے آگے بھی گزر جاتا تو رفتار کم کر کے موٹر سائیکل کو پیچھے لا کر رکشہ کے پیچھے پیچھے چلنے لگتا' لیکن اسے اس کی کوئی پروا، پریشانی یا تشویش نہیں، صرف اتنا کیا کہ ایک دو دفعہ اپنے کھلے گریبان پر جو کریب کا دوپٹا گلے میں رسماً پہنا ہوا تھا، ڈال لیا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ ہوا سے اڑ کر پہلے والی پوزیشن پر آ گیا۔ پھر اس کے بعد اس نے اسے درست کرنے اور اپنی زینت چھپانے کی زحمت تک گوارا نہ کی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اوباش' موٹر سائیکلوں پر پیچھے پیچھے چلتے رہے۔

پیچھے سے آنے والی ٹریفک کو آسانی سے آگے گزرنے میں دشواری پیش آنے لگی۔ اگلے چوک میں موٹر سائیکل سوار عام ٹریفک کے ساتھ چلے جا رہے ہیں جبکہ رکشہ ڈرائیور نے اچانک رکشہ کو بائیں سائیڈ منڈی کو جانے والی سڑک پر موڑ لیا...... یکدم رخ کی تبدیلی پر دو تین موٹر سائیکل سواروں نے بھی رکشہ ڈرائیور کی تقلید میں اس کے پیچھے سمت تبدیل کی تو ...... وہ پیچھے سے آنے والی دوسری گاڑیوں کی زد میں آ گئے...... دفعتہً گاڑیوں کی بریکوں سے ٹائر چرچرائے...... چیخیں بلند ہوئیں...... یکدم بریکوں سے گیلی سڑک پر آنے والی گاڑیاں سلپ ہو کر گھومیں...... چشم زدن میں دو موٹر سائیکل سواروں کو گاڑیوں نے ٹکر مار کر دور پھینک دیا۔ گرے ہوئے جوانوں کو...... بڑی مشکل سے ڈرائیوروں نے گاڑیوں کو کنٹرول کر کے کچلے جانے سے بچایا...... اب ان میں سے ایک زخمی سر پکڑے بیٹھا بہنے والے خون کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا' دوسرے کی ٹانگ ٹوٹ چکی تھی' جبکہ ایک بیہوش اور ایک اونچی آواز میں کراہ رہا تھا۔ حادثے کی وجہ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ ایک گاڑی

والے نے ترس کھایا اور ان کو زخمی اور خون آلود ہونے کے باوجود اپنی نئی گاڑی پر لاد کر ہسپتال لے گیا۔

ہم نے چونکہ اپنے موٹر سائیکل کے انجن کا نیا نیا کام کروایا تھا اور مکینک نے ہدایت کی تھی کہ ایک ماہ تک یا ۱۰۰۰ کلومیٹر رننگ پوری ہونے تک موٹر سائیکل کی رفتار ۴۰ کلومیٹر فی گھنٹہ سے نہیں بڑھانی' ورنہ آپ کے چار ہزار دو سو روپے اکارت جائیں گے' مجبوراً سست روی کی بنا پر دور سے ہم کو ان مغویان شیطان کا یہ تماشا دیکھنا پڑا۔ ادھر یہ المناک دردناک منظر تھا' ادھر وہ بے حجاب و بے پردہ ماڈرن لباس میں ملبوس ملعونہ اس ہنگامہ زندگی و موت سے بے خبر اپنی اسی روش پر برقرار و قائم رکشہ میں بیٹھی جا رہی تھی۔ اتنا کچھ ہونے کے باوجود بھی دو موٹر سائیکل والے پھر بھی اس کے پیچھے نکل گئے۔ اس سے قبل وہ بار بار کسی کو موبائل فون کے ذریعہ ہدایت کر رہے تھے کہ فلاں جگہ پر فوری کار لے کر پہنچو۔ ایک نئے مہمان کو لے کر حویلی جانا ہے۔

ہمارے دفتر آنے کا راستہ چونکہ ان سے جدا ہو چکا تھا' لہٰذا ہم نوجوان نسل کی اس فکری تباہی، دین سے دوری اور فحاشی کے طوفان بدتمیزی پر استغفار اور لاحول پڑھتے ہوئے دفتر پہنچے اور مسلسل سوچتے رہے۔ ہم نے تو ایسا منظر آج دیکھا تھا لیکن ایک کہنے والا کہہ رہا تھا کہ ایسے واقعات روزمرہ کا معمول بن چکے ہیں۔ اگر یہی صورت حال رہی تو کیا بنے گا اس قوم کا؟ اور کون سمجھائے ان بیوقوف اور شیطان کی ایجنٹ خواتین کو؟

چند دن بعد مجھے خبر ملی کہ اسی راستہ سے چند اوباشوں نے ایک خاتون کو اغوا کر کے اس کو رسوا کر دیا ہے، اب وہ شدید زخمی حالت میں موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا' ہسپتال میں داخل ہے۔ میرے دل میں خیال گزرا کہ کہیں یہ وہی پردے و حجاب کے قرآنی احکام کی دھجیاں اڑانے والی خاتون ہی نہ ہو' بلکہ میرا دل کہہ رہا تھا کہ یہ وہی ہو گی کہ جس کو اللہ نے دنیا میں ہی سزا دے دی ہے۔ تصدیق کے لئے ہم ہسپتال پہنچ گئے۔ مطلوبہ کمرے میں پہنچ کر جب دیکھا تو...... سامنے ایک مردہ پڑا تھا!...... چہرے کی رنگت یرقان کے مریض کی طرح زرد تھی...... آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئیں...... چہرے پر خراشیں اور زخم...... چھت کو حسرت

ویاس سے تکتی ہوئی آنکھیں ...... سرخ ...... جیسے ان میں ...... خون اتر آیا ہو ...... یا مسلسل بے خوابی کی وجہ سے یہ رنگ ہو ...... لیکن غور کیا تو پتا چلا کہ ...... اس کی تو ابھی سانسیں چل رہی ہیں ...... گویا ہمارے سامنے درندوں کی درندگی و بہیمیت کا شکار ...... زندہ لاش پڑی ہو ...... چند دن قبل کی فلم پردہ ذہن پر چل پڑی اور ہم ٹھٹھک گئے ...... دل پکار اٹھا ...... دماغ نے فوراً تصدیق کر دی کہ ...... یہ تو وہی ہے ...... یہ وہی ہے ...... وہی ہے ...... جو اللہ احکم الحاکمین کے فرامین سے جنگ کرتے ہوئے راوی پار کر رہی تھی ...... سیلابوں کی آماج گاہ راوی پار کر جانے کے باوجود اللہ ذوالجلال والاکرام اور جبار و قہار مولا نے اس کو ...... ذلتوں ...... بدنامیوں ...... پشیمانیوں ...... اور ندامتوں و رسوائیوں کے سیلاب میں ہمیشہ کے لئے غرق کر دیا ہے۔ اب اس سے نکلنا بھی چاہے تو نکل نہ سکے گی۔

میری نادان، بھولی بھالی، مغربی صلیبی نظام تعلیم کی پروردہ اور یورپی تہذیب کی پروان چڑھی غافل و ناسمجھ بہن! ...... کبھی تو نے سوچا ہے کہ پردہ نہ کر کے تو نے کس کے ساتھ مقابلہ کا اعلان کیا ہے؟ ...... کس کے خلاف اعلان جنگ کیا ہے؟ ...... کس کے 'آرڈرز' کو 'ریجیکٹ' کر کے ان کا مذاق اڑایا ہے ...... اور تو نے کبھی اس پر غور کیا ہے کہ تجھے پردے کا حکم کس نے دیا ہے؟ ...... اور کس کا حکم ماننے سے تو انکار کر رہی ہے؟؟ تو سن لے، تجھے پردہ کرنے کا ...... اور صرف اپنے جیون ساتھی کے لئے بننے سنورنے کا حکم تمہارے رب تعالیٰ نے دیا ہے ...... جو تمام کائنات کا خالق ہے ...... جس کے قبضہ قدرت میں نہ صرف تیری میری جان ہے بلکہ تمام کائنات کا نظام اس کے ہاتھ میں ہے۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے ...... کیا تو اس سے مقابلہ کر کے ...... کامیاب تو کبھی بھی نہ ہو سکے گی ...... البتہ اس دنیا میں ہی تباہیاں، بربادیاں، بدنامیاں، پشیمانیاں، مصائب و آلام تجھے تباہ و برباد کر دیں گے۔ اس طرح دنیا میں بھی برباد، ناشاد جبکہ دنیا میں اللہ رب العزت کو غضبناک کرنے کے نتیجے میں آخرت میں ناکامی اور دہکتی آگ تیرا نصیب بنے گی۔ ابھی وقت ہے، سانسیں چل رہی ہیں۔ دونوں میں سے جو راستہ پسند ہے چن لے۔

ہاتھ میں انگارا

گزشتہ دنوں روزنامہ خبریں میں شائع ہونے والی ایک خبر نے رونگٹے کھڑے کر دیے۔ خبر کا خلاصہ یہ تھا کہ معاشرے کے اوباش نوجوانوں نے کیمرے والے موبائل کے ذریعہ لڑکیوں کی تصاویر اتار کر انٹرنیٹ پر جاری کر دیں۔ ان میں بعض کی نیم عریاں تصاویر بھی خفیہ طریقہ سے اتار لی گئیں۔ یہ تصاویر اب انٹرنیٹ کے بعد پورے ملک کے موبائل سیٹوں میں منتقل ہو چکی ہیں۔ سکول، کالج اور یونیورسٹی کی طالبات کے ویڈیو کلپس بنا کر اوباش ان کو بلیک میل کر رہے ہیں اور یہ کلپس انہوں نے مارکیٹ میں بھیج دیے ہیں۔ یہ فحش تصویریں گندا ذہن رکھنے والوں کی دلچسپی کا سامان بنی ہوئی ہیں جبکہ لڑکیوں کے والدین اور بھائی زندہ درگور ہو چکے ہیں۔ وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔ کتنی ہی لڑکیوں نے اس موبائل فرینڈ شپ کے جھانسے میں آ کر اتروائی گئی تصاویر کے منظر عام پر آ جانے پر خود کشی کر لی ہے۔ تعلیمی اداروں میں زیر تعلیم طالبات خاص طور پر پریشان ہیں اور ان کی راتوں کی نیندیں اڑ چکی ہیں۔ کیمرہ والا موبائل ان کے لئے سوہان روح اور وبال جان بن چکا ہے۔

دین اسلام کی روشن تعلیمات سے بے بہرہ خواتین عام طور پر نت نئے فیشن کی دلدادہ ہوتی ہیں بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ یہ فیشن ان کا اوڑھنا بچھونا اور جینا مرنا بن جاتا ہے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ اس طرح اس دور کا نیا فیشن خواتین کا اپنے ہاتھوں میں ایک ناز سے، ایک سٹائل سے اور نہایت نخرے سے موبائل اٹھائے پھرنا ہے، جس طرح شوخے نوجوانوں میں موبائل ایک بیماری کی طرح پھیل رہا ہے، اسی طرح فیشن اور مصنوعی اسٹیٹس سمبل کے طور پر

عورتوں میں بھی یہ جنگل کی آگ کی طرح پھیلتا چلا جا رہا ہے۔ حقیقت میں موبائل آج کل زبان کے زنا کا محور و مرکز بن گیا ہے اور پھر اس کے ذریعہ اور بہت سے اخلاقی جرائم جنم لے رہے ہیں، جن کا نتیجہ آخر کار تباہی و بربادی اور بدنامی کے سوا کچھ نہیں۔

مجھے یاد ہے جب ٹیلی نار والوں نے رات کے ایک مخصوص ٹائم کے دورانیے میں اپنے صارفین کو ایک خاص وقت تک اپنے نیٹ ورک میں مفت کال کی سہولت فراہم کی تو ایک منچلے کو میں نے رات بارہ یا ایک بجے اکثر گلی کے ایک کونے میں دبک کر آہستہ آہستہ فون پر کسی سے نہایت خشوع وخضوع سے باتیں کرتے دیکھا، چند ہفتے میں یہ چکر چلتے دیکھتا رہا۔ میں جب بھی دیکھتا تو سوچتا شاید یہ آدمی بہت مصروف ہے کہ اسے سارا دن فون کرنے کی فرصت نہیں ملتی' رات گئے وقت ملتا ہے تو وہ سب کو جی بھر کر فون کرتا ہے۔ ایک ماہ بعد وہ مجھے وہاں نظر نہ آیا۔ اردگرد کے کچھ جاننے والوں سے پوچھا تو وہ ہنس دیے اور کہنے لگے: اچھا! اس عاشق نامراد کی بات کرتے ہو، اسے تو خوب سزا ملی ہے۔ تفصیل پوچھی تو بتانے لگے کہ اس نے ایک لڑکی کو موبائل کے ذریعہ گمراہ کیا، لمبا عرصہ تک ساری ساری رات اس سے گفتگو کرتا رہا، یہ تعلق اس حد تک بڑھ گیا کہ ایک دن وہ اس کو راضی کر کے آدھی رات کے وقت اس کے گھر پہنچ گیا، بھائیوں کی آنکھ کھل گئی، انہوں نے اسے مار مار کر ادھموا کر دیا اور پھر دوسری منزل سے نیچے سڑک پر پھینک دیا۔ اب وہ صاحب ہڈیاں تڑوانے کے بعد اپنے گھر میں چارپائی پر کراہ رہے ہیں جبکہ گھر والے اس پر نفرت سے تھوک رہے ہیں۔ بھائیوں نے اپنی بہن کو بھی اتنا مارا کہ اگر والدین درمیان میں نہ آتے تو وہ مر جاتی، اب وہ بھی ہسپتال میں زیر علاج ہے۔

کچھ عرصہ قبل سعودیہ میں ایک اوباش نے کسی جوان لڑکی کی ناچتے ہوئے لی گئی تصویر انٹرنیٹ پر جاری کر دی تو سعودی پولیس حرکت میں آ گئی۔ آخر انہوں نے اس کے مجرم کو پکڑ کر قرار واقعی سزا دی۔ ہمارے ہاں تو یہ روزمرہ کا معمول بن کر رہ گیا ہے لیکن حکومت کو شہریوں کے جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ سے متعلق اپنی ذمہ داری کا ذرہ بھر احساس

نہیں بلکہ حکومت کی نگرانی میں چلنے والے بعض ادارے تو اس مسئلہ میں بدکاروں، اوباشوں اور عزتوں کے لٹیروں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ پچھلے ہی دنوں پاکستان ٹی وی پر ایک موبائل کمپنی کی طرف سے تشہیر دکھائی گئی جس کا سلوگن تھا ''کال سنو اور بیلنس بڑھاؤ'' اس میں دکھایا گیا کہ ایک لڑکی ایک جوان کو فون کرتی ہے اور بات ختم نہیں کرتی بلکہ نہایت پرکشش انداز میں ہنستے کھلکھلاتے بات بڑھائے جاتی ہے۔ لڑکا اسی زعم میں مبتلا خوش دکھایا گیا ہے کہ ایک خوبرو حسینہ مجھے لفٹ کرا رہی ہے۔ یہ اشتہار پورے پاکستان میں نشر کر کے یہ پیغام دیا گیا کہ آپ بھی ایسے ہی فون کرنے والوں کو اپنی باتوں کے جال میں پھنسائیں، بدلے میں آپ کے موبائل کی کمپنی (ٹیلی نار) والے آپ کے موبائل بیلنس میں چند پیسے یا چند روپے کا اضافہ کر دیں گے۔ ایک دن میں جتنے زیادہ شکار پھانس کر آپ کمپنی کے حوالے کریں گے اتنا ہی آپ کا بیلنس زیادہ کیا جائے گا، لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔

یعنی یہ لوگ بے حیائی، فحاشی وعریانی، زبان کے زنا اور اخلاقی جرائم کو فروغ دے کر فساد فی الارض اور فتنہ عظیم کی دعوت دیتے ہیں۔

اے والدین محترم!...... ایسی حالت میں بھی آپ نہ سمجھیں اور عقل مندی کا مظاہرہ کر کے اپنی بچی خاص طور پر غیر شادی شدہ بچی کے ہاتھ سے موبائل نہ چھینیں تو پھر آپ کو ''اندھے والدین'' نہ کہا جائے تو اور کیا کہا جائے؟ آپ کی بچی نادان ہے۔ اس نے معاشرے کا اتنے گہرے انداز سے مطالعہ نہیں کیا جتنا آپ کر چکے ہیں۔ اس بے چاری کو سمجھانا آپ کا فرض ہے۔ آپ ''ہمیں اپنی بچی پر اعتماد ہے'' کی رٹ نہ لگائے رکھیں کیونکہ قدم پھسلتے دیر نہیں لگتی۔

اے غیور بھائی!...... اگر آپ نادان بچی کے بھائی ہیں تو کہاں گئی تمہاری غیرت؟ تم یقیناً اپنی ہمشیرہ سے ماں باپ کے بعد سب سے زیادہ محبت کرنے والے ہو! اگر واقعی ایسا ہے تو تم کیوں لاڈ پیار سے اپنی بہن کو اس کے نقصانات سے آگاہ نہیں کرتے؟ اور اس کے ہاتھ میں یہ بدکاری کا کھلونا دیکھ کر خاموش کیوں رہتے ہو؟ کیا تم اپنے آپ کو دنیا والوں سے

''دیوث'' کہلانا چاہتے ہو؟ یقیناً ایسا نہیں، تو پھر آج سے اپنی بہن کو ان ظالموں کی دستبرد سے بچانے کے لئے کوشاں ہو جاؤ۔

اے بہن! ...... تمہیں یقیناً مجھ پر غصہ آ رہا ہو گا...... لیکن ذرا ٹھنڈے دل سے غور کر...... تجھے اس موبائل فون کی کیا ضرورت آن پڑی ہے؟ ہاں...... اگر تیرے متعلقہ خالہ یا کسی سہیلی کا فون گھر پر آئے گا تو امی خود تجھے سنوا دے گی؟...... کیا تو لوگوں کی دیکھا دیکھی اسے بطور فیشن لئے پھرتی ہے؟ اگر ایسا ہے تو یاد رکھو! شادی سے پہلے بہنوں کا معاملہ بہت نازک ہوتا ہے، اس کے متعلق ذرا سی ناگوار بات اگر لوگوں کے ہاتھ آ جائے تو اس کا مستقبل ہمیشہ کے لئے اندھیر ہو جاتا ہے، کوئی خاندان اور مرد ایسی لڑکی کو اپنانے کے لئے تیار نہیں ہوتا، کہ جس کے متعلق یہ افواہ اڑ گئی ہو کہ یہ ٹیلی فون یا موبائل کے ذریعہ خفیہ آشنائیاں اور یاریاں پالنے والی ہے۔ کسی سے تیرا رابطہ کرنا اللہ کریم کے نازل کردہ احکام حجاب کی بھی کھلم کھلا خلاف ورزی ہے اور سنت رسول سے بھی جنگ کے مترادف ہے۔ تیرے اس فیشن کی دیکھا دیکھی تیری سگی بہنیں یا کزنیں بھی موبائل فیشن کی وبا کا شکار ہو سکتی ہیں۔ اگر وہ بھی غیر محرم سے رابطہ (زبان کا زنا) کر بیٹھیں تو ان سب کا مجموعی گناہ بھی تم پر ہو گا۔ یہ فون جس کو تم نازک اندام انداز میں پھول کی طرح ہاتھوں میں اٹھائے پھرتی ہو، یہ پھول نہیں بلکہ تمہارے ہاتھ میں انگارہ ہے، جو تمہارے سہانے مستقبل کے حسین سپنوں کو راکھ کر سکتا ہے۔ لہٰذا اس انگارے کو اس سے پہلے ہی پھینک دے کہ یہ تیرے گلشن حیات کو خاکستر کر دے اور تیرے خاندان کی عزت و شرافت کو جلا کر مٹی کا ڈھیر بنا دے۔

''بہن'' اور ''بھائی''

خاتون اسلام کے لیے اور عام طور پر دنیا کی کسی بھی عورت کے لیے اس کی عصمت ایک قیمتی نگینہ ہوتا ہے۔ اگر اس پر ذرا سی بھی آنچ آ جائے تو وہ جیتے جی مر جاتی ہے۔ اس عصمت کے موتی کو عام طور پر ''مصنوعی رشتے'' چکنا چور کرتے ہیں۔ ان مصنوعی اور بناوٹی رشتوں میں خود ساختہ ''بھائی'' کا رشتہ بھی شامل ہوتا ہے۔ اسی تلخ حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لاری اڈہ کے پاس ظلم کا شکار ہونے والی عورت کہہ رہی تھی:

ظلم ہو گیا...... ہائے غضب ہو گیا...... کس پر اعتبار کرے کوئی...... میں تو اس کو اپنا بھائی سمجھتی تھی...... لیکن وہ میری معصوم بچی کے دامن کو بدنامی کے انگاروں سے بھر کر چلتا بنا' اور مجھے پتا بھی نہ چلا......

لوگ اس کا دھاڑیں مار مار کر رونے کا منظر دیکھ رہے تھے اور اپنی اپنی دانست کے مطابق عجیب وغریب تبصرے کر رہے تھے۔ بعض کہہ رہے تھے کہ ہر وقت تو اس مشٹنڈے کو گھر میں گھسا کر گند کھاتی رہتی تھی' اب تو اس نے بیٹی کو بھی اپنے راستے پر ڈال لیا ہے وغیرہ وغیرہ۔

شاد باغ کے لاہور کے علاقہ میں ایک صبح وہاں کے باسیوں نے عجب دل دہلا دینے والا منظر دیکھا۔ ایک گھر کے صحن اور کمروں میں بچوں اور بڑوں کی گردنیں تیز دھار چھرے سے کاٹ دی گئی تھیں' ہر طرف خون ہی خون تھا۔ کوئی نامعلوم درندہ بچوں بڑوں کے گلے کاٹ کر زیور چوری کرنے کے بعد چلتا بنا تھا' قاتل کا پتا نہ چل رہا تھا' تفتیش کے بعد پتا چلا کہ اس عورت کا منہ بولا ''بھائی'' رات گھر آیا' سب کے سو جانے پر اس نے باری باری سب کے گلے کاٹے اور سونا و نقدی اور موبائل لے کر فرار ہو گیا' اس لیے کہ اسے کسی مسئلہ

میں رقم کی ضرورت تھی۔ بعد میں وہ مسروقہ موبائل سے کی جانے والی چند کالوں کی بنا پر پولیس کے ہتھے چڑھ گیا۔

چیچہ وطنی کے ایک نواحی گاؤں میں رہنے والی عورت جس کا خاوند قریبی شہر میں نوکری کرتا تھا' اس نے ہمسائیوں کے ایک لڑکے کو اپنے گھر بلا روک ٹوک آنے جانے کی اجازت دے دی۔ جب اس کو سمجھایا گیا کہ یہ مناسب نہیں کہ غیر محرم تنہائی میں گھر آئے' اس لیے اس کو گھر آنے سے منع کر دو' اس نے بغاوت کرتے ہوئے صاف انکار کر دیا پھر اس کو اس کے شوہر اور دوسرے لوگوں نے تھک ہار کر خوب مارا' وہ چمڑی ادھڑوا بیٹھی لیکن اپنے نازیبا رویے سے باز نہ آئی' کہنے لگی: یہ تو میرا ''بھائی'' ہے' میں اللہ کی قسم اٹھاتی ہوں کہ میں اس کو ''بھائی'' سمجھتی ہوں' یوں اس عورت کے اس رویے سے سارا خاندان علاقے میں بدنام ہو گیا' لوگ طرح طرح کی باتیں بنانے لگے اور اس عورت کے ساتھ ساتھ اس کی بچیوں کا مستقبل بھی داؤ پر لگ گیا۔

مصنوعی اور خود ساختہ بہن بھائی کے اس ناپاک رشتے نے ہر جگہ ایک فتنہ فساد' گناہ' تباہی و بربادی اور ہلاکت کا دروازہ کھول رکھا ہے۔ جب کسی عورت سے پوچھا جائے کہ یہ جو مرد تمہارے پاس آیا یا جس کے ساتھ تم باہر گئی' یہ کون ہے؟ تو وہ بلا جھجک جواب دیتی ہے کہ یہ ''میرا بھائی بنا ہوا'' ہے۔ جب کسی مرد سے پوچھا جائے کہ موصوفہ سے اس کا تعلق و رشتہ؟ تو وہ بلا تامل یہ جانکاہ خبر سناتا ہے کہ میں نے اسے ''بہن بنا رکھا'' ہے یا وہ میری بہن بنی ہوئی ہے۔

آج کل صرف اپنی حقیقی بہن کو ہی بہن سمجھا جاتا ہے۔ جن دوستوں پر انسان بھروسا کرتا ہے' وہی اس کے گھر میں نقب زنی کے مرتکب ہو رہے ہوتے ہیں۔ ایسے کسی کو منہ سے بھائی کہنے سے وہ بھائی نہیں بن جاتا جیسا کہ قرآن میں اللہ نے بیوی کو ماں کہہ دینے والے سے متعلق فرمایا ہے کہ اس کے ایسا کہہ دینے سے وہ اس کی ماں نہیں بن جاتی بلکہ یہ صرف اس کے منہ کی بات ہے۔ ماں وہی ہو گی جس نے اسے جنم دیا۔

اس فتنے اور شیطانی جال میں عام طور پر تو تمام دین سے بے بہرہ اور جدید تہذیب و کلچر کی دلدادہ خواتین پھنس جاتی ہیں لیکن خاص طور پر جن کے خاوند معاش کی تلاش میں گھر سے باہر غیر ممالک گئے ہوتے ہیں یا جن کو خاندان والے کسی مسئلہ پر اپنے سے دور کر دیں' یا ان سے غیر محسوس بائیکاٹ یعنی ملنا جلنا اور آنا جانا بند کر دیں' یا اپنوں سے دور ہو جانے والی اور معاشرہ میں کسی مقام پر الگ تھلگ زندگی گزارنے والی خواتین بھی شامل ہیں۔ آج کل تو موبائل فون پر بھی چیٹ کال پٹ بہن بنا چھوڑتے ہیں' یا دوسری شادی کرنے والے کی نئی دلہن بھی بھائی بنانے کے چکر میں الجھ جاتی ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس کے بہت سے محرکات واسباب ہیں لیکن سب سے بڑے دو محرک ہیں:

1. پردہ کے شرعی احکامات سے بغاوت۔
2. حیلوں بہانوں سے غیر محرم سے دوری کی بجائے رابطہ۔

اس کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے معاشرے میں اسلام کی فراہم کردہ تعلیمات کی روشنی میں عورت کو عزت وتوقیر اور تکریم فراہم نہیں کی جاتی بلکہ اسے پاؤں کی جوتی سمجھا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اپنے معاملات میں اس سے مشورہ لینا تو دور کی بات اس کی مداخلت کو بھی نہایت حقارت اور نفرت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ یوں عورت ہمیشہ ذرہ سی ہمدردی اور محبت وتوجہ کے لیے بھوکی وترسی رہتی ہے۔

بعض بدبخت اور شیطان کے آلہ کار افراد ایسے مواقع سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور ہمدردی وغمگساری کے چند بول بول کر راستہ بناتے ہیں۔ عورت اسے ہمدرد سمجھ بیٹھتی ہے اور یوں مصنوعی منہ بولے ''بھائی'' اور ''بہن'' کی چھتری کے نیچے قریب ہو جاتے ہیں اور پھر جب شریعت مطہرہ کی حدود کو پامال کیا جاتا ہے تو فتنے جنم لیتے ہیں اور کتنی عورتیں جیتے جی جہنم کے اندھے کنویں میں جا گرتی ہیں۔

اے میری بہن!...... یاد رکھ! یہ بات پتھر پر لکیر کی طرح اپنے ذہن پر نقش کر لے کہ غیر محرم کبھی نہ تو بھائی ہوتا ہے اور نہ بن سکتا ہے۔ اگر ایسا ہونا ممکن ہوتا تو پھر اس سے بھی

ایک گہرا اور قریبی رشتہ ہے' اس کا حق زیادہ بنتا ہے کہ اس کو بھائی قرار دے کر اس کے عورت کے پاس آنے جانے پر عائد قدغن ختم کر دی جاتی۔ وہ رشتہ ہے ''دیور'' کا۔ امام کائنات محبوب کائنات محمد ﷺ نے اس کے متعلق فرمایا ہے کہ یہ تو بھابھی کے لیے موت کی طرح ہے یعنی جس طرح موت سے ڈر کر بھاگا جاتا ہے ایسے ہی اس سے بھاگا جائے' دور رہا جائے اور پردہ کیا جائے۔

اے مومنہ بہن!...... جب تیرا اپنا حقیقی بھائی رحمت کا فرشتہ بن کر تیرے سر پر سایہ فگن ہے تو تجھے غیروں کو بھائی بنانے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ تیرا بھائی تیرے بقول اگر تمہارے پاس نہیں آتا' تمہارا خیال نہیں رکھتا تو تمہیں اس کے اسباب اور وجوہات کا پتہ لگانا چاہیے اور ان باتوں کو ختم کر دینا چاہیے جو اس کے تیرے پاس آنے سے رکاوٹ کا باعث ہیں۔ تیری عزت' تیرا وقار' تیرا رعب و دبدبہ' تیری عصمت' تیرے خاندان کی نیک نامی کا تحفظ اسی میں ہے کہ تو کبھی بھی کسی کو منہ بولا بھائی نہ بنا...... نہ کسی سے اس مصنوعی رشتے کے تحت رابطہ کر...... نہ کسی غیر محرم کو اس رشتے کا لبادہ اوڑھ کر اپنے گھر آنے دے ...... اگر تو ایسا کرے گی تو پھر جان لے کہ بربادیاں ہی بربادیاں...... تباہیاں ہی تباہیاں اور ہلاکتیں ہی ہلاکتیں ہیں۔ تو معاشرے میں گالی بن کر رہ جائے گی' خود بھی رسوا اور اولاد بھی جب جوان ہو کر بدنامیوں کی دھول میں آنکھ کھولے گی تو تیرے منہ پر تھوکے گی اور سر پر جوتے مارے گی۔

اے خاندان و برادری والو!...... اے غیور و باحمیت مگر' بہنوں کے بارے میں نرم گوشہ رکھنے والے بھائیو!...... دنیا کی مصروفیتوں میں گم ہو کر نہ رہ جاؤ بلکہ اپنی بہنوں کے لیے وقت نکالو...... ان کا خیال رکھو...... ان پر محبتوں کے پھول نچھاور کرتے رہا کرو...... وقت نکال کر ان کے غریب خانے پر پھیرا لگایا کرو...... اس سے بہنوں کا سیروں خون بڑھ جاتا ہے...... احوال دریافت کیا کرو...... چار پیار محبت اور دکھ سکھ کی باتیں کر کے واپس آجایا کرو...... اس سے کیا ہوگا؟ سسرال میں ان کی عزت بھی بڑھے گی...... وہ جان جائیں گے

کہ اس کے پیچھے کوئی ولی وارث ہے...... یہ آوارہ بے سہارا نہیں...... بہن بھی تنہائی و جدائی کا شکار نہ ہوگی...... آپ خاص طور پر بہن کے اور اس کے سسرال کے خاندان کے خوشی اور غمی کے مواقع کبھی بھی نظر انداز نہ کریں...... بلکہ بر وقت وہاں پہنچ کر ان کے دکھ درد اور خوشیوں میں شریک ہوں' بہن کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ رکھیں' جب آپ اپنی بہن کو محبت...... ہمدردی...... پیار اور ایثار...... کی خوراک دیں گے تو وہ کبھی بھی بھائی کی محبت کسی دوسری جگہ تلاش کرنے کا تصور نہ کرے گی...... اور نہ ہی تباہیوں و بربادیوں کی دلدل میں دھنس کر...... دنیا بھر کے طعن و تضحیک اور تذلیل کے تیروں سے زخمی ہو کر سسک سسک کر دم توڑے گی بلکہ مرتے دم بھی یہی کہے گی کہ ''میرا کوئی پتا نہیں زندہ رہوں کہ مروں' فوری میرے بھائی کو بلا لیں' تاکہ میں اس سے کچھ باتیں کرلوں' اس کے سامنے سکون سے میری روح نکلے۔''

''کاٹھے'' انگریز

بچپن میں ہم دیکھتے تھے کہ جب بچہ سکول سے واپس گھر آ کر:

TWINKLE TWINKLE LITTLE STAR

HOW I WONDER WHAT YOU ARE

کہتا تو ماں اپنے نونہال کے منہ سے انگریزی کے یہ الفاظ سن کر نہال ہو جاتی' قربان ہو جاتی اور خوشی سے سرشار ہو کر اس کا ماتھا چومنے لگتی۔ وہ سمجھتی شاید اس طرح انگریزی بولنا ہی سب سے بڑی کامیابی اور ترقی کی نشانی ہے۔ یہ عمل خالصتاً انگریزی کلچر سے مرعوبیت اور احساس کمتری کا آئینہ دار ہے۔ ایک بہن کو دیکھا کہ وہ اپنے ننھے منے بچے کو ابھی انگریزی کے چند جملے تو نہ رٹا سکتی تھی لیکن پھر بھی اس نے ایک آدھ انگریزی کا لفظ اس کو رٹا ہی دیا۔ اب جب بچہ اپنی ماں کے سامنے کہتا کہ ''گھوم گھوم کے فین (Fan) چلاؤ'' تو وہ خوشی سے لوٹ پوٹ ہو جاتی اور پیار سے کہتی ''مائی سن! اب آئیز Eyes بند کر لو اور Sleep ہو جاؤ۔ اسی طرح کچھ عرصہ قبل چڑیا گھر جانا ہوا تو وہاں ایک بوڑھی اماں پر انگریزی بولنے کا خبط سوار دیکھا۔ وہ اپنے ننھے نواسے کو مخاطب کر کے یہ کہہ رہی تھی'' پترا او سامنے کریکوڈیل (Crocodile) اے۔'' وہ سیدھا کہہ سکتی تھی کہ سامنے نظر آنے والا مگرمچھ ہے لیکن انگریزی بولنے کا خبط ایسے ذہنوں پر سوار ہوتا ہے کہ اترتا نہیں۔

اب عام آدمی اور نوجوان لڑکیاں بھی اپنی گفتگو میں انگریزی کے چند الفاظ کو ملا کر بولنا اپنے لئے باعث فخر وافتخار سمجھتے ہیں۔ بعض لوگوں نے اپنا تکیہ کلام Excuse me' بعض نے سوری (Sorry)' بعض نے کنفیوز' بعض نے مائنڈ نہ کریں اور بعض نے Sincere بنا رکھا ہے۔ حالانکہ جن الفاظ کو وہ تکلف کے ساتھ بول رہا ہوتا ہے ان کا

متبادل اردو میں نہ صرف موجود ہوتا ہے بلکہ روز مرہ استعمال اور بول چال میں رواں ہوتا ہے۔ بعض لوگ دوسروں پر مصنوعی رعب ڈالنے کے لیے کچھ انگریزی الفاظ جان بوجھ کر اپنی گفتگو کا حصہ بناتے ہیں' تاکہ دوسرا مرعوب ہو جائے کہ یہ تو بہت پڑھا لکھا آدمی ہے۔

چند سال پہلے میں اپنے کلاس فیلو یٰسین رحمانی ساکن بڈھا گورایہ گوجرانوالہ کے ساتھ G-7 2/4 اسلام آباد میں اپنے دوست لیاقت علی قمر اور اعجاز علی حال مقیم برمنگھم (برطانیہ) کے پاس گیا۔ اب یٰسین بہت پریشان تھا اور شکایتاً بتا رہا تھا کہ یہ لوگ اگرچہ اردو بولتے ہیں لیکن ان کی اردو میں بھی اردو کم اور انگریزی زیادہ ہوتی ہے۔ مجھے ان کی گفتگو سمجھ ہی نہیں آتی' میں ان کو کیا جواب دوں؟ مثلاً: یار What I do (میں کیا کروں) میرے ساتھ ایک پرابلم ہے۔ مائی مین آئی ایم بیزی ناؤ۔ اس لیے میں تمہارے ساتھ کمپنی شیئر نہیں کر سکتا۔ پلیز ڈیئر لیو می الون۔ میں نے دونوں کو بھائی کی پریشانی اور اس کا حل بتایا اور میں نے یٰسین بھائی کو کہا کہ میں نے ان کو بہت سمجھایا ہے لیکن اگر وہ اب بھی باز نہ آئے تو تم عربی میں جواب دینا۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ جب انہوں نے اس سے کوئی استفسار کیا تو وہ کہنے لگا ''انی مشغول فی اعمال المکتبة'' جب اس نے دو تین دفعہ ان کو ایسے ہی عربی میں جواب دیا تو دونوں بھاگے بھاگے میرے پاس آئے اور کہنے لگے: نقاش بھائی! یہ آپ کے دوست کیا چیز ہیں! یہ ہم سے عربی میں بات کرتے ہیں۔ اب عربی تو ہمارے باپ دادا بھی نہیں جانتے' ہماری سمجھ میں تو ان کی بات نہیں آتی۔ اس پر میں نے سمجھایا کہ بالکل ایسے ہی وہ آپ سے پریشان ہے' اس کو انگریزی صحیح طرح سمجھ نہیں آتی جبکہ تم پاکستانی ہو کر اردو جانتے ہوئے بھی اس کے ساتھ کاٹھے انگریزوں کی طرح انگریزی میں تکلف کرکے بات چیت کرتے رہے۔ وہ چونکہ عربی جانتا ہے اس لیے عربی میں جواب نہ دے گا تو اور کیا کرے گا؟ وہ سمجھ گئے اور پھر ہم جتنے دن وہاں رہے وہ خالص اردو میں بات کرتے رہے۔

انگریزی کلچر کا بھوت قوم کے ذہنوں پر ایسے سوار ہے کہ جن خاص لوگوں نے قوم کو فکری طور پر پالیسی دینا ہوتی ہے صلیبی تہذیب و تمدن سے دامن بچانے کی راہ عمل بتانی

ہوتی ہے وہ خود اس مرض لاعلاج کا شکار ہیں۔ وہ بھی اس احساس کمتری کا شکار ہیں کہ انگریزی کے جملے اور الفاظ گفتگو میں استعمال کر کے لوگوں کو مرعوب کیا جاسکتا ہے ورنہ آدمی کا رعب اور وقعت ہی نہیں رہتی۔ ایک بڑی مذہبی شخصیت جو مغربی فکر سے پاک تعلیمی پالیسی فراہم کرنے کی ذمہ داری پر متعین ہے' اپنے ایک خطبہ جمعہ میں ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کی قربانی کا واقعہ بیان کرتے ہوئے کہنے لگی: جب ابراہیم علیہ السلام نے اسماعیل علیہ السلام سے اپنا خواب بیان کیا تو پوچھا کہ اے اسماعیل What is your openion (اب تمہاری رائے کیا ہے یعنی مجھے کیا کرنا چاہیے؟)

بہرحال ایسے ہی تہذیبی بحران' صلیبی کلچر سے مرعوبیت اور اپنی شناخت کے حوالے سے احساس محرومی واحساس کمتری کے غماض بہت سے لطیفے ہیں بلکہ اگر کہا جائے کہ غافل مسلمانوں کی ساری زندگی ہی ان سے بھری پڑی ہے۔ ایسے مغربیت پسند اور مغربی تہذیب کی نقالی کرنے والے لوگوں کے متعلق یہ مقولہ ''کوا چلا ہنس کی چال تو اپنی چال بھی بھول گیا'' بولا جاتا ہے' جو درست وبرمحل نظر آتا ہے۔

آمدم برسر مطلب! اب میں اصل مسئلہ کی طرف آتا ہوں کہ جس کے متعلق آج لکھنے کو سوچا تھا' وہ بھی انگریزی تہذیب کے تیزاب میں گل سڑ جانے والی سوچیں اور فکریں ہیں' جہاں حفظ مراتب کے الفاظ مائی لارڈ' مائی ڈیئر' ہزایکسی لینسی تو تھے ہی' وہاں ہی ہم نے اپنے ننھے بچوں کے منہ سے اپنے لئے بھی ایسے ہی الفاظ سننے پسند کیے جو انگریز اپنے بچوں سے کہلواتے ہیں اوران کو بولتے اور پکارتے ہیں مثلاً ڈیڈی' ممی' مما' پپا' فادر' مدر' پاپا ماما' مام ڈیڈ' یا پھر مزید آگے بڑھیں تو انکل' کزن' گرینڈ فادر' گرینڈ مدر وغیرہ۔

ہم جب اپنے لئے اپنے بچوں کے منہ سے ماما' پاپا کے الفاظ سنتے ہیں تو خوشی سے بے حال ہو جاتے ہیں۔ کبھی ہم نے سوچا ہے کہ لاشعوری طور پر ایسا کیوں ہے؟ لوگ ابا جان' امی جان' بابا جان وغیرہ کے الفاظ پر اتنا خوش کیوں نہیں ہوتے۔ کیا دین حنیف جس پر الیوم اکملت لکم دینکم (آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا) کی

مہر لگ چکی ہے، میں اور ہماری اسلامی تہذیب میں حفظ مراتب کے لئے الفاظ بالکل نہیں ملتے جو ہم اسلام دشمن مشرک قوموں کے الفاظ کو افتخار کے ساتھ اپنا لیں۔ قرآن کے عطا کردہ بچوں کے لئے والدین کو مخاطب کرنے کے الفاظ وکلمات کے ہوتے ہوئے مجھے تو یہ الفاظ ''ماما'' اور ''پاپا'' زہر لگتے ہیں۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ ہمیں قرآن نے جو دو الفاظ اس مقصد کے لئے عطا کیے ہیں بلا مبالغہ ان سے بہتر ان سے میٹھے اور ادب واحترام کے جذبات سے معمور الفاظ کائنات میں کہیں نہیں ملتے۔ وہ الفاظ کیا ہیں؟ کبھی ہم نے سوچا ہے؟ تو سن لیں! وہ ہیں: اَبیؔ اور اُمّیؔ۔ ذرا اس لمحے کا تصور کریں جب مسلمان بچہ اپنی توتلی سی زبان کے ساتھ مٹھاس بھرے یہ قرآنی الفاظ کے ساتھ آپ کو مخاطب کرے گا۔ جب وہ آپ کو اَبیؔ جان اور پیاری اُمّیؔ جان کہہ کر پکارے گا..... تو کس قدر جچے گا۔ یہ قرآن کے مترنم میٹھے اور ادب واحترام کے جذبات سے بھرپور الفاظ سن کر کس قدر لطف وسرور آئے گا اور دل خوشی سے جھوم نہ اٹھیں گے!!؟؟

لیکن مسئلہ یہ ہے کہ یہ بات لوگوں کو سمجھائے کون؟ اس کو ذرہ برابر اہمیت نہیں دی گئی، کبھی کسی نے سوچا ہی نہیں کہ جس طرح (اچھے اور برے) نام بچے کی شخصیت پر اثر انداز ہوتے ہیں اسی طرح یہ حفظ مراتب کے کلمات اس کی مستقبل کی سوچ وفکر کی تعمیر کرتے ہیں اور اس کے تہذیب وتمدن کی بنیاد رکھتے ہیں۔ بڑی مصیبت یہ ہے کہ جنھوں نے قوم کو سمجھانا تھا اور پالیسی دینی تھی وہ خود سوئے پڑے ہیں۔ ایک مذہبی لیڈر صاحب گھر میں اپنی بیوی سے صرف اس لیے لڑتے ہیں اور اس پر زور دیتے ہیں کہ میرے ساتھ اور بچوں کے ساتھ گھر میں انگریزی میں بات کیا کرو۔ وہ اللہ کی بندی جواب دیتی ہے کہ مجھے انگریزی آتی ہی نہیں، بات کیسے کرسکتی ہوں۔ تو کہتے ہیں کہ چلو جس قدر آتی ہے اس قدر ہی بات کرلیا کرو مگر اُردو نہ بولا کرو۔ افسوس! انہیں چاہیے تو یہ تھا کہ کہتے: ہم مذہبی لوگ ہیں، ہمارے گھر میں قرآن وحدیث کی زبان عربی کا راج ہونا چاہیے لیکن وہ بھی ''کاٹھے انگریز'' بننے کے چکر میں پھنس گئے۔

سعودی عرب میں ایک دوست کے ہاں دعوت پر جانا ہوا تو اس کا بچہ جو وہاں ہی پیدا ہوا تھا' وہ ہمارے پاس آیا تو اپنے والد کو مخاطب کر کے کہنے لگا: پاپا...... ماما...... بلا رہی ہیں۔ اس کا وہاں بیٹھا بڑا بیٹا اسے مخاطب کرتے ہوئے میری طرف اشارہ کر کے کہنے لگا: بھائی انکل سے شیک ہینڈ کرو یعنی چاچا جان سے ہاتھ ملاؤ۔ یہ نہ کہا کہ السلام علیکم کہو۔ یہ بھائی چونکہ فرنگی تہذیب کے خلاف بہت شدومد سے پرچار کرتا تھا' میں نے یہ منظر دیکھ کر کہا:

بھائی! تجھے پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو......

کہنے لگا: کیا مطلب؟ میں نے کہا کہ تو دنیا کو فرنگی تہذیب کے اثرات سے محفوظ کرنا چاہتا ہے جبکہ تیرا تو اپنا گھر اس کی تباہ کاری کا شکار ہے اور جب میں نے اس کو باور کروایا تو شرمندہ ہو کر کہنے لگا: نہیں ایسے نہیں' میرا بیٹا مجھے پاپا نہیں' بلکہ بابا کہہ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس کا بیٹا میرے پاس آیا تو میں نے پیار سے کہا: بیٹا! تم اپنی ماں کو کیا کہہ کر بلاتے ہو؟ تو وہ کہنے لگا ''ماما'' میں نے کہا: اور باپ کو؟ اس نے جواب دیا ''پاپا''

اتنی دیر میں میرا دوست بھی ہمارے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے پتہ چل چکا تھا کہ وہ ہمارے پیچھے خاموش کھڑا سب کچھ سن اور دیکھ رہا ہے لیکن میں نے ظاہر نہ ہونے دیا۔ میں نے اس کے بیٹے کو مخاطب کر کے کہا' جبکہ میرا اصل مخاطب وہی تھا اور میرا مقصد اپنے اسی دوست کو سنانا اور سمجھانا تھا' میں نے کہا: بیٹا! تم اپنے والد گرامی کو ''پاپا'' کیوں کہتے ہو؟

❀ جبکہ پاپا تو اس بڑے سائز کے رس کو کہتے ہیں جو چائے میں ڈبو ڈبو کر آپ روزانہ کھاتے ہیں۔ آپ کے ابو تو ایسے نہیں ہیں ناں۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر میں نے کہا:

❀ بیٹا! پاپ گناہ کو کہتے ہیں اور پاپی گناہ گار کو' گناہ کرنے والے کو' اور پاپا تو اس معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ آپ کے ابو جان تو بہت نیک' پانچ وقت کے نمازی' پابند صوم و صلوۃ ہیں۔

❀ پاپ ایک میوزک کو بھی کہا جاتا ہے جس کے گانے والے کو پاپ سنگر کہتے ہیں۔

آپ کے ابو تو گویے بھی نہیں ہیں۔

❀ بیٹا! ''پاپا'' تو چاول کے کیڑے کو بھی کہتے ہیں۔

❀ (سانپ کی) پٹاری کو بھی پاپا کہتے ہیں۔

❀ اور پھر ''گھن'' کو بھی کہتے ہیں۔

❀ آپ کے ابو جان تو ان میں سے کچھ بھی نہیں ہیں۔ بچہ حیرانی سے سب کچھ سنتا جا رہا تھا اور اثبات میں سر ہلانا بھول گیا تھا۔

❀ ''پاپا'' سے ہی پوپ ہے اور عیسائی لوگ اپنے بڑے پادری کو بھی پاپا یا پوپ کہتے ہیں جبکہ تمہارے ابو جان تو عیسائیوں کے بڑے پادری نہیں بلکہ الحمدللہ مسلمان ہیں......

تو پھر تم اپنے ابو جان کو ''پاپا'' کیوں کہتے ہو اور کیا سوچ کر کس معنی میں پاپا کہتے ہو؟؟ بچہ عجیب الجھن کا شکار تھا کہ کیا جواب دے؟ صرف اتنا کہہ سکا: ان باتوں کے متعلق کبھی ہمیں پاپا نے تو کچھ نہیں بتایا۔

میرا دوست اور بچے کا باپ جو پیچھے کھڑا سب سن رہا تھا اچانک سامنے آ گیا اور کہنے لگا: نقاش بھائی! اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔ آپ نے میری آنکھیں کھول دیں۔ میں نے کبھی اس پر غور ہی نہیں کیا تھا بلکہ دنیا والوں کے ساتھ ہی اس رو میں بہتا چلا جا رہا تھا۔ اب میرے بچے کبھی بھی ممی ڈیڈی یا مما پاپا نہیں کہیں گے بلکہ وہ قرآن کے شیریں و مسحور کن الفاظ کے ترانے ہی اپنی زبان سے الاپیں گے۔ یعنی اب وہ ہمیشہ ابی اور امی کہہ کر ہمیں مخاطب کیا کریں گے۔

میں نے کہا: پیارے بھائی!......اللہ کرے سب لوگ آپ کی طرح ان گندے اور صلیبی الفاظ کو خیر باد کہہ کر قرآنی الفاظ کو اپنا لیں جو یقیناً اسلام و قرآن سے محبت کا ثبوت بھی ہوگا اور اچھی نیت کی بناء پر ثواب کے ساتھ اللہ کریم کی رضامندی کا باعث بھی۔ ان شاء اللہ

شکاری خود شکار ہو گیا

گزشتہ دنوں خبر پڑھی کہ ایک عامل پسند کی شادی کے لیے ایک نوجوان سے مسلسل رقم بٹورتا رہا حتیٰ کہ اس نے اس کو کنگلا کر دیا۔ وہ دعویٰ کرتا ہے کہ میرے پاس ایسے ایسے جن ہیں کہ اگر کہو تو وہ سلیمان علیہ السلام کے دور والی ملکہ بلقیس کے تخت کی طرح تمہاری محبوبہ کو اٹھا کر تمہارے پاس پہنچا دیں' لیکن میں ایسا نہیں کر رہا۔ میں چاہتا ہوں یہ میرے علم کے زور پر ہو' لڑکی کے گھر والے خود راضی ہوں اور تمہیں شادی کی آفر کریں ...... یوں لڑکے کی جمع شدہ رقم بھی ختم ہو گئی لیکن لڑکی والوں کی طرف سے آفر نہ ہو سکی......

یہ خبر پڑھ کر مجھے ایک دوست عامل بابا یاد آ گئے اور وہ منظر میری آنکھوں کے سامنے گھوم گیا جب مجھے حرم کعبہ کے باب بلال کے اندر پاکستانی دوستوں سے ملاقات کا موقع ملا تھا۔ حال احوال دریافت کرنے کے بعد گفتگو کا رخ کسی اور طرف نکل گیا۔ ہوا یوں کہ وہاں پاکستان کے ایک عالم دین بھی موجود تھے' جو جنات جادو وغیرہ کے خاتمہ میں خاصے مشہور ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہاں پہنچ کر بھی انہوں نے جن نکالنے کی خدمت کا ''شغل'' جاری رکھا ہوا ہے۔ ایک بھائی نے بتایا کہ وہ یہاں آتے ہی اس مقصد کے لیے ہیں' بلکہ جنات بھگانے کے لیے وہ یہاں آتے ہی رہتے ہیں۔ میں نے سوچا ضرور عرب کی سرزمین کے جنات نکال کر یہ لوگ پاکستان کا نام روشن کر رہے ہیں۔ چلو کسی نہ کسی طرح ملک کا نام روشن ہونا چاہیے خواہ کسی بھی طرح اور کسی بھی شعبہ میں ہو۔ ایٹمی ٹیکنالوجی کے بعد یہ میدان خالی رہ گیا تھا جو مار لیا گیا ہے۔

بہرحال چونکہ موصوف سامنے بیٹھے اپنی کارگزاری سنا رہے تھے کہ میں نے فلاں کا

جن یوں نکالا' یہ ہوا' وہ ہوا وغیرہ وغیرہ...... باتوں ہی باتوں میں انہوں نے جنات کے ذریعے کسی شخص کو اس کے مقام سکونت سے اٹھائے جاسکنے کا دعویٰ کر دیا۔ بندہ کو فوراً اپنا دیرینہ مطالبہ اور خواہش یاد آ گئی۔ بندہ نے فوراً کہا: حضرت صاحب! آپ لوگوں کے لیے مطلوبہ افراد کو جنات کے ذریعے اٹھوا کر فیس دینے والوں کے پاس پہنچانے کے دعویدار ہیں' میری ایک دیرینہ خواہش پوری کر دیں' بولے: وہ کیا ہے؟ میں نے کہا: اسرائیل کے سابقہ وزیراعظم شیرون کو کسی طرح اٹھوا کر ہمارے پاس پہنچا دیں تو منہ مانگی قیمت دیں گے۔ کہنے لگے: یہ کوئی مشکل کام نہیں لیکن اس کے لیے ''ایک کروڑ'' لوں گا اور وہ بھی ریال کی شکل میں۔ میرے ساتھ کویت کے بھائی خالد بشیر بیٹھے تھے' وہ پر جوش انداز میں بولے: نہیں بھائی! ہم ایک کروڑ ریال نہیں دیں گے...... بلکہ تین کروڑ ریال دیں گے!! آپ شیرون کو اٹھوا کر ہمارے حوالے کریں۔

اب یہ عامل صاحب حیران رہ گئے' فوری کہنے لگے: ادائیگی نقد ہوگی۔ تو انہوں نے کہا: میں تو چیک کاٹ کر دوں گا لیکن یہ کیش شیرون کی ہمارے پاس سپردگی کے بعد ہوگا۔ کافی بحث کے بعد معاملہ طے پا گیا' اب عامل صاحب کہنے لگے: میں اپنا عمل پاکستان جا کر شروع کروں گا اور وہاں ہی آپ کو شیرون کی سپردگی کرواؤں گا۔ ہمارا اصرار تھا کہ آپ نے جو کرنا ہے یہیں کریں اور یہیں سپردگی کروائیں۔ پاکستانی گورنمنٹ کا کیا' پتا اس کو فوری اسرائیل کے حوالے کر دے' لیکن وہ مسلسل آئیں بائیں شائیں کر رہے تھے' سپردگی کی جگہ پر کچھ اختلاف رہا جبکہ معاملہ طے پا گیا۔

اس موقعہ پر مجھے جامعہ محمدیہ جی ٹی روڈ گوجرانوالہ کے اپنے مرحوم استاد جناب جمعہ خاں صاحب یاد آ گئے' وہ جنات نکالنے اور دم وغیرہ کے مسئلہ میں علاقہ کی مشہور شخصیت تھے۔ اپنے طالب علمی کے دور میں' میں نے ان سے بھی یہی مطالبہ کیا تھا' اس وقت شیرون اسرائیلی فوج کی قیادت کرتے ہوئے صابرہ وشتیلا کیمپوں میں مسلمان بچوں' بوڑھوں اور خواتین کو خون میں نہلا رہا تھا' البتہ اس مطالبہ میں اتنا اضافہ کیا تھا کہ استاد صاحب! اگر

شیرون کے ساتھ ساتھ آپ کے جن اندرا گاندھی کو بھی اٹھالائیں تو مزہ آجائے گا!! انہوں نے کچھ سوچنے کے بعد کہا: بزرگ! ایک مسئلہ ہے' میرے پاس مسلمان جن تو موجود ہیں' جن کے ذریعہ ہم اسے اٹھوا سکتے ہیں' لیکن کیا کریں اُدھر یہودی جن بھی شیرون کی حفاظت کر رہے ہیں اور وہ میرے جنوں سے کہیں زیادہ طاقتور ہیں' وہ تو ان کو کچا چبا جائیں گے۔ یوں انہوں نے اندرا گاندھی اور شیرون کو اپنے تمام تر دعوؤں کے باوجود اٹھانے سے معذرت کرلی۔ یہاں یہ پاکستانی عامل دعویٰ کر رہے تھے کہ وہ ہر صورت میں شیرون کو اٹھوانے پر قادر ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ایسے دعوے عامل حضرات اکثر لوگوں کو مرعوب کرنے کے لیے کرتے ہیں اور جاہل لوگ ان کی باتوں میں آ کر اپنی جیب اور عقیدہ کی قربانی دیتے رہتے ہیں۔ مجھے بھی سو فیصد یقین تھا اور ہے کہ ان جیسے عاملوں سے ایسا ہونا مشکل نہیں بلکہ یقینی طور پر ناممکن ہے لیکن میں دوسرے لوگوں کے سامنے اصل حقیقت لانے کے لیے ایسا کر رہا تھا۔ ان عامل صاحب کا یقین اس قدر پختہ تھا اور وہ کہتے کہ یہ کوئی مشکل کام ہی نہیں۔ ان کے اس قدر ٹھوس اور یقینی لب ولہجہ کو دیکھ کر ایک دو دفعہ تو میں بھی سوچ میں پڑ گیا' ممکن ہے کہ یہ کوئی ایسا ٹونا ٹوٹکا جانتا ہو اور ہمارا مطالبہ پورا کر دے۔ پھر میں تصورات کی دنیا میں ہی کھو جاتا کہ کیا ہی خوب اور زبردست منظر ہوگا کہ جب شیرون ہماری قید میں ہوگا' پوری دنیا کا میڈیا اس کی گمشدگی اور اغوا کی خبریں نشر کر رہا ہوگا' ہم غزہ کی پٹی کا مسئلہ اور فلسطین کی آزادی کا مسئلہ حل کروائیں گے' اپنے مطالبات منوائیں گے اور شیرون کے گندے منہ پر تھپڑ جڑیں گے' مکے ماریں گے' اور اس کے پیٹ میں گھونسے اور لاتیں مار کر لاکھوں مظلوم بہنوں اور بھائیوں کی شہادتوں کا بدلہ لیں گے' یوں پورا پورا حساب چکائیں گے اور خوب انتقام لیں گے۔

ایسی ہی امیدوں اور ناامیدیوں کا دور گزر رہا تھا کہ سعودیہ میں ایک معروف شخصیت اور حجاج کے خادم ایک پاکستانی بھائی حفیظ اللہ بلوچ نے میرے موبائل پر ایک ایسی اطلاع دی کہ جسے سن کر میں اچھل پڑا اور بے اختیار میرے منہ سے نکلا: ''ایسا نہیں ہوسکتا'' لیکن

جواب میں مجھے بتایا گیا کہ ایسا ہوگیا ہے اور آپ کا وہ عامل کہ جو اپنے جنات کے زور پر شیروں کو اٹھوانے اور اغوا کروانے کا دعویٰ کر رہا ہے اور جس سے تین کروڑ سعودی ریال میں معاہدہ طے پا چکا ہے...... اس کو سعودی پولیس اٹھا کر لے گئی ہے اور جیل میں ڈال دیا ہے۔
تفصیلات دریافت کرنے پر انہوں نے بتایا کہ:

یہ حضرت بیت اللہ کا طواف کر رہے تھے کہ اچانک پیچھے سے ایک مصری نے چھا ڈال لیا اور چلاّنا شروع کر دیا: چور، چور...... چور...... وہ شیر ببر اس کو زبردستی پکڑ کر چوری کے الزام میں پولیس کے پاس لے گیا اور کہا کہ اس نے دوران طواف میری جیب کاٹ لی ہے۔ ان عامل صاحب نے بہت شور مچایا لیکن ان کی کوئی پیش نہ گئی اور پولیس نے ان کو ''اندر'' کر دیا۔ یوں دوسروں کو شکار کرنے والا خود شکار ہوگیا۔ اب اس عامل نے اپنے موبائل سے حفیظ اللہ بھائی کو فون کیا کہ مجھے پولیس والوں نے اٹھا کر جیل میں بند کر دیا ہے' کسی بھی طریقہ سے میرا کچھ کرو' مجھے یہاں سے اٹھواؤ اور باہر نکال کر اپنے پاس لے جاؤ۔
میں نے حفیظ اللہ بھائی سے کہا کہ یہ اللہ کا بندہ اسرائیل سے شیروں کو تو اٹھوانے والا ہے' اس کو کہیں کہ اپنے جنات کو حکم دے کہ وہ ابھی ادھر نہ جائیں بلکہ وہ اسے یہاں سے نکالیں۔ وہ ہنس پڑے' کہنے لگے: ایسا تو وہ نہیں کر سکے گا البتہ میرے موبائل پر بار بار فون کر رہا ہے کہ مجھے یہاں سے نکالو۔ میں نے کہا کہ میں آدھی رات کے وقت جدہ میں سو رہا ہوں' مجھے فوری مکہ مکرمہ پہنچنا مشکل ہو جائے گا' صبح آؤں گا تو کچھ ہو سکے گا۔ سعودی پولیس والوں نے اس کے بار بار فون کرنے پر اس سے موبائل بھی چھین کر اپنے قبضہ میں کر لیا۔ اب کوئی جن ان کو پولیس کی حراست سے موبائل اٹھا کر بھی نہ دے سکا کہ وہ دوبارہ کسی سے رابطہ کر سکے۔
صبح فجر کے وقت حفیظ اللہ بھائی نے عامل صاحب کے موبائل پر رابطہ کیا تو آگے سے پولیس والا بولا اور دریافت کرنے لگا کہ آپ نے اس شخص کو کیوں فون کیا؟ یہ کون ہے اور آپ کا اس سے کیا تعلق ہے؟ جس پر انہوں نے بتایا کہ میں یہاں سعودیہ کے دعوتی ادارے جالیات میں کام کرتا ہوں اور اس گرفتار شخص کو اس لیے جانتا ہوں کہ یہ پاکستان کا

ایک بہت بڑا عالم دین ہے' نہایت نیک سیرت اور صحیح العقیدہ آدمی ہے۔ اس نے کہا: مگر اس پر تو چوری کا الزام ہے اس لیے وہ یہاں بند ہے۔ حفیظ اللہ بھائی نے جواباً کہا کہ مصری مسلمان کو غلط فہمی ہوئی ہے اگر اس نے چوری کی ہوتی تو مال مسروقہ ضرور اس سے برآمد ہوتا اور اس چیز کی آپ بھی تصدیق کریں گے کہ اس سے کچھ بھی برآمد نہیں ہوا۔ لہٰذا یہ بے گناہ ہے اسے چھوڑ دیں' میں اس کی ضمانت دیتا ہوں۔ اب وہ افسر مطمئن ہو گیا اور اس نے اس کی مثبت رپورٹ لکھ دی۔ اب اس کی ڈیوٹی ختم ہوئی تو نئی شفٹ کے عملے نے جب رات کی رپورٹ پڑھی تو اس میں عامل کے متعلق لکھی گئی مثبت رپورٹ اور اس کو بے گناہ قرار دیے جانے پر اسے چھوڑ دیا۔ یوں اس کے جن تو اس کو وہاں سے نہ نکال سکے لیکن ایک اچھے انسان کی گواہی اس کی نجات کا سبب بن گئی۔ میں ایسے عاملوں کو بھی جانتا ہوں کہ جو مریض کو قرآن پاک کی آیات والے اوراق جلانے کے لیے دیتے ہیں کہ اس طرح کرنے سے آپ کو افاقہ ہو جائے گا۔ (لاحول ولا قوۃ الا باللہ) ایسا ہی ایک واقعہ سعودیہ میں میرے قیام کے دوران بھی ہوا لیکن مضطرب شخص علماء سے فتویٰ پوچھنے کی بنا پر ایسا کرنے سے بچ گیا۔

تو عرض ہے کہ میرے وہمی اور کمزور عقیدہ کے بھائی جو ذرا ذرا سے مسائل چوری چکاری اور حوادث پر جن جادو وغیرہ کے واہموں میں پڑ جاتے ہیں' وہ اللہ پر توکل کرتے ہوئے خرافاتی عاملین سے جان چھڑوا کر قرآن و سنت کی تعلیمات کو اپنائیں اور مجبوری کی صورت میں کسی صحیح العقیدہ توحید کے علمبردار عالم و عامل سے راہنمائی کے لیے رجوع کریں۔ خاص طور پر خواتین محتاط ہوں کہ سب سے زیادہ جنات کا عارضہ ان کو لاحق ہوتا ہے' کیونکہ غلط عاملین اور غیر شرعی خواہشات کی تکمیل کے پیچھے لگا انسان نہ صرف اپنا مال گنواتا ہے بلکہ اپنی توحید جیسی قیمتی متاع بھی لٹا بیٹھتا ہے۔ اللہ کریم ہمیں محفوظ فرمائے۔ (آمین)

❀❀❀❀

میوزیکل نماز

تہذیب و ثقافت کے جہاں اور بہت سے پہلو مذہبی اقدار کی دھجیاں بکھیر رہے ہیں اور اخلاقی اقدار کا جنازہ نکال رہے ہیں وہیں موبائل حاملین و صارفین کی ایک کثیر تعداد احساس کمتری کا شکار ہے۔ وہ اسے احساس برتری میں بدلنے کے لیے مختلف ہتھکنڈے اختیار کرتے ہیں۔ مثلاً بعض خواتین و حضرات موبائل سیٹ ہاتھوں میں پکڑ کر یہ باور کرواتے پھرتے ہیں کہ ہم موبائل رکھنے والے بہت مصروف' معروف اور اعلیٰ سوسائٹی والے ہیں۔ خواتین کے ہاتھوں میں تو خاص طور پر پرس کی جگہ تیزی سے موبائل آتا جا رہا ہے۔ بعض لوگوں کو اپنے تفاخر و امارت کے اظہار کا موقعہ عموماً اس وقت ملتا ہے کہ جب وہ آگے دیکھتے ہیں کہ اشارہ بند ہے تو وہ گاڑی اشارے پر روک کر کسی کا نمبر ڈائل کر کے موبائل کان سے لگا کر اونچی آواز میں باتیں کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اشارے پر دوسرے لوگ جو اشارہ کھلنے کے منتظر ہوتے ہیں' ان کو جب دیکھتے ہیں تو گویا یہ ان کے تفاخرانہ جذبات کی تسکین کا باعث ہوتا ہے۔

یوں موبائل فون بعض لوگوں کے لیے تو سٹیٹس سمبل بن کر رہ گیا ہے جبکہ بعض کاروباری حضرات کی حقیقی طور پر ضرورت ہے۔ کبھی ایک دور تھا جب موبائل کے حامل کو بڑی حسرت بھری نظر سے دیکھا جاتا تھا لیکن اب تو موبائل ایک بچے کا کھلونا بن کر رہ گیا ہے۔ سعودیہ میں راقم نے جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے بچوں کے ہاتھوں میں بھی موبائل دیکھے۔ اب موبائل اپر کلاس کا نہیں بلکہ لوئر کلاس کا بھی نشان ہے۔ اس کی دو مثالیں آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔ کچھ عرصہ قبل روزنامہ خبریں نے اپنے صفحہ اول پر ایک تصویر شائع کی جس میں دکھایا گیا کہ ایک بار بردار (کمہار) گدھوں کو ہانکتا ہوا لے جا رہا ہے جبکہ اس کے

دوسرے ہاتھ میں موبائل ہے جسے اس نے کان سے لگا رکھا ہے اور کسی سے باتیں کرتا اور گدھوں کو آگے بڑھاتا ہوا چلا جا رہا ہے۔

پچھلے دنوں لاہور کے مشہور اشاعتی ادارے دارالسلام کے بائنڈر حاجی اکبر نے اپنے ریڑھی والے طاہری کو موبائل سیٹ لے کر دیا کہ جب اس کی ضرورت ہوگی تو فوری طور پر اس سے رابطہ ہو سکے گا۔ اب ہوا یہ کہ (وہ شاید اس موبائل کی بنا پر) اس قدر کام میں مصروف ہو گیا کہ جب حاجی اکبر کی کال آئے تو وہ سکرین پر نمبر پہچان کر کال کاٹ دے بات نہ کرے۔ حاجی صاحب نے بعض قریبی افراد سے گلہ کیا کہ میں نے موبائل لے کر دیا اور اب وہ میری ہی کال سننا گوارا نہیں کرتا۔ گدھا گاڑی والے نے کہا: یہ بھی کوئی سیٹ ہے لہٰذا اس نے 3310 سیٹ فروخت کر کے کیمرہ والا موبائل 10 ہزار میں خرید لیا۔ پچھلے دنوں میری اس بھائی سے ملاقات ہوئی' میں نے موبائل کے قصہ پر استفسار کیا تو بتانے لگا کہ وہ کیمرے والا سیٹ تو تیسرے دن ہی کسی نے چوری کر لیا۔ لہٰذا اب میں دوبارہ کل یا پرسوں اچھا سا کیمرے والا سیٹ لینے والا ہوں۔

ہمارے کچھ قریبی دوست چند دن قبل اس وقت حیران و پریشان ہو گئے جب ایک گھر میں صفائی کے لیے آنے والی عورت فرش کی صفائی کر رہی تھی کہ اچانک موبائل کی رنگ بج اٹھی۔ اس نے فوراً کام روک کر اپنی جیب سے موبائل نکالا اور کان سے لگا کر باتیں کرنے لگی۔

موبائل اب کوئی ایسی چیز نہیں رہی جو آدمی کو دوسرے سے منفرد و ممتاز بناتی ہو یا یہ فخر کا باعث ہو' بلکہ اب تو بعض ایسے افراد بھی شوقیہ طور پر اور شو بازی میں موبائل سیٹ خرید لیتے ہیں کہ جن کو کسی طور پر بھی موبائل فون کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن خریدنے کے بعد وہ صرف اس کی بیلیں (گھنٹیاں) سننے اور گیمیں کھیلتے رہتے ہیں' یا جن کے موبائل نمبر یاد ہیں ان کو مس کالیں دیتے رہتے ہیں۔ وہ مضطرب اور ترستے رہتے ہیں کہ ان کو کوئی کال نہیں آ رہی' ان کو کوئی فون نہیں کر رہا۔ یوں اپنے فون کی رِنگ سننے کے لیے ان کے کان پک

جاتے ہیں۔

چند دن قبل مجھے ایک دوست کا دلچسپ مشاہدہ ہوا۔ اس نے موبائل فون خریدنے کے بعد تمام قریبی عزیزوں دوستوں کو پی سی او سے فون کر کے اطلاع دی کہ اللہ کے فضل سے میں نے موبائل خرید لیا ہے آپ رابطہ کے لیے میرا نمبر نوٹ کر لیں۔ جوابی طور پر اس نے مبارک بادیں بھی وصول کیں۔ یوں موبائل خریدنے کی اطلاع دینے پر اس کی جیب اچھی خاصی ہلکی ہوگئی۔ اب وہ انتظار میں بیٹھ گیا کہ اسے بھی لوگوں کی طرف سے کالیں وصول ہوں گی اور وہ بڑے نخرے سے کہے گا کہ نہیں جی نہیں! میں بہت مصروف ہوں' میرے پاس وقت نہیں' پھر کبھی آپ کی طرف آؤں گا وغیرہ وغیرہ۔

اس کے ایک لنگوٹیے دوست نے جب اپنے جگری یار کو مسلسل افسردہ دیکھا تو اس پر ترس کھاتے ہوئے پی سی او سے اس کے فون پر کال کی۔ جونہی اس کے موبائل فون کی گھنٹی گونجی اس کی آنکھیں چمک اٹھیں اور اس نے دوسری بیل نہ ہونے دی بلکہ فوراً کال ریسیو کر لی' جیسے کہ وہ اسی انتظار میں تو بیٹھا تھا۔ جونہی اس نے کال ریسیو کی تو دوسری طرف سے غصے بھری آواز گرجی: او گدھے کے بچے! میں نے تم پر ترس کھاتے ہوئے تجھے مس کال کی تھی اور تو نے جھٹ سے وصول کر لی...... اس کے علاوہ بھی اس کو کئی کڑوی کسیلی باتیں سننا پڑیں لیکن وہ محض اس لیے برداشت کر گیا کہ چلو میرے فون پر کال تو آئی' میرے فون کی گھنٹی تو بجی اور میری دیرینہ محرومی تو ختم ہوئی۔

اب بھی کچھ لوگ ایسے ہیں کہ جو اس فون کے ذریعہ اپنے آپ کو معاشرے میں اوپر والی مخلوق سمجھتے ہیں۔ ہم ایک ایسے مولانا صاحب سے بھی واقف ہیں کہ وہ جب بھی تصویر کھنچواتے ہیں تو کیمرہ مین کو اشارہ کرتے ہیں کہ ذرا ٹھہرو' پھر موبائل فون کان سے لگاتے ہیں اور علامہ اقبال کا سوچنے اور غور وفکر کرنے کا مشہور انداز اور پوز بنا کر کہتے ہیں کہ اب کھینچو تصویر میری۔ ادر یوں وہ موبائل پکڑ کر کان سے لگائے ہوئے انداز میں تصویر کھنچوا کر خوشی سے پھولے نہیں سماتے۔ اصل میں یہ لوگ احساس کمتری کے شکار ہوتے ہیں اور

اللہ کریم کی طرف سے ملنے والے زندگی کے ان چند قیمتی لمحات کو ضائع کرنے والے ہوتے ہیں۔ گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں۔ ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب ان کو احساس ہوتا ہے کہ ہم نے زندگی کے قیمتی لمحات کہ جن میں ہر انسان کچھ کر گزرنے کے دور سے گزر رہا ہوتا ہے' کو فضول شوق میں یکسر ضائع و برباد کر دیا۔ پھر وہ ہمیشہ زندگی کے ضائع ہو جانے والے وقت پر پچھتاتے رہتے ہیں۔

ان سب باتوں سے ہٹ کر موبائل فون کے استعمال کا ایک نہایت تکلیف دہ پہلو بھی ہے ...... وہ ہے عبادات کے ضیاع کا مسئلہ ...... اور خاص طور پر نماز پنج گانہ کا مسئلہ۔ ہمارے ہاں عام طور پر دیکھنے میں آتا ہے کہ جب انسان کسی سے ملاقات کرتا ہے تو وہ کوئی تھانیدار ہو' وزیر ہو' مشیر ہو' کوئی اعلیٰ حکومتی شخصیت ہو یا پھر بہت عزیز و قریبی رشتہ دار وہ یہ پسند نہیں کرتا کہ میری توجہ تمہاری طرف سے ہٹ کر کسی دوسری طرف چلی جائے۔ لہٰذا میں نے ہمہ تن گوش ہو کر تمہاری گفتگو سننے کے لیے اور ملاقات کے لیے فون کو مستقل طور پر بند کر دیا ہے کہ نہ ہی کوئی کال آئے' گھنٹی بجے اور نہ ہی ہماری ملاقات و گفتگو میں خلل و اضطراب و انقطاع پیدا ہو۔ لیکن یہی بھائی جب نماز کے لیے جاتا ہے تو اس کے ذہن کے کسی گوشے میں بھی یہ بات نہیں ہوتی کہ وہ نماز شروع کرنے سے قبل اپنا فون آف کر دے، تاکہ دوران نماز اپنی اور دیگر نمازیوں کی نماز خراب نہ ہو۔

موبائل سیٹ خریدنے کے بعد سب سے اہم مرحلہ اس کی ٹون یعنی بیل کے انتخاب کا مرحلہ ہوتا ہے۔ اگر آدمی شیطانی سوچ و فکر اور کلچر کا گرویدہ ہوگا تو وہ ویسی ہی ٹون سلیکٹ کرے گا۔ اگر وہ سنجیدہ' صاف ستھری اور مہذب اور اسلامی فکر کا حامل ہوگا تو اس کی ٹون کا انتخاب اس بات کی گواہی دے گا۔ ایک دفعہ محترم امیر حمزہ صاحب نے نیا سیٹ لیا' کال آئی تو ''غزوہ'' کا کمرہ گھوڑے کی ہنہناہٹ سے گونج اٹھا۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا: حمزہ صاحب! یہ کیسی ٹون لگا رکھی ہے آپ نے؟ تو انہوں نے تفصیل سے جو جواب دیا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ: میں نے جب سیٹ خریدا تو اب ٹون لگانے کا مسئلہ تھا۔ میں نے صرف یہ

ٹون سیٹ کی' صرف اس لیے کہ گھوڑا مجاہدین کا نشان ہے' جہادی ترک تازیوں کی جان ہے اور اللہ کریم نے قرآن پاک میں سورۃ العادیات میں اس کی قسمیں کھائی ہیں۔ اس لیے میں نے اس جانور کی عظمت کے پیش نظر اس کی میدان جہاد وقتال میں گونجنے والی آواز کو اپنے سیٹ پر بطور ٹون لگا دیا ہے' تا کہ ہمیں ہر وقت جہاد فی سبیل اللہ کی قرآنی پکار یاد آتی رہے۔ سبحان اللہ! یہ فرق ہے سوچ وفکر کے سفر کا۔ موبائل کی ٹون سیٹ کرتے ہوئے کسی کی سوچ و فکر سفر کرے مغربی ناچ گانوں اور میوزک کی طرف اور کسی کی اللہ کے قرآن کی طرف!! بہرحال فون پر ٹون سیٹنگ آدمی کے ذہنی رجحان کی نشاندہی کرتی ہے۔

بعض لوگ نماز میں بھی مختلف بہانوں سے موبائل سے کھیلتے دیکھے گئے ہیں۔ مثلاً اگر نماز کے درمیان کوئی کال آ گئی تو وہ فون نکال کر اس کو کٹ کریں گے ...... اور اگر مس کال آ گئی تو اس کو اور کاٹی گئی کال کو دوران نماز چیک کریں گے' کہ کس کا نمبر تھا۔ پھر نمبر چیک کر کے اطمینان سے فون جیب میں ڈال لیں گے۔ راقم سعودیہ میں تھا کہ ایک مسجد میں دوران نماز ایک بدو کے موبائل پر کال آئی۔ اس نے فوری موبائل نکالا اور کان سے لگا کر کہنے لگا: (انی فی الصلوۃ) میں نماز پڑھ رہا ہوں۔ اور پھر فون بند کر کے جیب میں ڈال لیا۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔

اسی طرح دسمبر 2005ء کا ایک جمعۃ المبارک بندہ نے مسجد الحرام بیت اللہ میں پڑھا تو آج چونکہ چھٹی تھی' ہندوستانی' پاکستانی' بنگلہ دیشی وغیرہ کافی تعداد میں یہاں جمع تھے' دوران خطبہ ونماز ان لوگوں کے موبائلوں نے میوزک اور فحش گانوں کا مسلسل طوفان بدتمیزی بپا کیے رکھا لیکن وہ اس کو معیوب سمجھنے کی بجائے روزمرہ کے معمول کی طرح کوئی اہمیت وتوجہ نہ دے رہے تھے۔ اسی صورت حال کو دیکھ کر سعودی عرب کے جلیل القدر علماء نے مسجد میں موبائل فون کھلا رکھنے کے خلاف باقاعدہ فتویٰ دیا ہے اور اس کی خوب تشہیر بھی کی ہے۔

اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ دوران نماز قرآن کی تلاوت ہو رہی ہوتی ہے ...... لوگ قرآن کی تلاوت سے محظوظ ومسحور ہو رہے ہوتے ہیں ...... لوگ ہمہ تن گوش ہوتے ہیں ......

ہر ایک کی توجہ اور سوچیں اپنے رب کے کلام اور اس کے پیغام کو سننے اور سمجھنے کی طرف لگی ہوتی ہیں...... کہ اچانک ...... مسجد کے مختلف اطراف سے گندے فحش حیاء سوز گانوں کی آوازیں آنی شروع ہو جاتی ہیں...... کسی طرف سے انگریزی میوزک کی تانیں اڑ رہی ہوتی ہیں تو کسی طرف سے ہندی گانوں کی۔ ایک تو مسجد کے خاموش پرسکون اور بند عمارت کے ماحول میں ان سازوں اور گانوں کی گونج ویسے ہی بہت بلند ہوتی ہے...... دوسرا مختلف کمپنیوں کے جدید سیٹ بھی ایسے آ گئے ہیں کہ ان کی آواز عام جگہ پر بھی ڈسکو میوزک سنٹر کا سماں باندھ دیتی ہے۔ جب ایسے بلند آواز پر مبنی ڈیک نما موبائل سیٹ مسجد کی پرسکون روحانی فضا کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیتے ہیں تو ایسے میوزک پسند لوگ اور شیطانی سوچ و فکر کے حامل لوگ اپنی نماز بھی گویا ایسی پڑھتے ہیں کہ جس کو ''میوزیکل نماز'' کہنا زیادہ بہتر ہوگا...... لیکن اس کے باوجود المیہ یہ ہے کہ ان کو اس بات کا احساس تک نہیں ہوتا اور وہ اپنی ڈگر پر قائم رہتے ہیں' اور اللہ کے گھروں کے سکون اور تقدس کو مسلسل برباد کر کے اللہ کے عذاب کو دعوت دیتے رہتے ہیں۔

دوستو! غور کرو' ہم نے دوستوں' عزیزوں' تھانیدار' ناظم' وزیر مشیر اور دوسرے لوگوں کی عزت و توقیر کرتے ہوئے تو دوران ملاقات یا پھر ملاقات سے پہلے ہی فون بند کر دیا...... لیکن جب رب ذوالجلال ساری کائنات کے مالک کے سامنے سر جھکانے کا وقت آیا تو اس طرف سوچنا بھی گوارا نہ کیا...... شاید ہمارے ایسے ہی اعمال کی بنا پر خالق کائنات نے قرآن مجید میں ہم سے شکوہ کیا ہے کہ:

﴿وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهِۦٓ﴾ (الانعام: ۶/ ۹۱)

''انہوں نے اللہ کی قدر پہچانی ہی نہیں جیسا کہ اس کی قدر پہچاننے کا حق تھا۔''

استغفر اللہ! ہم نے اللہ کی قدر کیا پہچاننی تھی' ہم نے تو اس کا اس طرح مذاق اڑایا کہ دوران نماز بعض مساجد میں ایسے مناظر برپا ہو جاتے ہیں کہ نقلِ کفر کفر نا باشد...... مسجد ......س...... کا منظر پیش کرنے لگتی ہے ...... اس وقت ...... جب اللہ کے گھر ...... مسجد پر گندے گانوں کے تیر لگتے ہیں ...... اس کی پاکیزہ ایمان پرور' روح کو زخمی کرتے ہیں...... تو

وہ ایسے میوزیکل نمازیوں کے لیے اللہ کے حضور یقیناً بد دعا کرتی ہے...... آپ بھی سوچ لیں' غور وفکر کر لیں، کہیں آپ ان لوگوں میں شامل تو نہیں۔ اللہ نے قرآن میں فرمایا ہے'' آپ اپنے رب کا نام لیتے رہیں اور اس کی طرف ہمہ تن اور یکسو ہو کر متوجہ ہو جائیں''۔ کیا آپ ایسی صورت حال میں اس حکم پر عمل پیرا ہو سکتے ہیں۔ اللہ کریم تو کہے کہ میری طرف ہمہ تن و یکسو اور متوجہ ہو جاؤ جبکہ ہم اس کا یہ حق دوستوں یاروں یا دوسرے صاحب اقتدار لوگوں کو دے دیں اور اس خالق و مالک کا خیال ہی نہ رکھیں۔ کیا ایسی صورت میں ہم کامیاب ہو جائیں گے؟ آج ہی غور کر لیں' سوچ لیں' اللہ کریم کا قرآن بھی آپ کے خلاف شکایت کناں ہے' اللہ کا گھر (مسجد) بھی آپ کے خلاف شکایت کناں ہے...... اللہ کا گھر آپ کے خلاف رو رو کر فریادیں کر رہا ہے...... اگر اللہ کو خوش کرنا چاہتے ہیں...... اور ان کی اپنے خلاف درخواست پر اللہ کے غضب سے بچنے کا ارادہ ہے تو...... پھر آج ہی اپنے فکر و عمل میں تبدیلی پیدا کر لیں...... اور اپنی نمازوں کو خشوع وخضوع والی بنالیں...... کیونکہ نماز دین کا ستون ہے اگر نماز ہی ضائع ہوگئی تو ستون گرنے کا خطرہ ہے اور اگر ستون گر گیا تو عمارت (دین) کا نقصان کس قدر ہولناک ہوگا' اندازہ خود لگا لیں۔

❀❀❀

حرم میں شادی

ہم باب ملک فہد کے پاس حرم میں بیٹھے بیت اللہ کے نور سے اپنے دلوں کو منور کر رہے تھے اور نیکیوں کے موسم بہار میں مزے لوٹ رہے تھے۔ میرے پاس انجینئر اکمل صاحب بیٹھے تھے، انجینئر صاحب تقریباً تیس سال قبل سعودیہ میں نوکری کے سلسلے میں آئے اور پھر انھوں نے وہیں ڈیرے ڈال لیے۔ ان کا معمول ہے کہ وہ جمعرات اور جمعہ کا دن جدہ سے آ کر حرم میں عبادت الٰہی میں مصروف رہ کر' ان دو دنوں کے ہر لمحے کو نیکیوں میں ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ میرے پاس بیٹھے تھے، اپنی اولاد کے متعلق کہنے لگے:

بچوں کی تعلیم مکمل ہوگئی ہے، دو بچے لاہور میں زیر تعلیم ہیں' بیٹی نے بھی تعلیم مکمل کرلی ہے، اب وہ سعودیہ میں لیڈی ڈاکٹر کی حیثیت سے ایک سرکاری ہسپتال میں خدمات سرانجام دے رہی ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے بچی کی تربیت اسلامی نہج پر کی ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ میری بیٹی ہسپتال میں باحجاب کام کرتی ہے۔ کئی لوگ اعتراض بھی کرتے ہیں' لیکن وہ پروا نہیں کرتی۔ اب چونکہ وہ جوان ہو چکی ہے، ڈاکٹر بن گئی ہے، اس کی پیدائش یہیں کی ہے اس لیے اسے سعودیہ کی شہریت (نیشنیلٹی) بھی ملنے والی ہے، ہم چاہتے ہیں کہ اس کی پاکستان میں کسی ایسے شریف نوجوان سے شادی کر دیں جو ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کر چکا ہو' اس کو سعودیہ میں جاب پر بھی لگوائیں گے اور شادی کے بعد اسے بھی یہاں کی شہریت مل جائے گی۔ مقصد یہ ہے کہ بچی ہماری آنکھوں کے سامنے رہے' لیکن ادھر اس طرح کا رشتہ نہیں مل رہا۔ آپ ہماری مدد کریں۔

میں نے وعدہ کر لیا۔ اب بھی کبھی کبھی ان کا فون آتا ہے کہ کوئی مناسب رشتہ ملا یا نہیں؟ دراصل حرمین کی محبت ان کے دل و دماغ میں رچ بس گئی ہے۔ ان کا کہنا تھا: ہمیں حرمین کی سرزمین سے اس قدر پیار ہو گیا ہے کہ اس کو چھوڑنا موت لگتا ہے۔ دل چاہتا ہے کہ یہیں رہیں اور یہیں مریں اور یہ کہ ہمارے بچے بھی اب اسی پاک سرزمین میں رہیں، ہم پاکستان نہیں جانا چاہتے۔ میں نے دل میں کہا: اس میں تو کوئی شک نہیں کہ جو یہاں آ گیا وہ واپس جانا بھول جاتا ہے کہ یہ خطہ ہی ایسا ہے۔

میں ان کی باتیں سن رہا تھا' اچانک میں نے دیکھا کہ ہمارے سامنے کچھ لوگ نئے نویلے' صاف شفاف کپڑوں میں ملبوس آئے اور دو بیضوی دائروں میں بیٹھنے لگے۔ میں نے کہا: اکمل صاحب! یہ کون ہیں اور اس انداز سے کیوں بیٹھ رہے ہیں؟ کہنے لگے: شادی ہے۔ اور پھر ساتھ ہی یہ کہہ کر چلے گئے کہ میں نے امام کعبہ کی نماز پڑھانے والی جگہ پر ایک دوست سے ملنے کا وعدہ کیا ہے، مجھے باتوں میں یاد نہ رہا کہ میں لیٹ ہو رہا ہوں' تھوڑی دیر بعد واپس آ جاؤں گا' یہ کہہ کر وہ وہاں سے چلتے بنے اور میں ان کے فقرے کہ ''شادی ہے'' میں الجھ کر رہ گیا۔ بات میری سمجھ میں نہ آ سکی' تاہم میں اذکار میں مصروف ہو گیا۔ اچانک ذہن میں آیا کہ ان لوگوں کے پاس جا کر دریافت کروں یہ یوں بیضوی دائرہ بنا کر یہاں کیا کر رہے ہیں؟ میں نے دیکھا کہ اب تو قہوے کے دو تھرماس اور اعلیٰ بادام والی کھجوروں کے دو پیکٹ لا کر تقسیم کیے جا رہے ہیں۔ میں ان لوگوں کے قریب پہنچا اور ایک بوڑھے بزرگ سے دریافت کیا کہ کیا معاملہ ہے؟ اس نے کہا: ''شادی'' میں پھر الجھ گیا کہ یہ تو اکمل صاحب والی بات کہہ گیا۔ پھر میں نے اس سے تفصیل پوچھی تو وہ بتانے لگا:

سامنے بیٹھا لڑکا دلہا ہے، اس کے بائیں ہاتھ نکاح خواں ہے اور اس کے ساتھ دلہن کا والد ہے۔ ہم یہاں حرم کعبہ میں شادی کرنا باعث برکت سمجھتے ہیں۔ آج بھی ہم اپنے ایک بیٹے کی شادی کے لیے آئے ہیں۔ میں حیرت زدہ دیکھ رہا تھا کہ یہ عجب شادی ہے کہ نہ یہاں شادی والا ہنگامہ، نہ شور شرابہ، نہ عورتوں کا جمگھٹا، نہ رسم و رواج، نہ بری نہ بارات، نہ

جہیز، نہ لمبے چوڑے کھانوں اور ڈشوں کے چکر، نہ نائیوں اور خاں صاحبوں کے لاگ، نہ منہ دکھائی، نہ سہرا اور نہ بارات کے لیے سپیشل مشروبات و ماکولات۔ سب لوگ خاموشی سے بیٹھے تھے۔ نکاح خواں نے خطبہ مسنونہ کے بعد نکاح پڑھایا اور چند نصیحت پر مبنی باتیں کیں، پھر دلہا کا ہاتھ پکڑا اور دلہن کے والد کے ہاتھ میں دے دیا۔ دونوں مسکرا دیے...... لیجئے! شادی ہوگئی......

میں نے بابا سے پوچھا: بابا جہیز کہاں ہے؟

کون سا جہیز؟ بابا نے کہا۔

میں نے کہا: دلہن کا جہیز جو اس کے والدین شادی کے موقعہ پر اسے دیتے ہیں۔ کہنے لگا: یہ پاکستانی اور ہندوستانی لوگ دیا کرتے ہیں، ہم لوگ نہیں۔ مجھے ایسے لگا جیسے بابا نے ہمارے معاشرے کے منہ پر ایک تھپڑ رسید کر دیا ہو۔ کہنے لگا:

ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ لڑکا بچی کو کما کر کھلا سکتا ہے، رہائش دے سکتا ہے اور عقیدہ درست ہے تو ہم بغیر کسی حیل و حجت کے شادی کر دیتے ہیں۔

میں نے دیکھا کہ لڑکے نے نکاح خواں کو ایک خوبصورت لفافہ دیا ہے تو میں نے اسی بزرگ سے پوچھا: یہ کیا ہے؟ وہ کہنے لگے کہ دلہا حق مہر ادا کر رہا ہے۔ میں نے پوچھا: کیا نکاح کے بعد دلہن سے ملاقات سے قبل حق مہر ادا کرنا ضروری ہے؟

انھوں نے کہا: ہم یہ سمجھتے ہیں کہ نکاح کے بعد حق مہر فوری ادا کر دینا چاہئے اور اس پر عمل بھی کرتے ہیں، ہاں اگر کوئی مجبوری ہو تو فریقین کی رضامندی سے حق مہر کی ادائیگی بعد میں بھی کی جا سکتی ہے۔ میں نے دیکھا کہ نکاح خواں نے دلہا اور دلہن کے والد کا ہاتھ پکڑا اور دونوں کو آپس میں ملا دیا، جیسے سلام لیا جا رہا ہو۔ اس کے بعد دلہن کا والد بڑے وقار سے اٹھا اور خوشی سے دلہے کو سینے سے لگا لیا، اس کے گالوں پر بوسے دیے اور کوئی بات کہی جو مجھے سنائی نہ دی۔ اس کے بعد سب باری باری اس سے گلے ملے اور سب نے مسکراتے ہوئے دلہا کو مبارکباد دی۔ جواب میں دلہا مسکراتا رہا۔

پھر سب کو عربی قہوہ کا ننھا سا کپ پیش کیا گیا' جس کے ساتھ ہر کسی نے ایک دو یا تین کھجوریں لے لیں۔ میں نے دریافت کیا: یہ لوگ جو ساتھ آئے ہیں (جن کی تعداد ۱۶ سے ۲۲ کے درمیان ہوگی) یہ کون ہیں؟ کہنے لگے: یہ دلہا اور دلہن دونوں کے عزیز و اقارب ہیں۔ لیجئے سب کی ضیافت ہو چکی، سب لوگ خوشی خوشی ایک دوسرے سے ملے اور رخصت ہو گئے' البتہ دلہا عشاء کی نماز پڑھ کر گیا۔

یہ منظر دیکھ کر میں پریشان ہو گیا کہ ایک یہ باپ انجینئر اکمل صاحب ہیں کہ جن کی بیٹی تعلیم یافتہ اور برسر روزگار ہے، ساتھ سعودیہ کی نیشنیلٹی اور دلہا کی سعودیہ میں یقینی ملازمت کے مواقع ہیں' ساتھ دلہا کے لیے بساط بھر جہیز بھی ہے' لیکن وہ پھر بھی پریشان ہیں، دوسری طرف یہ عرب معاشرہ کے لوگ ہیں کہ وہاں لڑکی والے اگر غریب ہوں تو ان کے ساتھ دلہن کی تیاری کے لیے دلہا والے مدد کرتے ہیں یعنی دوسرے الفاظ میں جہیز لینے کی بجائے لڑکی کے والدین کو معقول رقم ادا کرتے ہیں، تاکہ وہ بہ سہولت شادی کے اخراجات برداشت کر سکیں۔ اگر کسی نے ایک لاکھ ریال یا پچاس ہزار ریال دیئے ہیں اور والدین نے بیس، تیس یا چالیس ہزار ریال بچا بھی لئے ہیں تو کسی کو اعتراض نہیں اور نہ ہی یہ معیوب ہے۔ کئی غریب والدین یوں شادی کی تیاری کے لیے ملنے والی رقم سے بچت کر کے کوئی چھوٹا موٹا کاروبار شروع کر لیتے ہیں اور بہت جلد اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے عرب معاشرے میں جب بچی پیدا ہوتی ہے تو کوئی باپ یا ماں پریشان نہیں ہوتی، بلکہ وہ اسے باعث رحمت سمجھتے ہیں اور جان توڑ کر اس کی تعلیم و تربیت کرتے ہیں۔

ماضی قریب میں راولپنڈی سے چار بہنوں نے ارشاد احمد حقانی صاحب کو خط لکھا' جس میں انہوں نے ایک فقرہ لکھا' آج تک کئی بار سوچنے کے باوجود اس کا مطلب میری سمجھ میں نہیں آیا مگر حرم میں ہونے والی اس شادی کو دیکھ کر مجھے ان بچیوں کے اس فقرے کا' جو روزنامہ جنگ میں چھپا تھا' مطلب سمجھ میں آ گیا، فقرہ یہ تھا:

''کاش! ہم کسی عرب معاشرے میں پیدا ہوئی ہوتیں۔''

ان کا کہنا تھا کہ ہمیں بدکاری کے لیے تو بڑی بڑی رقوم کی آفر ہوتی ہے' لیکن حلال ذریعہ سے ہم اپنا جہیز نہیں بنا پا رہیں اور نہ کوئی ہمیں اس کے بغیر قبول کرنے کے لئے تیار ہے۔ ایسے حالات میں دوسری بہنوں کے جہیز اور شادی کے اخراجات کی تیاری کے لیے بڑی بہن کو گناہ کی اجازت دی جائے' ورنہ سب بہنیں یونہی بیٹھی بوڑھی ہو جائیں گی۔

ہمارے معاشرے میں عورت اور اس کے والدین سے کچھ لینے کا ہی سوچا جاتا ہے، دینا کبھی کسی کے تصور میں نہیں آتا، حتیٰ کہ بعض لوگوں کو تو یہ بھی پتا نہیں کہ حق مہر عورت سے لیا جاتا ہے یا اس کو دیا جاتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ ہمارا احسان ہے کہ ہم نے کبھی اپنی بیوی سے حق مہر طلب نہیں کیا۔ مولانا علی محمد صمصام مرحوم اس ضمن میں ایک دلچسپ واقعہ سناتے ہیں:

> ایک گاؤں میں ایک عورت فوت ہوگئی، میں نے اس کے خاوند سے تعزیت کی اور پوچھا کہ فوتگی کے وقت تُو اس کے پاس موجود تھا؟ وہ کہنے لگا: موجود تو نہیں تھا' لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ نے حق حقوق معاف کروانے تھے، اس لیے اس نے آخری وقت پر مجھے پہنچا دیا۔ میں گاؤں سے باہر گیا تھا' لیکن اس کی جان نکلنے سے پہلے اس کے سرہانے پہنچ گیا اور اس کو حق معاف کر دیا۔ میں نے کہا حق سے کیا مطلب؟ کہنے لگا کہ میں نے اس کی جان نکلنے سے پہلے اس کو صاف اور برملا کہہ دیا کہ جاؤ اللہ کی بندی! سکون سے مرو، میں نے تمہیں حق مہر معاف کیا!!

(مولانا کہتے ہیں): میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا کہ اس کو کون سمجھائے کہ حق مہر تو تم نے اس سے معاف کروانا تھا' جو اس کا تجھ پر حق تھا، لیکن تو نے الٹا اس کو معاف کر کے بڑا کارنامہ سرانجام دے دیا۔

تو اے قارئین محترم!...... کتنی ہی بچیاں ہیں جو شادی کے انتظار میں بوڑھی ہو رہی ہیں۔ کاش! حرم میں ہونے والی اس شادی کی طرز پر شادیاں کی جائیں تو میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان میں کوئی بچی بن بیاہی نہ رہے...... کسی کے بالوں میں چاندی نہ اترے...... کسی کو

فرسودہ اور غیر شرعی رسومات کے لیے عزت وعصمت داؤ پر نہ لگانی پڑے...... کسی کو خودکشی نہ کرنی پڑے ...... اور کوئی والد بچی کی پیدائش پر پریشان نہ ہو...... اور کوئی ماں بچیوں کی پیدائش پر نس بندی کی مکروہ و مذموم جسارت نہ کرے۔

اللہ کرے یہ دن جلدی آئیں۔ آمین!

”مجرم نہیں‘ محبوب کہو پاپا!“

گاؤں سے آنے کے بعد شہر کے مکان میں پل بڑھ کر اس کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں جوان ہو گئیں۔ عائشہ اب نہم کلاس کی طالبہ تھی‘ جب کہ آسیہ بی اے کی تیاری کر رہی تھی۔ انسپکٹر ذاکر حسین کی بیوی اکثر اصرار کرتی کہ گھر میں فون لگوا لیں کیونکہ پیچھے گاؤں میں خاندان والوں کے پاس تو جانے کی فرصت نہیں ملتی‘ چلو فون ہی پر رابطہ کر لیا کریں گے۔ وہ اکثر کہتی ویسے بھی فون، ٹیلی ویژن اور گاڑی آج کے دور میں ہر گھر کی لازمی ضرورت ہے۔ لیکن ذاکر کا نظریہ اس کے برعکس تھا‘ وہ کہتا کہ یہ چیزیں مالداروں اور عیاش لوگوں کو زیب دیتی ہیں‘ میں ایک تنخواہ دار آدمی ہوں اگرچہ پولیس میں ہوں لیکن گھر کا خرچہ تو اسی تنخواہ سے چلے گا۔ جیسے میں رشوت لینا حرام سمجھتا ہوں ایسے ہی خاص طور پر جوان بیٹیوں والے گھر میں ٹیلی ویژن اور ٹیلی فون کا داخلہ بھی ایسا ہی خیال کرتا ہوں۔ یہ دونوں چیزیں ان کی کی گئی بہترین تربیت پر اثر انداز ہو سکتی ہیں۔ میں ہر ماہ کتنے ہی ایسے کیس ڈیل کرتا ہوں جن کے پیچھے ان دونوں چیزوں کی مضرت رسانیاں کارفرما ہوتی ہیں، ان کی وجہ سے والدین کو شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایک عرصہ کی بحث وتکرار پر مبنی جنگ سے عاجز آ کر ایک دن انسپکٹر نے ہتھیار ڈال دیے اور ٹیلی فون کے لیے درخواست دے دی لیکن ٹیلی ویژن کے لیے پھر بھی تیار نہ ہوا۔

چند دن بعد انسپکٹر ذاکر کے گھر میں ٹیلی فون لگ گیا۔ اب بیگم پھولے نہ سماتی اور اپنی سہیلیوں کو اور ملنے والیوں کو فون کر کے بتاتی کہ ہمارے گھر فون لگ چکا ہے اور یہ نمبر ہے، وہ گھنٹوں فون پر حال احوال پوچھتی اور گپ شپ کرتی رہتی۔ عائشہ کے امتحان سر پر آ رہے

تھے، ذاکر نے اس کی اچھی پوزیشن کے لیے اس کی خاطر محلے ہی میں ایک گھر میں ٹیوشن پڑھنے کا بندوبست کر دیا۔ وہ باقاعدہ ٹیوشن پر جانے لگی۔

کچھ عرصہ سے عائشہ ٹیوشن سے لیٹ آنے لگی تھی، ماں کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ چونکہ امتحان سر پر ہیں اس لیے ہم سہیلیاں بیٹھ کر معروضی سوالات کی مشق کرتی رہتی ہیں' اس لیے میں لیٹ ہو جاتی ہوں۔ ماں مطمئن ہوگئی۔ عائشہ کی ماں اس کے والد کے برعکس پردہ کو ضروری نہ سمجھتی تھی۔ وہ ذاکر کی ڈانٹ پر اکثر کہتی ''ابھی میری بچی نے دیکھا ہی کیا ہے...... ابھی چھوٹی سی تو ہے...... ابھی میٹرک کی طالبہ ہے اور تم پردے کے پیچھے پڑے رہتے ہو، جب بڑی ہو جائے گی تو کرلے گی پردہ۔'' یوں ماں کے دلائل کے بعد ذاکر بھی طوعاً و کرہاً خاموش ہو جاتا لیکن خاموش ہونے سے پہلے اتنا ضرور کہتا: ''کلثوم! میرا تجربہ ہے کہ جب بچیوں پر نماز فرض ہو جاتی ہے تو اسی وقت ان پر پردہ بھی لازم ہو جاتا ہے' اسی میں ان کی دین و دنیا کی بھلائی ہے۔'' کلثوم یہ کہتے ہوئے چلی جاتی کہ ''آپ انسپکٹر نہ ہوتے بلکہ مولوی ہوتے تو زیادہ بہتر تھا۔'' یوں عائشہ ننگے منہ بغیر پردہ کے ٹیوشن اور سکول آتی جاتی۔

کچھ دنوں سے عائشہ کے لیے روزانہ فون آنے لگا' وہ فون پر کسی سے دیر تک باتیں کرتی رہتی۔ ایک دن ماں نے کہا: یہ کون ہے جس کا روزانہ فون آ جاتا ہے؟ عائشہ نے بتایا کہ اس کی سہیلی ہے جو ٹیوشن میں اس کے ساتھ پڑھتی ہے' بہت باتونی ہے، جب فون کرتی ہے تو پھر بات سے بات نکالتی رہتی ہے۔ اب عائشہ کا معمول بن گیا کہ وہ ٹیوشن جانے سے قبل کتنی دیر اس سے فون پر باتیں کرتی رہتی اور پھر بیگ اٹھا کر ٹیوشن چلی جاتی۔ انہی معمولات میں امتحانات ہوگئے۔ اب نتائج کا انتظار ہونے لگا۔ عائشہ کا رویہ بتا رہا تھا کہ جیسے اسے اپنے نتیجہ کے معاملہ میں کوئی خاص دلچسپی نہ ہو، جب کہ اس کے والد سخت اضطراب میں اس کے رزلٹ کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ کہتے کہ اگر بورڈ میں میری بیٹی نے پہلی پوزیشن حاصل کی تو میں اسے ایک بہت قیمتی انعام دوں گا۔

آخر نتیجہ کا دن بھی آ پہنچا۔ عائشہ کی انگلش، ریاضی، بیالوجی اور کیمسٹری میں کمپارٹ

تھی ...... ذاکر کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

وہ غصے میں فوری طور پر اٹھے اور ٹیوشن والے گھر پہنچے' وہاں پہنچ کر ٹیوشن پڑھانے والی استانی کو کوسنے لگے کہ ہماری بچی کو کیا پڑھایا ہے کہ وہ تمہارے پاس ٹیوشن آنے سے پہلے زیادہ لائق تھی اور اب تم سے ٹیوشن پڑھ کر مزید لائق ہونے کی بجائے چار مضامین میں فیل ہوگئی ہے۔ استانی نے بڑے دھیمے لہجے میں جواب دیا: بھائی جان! اس میں میرا نہیں بلکہ آپ کا قصور ہے' اس لیے کہ وہ اکثر ٹیوشن سے غیر حاضر رہتی اور پوچھنے پر بتاتی کہ آج گھر میں کوئی کام تھا، ابو نے روک لیا تھا یا امی نے چھٹی کے لیے کہہ دیا تھا' اس لیے میں نہیں آسکی۔ جب آپ لوگ خود اس کو روک لیں تو پھر میرا کوئی قصور نہیں۔

انسپکٹر نے انکار کیا کہ ایسا تو ہرگز نہیں ہوا۔ اس پر استانی اور ذاکر دونوں حیران اور پریشان تھے کہ عائشہ کی ایک کلاس فیلو جو استانی کے لیے امتحان میں کامیابی پر مٹھائی کا ڈبہ لے کر آئی تھی، اپنی ٹیچر کو کچھ دیر کے لیے دوسرے کمرے میں لے گئی اور بتایا کہ میں تو عائشہ کو پہلے ہی منع کرتی تھی کہ ایسا نہ کرو، اس کا نتیجہ اچھا نہ نکلے گا لیکن وہ اس کا کچھ اثر نہ لیتی تھی ...... کیا مطلب، کیا کہنا چاہتی ہو تم؟ ٹیچر نے وضاحت طلب کرتے ہوئے پوچھا۔

عائشہ کی سہیلی نے تفصیلات بتاتے ہوئے بتایا کہ عائشہ نے مجھے یہ ساری باتیں خود بتائی ہیں۔ وہ جب گھر سے ٹیوشن کے لیے نکلتی تو ایک لڑکا اکثر اس کا پیچھا کرتا۔ اب اس لڑکے نے کسی طرح عائشہ کے گھر کا فون نمبر حاصل کیا اور گھر پر رابطہ کرنے لگا، اگر اس کا والد یا بھائی یا والدہ ریسور اٹھاتے تو وہ نسوانی آواز میں کہتا کہ میں عائشہ کی سہیلی شکیلہ بول رہی ہوں۔ یوں وہ اس کا ٹیلی فونک دوست بن گیا۔ یہ سلسلہ چلتا رہا اور کسی کو اس کی کانوں کان خبر نہ ہوسکی۔ اب اس لڑکے شہزاد نے عائشہ سے اصرار شروع کر دیا کہ مجھ سے باہر کسی پرسکون جگہ ملو۔ اور اس کے بعد وہ اکثر چمن آئیس کریم اور جناح باغ میں اکٹھے ملنے لگے۔ اب عائشہ اپنی ٹیوشن کی ٹیچر سے کوئی نہ کوئی بہانہ کر دیتی کہ ابو نے روک لیا یا کوئی مسئلہ بنا دیتی لیکن حقیقت میں وہ ٹیوشن کی بجائے شہزاد کے ساتھ گھومنے پھرنے نکل جاتی تھی' حتیٰ کہ

امتحانات سر پر آ پہنچے۔ اس بنا پر وہ محنت بھی نہ کر سکی اور اب بری طرح فیل ہوگئی ہے۔

ٹیچر یہ سن کر ہکی بکی اور حیران وششدر رہ گئی اور اس نے واپس ڈرائنگ روم میں آ کر نہایت شرمندگی اور ندامت سے عائشہ کے والد کو حقیقت حال سے آگاہ کر دیا لیکن ساتھ ہی تلقین کی کہ وہ بچی کو کچھ نہ کہیں، وہ ابھی کچی عمر کی ہے، اسے ابھی اپنے نفع ونقصان کا پتا نہیں اور ویسے بھی اگر کچھ کہیں گے تو اس میں بدنامی آپ ہی کی ہے۔

ذاکر حسین کے پاؤں تلے سے زمین نکلی جا رہی تھی...... اس کا سر چکرا رہا تھا اور دل ڈوب رہا تھا...... اس کے دل و دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں...... بجلیاں کوند رہی تھیں...... اور آتش فشاں پھٹ رہے تھے...... ایک زلزلہ بپا تھا...... جو اس کو اندر ہی اندر توڑ پھوڑ رہا تھا...... اس کو ریزہ ریزہ کر رہا تھا...... اسے دنیا اس قدر وسیع وعریض ہوتے ہوئے بھی سکڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی...... ایک کرب تھا...... ایک الم تھا...... جو ٹیسوں کی شکل میں اٹھ رہا تھا...... وہ نظریں جھکائے سر کو ہاتھوں میں تھام کر...... مسلسل سوچوں میں گم تھا...... کہ یہ کیا ہوگیا...... اس کے سامنے ساری دنیا اندھیر تھی...... کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے...... آخر وہ لڑکھڑاتے قدموں...... شدت جذبات سے کانپتے ہاتھوں...... اور بھیگی بھیگی پلکوں سے اٹھ کر گھر پہنچا' اور پہنچتے ہی...... چارپائی پر کٹے ہوئے درخت کی مانند گر گیا۔ اس کی بیوی کلثوم بھاگی بھاگی آئی اور پوچھنے لگی: ''کیا بات ہے، کیا بات ہے، خیر تو ہے...... طبیعت تو ٹھیک ہے...... بتاتے کیوں نہیں...... چپ کیوں ہیں؟''

اچانک عائشہ بھی بھاگتی ہوئی آئی اور رندھی آواز میں کہنے لگی: ''پاپا! کیا ہوا' آپ گر کیوں گئے۔ آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟ میں ڈاکٹر کو فون کرتی ہوں۔'' ذاکر کے ذہن میں لفظ ''فون'' چپک کر رہ گیا اور بار بار یہی لفظ گونجنے لگا...... پھر اس کی نظریں بے اختیار عائشہ کے چہرے پر گڑ گئیں اور اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے' جسم کپکپایا اور وہ بے ہوش ہوگیا۔

تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر آیا، اس نے معائنہ کرنے کے بعد بتایا: ویسے تو کوئی ایسی بات ظاہراً محسوس نہیں ہو رہی لیکن لگتا ہے ان کو کوئی ذہنی صدمہ پہنچا ہے۔ انہیں خوش رکھنے کی

کوشش کریں۔ انجکشن لگا کر ڈاکٹر چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد اس کو ہوش آ گیا، سب نے دریافت کیا کہ کیا ہوا؟...... تو ذاکر حسین پہلے تو کچھ سوچتا رہا...... جیسے کسی مسئلہ کا حل سوچ رہا ہو...... پھر اچانک جیسے حل اس کے ذہن میں آ گیا اور اس نے کوئی فیصلہ کر لیا ہو...... اور واقعی ذاکر حسین ایک فیصلے پر پہنچ چکا تھا کہ اب اسے کیا کرنا ہے...... جب دوبارہ اس کے کانوں سے گھر والوں کی آواز ٹکرائی تو اس نے بڑے اطمینان سے جواب دیا: ''بس ذرا چکر آ گیا تھا اور کوئی بات نہیں، دیکھو! میں اب ٹھیک ہوں''۔ اور پھر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

چند دن گزرے تھے کہ ذاکر نے مسلسل نگرانی کے بعد شہزاد کو ایک اور لڑکی کو گمراہ کر کے گھر سے باہر لے جانے کے جرم میں رنگے ہاتھوں پکڑ کر حوالات میں بند کر دیا۔ دوران تفتیش پتا چلا کہ اس طرح کا ٹیلی فونک تعلق اس کا کئی لڑکیوں کے ساتھ ہے اور وہ ان سے مختلف مقامات پر ملاقاتیں بھی کرتا رہتا ہے۔ شہزاد کے والدین نے اپنے تعلقات استعمال کرتے ہوئے اس کی ضمانت کروا لی اور ذاکر حسین کو یہ کہہ کر چلے گئے کہ ''وہ کسی مناسب وقت پر اس کا بدلہ ضرور لیں گے۔'' اگرچہ ذاکر ہر مجرم کی طرف سے ایسی دھمکیاں سننے کا عادی ہو چکا تھا لیکن شہزاد کے والدین کی دھمکی کو اس نے نہایت سنجیدگی سے لیا، اس لیے کہ یہاں صرف اس کی ذات کا مسئلہ نہ تھا بلکہ اس کی بیٹی اور خاندان کی عزت کا مسئلہ بھی تھا۔

کچھ دن مزید گزرے کہ ایک دن ذاکر حسین تھکا ماندہ گھر میں داخل ہوا تو گھر میں خلاف معمول لڑائی جھگڑے کی آوازیں بلند ہوتی سنیں۔ اس نے آگے بڑھ کر دیکھا کہ ایک طرف اس کی لاڈلی تھی اور دوسری طرف اس کی بیوی، تینوں بیٹے اور بڑی بیٹی تھی، سب اپنے والد کو دیکھتے ہی چپ ہو گئے۔ ذاکر ابھی جھگڑے کے متعلق پوچھنے کے لیے سوچ ہی رہا تھا کہ اس کی بیوی بول اٹھی: سرتاج! آپ کے لاڈ اور بے جا پیار نے عائشہ کو خراب کر دیا ہے، پتا ہے آج یہ کس چیز پر لڑ جھگڑ رہی ہے؟

ذاکر نے عائشہ کو پیار کرتے ہوئے اور اس کے سر پر شفقت و محبت سے ہاتھ

پھیرتے ہوئے کہا: ''کیا جرم کرلیا ہے میری بٹیا نے، جوتم سب اس بیچاری کے خلاف ہو گئے ہو۔'' ''ہاں ہاں! جرم ہی ایسا ہے کہ جب آپ سنیں گے تو آپ خود بھی اس کے خلاف ہوں گے۔ یہ کہہ رہی ہے کہ میں اس بدمعاش شہزاد کے ساتھ شادی کروں گی اور اس کے علاوہ دنیا بھر میں کسی سے نہ کروں گی، خواہ کچھ بھی ہو جائے۔'' ذاکر حسین کو اپنے قدموں کے نیچے سے زمین نکلتی ہوئی محسوس ہوئی، اسے یقین نہ آ رہا تھا پھر بھی اس نے بے اعتباری اور بے یقینی کے عالم میں اپنی بیٹی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا: ''کیا یہ سچ کہہ رہے ہیں؟'' ''جی ہاں!'' عائشہ نے مختصر سا جواب دیا۔

لیکن بیٹا وہ تو ایک عادی مجرم ہے' جو کئی لڑکیوں کو برباد کر چکا ہے، جس کو میں نے ابھی چند دن پہلے ہی رنگے ہاتھوں پکڑا ہے اور وہ جیل کی ہوا بھی کھا چکا ہے، اب ضمانت پر کچھ دن کے لیے رہا ہوا ہے، میں تمہیں کبھی بھی اس سے شادی کر کے اپنی زندگی برباد کرنے کی اجازت نہیں دوں گا۔ خاص طور پر جب کہ وہ چند دن قبل ہی مجھے برے نتائج کی دھمکیاں دے کر گئے ہیں۔

ابھی ذاکر حسین نے اپنی بات مکمل نہ کی تھی کہ عائشہ درمیان ہی میں بول اٹھی: آپ لوگ مجھے شہزاد کے ساتھ شادی کرنے سے نہ ہی روکیں تو اچھا ہے۔ میں قانونی طور پر اپنے معاملات میں آزاد ہوں، اگر آپ لوگوں نے اس کی اجازت نہ دی تو پھر شاید مجھے کوئی اور طریقہ اپنانا پڑے اور اگر آپ رکاوٹ بنے تو پھر میں گھر سے بھاگ کر اس کے ساتھ کورٹ میرج کروں گی۔ پھر آپ لوگ اچھے رہیں گے جب پورے شہر میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے۔ اگر آپ لوگوں نے میری بات نہ مانی تو میں کسی بھی وقت گھر سے اس کے ساتھ بھاگ جاؤں گی پھر نہ کہنا ہمیں بتایا نہ تھا!!

ذاکر کو ایسے لگا کہ جیسے وہ آسمان سے زمین پر اور وہ بھی کانٹوں بھری زمین پر آ گرا ہو......

وہ بڑبڑاتا ہوا کہنے لگا: کیا پتا تھا کہ ایک دن دوسروں کے گھروں کو بچانے والے

بدنصیب کا اپنا گھر ہی خزاں کی لپیٹ میں آ جائے گا...... ایک دور بیٹھا مجرم...... ایک بدطینت...... ایک بداطوار و رذیل عادی مجرم میرے گھر کے سکون کو تباہ و برباد کر کے اس کے مکمل طور پر نام ونشان کو مٹانے کے درپے ہوگا۔

''مجرم نہ کہیے پاپا...... بلکہ وہ میرا محبوب ہے!!'' فوری طور پر ذاکر عائشہ کا یہ جواب سن کر لاجواب ہوگیا جبکہ وہاں کھڑے اس کے سب بیٹوں کے سر شرم سے جھک گئے۔

اس کے بعد سب بھائی جذباتی ہو گئے۔ قریب تھا کہ کوئی خطرناک اقدام اٹھاتے کہ ماں آگے بڑھی اور روتے ہوئے اپنے سر کی چادر ان کے قدموں میں ڈال کر کہنے لگی: ''اسے میری خاطر اللہ کے لیے معاف کر دیں' میں اسے سمجھا لوں گی۔'' ''ماں! اس کو سمجھا لو ورنہ ہم سے برا کوئی نہ ہوگا۔'' یہ کہتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکل گئے۔

ہفتہ اسی بحث مباحثے' لڑائی جھگڑے میں گزر گیا اور عائشہ اپنی ضد پر قائم رہی۔ ماں نے لاکھ سمجھایا کہ جو تجھے اس لڑکے نے سپنے دکھائے ہیں یہ محض سہانے سپنے ہی ہیں' سراب ہیں' حقیقت سے خالی افسانے ہیں...... ان سے تمہیں سوائے مایوسی و لاچارگی کے کچھ نہ ملے گا اور اگر پھر بھی تم اس لڑکے کے ساتھ چلی گئی تو یاد رکھنا! پھر کامیابی یا ناکامی کسی صورت میں ہماری طرف لوٹ کر کبھی نہ آنا۔ ہمارے دروازے تمہارے لئے ہمیشہ کے لئے بند ہو جائیں گے۔ بھول جانا کہ تمہارا کوئی باپ بھائی اور والدہ تھے۔ ان باتوں کا بھی عائشہ پر اثر نہ ہوا۔ اس پر ایک ہی دھن سوار تھی کہ وہ اگر شادی کرے گی تو اپنے ٹیلی فونک دوست شہزاد سے کرے گی' اس کے علاوہ کسی سے بھی نہیں۔

آخر ذاکر حسین نے ہتھیار ڈال دیئے' ہار مان لی اور طوعاً و کرہاً ہاں کر دی کہ بیٹی! تیری جس طرح بھی خوشی ہے ہم اسے پورا کریں گے۔ ذاکر حسین نے اپنی استطاعت کے مطابق ہر چیز اپنی بیٹی کو بنا کر دی اور اس کی شادی کر دی۔

دوسرے گھر میں جاتے ہی پہلے دن ہی کہ جب دلہن کے ناز اٹھائے جاتے ہیں' اس کی بلائیں لی جاتی ہیں' خاندان کی عورتوں کے سامنے اپنی نئی نویلی دلہن کو فخر سے پیش کیا جاتا

ہے' رسومات شادی ادا کی جاتی ہیں' اس دن عائشہ کو کسی نے سیدھے منہ روٹی تک نہ پوچھی کہ تو گوشت پوست کی ہے' تجھے بھوک تو نہیں لگی۔ آخر اس کے پاس جب شام کے بعد شہزاد آیا تو اس نے بھوک کی شکایت کی۔ اس نے کہا: ''میں ابھی بھیجتا ہوں۔'' پھر ایک بوڑھی اماں جو گھر میں خادمہ کی حیثیت سے کام کرتی تھی' دو روٹیاں اور سبزی کی پلیٹ چھابی (چنگیر) میں رکھ کر چلی گئی۔ عائشہ نے جب یہ سلوک دیکھا تو بے اختیار اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

یوں چند دن مزید گزر گئے' گھر کے افراد اس سے اچھی طرح بات بھی نہ کرتے تھے بلکہ وہ ایک مشین تھی جو تمام گھر کے کام کاج پر جت گئی تھی۔ کام کی زیادتی کی بنا پر اسے بخار رہنے لگا۔ وہ اکیلے میں اپنی قسمت پر پھوٹ پھوٹ کر روتی' آنکھوں سے آنسو بہاتی...... اللہ سے دعائیں کرتی کہ ایسے حالات میں شہزاد اسے چھوڑ نہ جائے یا اسے طلاق نہ دے دے۔ کیونکہ اس نے نوٹ کیا کہ اب بھی شہزاد کی کئی لڑکیوں میں دلچسپی تھی' جن سے وہ لمبی گفتگوئیں کرتا' ان سے ملاقات کے ٹائم طے کرتا اور بن سنور کر وقت مقررہ پر ان سے ملنے گھر سے نکل جاتا۔ شہزاد کا کوئی بھی فون جو رات ۸ بجے کے بعد آتا اسے سننے پر عائشہ پر پابندی تھی۔

عائشہ اندر ہی اندر ٹوٹتی پھوٹتی رہتی' کڑھتی رہتی اور مزید دکھ کی بات تو یہ تھی کہ وہ کسی سے اپنی مصیبت و تکلیف بیان کر کے اپنا غم غلط بھی نہ کر سکتی تھی' کسی سے دل کی بات نہ کر سکتی تھی کہ دل کا بوجھ ہلکا ہو سکے...... اس لیے کہ یہاں کوئی اس کا ہمدم' ہم راز اور دکھ درد بانٹنے والا اور اسے حوصلہ و تسلی دینے والا نہ تھا' کوئی اس کے زخموں پر مرہم رکھنے والا نہ تھا...... کوئی اس کے دکھیارے دل کو سکھ کا گیت سنانے والا نہ تھا...... کوئی اس کا اپنا نہ تھا...... وہ اکیلی تھی...... اور مزید دکھ یہ تھا کہ اس کے اپنے گھر میں بھی...... ہاں ہاں اس کی ماں کے' باپ کے' بھائیوں کے گھر میں...... ہاں ہاں...... اس گھر میں کہ جس میں اس نے زندگی کی اٹھارہ بہاریں دیکھی تھیں...... اس گھر میں بھی اس کا کوئی غمگسار نہ تھا' کوئی ہمدرد نہ تھا' سب

اس سے نفرت کرتے تھے..... اسے بدنامی کا سبب جانتے تھے..... اپنے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ تصور کرتے تھے۔ وہ ان کے لیے ایک رستا ہوا ناسور تھی ..... اسے اپنی ماں کے الفاظ آج دو سال گزرنے کے بعد بھی یاد تھے کہ جب اس نے کہہ دیا تھا کہ ''آج کے بعد ہم تمہارے لیے اور تم ہمارے لیے مرگئی۔ ہمارے دروازے پر کبھی اپنا نافرمان وجود لے کر نہ آنا۔'' اب اسی بات کا پاس کرتے ہوئے عائشہ اپنی والدہ کے گھر نہیں جاتی کہ وہ کس منہ سے جائے۔

دو سال بعد خاندان والوں نے ان کو الگ کردیا۔ تب سے وہ کرائے کے مکانوں میں ٹھوکریں کھاتی پھر رہی ہے۔ اب سات سال ہوگئے اس کی ''شادی'' کو لیکن ان سات سالوں ہی میں غموں' دکھوں' تکلیفوں اور سوچوں و پریشانیوں اور خاص طور پر ذہنی خلش اور اخلاقی جرم کے احساس کہ جس نے اس کے والدین کو محلہ میں بدنام کردیا' بھائیوں کو منہ دکھانے کے قابل نہ چھوڑا اور اپنی بڑی بہن کے متعلق بھی طرح طرح کی باتوں کا سبب وہی بنی' اسی جرم کے احساس نے وقت سے پہلے اس سے اس کی رعنائیاں' زیبائیاں ،دلربائیاں اور جوانی چھین لی ہے کہ وہ اپنے خدوخال سے عمر رسیدہ عورت نظر آتی ہے۔ باقی ان سات سالوں میں بھائیوں کی شادیاں ہوئیں' بہن کا ڈولا اٹھا اور خاندان میں بچوں بچیوں کی پیدائش کے خوشی بھرے مواقع آئے لیکن کسی نے اس کو ان خوشی کی گھڑیوں میں یاد نہ کیا۔

اب وہ اپنے دو بچوں کے ساتھ کانٹوں بھری زندگی' دنیا کے طعنے سن کر گزار رہی ہے۔ وہ جہاں جاتی ہے اس کی ٹیلی فونک معاشقے کی داستان ،والدین سے لاتعلقی اور بدنامی کی کہانی پہلے پہنچ جاتی ہے۔ خرچے سے ہمیشہ تنگ' کھچی کھچی رہنا' غصہ بچوں پر مار پیٹ کے ذریعہ نکالنا اور آخر میں تھک ہار کر روتے بیٹھ جانا' اس کا معمول ہے۔ شہزاد کا اب بھی رات گئے گھر لوٹنا اور لمبی تان کر سوجانا معمول ہے۔ عائشہ اب اپنے دونوں بچوں کے متعلق پریشان ہے کہ یہ خاندان سے کٹ جانے والے..... یہ اپنے قافلے سے پیچھے رہ جانے والے..... ننھے معصوم پھول' جنہوں نے ابھی تک خاندان کی شفقتوں کو بھی دیکھا نہیں..... ان کا کیا بنے گا؟..... ایسی ہی سوچوں میں گم عائشہ زندگی گزار رہی ہے..... اور وہ کہتی ہے:

ایسے ہی کسی دن میری زندگی کی شام ہو جائے گی ......لیکن میرے بچوں کا کیا بنے گا؟ ......محرومیوں کا شکار یہ معصوم فرشتے کہاں جائیں......اس فکر سے پریشان ہو کر وہ پڑوس میں اتفاقیہ اپنی سہیلی بن جانے والی ایک بیوہ کے پاس بار بار جاتی ہے...... اور اسے اپنے بچوں کا خیال رکھنے کا کہتی رہتی ہے...... وہ اسے تسلی دیتی ہے کہ بچوں کے جوان ہونے تک تجھے کچھ نہیں ہوگا۔ اس کی اس تسلی پر وہ پھر گھر میں آجاتی ہے......اور یوں اب بھی اس کی تلخ زندگی کے دن ہوا کے دوش پر اڑتے چلے جارہے ہیں...... اور آنسوؤں کے موسم ہیں کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتے......شاید قبر کی دہلیز تک پیچھا کریں گے......

ایسا تو ہونا ہی تھا............!!

گھر کے آنگن میں ہر طرف بکھرا خون ہی خون دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ آج کے تقریباً تمام اخبارات نے اس خبر کو پہلے صفحہ پر شہ سرخیوں سے شائع کیا تھا۔ ابتدائی تفتیش سے پتا چلا کہ وزارت داخلہ کا سابق ڈرائیور محمد نواز آج سے ۲۵ سال قبل ایک عیسائی لڑکی کی محبت میں گرفتار ہوگیا۔ دونوں کے درمیان راہ و رسم بڑھی تو لڑکی مسلمان ہوگئی اور گھر سے بھاگ آئی، یوں محمد نواز نے اس سے لومیرج کرلی۔ اسی طرح شادی کے کافی عرصہ بعد اس کے بیٹے کبیر نے بھی جوان ہوکر ایک لڑکی کو گمراہ کرکے خاندان کی مرضی کے خلاف اس سے شادی کی۔ ان واقعات سے محمد نواز کو بہت رنج وغم پہنچا' لہٰذا اس نے ایک ترکیب اپنائی اور اپنی بیوی، داماد، بہو اور چار بیٹوں، بیٹیوں سمیت پورے خاندان کو پرتکلف دعوت کھلائی۔ کھانے میں نشہ آور چیز ملادی۔ جب سب بے ہوش ہوگئے تو یکے بعد دیگرے سب کو بارہ بور گن اور پسٹل سے فائرنگ کرکے قتل کردیا..... یہ خون جو میں دیکھ رہا تھا یہ انہی لوگوں کا تھا جو اسلام آباد میں واقع گھر کے صحن میں پڑی لاشوں سے نکل کر فرش پر پھیل چکا تھا۔

غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے گردوپیش میں ایسے واقعات آئے روز رونما ہورہے ہیں لیکن ہم نے کبھی غور کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ ایسا کیوں ہورہا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ جو خرابیاں اور عوامل ان گھروں کو برباد کررہے ہیں ہمارے گھروں کی دہلیز تک پہنچ جائیں۔ مروجہ محبت (Love) اور مردوزن کی خفیہ دوستی انسانیت کی قاتل ہے اور خاص طور پر خاندانوں کی تباہی کا باعث۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں آئیڈیل اور نیک عورتوں کی نشانی یہ بتائی ہے:

﴿ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۚ ﴾

(النساء : ۴/ ۲۵)

''جن عورتوں سے تم نکاح کرنا چاہتے ہو ان کی خوبیوں میں سے یہ بھی ہے کہ وہ پاک دامن ہوں، بدکاری کرنے والی نہ ہوں، اور نہ خفیہ یاریاں پالنے والی ہوں۔''

اب یہ ہے کہ گھر والوں سے چھپ چھپ کر ٹیلی فون، انٹرنیٹ یا خط و کتابت کے ذریعے غیر شرعی دوستیاں کی جاتی ہیں جو فطرت سے جنگ کے مترادف ہے۔ یہی معاملہ محمد نواز کے ساتھ ہوا کہ پہلے غیر شرعی دوستیاں قائم کیں' ملاقاتیں ہوئیں، ہوس کی آگ دونوں طرف بھڑکی تو ہمیشہ اکٹھے رہنے کے لئے شادی کر لینے کی سوجھی' لیکن چونکہ لڑکی عیسائی تھی اور نواز مسلمان، اس لڑکی نے باہمی ملاپ کے درمیان حائل دیوار ''مذہب'' کو گرا دیا اور کہا کہ میں مسلمان ہوتی ہوں۔ یوں دونوں کی شادی ہوگئی۔ شادی کے لئے ایسا قبول اسلام، اسلام میں معتبر نہیں ہے۔ البتہ اگر ایسی عورت بعد ازاں اسلام کے ساتھ مخلص ہو جائے' نیت درست کرے اور سچے دل سے اسلام کی حقانیت کو تسلیم کر لے تو فساد نیت کی وجہ سے بگڑا ہوا معاملہ درست ہو جائے گا لیکن یہاں تو صرف ملاپ کے درمیان حائل رکاوٹ ''مذہب'' کو ایک فریق ختم کر دیتا ہے جو صرف اور صرف نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لئے ہوتا ہے۔

اگر لو میرج کے لئے مذہب تبدیل کرنے والوں کا بغور جائزہ لیں تو آپ کو ان کی زندگی میں اسلام سے والہانہ محبت اور اسلام سے میل کھانے والی کوئی قدر نظر نہیں آئے گی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ جو اسلام سے متاثر ہو کر مسلمان ہوا ہے اس کی زندگی میں ایک انقلاب برپا ہو جائے۔ عفت و عصمت، شرم و حیا، اسلامی اقدار کی پاسداری، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کی پابندی اس کی زندگی کا حصہ بن جائے۔ سنت سے اس کو دل و جان سے محبت ہو جائے۔ اپنی زندگی میں شرعی پردے کو وہ باقاعدگی اور سختی سے اپنا لیں' لیکن دیکھنے میں آیا ہے کہ اسلام قبول کرنے کا دعویٰ کرنے والے ایسے افراد کی زندگی میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آتی۔ ان کے معمولات سابقہ ڈگر پر ہی چلتے رہتے ہیں۔ اسلام کی حقانیت کو انہوں نے دل و جان سے تسلیم نہیں کیا ہوتا۔ اگر وہ اسلام کی آفاقی تعلیمات سے متاثر ہو کر مسلمان ہوتے تو اس کا

پاکیزہ عکس ان کی زندگی میں دیکھنے میں ضرور نظر آتا۔ ان کی زندگی میں ایک واضح تبدیلی نظر آتی۔ لیکن حقیقت میں ایسا ہوتا کیوں نہیں؟ اس لئے کہ انہوں نے اسلام کی حقانیت سے متاثر ہوکر اسلام قبول کرنے کا اعلان نہیں کیا ہوتا بلکہ انہوں نے تو دنیا کو دھوکا دینے کے لئے اور مجبور ہوکر ظاہری طور پر اسلام کا مصنوعی لبادہ اوڑھا ہوتا ہے' تاکہ ان کے ملاپ میں مذہب رکاوٹ نہ بن سکے اور اس لئے بھی کہ اس کے بغیر معاشرہ و اسلامی سوسائٹی ان کو ہرگز قبول نہیں کرتی۔

دوسرا مسئلہ یہ کہ ایسے کیسوں میں والدین اور خاندان سے بغاوت کی جاتی ہے اور بھاگ کر نکاح کیا جاتا ہے' جس میں ولی (سرپرست) موجود نہیں ہوتے' جبکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''لَا نِكَاحَ إِلَّا بِوَلِيٍّ'' کہ ''ولی کے بغیر نکاح نہیں ہوسکتا'' جبکہ ایسے کیسوں میں ولی ہی کو سب سے بڑی رکاوٹ سمجھا جاتا ہے' چہ جائیکہ ان کی رضا مندی کا خیال رکھا جاتا ہو۔ اگر اسلام کی ان تعلیمات کو نہیں ماننا تو اسلام قبول کرنے کا مقصد کیا رہ جاتا ہے؟؟؟ ایسے کیسوں میں صرف عورت کا حصول ہی اصل مقصد ہوتا ہے، اس کے راستے میں جو بھی رکاوٹ ہو اس کو ختم کرنے کی پوری کوشش کی جاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

انما لکل امری ما نویٰ و من کانت ھجرۃ الی دنیا یصیبھا او الی امراۃ ینکحھا یتزوجھا۔ فھجرتہ الی ما ھاجر الیہ۔

(صحیح بخاری کتاب بدء الوحی)

''ہر شخص کو وہی کچھ ملے گا جس کی اس نے نیت کی ہوگی۔ تو جس نے دنیا (کے مال و دولت) کے حصول کے لیے ہجرت کی وہ اس کو حاصل کر لے گا' یا جس نے کسی عورت کے حصول کے لیے ہجرت کی تو وہ اس سے شادی کر لے گا۔ تو اس کی ہجرت اس چیز کی طرف ہوگی جس کی اس نے نیت کی ہوگی (نہ کہ اسلام کی خاطر)''

تو معلوم ہوا کہ ایسے واقعات میں اسلام قبول کرنے کا جو سنگین مذاق کیا جاتا ہے اس کے پیچھے بھی صرف عورت کے حصول کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ ہمارے دیہات میں کتنے ہی ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں کہ عیسائی خاندان نے یا کسی بچی نے اسلام کی تعلیمات یا کسی کی ترغیب پر اسلام قبول کر لیا' اب اس سے شادی کرنا تو درکنار دین سے بے بہرہ ہماری اکثریت اس خاندان کو ذہنی طور پر قبول کرنے کے لیے بھی تیار نہیں ہوتی۔ یہی کچھ اس محمد نواز والے واقعہ میں ہوا کہ ۲۵ سال قبل نواز اور عیسائی لڑکی محبت کے ہاتھوں مجبور ہوئے' لڑکی نے مذہب تبدیل کر کے' اسلام قبول کرنے کا ڈھونگ رچا کر اسلام کے ساتھ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے احکامات سے مذاق کیا' نکاح میں ولی کی شمولیت اور رضا مندی کو پس پشت ڈالا' گھر سے بھاگ کر لومیرج کی ... اور پھر اسلام سے بے وفائی اور نفسانی ہوس کی غلامی کی سزا' اللہ کا عذاب بن کر یوں نازل ہوا کہ اس کی اپنی مسلمان بیٹی نے مذہب بھی تبدیل نہ کیا اور اپنے ایک عیسائی کزن کے ساتھ بھاگ کر لومیرج کر لی۔ اسی طرح بیٹے نے بھی اسلامی اقدار کا جنازہ نکالتے ہوئے کسی لڑکی کو بھگایا اور اس سے شادی رچا لی۔ نتیجتاً بدنامیوں نے گھر پر ڈیرے ڈال لئے' لوگوں کی انگلیاں اٹھنے لگیں' اس ذلت سے بچنے کے لیے' اپنی خود ساختہ غیرت کا ثبوت دیتے ہوئے' محمد نواز نے سب کو خون میں نہلا کر قتل کر دیا ...... افسوس صد افسوس ...... اپنی غیرت کا اتنا پاس جبکہ غیر محرم عیسائی رشتہ دار بلا روک ٹوک گھر میں آتے جاتے رہے' پردہ کے احکامات پامال کرتے رہے ...... غیر محرموں کے ساتھ لڑکیوں کے گھر سے باہر سیر و تفریح کے نام پر جانے کے چکر چلتے رہے۔ یوں اللہ تعالیٰ کی شریعت کے لیے ذرہ برابر غیرت کا مظاہرہ نہ ہو سکا ... ۲۵ سال گزر گئے' دین اسلام کی تعلیمات کو پامال ہوتے ہوئے ... لیکن کبھی بھولے سے بھی اس کا احساس نہ ہوا ...... تو مکافات عمل کے تحت ... اللہ کے عذاب کا کوڑا یوں برس پڑا ...... اور اس طرح کے اللہ کریم کی ناراضی کی نشان دہی کرنے والے واقعات بڑی تیزی سے رونما ہو رہے ہیں ... لیکن ہم ان سے عبرت حاصل نہیں کر رہے ... فانی زندگی کا آخری مرحلہ آنے سے پہلے اس قرآنی

ہدایت:

﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِیْكُمْ نَارًا ﴾

(التحریم: ۶۶/ ۶)

''اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو جہنم کی آگ سے بچا لو۔''

پر عمل کرتے ہوئے ہمیں اپنے اپنے گھر کو بچانے کی فکر کرنی چاہیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ...... لاعلمی میں یہودی میڈیا کی یلغار میں ...... ہمارے اپنے گھر بھی بہہ جائیں ...... اور ہمیں اس وقت پتہ چلے جب پانی سر سے گزر جائے۔

لڑکیاں گھر سے کیوں بھاگتی ہیں؟

بہنوں پر گزشتہ کالموں کے شائع ہونے کے بعد بہت سے بھائیوں اور بہنوں نے فون کے ذریعہ رابطہ کر کے اپنے خیالات، مشوروں اور تجاویز و آراء سے آگاہ کیا۔ سیالکوٹ سے گھر سے بھاگنے والی ایک لڑکی نے اپنی المناک داستان غم سناتے ہوئے بتایا:

اس کی خاطر تارے توڑ لانے والے، دنیا کی ہر طاقت سے ٹکرا جانے والے تاج محل کی مثال پیش کر کے بنگلوں اور کوٹھیوں میں رکھنے کے سہانے سپنے دکھانے والے دنیا جہان کی دولت قدموں میں لا ڈالنے کے وعدے کرنے والے، اس کے چاہنے والے نے گھر سے بھاگنے پر مجبور کیا اور وہ ایسا کر بیٹھی ہے۔ اب لاہور امامیہ کالونی کے پاس زندگی کے عبرتناک اذیت ناک اور ذلت آمیز دن پورے کر رہی ہے۔ گھر سے بھگا لانے والا میرا شوہر اب کبھی کبھی میرے پاس آتا اور مجھے مل کر واجبی سا خرچہ دے کر چلا جاتا ہے۔ میں اب ایک تاریک اور تعفن سے بھرپور کرائے کے گندے کوارٹر میں زندگی کے دن پورے کر رہی ہوں اور دکھائے گئے سہانے سپنوں کی تکمیل کا خواب شرمندہ تعبیر ہوتا دیکھنے کی بجائے دو وقت کی روٹی بھی مشکل سے حاصل کرتی ہوں۔ اکیلی ہونے کی بنا پر تین وقت کی روٹی بھی مشکل سے حاصل کرتی ہوں۔ اکیلی ہونے کی بنا پر ہر وقت مجھے اپنی عفت وعصمت اور عزت کے تحفظ کے متعلق خدشہ لگا رہتا ہے۔ رات دن ڈر ڈر کر اور جاگ جاگ کر صحت خراب ہو چکی ہے۔ میری بہنوں سے التجا ہے کہ وہ کسی بھی صورت میں ایسی غلطی کر کے اپنی قبر نہ کھودیں اور میرے جیسی مثالی صحت

کی مالک کے ہڈیوں کے ڈھانچے میں تبدیل ہو جانے سے عبرت پکڑیں۔

لڑکیوں کے گھروں سے بھاگنے کی اصل بنیاد دین و مذہب سے دوری، بے پردگی اور غیر شرعی و غیر اخلاقی روابط کی بنا پر عشق و محبت کے جذبات ہیں' جو شادی کے تھوڑے ہی عرصہ بعد جانبین کے سروں سے ایسے غائب ہوتے ہیں جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ مسرت انگیز سہانے سپنوں کا پول جلد ہی کھل جاتا ہے اور زندگی ایک تلخ حقیقت کا روپ دھارے سامنے آتی ہے۔ زمانے بھر میں رسوائی، اپنوں سے دوری کی ذلت ہر وقت ان کو ناگ بن کر ڈستی رہتی ہے۔ مصنوعی اور وقتی خیر خواہ، محبّ و ہمدرد اور دوست کے سامنے اس نازک مرحلہ پر بہت ہی کم لڑکیاں ثابت قدم رہتی ہیں۔ ایک بہن نے بتایا:

> اس کے دوست نے بڑے بلند و بانگ دعوے کرنے کے بعد اسے اکسایا کہ یہ ظالم سماج ہماری محبت کا دشمن ہے، چلیں ہم گھر سے کورٹ میں چلتے ہیں اور لو میرج کر لیتے ہیں۔ جب بعد میں پتا چلے گا تو پھر کچھ بھی نہ ہوگا' وہ کہیں گے کہ جو ہونا تھا وہ ہوگیا' اب کیا کیا جا سکتا ہے؟ اور یوں معاملہ ٹھنڈا پڑ کر رفع دفع ہو جائے گا لیکن میں نے اس کو جواب دیا کہ میں کسی صورت بھی اپنے خاندان کی عزت کو داؤ پر نہیں لگا سکتی' تم نے اگر مجھ سے شادی کرنی ہے تو اپنے والدین کو میرے گھر بھیجو' میں کھل کر تمہارا ساتھ دوں گی' لیکن وہ بھاگ گیا اور کسی دوسری لڑکی کو بھگا کر کورٹ میرج کر لی' اب ان میں طلاق ہو چکی ہے۔

بچیوں کے گھروں سے بھاگنے میں جہاں تک میڈیا اور ذرائع ابلاغ کا عمل دخل ہے' وہیں گھر والوں کا ان کی مکمل نگرانی نہ رکھنا، روشن خیالی کے خبط میں مبتلا ہونا، شرعی پردہ کا ترک' غیر محرم رشتہ داروں سے تعلق' گفتگو' میل جول' لین دین اور مخلوط خاندانی تقریبات میں شمولیت سے نہ روکنا، اور اگر شامل ہونا بھی پڑے تو کسی اخلاقی ضابطہ کی پابندی نہ خود کرنا اور نہ گھر والوں سے کروانا بھی گھر سے بھاگنے کے عوامل میں سے ہیں۔

اس مسئلے کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے' جو اکثر نظر انداز کیا جاتا ہے' وہ ہے''ولی''۔ ولی کی

ولایت اور لڑکی کی پسند کا مسئلہ، عورت کا ولی با اختیار ضرور ہے' لیکن مطلق العنان حاکم نہیں کہ وہ اپنا غلط فیصلہ بھی اس پر ٹھونس دے اور اپنے حق ولایت کا غیر محل، غلط، متکبرانہ، تحکمانہ، تحقیرانہ، جابرانہ اور ظالمانہ استعمال کرے۔ اسے یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اسلام نے ولی کو پابند کیا ہے کہ وہ شادی کے معاملہ میں عورت کی رضا مندی، پسند، خواہش اور اس کے انتخاب کا لحاظ رکھے۔

شادی کے مسئلہ میں ترجیح پسند ہی کو دی جائے گی، ہمارے ہاں جہالت کا یہ عنصر بدرجہ اتم موجود ہے کہ لڑکی کی پسند اور اس کے انتخاب کو بہت بڑا گناہ سمجھا جاتا ہے' حالانکہ اسلام نے شرعی و اخلاقی حدود و قیود میں رہتے ہوئے نہ صرف اس کی اجازت دی ہے' بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کے دور میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں' جن میں خواتین نے اپنے شریک حیات کا انتخاب کیا ہے۔ سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کا رسول اللہ ﷺ کا انتخاب کرنا اور ایک صحابیہ کا رسول ﷺ کی طرف سے رشتہ کے لئے بھیجے گئے صحابی عبداللہ ذوالبجادین کو منتخب کرنا' حالانکہ اس کے والدین کو اس میں تردد تھا' اس جیسی دوسری مثالیں اس بات کا بین ثبوت ہیں۔

والدین کو چاہیے کہ لڑکی جہاں شادی کی خواہش کا اظہار کرے' اگر کوئی شرعی اور اخلاقی قباحت نہ ہو تو وہیں اس کی شادی کر دیں' کیونکہ دوسری صورت میں عدالت کی سرپرستی میں وہ کورٹ میرج کر لے گی' جو خود اس کے لئے بھی بدنامی کا باعث اور عار کا سبب بنے گی اور اس کے والدین بھی معاشرے میں عزت و وقار کھو بیٹھیں گے۔ ولی کو اس کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اس کی شادی اس کے ساتھ کر دینی چاہیے جس کے ساتھ وہ چاہتی ہے' بشرطیکہ کوئی شرعی و اخلاقی قباحت نہ آڑے آتی ہو' لیکن ہمارے ہاں لڑکی کی خواہش کو کچھ جاہلانہ تصورات کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے مثلاً اپنی برادری کا لڑکا نہیں ہے، غریب ہے، ہمارے مرتبے کے برابر نہیں، یہ لڑکی ہو کر بکواس کرتی ہے کہ میرا فلاں سے نکاح کر دو، گھر بٹھائے لڑکیوں کو بوڑھا کر دینا' لیکن نامناسب بہانے بنا کر ان کی شادی نہ

کرنا' یا کسی برسرروزگار بچی کے متعلق یہ کہنا کہ یہ ابھی اچھا خاصا کما رہی ہے' ابھی کون سی جلدی پڑی ہے شادی کی، پھر ابھی اس نے کمائی کے بل بوتے پر فلاں کو یہ کروانا ہے، فلاں کو نوکری دلوانی ہے، فلاں کو یہ کاروبار کروانا ہے، یوں دولت کے لالچ میں اس کے لیے آنے والے رشتوں کو ٹھکراتے جانا' اسی طرح اچھے رشتوں کو بے بنیاد اور لایعنی جاہلانہ تصورات کی بنیاد پر رد کر دینا اور بچی کو بے کار گھر بٹھا کر اس کے اپنے گھر کے متعلق ارمانوں کا خون کرتے چلے جانا بھی اس کو بغاوت پر ابھارتا ہے۔

میری ایک مرحومہ عزیزہ نے اپنی بیٹی کے رشتہ کے لیے بہت سی شرطیں رکھیں کہ اگر لڑکا مندرجہ ذیل خوبیوں کا مالک ہوگا تو پھر شادی کروں گی۔ یہ ممکن نہیں ہوتا کہ جو تصورات کسی نے کسی انتخاب کے لئے قائم کر رکھے ہوں وہ تمام کے تمام حاصل بھی ہو جائیں' لیکن ہوا یہ کہ تمام شرائط کا حامل لڑکا مل گیا۔ وہ حافظ قرآن بھی تھا، درس نظامی وفاق المدارس کی تعلیم کے علاوہ عصری تعلیم کے زیور سے بھی آراستہ تھا' قد کاٹھ، رنگ روپ میں اچھا تھا، برسرروزگار، خوش شکل، اپنے مکان اور زمین کا مالک تھا۔ خوبصورتی کے ساتھ ساتھ خوب سیرت اور صوم وصلوٰۃ کا پابند تھا' لیکن ان تمام خوبیوں کا اعتراف اور مشاہدہ کرنے کے باوجود عزیزہ نے یہ رشتہ لینے سے انکار کر دیا کہ سب کچھ ٹھیک ہے' ہر مطلوبہ شرط اس بچے میں موجود ہے لیکن کیا کروں گاؤں کا رہنے والا ہے اور اس گاؤں میں سوئی گیس کی سہولت نہیں ہے، میری بچی کو لکڑیاں جلا کر دھوئیں میں روٹیاں پکانی پڑیں گی۔ وہ شہر کی پلی ہوئی دیہات میں کیسے رہ سکے گی؟ اسی کشمکش میں وہ رشتہ کہیں اور ہو گیا' بعد میں اپنی بیٹی کے لئے مطلوبہ خوبیوں اور شرائط کا حامل جوان نہ ملا، پھر وہ ساری زندگی یہ رشتہ ہاتھ سے نکل جانے پر کف افسوس ملتی رہیں۔

یوں ہم نے اپنے مصنوعی سٹیٹس اور جھوٹے وقار کے لبادوں میں ملبوس ہو کر بچیوں کو ان کے حقوق سے ظالمانہ طریقہ سے محروم کر رکھا ہے جس کا نتیجہ غلط رہنمائی کی بنا پر بغاوت کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ والدین کو چاہیے کہ بدنامی کے طوفانوں سے بچنے کے لئے

عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بچی کی شادی اس کی خواہش کے مطابق جہاں وہ چاہے کردیں' ہاں اگر دیکھیں کہ یہ رشتہ بچی کے لیے فلاں فلاں وجوہ کی بنا پر نامناسب ہے، نقصان دہ اور پریشانی کا سبب بن سکتا ہے تو اس کو محبت اور پیار سے یہ باتیں سمجھائیں کہ ہم تمہارے والدین ہیں' تمہارے ہاں خوشیاں ہی خوشیاں دیکھنا چاہتے ہیں' اس پر ضد نہ کرو، اس کے یہ یہ نقصانات ہیں، اگر اپنی مرضی کروگی اور ضد کرکے اپنی ہی بات منواؤ گی تو نتائج کی ذمہ دار خود ہی ہوگی۔ اب اگر دیکھیں کہ وہ پھر بغاوت پر آمادہ نظر آتی ہے، خودسر بنتی جا رہی ہے، اپنی ضد پر قائم ہے تو بدنامی سے اپنے دامن کو بچانے کے لیے بظاہر اس غیر مناسب رشتے کو بھی پایہ تکمیل تک پہنچا کر ان کی کامیاب ازدواجی زندگی کی دعا کریں اور ان کو وعظ ونصیحت کرتے رہا کریں۔ یوں بچیوں کے گھر سے بھاگنے کا تناسب یقیناً کم ہی نہیں بلکہ ختم ہو جائے گا اور نئی نسل اپنے سامنے رونما ہونے والی پرانی ناکام مثالوں سے سبق حاصل کرتے ہوئے اور اپنے مستقبل کے فیصلے کرتے ہوئے جذبات، جلد بازی اور ہٹ دھرمی کی بجائے سوچ وفکر اور غور وخوض اور والدین کی مشاورت سے اپنے مسائل حل کرنے کا ثبوت دیا کرے گی۔ ان شاء اللہ!

لڑکیوں کو آشناؤں کے ساتھ بھگانے والی عدالتیں

ہم آزاد قوم ہیں، زندہ قوم ہیں، ہماری انفرادی و اجتماعی زندگی آزادی کی مظہر ہے۔ ہمارے محکمے، ہماری حکومتی مشینری حتی کہ ہماری عدلیہ تک آزاد ہے، کس چیز میں؟ اپنے تمام قسم کے فیصلے کرنے میں...... ہمیں کوئی روک ٹوک نہیں، ہم من حیث القوم جو چاہیں کریں، کوئی ضابطہ و قانون ہمارے آڑے نہیں آئے گا...... اخلاقیات کی گتھیاں سلجھیں یا سیاسیات کی منازل طے ہوں۔ اخلاقیات کا جنازہ تو یہاں تک نکل چکا ہے کہ بے حیائی و فحاشی کے تیروں سے زخمی قوم عشق و محبت کے بخار میں مبتلا ہے۔ خاص طور پر نوخیز نسل، فلموں اور ڈراموں سے تربیت یافتہ اوباش نوجوان سکرین پر سیکھے گئے "گر" استعمال کر کے بھولی بھالی معصوم بچیوں کو عشق و محبت کے مکروہ جال میں پھانس کر گمراہ کرتے ہیں۔ اپنی مشرقی و اسلامی روایات کو توڑ کر زمانے سے ٹکرا جانے اور محبت کو امر کرنے کے سہانے خواب دکھلاتے ہیں۔ اندھے جذبات کی حامل، مغربی تعلیم و تہذیب کی علمبردار و پاسدار اور اسلامی تعلیمات سے ناآشنا یہ بچیاں ان کے پیچھے لگ کر گھر سے بھاگ جانے کی غلطی کر بیٹھتی ہیں۔ بات گلی محلے بستی و شہر میں پھیلتی ہے، والدین زندہ رہتے ہوئے بھی مر جاتے ہیں، زمین میں گڑ جاتے ہیں، زبانوں پر تالے، آنکھوں میں جھلملاتے آنسو اور اذہان و قلوب میں عزت و وقار کی بربادی کی آندھیاں چلنے لگتی ہیں...... اپنی عزت بحال کرنے کے لیے جگہ جگہ مارے مارے پھرتے ہیں۔ آخر اپنی گری ہوئی پگڑی کے وقار کو بحال کرنے کے لیے وہ عدالتوں کی طرف بھاگتے ہیں کہ وہاں انصاف کا کوڑا تھامے براجمان قاضیان باصفا ہمیں چرکے لگانے والوں، ہمیں زخم دینے والوں اور ہماری عزت و ناموس پر نشتر چلانے والوں کو عبرتناک سزا

دے کر ہمارے زخموں پر پھاہا رکھیں گے، مرہم لگائیں گے، اپنی مسیحائی دکھائیں گے۔

جب وہ ان قاضیوں اور مفتیوں کے روبرو اپنا دکھڑا لے کر فریاد کناں ہوتے ہیں تو عدالت کا آرڈر، آرڈر، آرڈر، والا ہتھوڑا..... جوتے کی شکل میں ان کے منہ پر رسید ہوتا ہے کہ یہ کون سے دقیانوسی جاہل، گنوار، ظالم، سفاک، گمراہ اور تہذیب وتمدن سے نابلد لوگ آگئے ہیں' کہ جن کو یہ بھی پتا نہیں کہ ان کی بچی پندرہ سال کی ہوچکی ہے، اب وہ آزاد ہے، وہ اپنے والدین کو اطلاع دیے بغیر جس کے ساتھ چاہے' جس وقت چاہے جہاں چاہے' بغیر کسی روک ٹوک کے گھر سے بھاگ سکتی ہے اور عشق ومحبت کی منزلیں عملی طور پر طے کر سکتی ہیں..... تم کون ہوتے ہو اس بالغہ کی آزادیوں میں خلل ڈالنے والے..... چلو بھاگو اپنے گھروں کو..... آئندہ ان کی آزادیوں میں مخل اور رنگ میں بھنگ ڈالنے کی کوشش نہ کرنا۔

والدین اس وقت ایسے چکرا جاتے ہیں جیسے کہ کائنات میں ان کا کوئی سہارا نہ رہا ہو، کئی دل کا دورہ پڑنے سے، کئی دماغ کی شریان پھٹنے سے اس دنیا کو الوداع کہہ جاتے ہیں اور کئی جی جی کر مرنے اور مر مر کر جینے کے لیے ذلتیں اٹھانے' نفرتیں سہنے، طعنوں کے مہلک تیر کھانے کے لئے برائے نام زندہ رہ جاتے ہیں اور بار بار یہ کہتے ہیں:

ایسے جینے سے بہتر تھا مر جاتے ہم
ایسی ذلت تو ہم کو گوارا نہیں

پچھلے دنوں لاہور ہائی کورٹ نے مختلف علاقوں کی عشق لڑانے کے بعد گھروں سے بھاگ کر آنے والی لڑکیوں کی شادیوں کو جائز قرار دے دیا اور ان کے والدین کی طرف سے درج کرائے گئے مقدمات کو بغیر کسی تادیبی کارروائی کے خارج کر دیا۔ ایم ڈی طاہر ایڈووکیٹ نے عدالت سے کہا کہ پولیس خانگی معاملات میں مداخلت سے باز نہیں آ رہی۔ ایک ۱۵ سالہ دوشیزہ کوثر نے گھر سے اپنے عاشق کے ساتھ بھاگنے کے بعد والدین کی مرضی کے خلاف معشوق علی سے شادی کر لی تھی۔ کوثر کے والد فضل حسین نے معشوق علی کے خلاف بیٹی کے اغوا کا مقدمہ درج کروا دیا، جسے کوثر نے اپنے والد کے خلاف ایکشن لیتے ہوئے ایم

ڈی طاہر کی وساطت سے چیلنج کر دیا۔ وکیل نے بتایا کہ عاقل و بالغ لڑکیوں کو والدین کے خلاف اپنی مرضی کی شادی کرنے کا حق ہے۔ عدالت نے سماعت کے بعد کوثر کو معشوق علی کے ساتھ جانے کی اجازت دے کر مقدمہ خارج کر دیا۔

دوسری عدالت نے گوجرانوالہ کی شاہدہ بی بی کی شہباز احمد کے ساتھ شادی کو جائز قرار دے کر شاہدہ کے دکھیارے والدین کی طرف سے درج کروایا گیا مقدمہ خارج کر دیا۔ ایک تیسری عدالت نے شیخوپورہ کی فہمیدہ خانم کی درخواست پر کارروائی ملتوی کر دی۔ فہمیدہ نے اپنی مرضی سے منیر احمد کے ساتھ شادی کر لی مگر ماں باپ نے (عزت کی بحالی کی آس امید پر) مقدمہ درج کروا دیا۔ لیکن جب مقدمہ خارج کرانے کے لیے لڑکی لڑکے نے تحفظ فراہم کرنے کے لیے ہائی کورٹ سے رجوع کرلیا تو مقدمہ کی کارروائی ملتوی کر دی گئی۔

عدالت کی اس کارروائی کے بعد ہوتا کیا ہے ..... اخبارات و جرائد اور ٹی وی وغیرہ کا میڈیا والدین کے خلاف ان کی جیت کو واضح کوریج اور شہ سرخیوں کے ساتھ، نمایاں انداز میں پہلے صفحے پر شائع کرتا ہے۔ ان کو بطور ونر اور ہیرو قوم کے سامنے پیش کرتا ہے اور والدین کو سفاک، ظالم، ولن، خائب و خاسر، ناکام و نامراد اور عشق و محبت کے دشمنوں کے طور پر پیش کرتا ہے۔

یوں والدین معاشرے میں جیتے جی مر جاتے ہیں۔ جب بیٹی ہی اپنے باپ اور ماں کو غلط اور جھوٹا ثابت کرنے کے لیے باقاعدہ وکیل کرتی ہے، فیسیں ادا کرتی ہے، والدین کو عدالت میں گھسیٹتی ہے، ان پر ساری دنیا کے سامنے الزام دھرتی ہے، ایک کٹہرے میں باپ مجرم کی طرح کھڑا ہوتا ہے' دوسرے میں بیٹی مدعی کے طور پر تمام قسم کے قانونی و آئینی اسلحوں کے ساتھ مسلح کھڑی باپ کو کھری کھری سنا رہی ہوتی ہے' تو بے اختیار باپ کی شفقت و محبت بھری آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتی ہیں اور اسے وہ منظر ماضی کے دھندلکوں میں جامد نظر آتا ہے..... جب اس کی بیوی اس کو کہہ رہی ہوتی ہے: ''اس ننھی بچی کو اپنے سینے پر لٹا کر نہ سلایا کرو، اس طرح اس کی یہ عادت بن جائے گی اور آپ کی غیر موجودگی میں آپ کی یہ کمال

محبت ہمارے لیے مسئلہ کھڑا کر دے گی۔'' تو باپ تڑپ کر کہتا: ''ایسا نہ کہا کرو اللہ والی! کیا تو جانتی نہیں' بیٹیاں اللہ کی رحمت ہوتی ہیں' یہ بیٹی تو میرے جگر کا ٹکڑا ہے، اسے کون مجھ سے جدا کر سکتا ہے، یہ مستقبل میں میری عزت و وقار کا باعث بنے گی، ہماری نیک نامی کا سبب ہو گی اور ہمارا نام روشن کرے گی' اور تو یہ جانتی ہے کہ بیٹوں کی نسبت بیٹیاں ہی زیادہ ماں باپ کا مستقبل میں خیال رکھتی ہیں، ان پر محبت نچھاور کرتی ہیں، بڑھاپے میں ان کی لاٹھی بنتی ہیں اور بہتر طریقے سے دیکھ بھال کرتی ہیں۔'' پھر باپ اچانک عدالت کے ہتھوڑے کی آواز سنتے ہی چونک کر حقیقت کی دنیا میں واپس آ جاتا ہے' اس کے سامنے اس کی وہی بیٹی، جسے وہ جگر کا ٹکڑا کہتا تھا، اس کے جگر کو اپنے الزامات و بیانات کے تیروں سے چھلنی کر رہی ہوتی ہے۔

وہ پھر تصورات کی دنیا میں غرق ہو جاتا ہے اور فریاد کناں ہوتا ہے کہ اے رب العالمین...... ! تیری اس دنیا میں یہ کیسی عدالتیں ہیں جو انصاف کے نام پر تیرے دین اسلام کی تعلیمات سے روگردانی کو آزادی تصور کر رہی ہیں۔ تیرے آخری رسول شاہ امم، سلطان مدینہﷺ نے اپنی عدالت میں تو یہ کہا ہے کہ جو نکاح ولی (ماں باپ وغیرہ) کے بغیر منعقد ہو وہ نکاح ہی نہیں ہے، مگر اس کے ماننے والوں' اس کے نام لیواؤں کی یہ عدالتیں اس کے آرڈر کی تعمیل کرنے کی بجائے تحقیر کرنے والوں کی سرزنش کی بجائے ان کو اعتماد اور تحفظ فراہم کر رہی ہیں' اسلامی روایات کی پاسداری کی بجائے مغربی و صلیبی تہذیب کی آبیاری اور دلداری کا سبق دے رہی ہیں۔ یالعجب...... !! ...... عدالت کے ہتھوڑے کی آواز پھر اسے حقیقی دنیا میں لاتی ہے، وہ دیکھتا ہے کہ اس کی اپنی لخت جگر...... نورنظر...... اسے جھوٹا قرار دے کر کامیاب قرار پا کر فاتح کی حیثیت سے لوٹ رہی ہوتی ہے۔ وہ اب ہر طرف گردش کرنے والے اخبارات و ٹی وی کے کیمروں کی چکا چوند سے گزر رہی ہوتی ہے' جو ہمیشہ کے لیے اس کی کامیابی کے ان مناظر کو محفوظ کر لینا چاہتے ہیں' کہ باپ اپنی بیٹی اور معاشرہ کے سامنے کبھی آنکھ نہ اٹھا سکے۔ باپ یہ منظر کرچی کرچی دل اور پتھرائی ہوئی نظروں کے ساتھ

دیکھتا ہے تو پھر ماضی کے سمندر میں ڈوب جاتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ...... جب اس نے اپنی دوسری سولہ سالہ بیٹی کی شادی کی تھی تو اسی معاشرہ میں کہرام مچ گیا تھا...... کہ اس جاہل نے اتنی کم عمری میں اپنی بچی کی شادی کر دی، بہت جلدی تھی اسے...... کیا بیٹی اس پر بوجھ بن گئی تھی...... جو اتار پھینکا!!؟ وغیرہ وغیرہ...... لیکن پندرہ سال کی عمر میں اس کی دوسری بیٹی نے غلیظ و قبیح معاشقہ لڑا کر...... ہمیں بدنام کر کے اپنا اور ہمارا نام گالی بنا کر' گھر سے بھاگ کر شادی کر لی ہے...... تو اب اسے ہر سطح پر تحفظ فراہم کیا جا رہا ہے۔ اسے بطور ہیرو پیش کیا جا رہا ہے۔ لڑکیوں کا لڑکوں سے خفیہ تعلقات اور عشق و محبت کی حیا سوز پینگیں بڑھانا، پھر گھر والوں سے چھپ چھپا کر اپنی عصمت کی سفید و شفاف چادر پر سیاہ دھبے لگوا لینا اور پھر والدین کی مرضی، عزت و ناموس اور وقار کا خیال کیے بغیر زندگی بھر کے فیصلے خود ہی کر لینا، اس کی اجازت تو قطعاً ہمارا مذہب نہیں دیتا' حتیٰ کہ ہماری مشرقی روایات بھی اس کی متحمل نہیں، تو پھر یہ کیا ہو رہا ہے؟ اس کے بعد اس کا دماغ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا بلکہ ماؤف ہو جاتا ہے۔

کیا گھروں سے بھاگ کر آنے والی ایسی نادان اور گمراہ لڑکیوں کے مقدمات لڑنے والے وکلاء سے ہم پوچھ سکتے ہیں کہ اگر آپ کے گھر میں بھی ایسا سانحہ رونما ہو جائے تو کیا آپ اسے بالغوں کے حقوق میں شامل قرار دے کر چشم پوشی کر لیں گے؟

اس مسئلے کا عبرتناک پہلو یہ ہے کہ ایسی لڑکیوں کا انجام جو غیر شرعی و بے حیائی پر مبنی عشق و محبت کے مکروہ چکروں میں پھنس کر اپنے آشناؤں کے ساتھ گھروں سے بھاگ جاتی ہیں، بہت دردناک ہوتا ہے۔ کچھ ہی عرصہ بعد جب اسلام سے بغاوت پر مبنی جذبات کا بھوت اترتا ہے تو ایسی دوشیزائیں آزادیوں کے سفر کے اختتام پر آخر ایک ہمکتی ہوئی ننھی منی جان کو گود میں اٹھائے ہوئے بابل کا دروازہ کھٹکھٹاتی ہیں اور سسکتے ہوئے' بلکتے ہوئے' روتے ہوئے اور لرزتے و کانپتے ہوئے ہونٹوں سے لڑکھڑاتی زبان سے یوں عرض پرداز ہوتی ہیں:

ب..... بب..... بابا! اس نے مجھے چھوڑ دیا ہے..... اس نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے..... بے وفائی کی ہے..... وہ مجھ سے اکتا گیا ہے..... اس نے مجھے چھوڑ دیا ہے، وہ مجھے اور میری اس ننھی بچی کو اکیلے ہی اس بھری دنیا میں چھوڑ کر کہیں چلا گیا ہے..... اس نے مجھے بدکردار اور گھر سے بھاگی ہوئی قرار دے کر ٹھوکر مار دی ہے اور..... طلاق دے دی ہے۔ یا اس کے گھر والوں نے مجھے قبول نہیں کیا اور تشدد کر کے نکال باہر کیا ہے..... اس نے مجھے عصمت کے بیوپاریوں کے ہاتھوں بیچ دیا تھا..... میں بڑی مشکل سے جان بچا کر آئی ہوں۔ بابا! اللہ کے لیے مجھے معاف کر دو..... اب میں کبھی کہیں نہ جاؤں گی' آپ کو دکھ نہ دوں گی..... بابا کی خاموشی پر پھر بلکتی ہے اور فقیروں کی طرح ہاتھ پھیلا کر کہتی ہے: بابا! مجھے نہ سہی' میری اس ننھی بچی ہی کو اپنے سائبان کے نیچے جگہ دے دو، پناہ دے دو۔

یوں یہ سلسلہ چلتا آیا ہے اور چلتا رہے گا..... کب تک.....؟ جب تک یہ بے حیائی و فحاشی کے آلات ہمارے گھروں کی زینت بنے رہیں گے، جب تک مغربی تہذیب کے علمبردار ادارے' کلیدی عہدوں پر فائز افراد' غیر اسلامی اور صلیب پرستوں کے قانون کی محافظ عدالتیں قائم رہیں گی، اللہ کریم کے متعین کردہ ضابطہ حیات سے بغاوت ہوتی رہے گی، بے حیائی' بے حجابی اور مغربی تہذیب کو آئیڈیل بنا کر اپنایا جاتا رہے گا، ایسا ہوتا ہی رہے گا' اگر سلطان مدینہ ﷺ کا قانون اپنایا جائے تو آج مکمل و یقینی نجات ممکن ہے۔ ان شاء اللہ!!

جیسے آپ راضی ویسے ہم راضی

عجب دنیا ہے اور عجب اس کے لوگ۔ یہاں جیون کے بہتے دھاروں میں ہر ایک کی ایک علیحدہ جیون کہانی ہے۔ غموں کے کانٹوں میں الجھے لوگ خوشیوں کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ یہاں ہر ایک کو اپنی ہی پڑی ہے۔ ہر کوئی چاہتا ہے کہ دنیا جہان کی خوشیاں مجھ اکیلے کو مل جائیں' دوسرا بے شک تہی دامن وتشنہ رہے۔ یہیں پہ بس نہیں بلکہ بعض لوگ تو اس قدر سفاکی اور بہیمیت کا ثبوت دیتے ہیں کہ دوسروں کے کھلے گلشن کو بھی حسد وخود غرضی کی آگ سے جلا کر راکھ کر دینے کیلئے کمر بستہ نظر آتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ دوسرا بے شک جہنم میں جائے لیکن اس کے حصے کی خوشیاں بھی ہمیں ہی مل جائیں۔ کبھی یہ نہیں سوچتے دوسری بے چاری دنیا پہ آنے والی جان بھی جینے کی امنگ رکھتی ہے۔ خوشیوں کی کہکشاں میں زندگی کے ایام گزارنا چاہتی ہے۔ شادمانیوں و کامرانیوں کو پانے کی اس محروم ومحزون دل کی بھی خواہش ہے۔ اس کا بھی دل چاہتا ہے کہ جیون کے اس سفر کو طے کر کے منزل تک پہنچنے کے لیے کوئی اس کا ہم سفر ہو' ہم درد' غمگسار و مونس ہو۔ اگرچہ کبھی کبھی ہی سہی لیکن خوشیوں کی نمناک ہوا میں وہ بھی سانس لے سکیں۔

ایسی ہی ایک جیون کتھا کے متعلق مجھے طائف سعودیہ سے بھائی محمد فریاد کا فون آیا۔ انہوں نے ابتداء ہی میں مجھ سے سوال کیا: طاہر بھائی! بتائیں کہ عورت پر ظلم کون کرتا ہے؟ ...... میں یہ سوچنے لگا کہ انہوں نے ایسا کیوں پوچھا ہے...... بہرحال میں نے جواب دیا کہ عورت پر ظلم مرد ہی کرتا ہے۔ کبھی وہ شوہر کی شکل میں، کبھی بیٹے کی شکل میں، کبھی بھائی اور کبھی باپ کی شکل میں ہوتا ہے۔ وہ کہنے لگے: نہیں' ایسا نہیں ہے' میرا تو مشاہدہ ہے کہ عورت

پر ظلم خود عورت کرتی ہے۔ میں نے کہا: یہ آپ نے عجیب کہی، مجھے تو اس کی سمجھ نہیں آئی، ذرا وضاحت کریں، تو اس بھائی نے فون پر ہی اپنی جیون کتھا بیان کرنا شروع کر دی۔ کہنے لگا: چند سال قبل میری شادی ایسی جگہ ہوئی جہاں میں بالکل خوش نہ تھا، میری مرضی کے خلاف زبردستی میری شادی کر دی گئی ...... آج تک میرا بیوی کے ساتھ اچھا وقت گزرا لیکن اولاد نہیں ہو سکی۔ میری عمر تقریباً ۴۴ سال ہے جبکہ میری اہلیہ کی عمر ۴۵ سال ہے۔ اولاد کی شدید خواہش کو دیکھ کر میری بیوی نے دوسری شادی کرنے کی اجازت دے دی ہے۔ میں نے چند جگہ بات چلائی تو بعض دفعہ لڑکی نے اور بعض دفعہ لڑکی کے والدین میں سے کسی نے ایک عجیب مطالبہ میرے سامنے رکھ دیا کہ جسے میں کیسے پورا کروں؟

میں نے کہا: شاید بڑے جہیز کا مطالبہ ہوگا، جو عام طور پر معاشرتی ناسور اور لعنت بن چکا ہے، لیکن یہ تو لڑکے والوں کی طرف سے ہوتا ہے جبکہ یہ دو کپڑوں میں قبول کرنے کے لیے تیار ہے۔ شاید لڑکی والوں میں سے کسی آدمی کو سعودیہ اپنے خرچ پر بلوانے کا مطالبہ ہوگا یا پھر لڑکی کے نام کوئی مکان، پلاٹ یا جائداد لگانے کا مطالبہ ہوگا۔ میں نے سوچوں کے بھنور سے نکل کر اس کی گفتگو کاٹ کر سوال کیا کہ کیا مطالبہ کیا انہوں نے؟ وہ کہنے لگا:

> یہی بتانے کے لیے ہی تو میں نے فون کیا ہے، آپ بھی سنیں اور میری رہنمائی کریں۔ میں عجب الجھن میں پھنس گیا ہوں۔ اس الجھن کی سلجھن آپ کے ذمہ ہے۔ میں نے کہا: بھائی کچھ بتاؤ بھی تو ...... اس پر وہ ساری بات ایک فقرے ہی میں بتا گیا، کہنے لگا: لڑکی والے خاص طور پر لڑکی یا اس کی والدہ اور ہمشیرہ سب سے پہلے یہ مطالبہ کرتی ہیں کہ ہم آپ کا رشتہ منظور کرتے ہیں، بشرطیکہ آپ پہلی بیوی کو فوری طلاق دے دیں۔ جب آپ طلاق دے دیں گے تو ہم نکاح کر دیں گے، ورنہ ...... ہماری طرف سے جواب ہے۔ اب بتایئے! ہے نا عورت ہی عورت کی دشمن!! مرد تو مفت میں بدنام ہے ......

میں لاجواب ہو گیا۔ میں باقی تو سب کچھ بھول گیا، فوری فریاد بھائی کو نصیحت کرنے

لگا: فریاد بھائی ایک بات کان کھول کر سن لیں، کہیں رشتہ ہو یا نہ ہو یہ ایک علیحدہ بحث ہے۔ آپ نے پہلی بیگم کو طلاق ہرگز نہیں دینی۔ اس بے چاری کا کیا قصور ہے؟ اس نے تمہیں اجازت بھی دے دی ہے اور اس عمر میں وہ اللہ کی بندی جائے بھی تو کہاں؟ تمہارے پیار کی یادوں کے سہارے تو زندگی ہنسی خوشی گزار دے گی لیکن اس بے وفائی کے نتیجے میں ہو سکتا ہے آہ سرد بھر کے اگلے جہان سدھار جائے یا پھر انگاروں پہ جھلس جھلس کر اپنی ذلت و بربادی کی دلدل میں دھنس کر تھوڑے عرصے ہی میں غرق ہو جائے۔ یاد رکھو! ان حالات میں اس کو اپنے سے علیحدہ نہ کرنا، طلاق نہ دینا، بلکہ احساس محرومی و احساس کمتری کی شکار اس حوا کی بیٹی کو خوشیاں دینا' یقیناً یہ اللہ کی رضا کے حصول کا باعث بنے گا اور کیا عجب کہ اس کو طلاق نہ دینے والا تمہارا یہ عمل اللہ کریم کو اس قدر پسند آئے کہ وہ اس کے بدلے میں تمہیں جنتوں میں داخل کر دے۔ لہٰذا ہرگز ہرگز اس کو طلاق نہ دیں اور معاملہ اللہ کریم کے سپرد کر کے اپنی کوشش جاری رکھیں' اللہ کریم ضرور تمہاری مدد کرے گا اور جب اس اللہ کی بندی کو اس بات کا علم ہوگا کہ اس نے ہتھیار نہیں ڈالے اور مجھے اپنے سے جدا نہیں کیا تو وہ بھی اللہ کے دربار میں اپنی جھولی پھیلا کر گڑ گڑا کر تمہاری سلامتی اور دنیا و آخرت میں کامیابی کی دعائیں کرے گی۔ اللہ کریم اس کی بے لوث دعاؤں کو ضرور سنے گا۔ اس بھائی نے مجھ سے پختہ وعدہ کیا کہ وہ اس کو طلاق ہرگز نہ دے گا بلکہ اس گفتگو کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ اسے پہلے سے بھی زیادہ خوشیاں دے گا اور اس کا خیال رکھے گا تاکہ اسے اپنی حیثیت میں کمی کا احساس نہ ہو۔

اے حوا کی بیٹی!...... اے ہماری بہن و بیٹی!...... تو کیوں خود ہی اپنی دشمن بن بیٹھی ہے۔ تو دوسروں کے آنگن کو سُونا کر کے صرف اپنا گلشن کیوں آباد کرنا چاہتی ہے۔ یاد رکھ! دوسروں کی خوشیوں کا خون کر کے اپنا بسایا ہوا نشیمن کبھی مضبوط اور محفوظ نہیں ہوتا۔ دوسروں کی لاش پہ کھڑا کیا گیا محل ہمیشہ بغیر بنیادوں کے ہوا میں معلق عمارت ہوتی ہے' جو کسی بھی وقت تیز آندھی سے زمین بوس ہو سکتی ہے' جس کو خزاں کے جھونکے کسی بھی وقت زرد پتے کی

طرح شاخ سے علیحدہ کر کے گلنے سڑنے والے پتوں کے ڈھیر میں لا پھینکتے ہیں' جہاں وہ گل سڑ کر اپنا وجود ہمیشہ کے لیے کھو دیتا ہے۔

ایسا ہی ایک عبرت ناک واقعہ اس وقت دیکھنے میں آیا جب کراچی کا ایک تاجر اور ساہیوال میں زرعی زمینوں کا مالک اپنے ڈیرے پر آیا۔ اپنی کسی ضرورت کے تحت اس نے ایک غریب کسان کے ہاں شادی کی بات چلائی۔ اس کی سترہ سالہ خوبصورت مگر نادان لڑکی نجمہ نے اشارہ دیا کہ اگر پہلی بیگم راستے کا پتھر نہ بنے تو نکاح ہوسکتا ہے۔ نکاح کے بعد اس نے اس وقت تک دم نہ لیا جب تک پہلی بیگم کو طلاق نہ دلوا لی۔ اللہ کے عذاب کا کوڑا برستے دیر نہیں لگتی۔ ہر عمل کا ردعمل ہوتا ہے۔ مکافات عمل کا لٹو ہمیشہ گردش میں رہتا ہے۔ یہاں بھی ایسا ہی ہوا۔ دس سال اسے تن تنہا خوشیاں سمیٹتے گزر گئے جبکہ دوسری بیگم اکیلی ہی اپنے بچوں کو پالنے پوسنے میں روتی دھوتی محنت مزدوری کرتی رہی' بہنوں بھائیوں ماں باپ کی جھڑکیاں سہتی رہی' کیونکہ یہ بھی ایک المیہ ہے کہ ایسی صورت میں ایک تو اس مظلوم عورت سے ظلم ہوتا ہے لیکن جب وہ اپنے ورثاء کے گھر گرتی پڑتی آتی ہے تو اسے بوجھ سمجھ لیا جاتا ہے اور پھر غیر نہیں اپنے ہی طرح طرح کی جلا دینے اور رلا دینے والی باتوں کے تیر پھینکتے ہیں' نشتر چلاتے ہیں' بچوں کو کنٹرول کرنے والا کوئی ہوتا نہیں' وہ علیحدہ نافرمانی کر کے اس کا جینا محال کیے رکھتے ہیں' لہٰذا یوں وہ ہر پل کانٹوں اور انگاروں پر گزار کر زمین کے نیچے جا سوتی ہے۔

بہرحال دس سال بعد جب اس غریب کسان کی بیٹی کی عمر ستائیس سال ہوئی تو وہ بیمار پڑ گئی۔ گھر میں تیمارداری کرنے والا کوئی نہ تھا۔ خاوند نے اپنی کزن عشرت کو دوسرے شہر سے بلا لیا۔ اس کی کوکھ ابھی تک اولاد سے خالی تھی۔ اگر پہلی بیوی (سوتن) ہوتی تو شاید وہ اس نازک وقت میں تیمار داری کرتی۔ خاوند کی کزن نے خوب تیمار داری کی لیکن وہی مسئلہ کہ جس کو اسلام نے غیر محرم سے پردہ کا مسئلہ بتایا ہے' یہاں خلاف ورزی ہوئی' کزن سے گفتگو، تبادلہ خیالات ہوا تو بات شادی تک پہنچی۔ اس کزن نے شادی کے لیے وہی شرط رکھ دی جو دس گیارہ سال قبل نجمہ نے اپنے خاوند کے سامنے رکھی تھی۔ اب جب نجمہ بیماری

سے صحت یاب ہوئی تو اسے اڑتی اڑتی خاوند کی دوسری شادی میں دلچسپی کی خبر پہنچی' جس کے نتیجے میں اسے اندر ہی اندر دوسری بیماری لگنے لگی۔ مکافات عمل کا نتیجہ سامنے آیا۔ خاوند کی نئی کزن نے اسے طلاق دلوا دی اور اس سنگھاسن پر خود بیٹھ گئی جس سے نجمہ گیارہ سال قبل کسی کو گرا کر بیٹھی تھی۔ نجمہ کو یہ بات اندر ہی اندر کھا گئی۔ انتقام کے جذبے نے انگڑائی لی۔ اس نے سوچا: میں نے تو پہلی بیوی کو طلاق دلوا دی تھی' اب اگر میں مطلقہ ہو گئی ہوں تو اس گھر میں جہاں میں نے تن تنہا مالکہ کی حیثیت سے زندگی گزاری ہے اس کو بھی نہ رہنے دوں گی، لہٰذا وہ ایک دن خاوند کی غیر موجودگی میں گھر آئی' عشرت سے تو تکار ہوئی' بحث مباحثہ بڑھا' لڑائی تک نوبت پہنچی' ایک دوسری پر بدکارہ ہونے کے الزام لگے تو نجمہ نے انتقام کی آگ میں جھلستے ہوئے آگے بڑھ کر اس کا گلا دبا کر نیچے گرایا' اوپر سے سینے پر شدید ضربیں لگائیں اور اسے دفاع کے لیے بھی دوبارہ نہ اٹھنے دیا۔ نجمہ کو اس وقت ہوش آیا جب عشرت کی روح پرواز کر چکی تھی۔ یوں اب نجمہ دوشیزہ سے دلہن اور پھر دلہن سے مطلقہ اور مطلقہ سے قاتلہ بن چکی تھی۔ ضروری کارروائی کے بعد پولیس کی گرفت میں تھی' مقدمہ چلا، کوئی کچھ نہ کر سکا۔ اگرچہ نجمہ کے والدین نے پیسہ پانی کی طرح بہایا...... لیکن اس کے باوجود...... وہ لمبی قید کی سزا لے کر...... جیل کی کال کوٹھری میں بند کر دی گئی۔

روزمرہ معاشرہ میں سامنے آنے والے ایسے حقائق سے تو واقعی یہ ثابت ہوتا ہے کہ عورت کی دشمن عورت خود بھی ہے۔ وہ کیوں نہیں اس حقیقت کو سمجھ لیتی کہ جتنی خوشیاں اللہ کریم نے اس کی قسمت میں لکھی ہیں وہ اسے مل کر ہی رہیں گی' اگرچہ پوری دنیا ان کو روکنے کی کوشش کرے وہ اس کی خوشیوں کو کم نہ کر سکے گی اور جو خوشیاں دوسروں کے حصے میں قادر مطلق نے لکھ دی ہیں وہ ان کا حق ہیں' وہ ان سے خوشیاں چھیننے کی کوشش نہ کرے' ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرے' اگر ایسا کرے گی تو یقیناً اللہ کریم اس سے خوش ہو کر اس کے حصے میں دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی مزید خوشیاں لکھ دیں گے۔ یوں اس کی تقدیر ہی بدل جائے گی۔ اگر وہ یہ سمجھتی ہے کہ فلاں کو زیادہ خوشیاں ملی ہیں اور مجھے کم، ایسا کیوں ہے؟ مجھے بھی اتنی ہی خوشیاں ملنی چاہیے تھیں۔ اگرچہ یہ بچوں کی سی ذہنیت ہے...... لیکن پھر بھی اسے

اس حقیقت کو سمجھ لینا چاہئے کہ یہ دنیا کی چار دن کی عارضی زندگی دارالامتحان ہے' دارالعمل ہے' یہ امتحان کی جگہ ہے' اگر یہاں آدمی امتحان میں کامیاب ہو گیا تو پھر حقیقی اور ابدی نہ ختم ہونے والی زندگی میں بھی کامیاب ہو کر ہمیشہ نہ ختم ہونے والی لامحدود خوشیوں کا مالک بن جائے گا۔ یہ خوشیاں، یہ غم اس مالک کے عطا کردہ ہیں کہ جس نے زمین و آسمان بنا کر ہمیں یہاں بھیجا' تاکہ ہمیں آزما سکے کہ کیا یہ میری عطا پر صابر و شاکر اور خوش و خرم ہیں یا ناشکرے اور شاکی ہیں۔ ہمیں اپنے ہر عمل سے یہ ظاہر کرنا چاہئے کہ اے پیارے خالق و مالک! اے پیارے رب کریم! ہم تیری عطا پر خوش ہیں، تو نے ہمیں غم دیے، دکھ دیے یا خوشیاں و سکھ دیے ہم ہر حال میں تجھ سے خوش و شکر گزار ہیں۔ ہم تیری طرف سے رنگین و خوبصورت دنیا کا مشاہدہ کرنے کے لیے عطا کی گئی صرف دو آنکھوں کا بھی حق ادا نہیں کر سکتے' ان کا شکریہ ہی ادا نہیں کر سکتے' جبکہ تو نے تو ہمیں ان آنکھوں کے علاوہ اور بھی بہت کچھ دے رکھا ہے۔ ہم اسی طرح خوش ہیں کہ جس طرح تیرے آخری پیغمبر' محبوب کائنات' سرور کائنات، امام کائنات محمد رسول اللہ ﷺ کے نواسے حسین بن علی رضی اللہ عنہما نے کربلا میں سارا کنبہ کٹ جانے کے بعد تیری بارگاہ میں سر ریتلی زمین پر سجدے میں رکھ کر کہا تھا: رضیت برضائك اے رب کائنات! اے رب ذوالجلال والاکرام!...... میں بالکل اس طرح راضی ہوں کہ جس طرح تو راضی ہے۔ اگر تو میرے سارے خاندان کو کربلا میں شہید کروا کر راضی ہے تو میں بھی تیری اس رضا کے ساتھ راضی ہوں۔

مطلب کیا تھا کہ اگر تو راضی ہو گیا تو پھر دنیا جہاں کی خوشیاں اور کامیابیاں وافر مقدار میں تو اسی کو ملتی ہیں جس سے تو راضی ہوتا ہے۔

اے مالک دو جہاں!...... اس جہان فانی میں جہاں ہمیں خوشیوں کی کمی محسوس ہوتی ہے یہ چونکہ تیری طرف سے عطا شدہ ہے' اس لیے ہم اپنی اسی قسمت کے لکھے پر راضی رہیں۔ تجھ سے امید کرتے ہیں کہ دنیا میں محسوس ہونے والے کمی کے اس احساس کو تو آخرت میں ضرور ختم کر کے اس کا بہتر بدل عطا کرے گا۔ ان شاء اللہ۔

مظلوم دلہے!!

میں تو اپنا کالم ''پردے میں رہنے دو'' لکھ کر ڈرا ہوا تھا کہ بہنوں اور ماؤں کی طرف سے ردعمل میں خوب درگت بنے گی۔ کہیں گی کہ جدید تہذیب و ترقی اور سائنس کے دور میں رہ کر بھی تم پرانے زمانوں کی بات کر رہے ہو۔ دنیا چاند پر پہنچ چکی ہے اور تم ابھی تک برقعے اور پردے ہی کی باتیں لئے بیٹھے ہو، لیکن میرے تمام خدشات غلط نکلے۔ میں بھول گیا تھا کہ یہ شہداء کے ورثا کی جماعت ہے۔ یہ اسلام کی سربلندی کے لئے بیٹے بھائی اور خاوند قربان کرنے والی مومنات، طیبات، عابدات، زاہدات اور ساجدات بہنوں کی جماعت ہے۔ دین اسلام کی سربلندی کے لئے ان کے پیش کردہ خون کی وجہ سے ہی تو آج ہمارے سروں پر عزت و وقار اور رعب و دبدبہ کا تاج ہے۔ لہٰذا کتنے ہی بھائیوں، بہنوں اور ماؤں نے فون کر کے اپنے مثبت جذبات کا اظہار کیا اور کہا کہ اس مسئلہ کی طرف تو کبھی توجہ دلائی ہی نہیں گئی۔ ہم آج ہی سے ان شاء اللہ، شرعی پردے کے تقاضوں کو پورا کریں گے۔ آپ نے اس طرف توجہ دلا کر بہت بڑی نیکی اور احسان کیا ہے۔ ہم آپ کے لئے دعا گو ہیں۔

بہت سی سکول و کالج کی طالبات بہنوں نے اطلاع دی کہ انہوں نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ اب ٹوپی برقعہ پہن کر یا مکمل طور پر ساتر لباس پہن کر سکول، کالج یا اکیڈمی جایا کریں گی۔ اسی طرح بیرون ملک' خاص طور پر سعودی عرب سے بھی بہت سے احباب نے فون پر اس معاشرتی برائی کی نشاندہی پر حوصلہ افزائی کی اور کہا کہ اس کالم کو پمفلٹ کی صورت میں شائع کر کے عوام میں تقسیم کریں، خرچ ہم برداشت کریں گے۔ بہرحال میں سمجھتا ہوں کہ میری اس کوشش سے اگر ایک سو بہنیں بھی پردے کے مقدس حصار میں آ گئیں تو اللہ تعالیٰ قیامت

کے دن اس کے بدلے میں اجر سے محروم نہیں کرے گا۔ ان شاء اللہ

مذکورہ کالم پڑھنے کے بعد ہی کراچی سے ایک ماں جی کا فون آیا، وہ بہت پریشان تھیں، بتانے لگیں کہ میری تین بیٹیاں ہیں، دو تعلیم سے فارغ ہیں اور ایک ایم بی بی ایس کر رہی ہے، کسی کی شادی ابھی تک نہیں ہو سکی، ہماری کوئی لمبی چوڑی ڈیمانڈ بھی نہیں کہ جس کی وجہ سے تاخیر ہو رہی ہو۔ بس اتنی خواہش ہے کہ لڑکے عقیدہ کے اعتبار سے موحد ہوں، حلال روزی کمانے والے ہوں، اگرچہ تھوڑی ہی ہو یعنی بہت بڑے کاروبار کے مالک نہ بھی ہوں اور بہتر ہوگا کہ کراچی کے علاقہ کے ہوں۔ پھر ماں جی کی آواز بھرا گئی، وہ رندھی ہوئی آواز میں کہنے لگی: یہ بیٹیوں کے دکھ بھی عجیب ہوتے ہیں، آدمی کو زندہ قبر میں دفن کر دیتے ہیں، مجھے پتا نہیں کب بلاوا آ جائے، بس خواہش ہے کہ مرنے سے قبل کم از کم اپنی بیٹیوں کے ہاتھ پیلے کر جاؤں، پھر وہ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکیں اور مزید رونے لگیں، میں جو سوتے جاگتے کی کیفیت میں لیٹا ہوا تھا، میری نیند اڑ گئی اور ایک ایسے کرب کا، جو ماؤں کے دل چیر دیتا ہے، پتا چلا کہ جو بیٹیوں کے دوسرے گھر سدھار جانے کا ہوتا ہے، مجھ سے ان کا رونا سنا نہ گیا، میں نے کہا: آپ بے فکر رہیں، میں جو ہو سکا کروں گا۔ یوں ان کو تسلی دی، ارادہ تھا کہ کراچی کے مسئول محترم نوید قمر بھائی سے بات کروں گا کہ عقیدہ توحید کے حاملین کے متلاشیوں کے لئے اس مسئلہ میں بھی کچھ کریں۔

غور کریں! یہ ماں کیوں رو رہی ہے؟...... بلک رہی ہے...... سسک رہی ہے...... آہ و زاری کر رہی ہے...... فکر مند و پریشان ہو رہی ہے...... گن گن کر دن گزار رہی ہے...... صرف اس لئے کہ اس کی بچیوں کا وقت پر کہیں گھر بس جائے، ماں جو ہوئی، ماں بچیوں کی خوشیوں کے لئے قربان ہو جاتی ہے، ان کی ایک مسکان کے لئے، ایک مسکراہٹ و خوشی کے لئے ساری کائنات داؤ پر لگانے کے لئے تیار ہو جاتی ہے۔ جب وہ اپنی کلیوں کو مہکتا ہوا نہ دیکھ سکے، ننھی کونپلوں کو کھلتا ہوا نہ دیکھ سکے، جب ان کی کھلکھلاہٹیں، مسکراہٹیں، گنگناہٹیں اور چہچہاہٹیں نہ دیکھ سکے، تو یہ جذبات و قربانیوں کی دولت سے مالا مال بے چاری کیا کر سکتی

ہے؟ صرف رو ہی تو سکتی ہے' کہ یہی اس کے اختیار میں ہے۔ یہ ماں بھی اس لئے بلک رہی تھی کہ اس کی بچیوں کا گھر جلد از جلد بس جائے۔

آپ حیران ہوں گے کہ کچھ ایسے والدین بھی ہوتے ہیں کہ جو جان بوجھ کر خود اپنی بچیوں کی شادی لیٹ کرتے جاتے ہیں۔ میں تو ایسے والدین کو ظالم ہی کہوں گا۔ لیٹ کرنے کے لئے وہ طرح طرح کے عذر پیش کرتے ہیں، مثلاً لڑکی ابھی پڑھ رہی ہے، تعلیم مکمل ہوگی تو بات کریں گے...... برادری غیر ہے...... سید نہیں ہے...... لڑکا ٹھیک ہے نیک ہے لیکن اس کی آمدن تھوڑی ہے...... لڑکی نوکری کر رہی ہے، اس کی نوکری کی بنا پر ہی گھر چل رہا ہے، بعض مسائل ہیں، جب حل ہوں گے تو اس کو رخصت کر دیں گے...... فی الحال تو سارے گھر کا خرچہ اور چھوٹے بچوں کی پڑھائی وغیرہ کے اخراجات سب اس کی تنخواہ سے چل رہے ہیں...... ابھی تک ہم جہیز نہیں تیار کر سکے، جب وافر جہیز بن جائے گا تو سوچیں گے...... تین سال ہو گئے ہمیں کوئی مناسب اور مرضی کا رشتہ نہیں مل سکا' جونہی ایسا ہوا یہ فرض کندھوں سے اتار دیں گے...... جب ہمارے بیٹے کی شادی ہو گی اور گھر سنبھالنے والی بہو آ جائے گی تو اس کے فرض سے بھی فارغ ہو جائیں گے...... ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے؟ ۱۷ سال ہی تو ہے، ذرا سیانی ہو جائے...... ابھی اس کے بھائی نہیں مان رہے، جب اس کا بھائی دوبئی سے آئے گا تو بڑی شان و شوکت اور دھوم دھام سے شادی کریں گے...... ابھی جو لڑکا ہماری نظر میں ہے، وہ فلاں کورس کر رہا ہے یا فلاں ملک میں نوکری کے لئے گیا ہے، جب کورس یا تعلیم مکمل کر لے گا یا کچھ کما کر لائے گا تو اسے بیاہ کر لے جائے گا...... لڑکا اچھا ہے لیکن ہمارے سٹینس کا نہیں ہے...... ان سے فلاں کورس بھی کروانا ہے، فلاں ڈپلومہ بھی دلوانا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ سٹینس وغیرہ کے چکروں میں پھنس کر سعودی عرب جیسے مثالی ملک کی ۳۶ لاکھ بچیوں کے سروں میں چاندی آ رہی ہے اور وہ شادی کے انتظار میں بیٹھی بوڑھی ہو رہی ہیں۔

میرے پاس اپنے اخبار غزوہ کے ذمہ دار تین جوان بیٹھے ہیں جو شادی کے منتظر ہیں، لیکن لڑکی والے ٹالتے ہی جا رہے ہیں، ان سب کے مسائل ایک جیسے ہی ہیں۔ کتنے

بھائیوں کے نکاح بھی ہو جاتے ہیں، لیکن رخصتی میں مختلف بہانے آڑے آتے رہتے ہیں۔ ایک بھائی کا کہنا ہے کہ تین سال ہو گئے ہیں نکاح ہوئے لیکن رخصتی نہیں کی جا رہی، کیونکہ ابھی لڑکی کا جہیز تیار نہیں ہوا۔ لڑکا کہتا ہے: ہمارا تو جہیز کے لئے کسی قسم کا مطالبہ بھی نہیں ہے۔ ہم کہتے ہیں: ان رسموں کو چھوڑیں اور رخصتی کریں، لیکن اس طرح بغیر جہیز اور رسوم ورواج کے رخصتی سے ان کی برادری میں ناک کٹتی ہے، بس اپنی ناک اونچی کرنے کے لئے بچی کو گھر میں بٹھایا ہوا ہے اور رخصت نہیں کر رہے، اللہ جانے کب تک انتظار کا یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ یوں کتنے ہی جوان ہیں کہ جن کے نکاح ہو چکے ہیں اور وہ اپنے آپ کو دلہے سمجھتے رہتے ہیں مگر عرصہ بیت جاتا ہے اور وہ حقیقی دلہے نہیں بنتے۔ اسی گومگو میں بقول شاعر ان کا اور لڑکی والوں کا وہ حال ہو جاتا ہے کہ:

کچھ وہ کھچے کھچے رہے کچھ ہم تنے تنے سے
اسی کشمکش میں ٹوٹ گیا رشتہ چاہ کا

لڑکے والے اس بندھن کو توڑ کر کسی اور جگہ لڑکے کی نسبت قائم کر کے رشتہ کر دیتے ہیں اور لڑکی بیٹھی کی بیٹھی رہ جاتی ہے۔ ایسے ہی جاہلانہ وغیر شرعی طرز عمل کا شکار ہو کر کتنے ہی مظلوم دلہے اور مظلوم دلہنیں، خیالی دلہنیں اور خیالی دلہے بن کر زندگی گزار رہے ہیں۔ کبھی مظلوم دلہنوں پر بھی لکھوں گا، ان شاء اللہ۔ گمراہی جہالت اور دین سے دوری کی بنا پر لڑکے والے تو ٹال مٹول کریں، لیکن لڑکی والوں کی طرف سے یہ رویہ، سراسر نادانی ناسمجھی اور عاقبت نااندیشی کا ثبوت ہے۔

اے محترم والدین! آپ کیوں بچیوں کی شادی لیٹ کرتے ہیں؟ کیا آپ نے اس کے نقصانات پر کبھی غور کیا ہے؟...... آپ ان کو گھر میں بٹھا کر بیل، بھینس اور سانڈ کی طرح پال رہے ہیں۔ کیا آپ نے اس کو ساری زندگی اپنے گھر ہی میں رکھنا ہے؟ یہ پرائے گھر کی امانت ہے، آپ کو پتا ہے کہ اللہ کریم نے ایک خاص عمر اور وقت مقرر کر دیا ہے کہ جب وہ آ جائے تو فوراً بچیوں کی شادی کر دینی چاہئے، اس عمر میں اللہ نے ان میں ایک کشش اور وقار

رکھا ہے کہ جو اپنی بیٹی بنانے کے لئے دیکھتا ہے اس کو اچھی اور بھلی لگتی ہیں، پیاری لگتی ہیں اور وہ اس کو اپنے گھر کی رونق بنانے کے لئے آمادگی اور چاہت کا اظہار کرتا ہے، لیکن جب عمر بڑھتی ہے، شادی کی حقیقی عمر ڈھلنے لگتی ہے اور آپ لوگ اسے گھر بٹھا کر لڑکی سے عورت بنا دیتے ہیں' تو لوگ بہانے بہانے سے پہلو بچاتے اور رد کر کے چلتے بنتے ہیں۔ جہیز کے چکر میں نہ آئیں، رکھ رکھاؤ، برادری اور ناک رکھنے کے چکروں سے نکلیں، یہ زمانہ جاہلیت کی نشانیاں ہیں۔ کتنی جوان لڑکیوں کو دیکھا ہے کہ جب ان کے ہاں بچی جنم لیتی ہے تو وہ اپنے جہیز کا سامان بستر کپڑے برتن فرنیچر زیور وغیرہ سنبھال کر رکھ لیتی ہے' کہ میں اپنی اس چھوٹی سی بچی کو جب وہ جوان ہوگی تو جہیز میں دوں گی، عمر بیت جاتی ہے اس گردش ایام میں اور پھر اس کی بچی شادی کے بعد اپنی بچی کے لئے یہی سلسلہ شروع کر دیتی ہے۔

ایسے بہانوں سے بٹھانے کے بعد بچیوں کے بالوں میں چاندی اتر آتی ہے لیکن یہ بچیاں چونکہ گونگی مخلوق ہیں، یہ خود تو منہ سے نہ کہیں گی کہ ہماری شادی کریں کہ اس طرح ان پر انگلیاں اٹھنے کا خدشہ ہے، حالانکہ یہ مطالبہ ان کا شرعی حق ہے، لیکن اگر وہ منہ سے نہیں کہتیں تو آپ ہی خیال کریں، ان کو پڑھائیں آخرت سنوارنے اور اولاد پالنے کے لئے نہ کہ نوکری کے لئے کہ دفتروں میں کمینے لوگوں کی چاکری کرتی پھرے۔ یاد رکھیں! جونہی بچی دس سال کی ہو جائے تو اس کے متعلق سوچنا شروع کر دیں، پھر اس کی بھرپور گھریلو معاشرتی دینی و دنیاوی تربیت کریں، جب اس کی عمر ۱۶ سال ہو جائے تو فکر کریں کہ اس کی شادی کیوں نہیں ہو رہی؟ یہی وہ عمر ہوتی ہے جس میں اللہ کریم نے دونوں اصناف کے لئے کشش و جاذبیت رکھی ہوتی ہے۔ اس عمر میں بچوں اور بچیوں کو والدین کی بھرپور تربیت و رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے، اسی عمر ہی میں غلط رہنمائی سے گمراہ ہو کر جانبین بھٹک جاتے ہیں۔ شادی کو لیٹ کرنے کے بہت سے معاشرتی نقصانات بھی ہیں، ایسے مواقع بھی آتے ہیں کہ والدین دنیا والوں کے سامنے سر اٹھانے اور نظریں ملانے کے قابل بھی نہیں رہتے۔ پھر پچھتاتے ہیں، روتے اور بلکتے ہیں' مرنے کے لئے جگہ ڈھونڈتے ہیں، بچیوں کی عصمت کی

صاف شفاف اور سفید چادر پر بدنامی کا دھبہ لگ جاتا ہے جو پاکیزہ سیرتی کے باوجود کبھی نہیں دھلتا، یہ ہمارا معاشرتی روگ ہے۔

محترم والدین!...... دیکھیں اور غور کریں، اگر غافل ہیں تو ہوش میں آئیں اور اگر بچی بالغ ہوگئی ہے تو جہیز وغیرہ کے بہانے بنا کر اس کو گھر نہ بٹھائے رکھیں، بلکہ فوراً اس کا گھر بسا دیں' ورنہ کوئی نا خوشگوار سانحہ کسی بھی وقت رونما ہوسکتا ہے، بچیوں کو بالغ ہونے کے بعد گھر میں بٹھائے رکھنا بہت بڑا گناہ ہے..... دیکھیں اگر آپ نے وقت پر شادی نہ کی تو یہ بچیاں دل میں آپ سے نفرت کریں گی، معاشرہ انگلیاں اٹھائے گا، اور یہ بھی یاد رکھیں کہ اولاد کے جوان ہو جانے کے بعد اگر ان کی شادی وقت پر نہ کی جا سکے تو ان کے گناہوں کے ذمہ دار والدین بھی ہوں گے، قیامت کے دن یہی بچیاں جب آپ کا گریبان پکڑ کر اللہ کے دربار میں یہ صدا بلند کریں گی کہ "اے اللہ! ہمارے گناہوں کے ذمہ دار یہ ہیں، ہمیں کچھ نہ کہہ، عذاب ان اصل مجرموں کو دے"......اس وقت آپ اپنے آپ کو کیسے بچا سکیں گے؟ کیونکہ وہاں کسی کی سفارش نہیں چلے گی، مجرم کو سزا اسی وقت دی جائے گی، دنیا میں بدنامی کی سزا اور آخرت میں جہنم کا عذاب کس نے برداشت کرنا ہے؟ سوچ لیں!!!

سب کی خادمہ

گزشتہ ماہ اپنی بہوؤں کو طلاق دینے والے کتنے ہی خاندانوں نے مجھ سے مشورہ طلب کیا۔ اس مسئلہ میں نہ تو میرا کوئی زیادہ تجربہ ہے نہ ہی میں کوئی جہاں دیدہ بابا ہوں۔ یہ صرف اللہ کی رحمت ہے کہ اس نے لوگوں کے دلوں میں میری عزت اور محبت ڈالی ہے اور وہ مجھ سے مشورہ لیتے ہیں۔ بہرحال میں اپنی دانست کے مطابق چار خاندانوں کو اس بات پر قائل کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ وہ طلاق نہ دیں بلکہ ان کو دعوت دے کر اور سمجھا کر سیدھے راستے پر لائیں۔

مقام غور ہے کہ ان میں چار خواتین کے کیس تو ایسے تھے کہ خود میرے دل میں یہ خیال ابھرا کہ اگر میرے بس میں ہوتا تو فوراً ان کو طلاق دے کر فارغ کر دیتا اور ذہنی تکلیف سے نجات پا لیتا۔ لیکن پھر ٹھنڈے دل سے غور کرنے پر پتا چلا کہ طلاق دے دینا کسی مسئلہ کا کوئی پائیدار حل نہیں۔ بلکہ یہ تو بہت سی مزید جان لیوا بیماریوں اور پریشانیوں کا سبب بنتا ہے..... ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہاں تک نوبت پہنچتی کیوں ہے؟ لوگوں کو طلاق دینے میں ہی اپنا چھٹکارہ نظر آتا ہے۔ اس کی جہاں اور بہت سی وجوہات ہیں وہاں ایک بڑی وجہ وہ بھی ہے جس کو امام کائناتﷺ نے چودہ سو سال قبل بتا دیا تھا جس کو کفران نعمت کہا جاتا ہے۔ یعنی عورت ہمیشہ یکدم اپنے شریک سفر کی قربانیوں کو جھٹلا دیتی ہے۔ اس کے احسانات کا اعتراف کرنے کی بجائے یکسر انکار کر دیتی ہے۔ اس کو ظالم اور خود کو فوراً مظلوم بنا لیتی ہے۔

اس کی مثال پچھلے ماہ میرے سامنے اس وقت آئی جب ایک بہن میرے گھر والوں کو

بتا رہی تھی کہ فلاں چودھریوں کی بیگم نے مجھے دوبارہ اپنے گھر ملازمت کے لیے بلایا تھا اور بسکٹوں کے ساتھ چائے پلاتے ہوئے کہا تھا:

لاڈو! جب سے تم نے ہمارے گھر کی صفائی چھوڑی ہے کئی دوسری عورتیں آئی ہیں لیکن کسی سے گھر اس طرح صاف ستھرا نہیں ہو سکا جس طرح تم کرتی تھی۔ تم تو باتھ روم لیٹرین کو بھی ایسے چمکا دیتی تھی کہ اس میں اپنا عکس نظر آنے لگتا تھا۔ جس طرح تم فرش چمکاتی تھی' کپڑے دھو کر نئے بنا دیتی تھی' گملوں اور باغیچوں کی باغبانی و گوڈی کرتی تھی...... اب تو تمہاری یادیں ہی رہ گئی ہیں۔ صاحب بھی کہتے ہیں کہ لاڈو جس طرح میری گاڑی دھو کر چمکاتی تھی اور لش پش کر دیتی تھی اس طرح تو سروس اسٹیشن والے بھی نہیں کر پاتے۔ بچے یاد کر کے کہتے ہیں کہ اب انہیں سکول نہیں جانا' اس لیے کہ لاڈو اب ہمیں چھوڑنے نہیں جاتی۔ زبردستی ڈرا دھمکا کر بھیجتے ہیں۔ خود میرے سر کی مالش تمہارے جانے کے بعد آج تک کسی نے نہیں کی۔ تمہارے ہاتھوں کے لمس کے نشے کی میں عادی ہو چکی ہوں۔ اب سر بھاری بھاری رہتا ہے۔ اس طرح اور بھی کتنے کام تمہارے جانے کے بعد چوپٹ پڑے ہیں۔ تم دوبارہ کام پر آ جاؤ ہم تمہاری تنخواہ بھی آٹھ سو سے ہزار کر دیں گے اور میں نے تو تمہارے لیے اپنے کچھ (استعمال شدہ پرانے) سوٹ بھی نکال رکھے ہیں' وہ بھی لے لینا۔

یہ بہن گھر والوں کو نہایت فخر سے بتا رہی تھی کہ ان کے سارے گھر کا نظام میں ہی سنبھالتی تھی۔ اب ان کو میری بہت کمی محسوس ہو رہی ہے۔ نئی ملازمہ و خادمہ بھی آتی ہے لیکن وہ میرے جتنا کام نہیں کر پاتی اور گھر والے پریشان رہتے ہیں۔ پھر کچھ دیر توقف کے بعد کہنے لگی: کیا کروں؟ کتنا کام کروں اور اگر کروں بھی تو کب تک...... اب مجھ سے زیادہ کام نہیں ہوتا' جوڑوں میں درد رہنے لگا ہے' بلڈ پریشر کا مرض بھی لگ گیا ہے...... اور ساتھ ہی جسم پر سوزش ہونے لگی ہے' معدہ خراب رہتا ہے...... وغیرہ وغیرہ۔

پیارے قارئین!...... آپ سوچ رہے ہوں گے کہ اس بہن کو یہ سب جتن کیوں کرنے پڑ رہے ہیں؟ وہ غلامی، نوکرانی اور خادمہ کی سی حقیرانہ ذلیلانہ زندگی گزارنے پر کیوں مجبور ہے؟ تو ہاں میں اسی طرف آ رہا ہوں۔ اس بہن کا گھر نہایت شان وشوکت سے آباد تھا۔ ہر وقت فریج میں پھل سبزیاں شربت گوشت وغیرہ بھرے رہتے تھے۔ اس کا شوہر اسے بہت چاہتا تھا۔ اس لیے اسی کا نام ''لاڈو'' پڑ چکا تھا۔ اپنے میاں کے دم خم سے اس کے بہت نخرے تھے۔ نوکر تھے جو گھر پر ہی ہر ضرورت کی چیز پہنچا دیتے تھے۔ جہاں فراوانیاں اور خوشحالیاں تھیں وہیں گھر میں وی سی آر بھی تھا اور ہندوستانی فلموں کا دور بھی چل جاتا تھا۔ ان فلموں نے اس کے خاوند کی محبت میں قید دل کو آزاد کیا اور پھر روز بروز حقوق کا مسئلہ پیدا ہونے لگا۔ آزاد خیال اور شتر بے مہار آزادی آ گئی۔ کسی اور سے آنکھیں چار ہونے کی وجہ سے خاوند میں نقص نظر آنے لگے اور دل اچاٹ رہنے لگا۔ یہی بہن اب جب اپنے جیون ساتھی سے لڑتی تو ناشکری کرتے طعنہ دیتی کہ تمہارے گھر آ کر میری تو قسمت ہی پھوٹ گئی۔ میں نے تمہارے گھر دیکھا ہی کیا ہے۔ زندگی محرومیوں ذلتوں اور حسرتوں میں گزر رہی ہے۔ میں نے آج تک تمہارے گھر میں سکون چین راحت و آرام اور کشادگی و فراخی دیکھی ہی نہیں۔

جیون ساتھی کی فراہم کردہ تمام آسائشوں راحتوں کی ناشکری کرنے کے نتیجہ میں روز روز لڑائی جھگڑے ہونے لگے۔ اس نے کسی کی طرف سے دکھائے گئے سبز باغ کے نتیجے میں طلاق کا مطالبہ کیا...... حتیٰ کہ طلاق ہوگئی اور چند ماہ میں ہی اسے احساس ہوگیا کہ وہ نیلے آسمان کے نیچے تن تنہا ہے' کوئی اس کے ساتھ غمگسار و مونس نہیں۔ لہٰذا عافیت اسی میں نظر آئی کہ وہ ایک بڑے گھرانے کی نوکرانی و خادمہ بن جائے۔ یوں اب وہ لاڈو نہیں رہی' کیونکہ اسے لاڈ لڈانے والا جو نہیں رہا' بلکہ اب لڈو کے دانے کی مانند ہر کوئی اس کی زندگی سے کھیل رہا تھا' اس سے خدمت لے رہا تھا۔ اس نے ایک کی خدمت سے انکار کیا تو سب کی خادمہ بننے کا اور وہ بھی ذلیلانہ انداز میں حقیرانہ خادمہ بننے کا طوق گلے میں ڈالنا پڑا اور اب یہی

لاڈو مختلف بیماریوں کو سینے سے لگائے سسکتی بلکتی ڈرتی مرتی زندگی کے دن پورے کر رہی ہے۔

ایسے مواقع پر بچی کے لیے سب سے بہتر سہارا اور راہبر ماں ہوتی ہے لیکن دیکھنے میں آیا ہے کہ اگر بیٹی ناراض ہو کر گھر آ جائے تو وہ اسے سمجھانے اور واپس بھیجنے کی بجائے کہتی ہے: ہمارے پاس اس کے لیے دو وقت کی روٹی بھی ہے اور کپڑا بھی۔ اکثر نادان و ناسمجھ مائیں لڑکیوں کو یہ سمجھانے کی بجائے کہ خاوند کی تابعداری فرمانبرداری کس طرح کرنی ہے ان کو الٹے سیدھے سبق پڑھاتی ہیں کہ تم نے اس طرح خاوند کو مٹھی میں کرنا ہے۔ اس طرح اس کے خاندان والوں سے اس کو دور رکھنا ہے۔ الگ گھر کا مطالبہ کر کے اس کے ماں باپ کے ساتھ رہنے سے انکار کرنا ہے۔ اس کی تنخواہ اس کی ماں کے پاس جانے کی بجائے اپنے قبضہ میں کیسے کرنی ہے وغیرہ وغیرہ۔ ایسی نادان و جاہل مائیں اکثر بچیوں کے گھر اجاڑنے کا باعث بنتی ہیں۔ وہ ان کی محبت نہیں بلکہ نادان دشمن ثابت ہوتی ہیں۔

اے بہن! اے اللہ کی بندی!...... کبھی تو نے سوچا ہے کہ تیرا سرتاج کس طرح نوکری چاکری کر کے لوگوں کی جھڑکیاں اور کڑوی کسیلی باتیں سن کر' اپنی عزت نفس کو مار کر سارا دن مشین کی طرح محنت مزدوری میں لگا رہتا ہے اور...... شام کو بے قراری کے عالم میں گھونسلوں میں لوٹنے والے پرندوں کی طرح اڑ کر آشیانے میں تیرے پاس آ جاتا ہے۔ تیری اور تیرے بچوں کی دیکھ بھال و حفاظت کرتا ہے۔ ڈاکٹروں کے پاس لیے پھرتا ہے۔ کپڑے جوتے' کھانا پینا' گھر اور گھر کی تمام ضروریات اپنی راحت جان کے لیے جان توڑ کر مہیا کرتا ہے۔ وہ خود بیماریوں سے لڑتا ہے' حادثات کا شکار ہوتا ہے پھر بھی ہمت نہیں ہارتا۔ زندگی کے آخری دموں تک تمہیں ہنساتا ہے کھلاتا ہے...... تمہارے لیے اتنا زادِ سفر مہیا کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ مر بھی جائے تو تمہیں پریشانی نہ اٹھانی پڑے...... کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے...... اور تو ہے کہ اس کی جائز خواہشات مثلاً پردہ' نماز' روزہ' بچوں کی تربیت' گھر کی صفائی وغیرہ سے لاپروائی کرتی ہے۔ بلکہ تو اس کو وفاؤں کا بدلہ وفاؤں سے دینے کی بجائے جفاؤں اور ناشکریوں اور کفران نعمت کی شکل میں دیتی ہے' اور کہتی ہے کہ میں نے آج

تک تمہارے پاس سکھ کا سانس لیا ہی نہیں۔ ڈر جا اپنے اس ظالمانہ رویے سے۔ تو اپنی وفائیں اپنی ادائیں' اپنی تمنائیں اور آرزوئیں اس پر نچھاور کر دے۔ یاد رکھ!...... اگر یہ خوش ہے تو تم بھی خوش ہو۔ ہاں یاد رکھ...... اگر اسے کچھ ہو گیا تو جیون کی اس ندی میں کون تمہارے پتوار کو سنبھالا دے گا؟!! سب منہ موڑ کر تجھے بے لق و دق صحرا میں چھوڑ کر چلتے بنیں گے۔

اگر تو اس عارضی زندگی کے اپنے شریک سفر کو ناراض رکھے گی تو پھر تجھ سے اللہ بھی ناراض' اس کا رسولؐ بھی ناراض ہو جائیں گے اور پھر خالق کائنات ہمیشہ کے نہ ختم ہونے والے جیون کے سفر کے لیے اسے نیا جنت کا ہم سفر عطا فرمائیں گے اور تو اس نافرمانی کی وجہ سے ناکام و نامراد رہ جائے گی۔ لہٰذا آج ہی ایک صرف ایک کی خادمہ بن جا' سب عزیز و اقارب' رشتہ دار' خاندان و برادری والے سب تیرے خادم بن جائیں گے۔ تیری راہوں میں عزت سے آنکھیں بچھائیں گے۔ بصورت دیگر تمہیں...... کئی ایک کی خادمہ بننا پڑے گا...... اور ایک اچھوت کی طرح ناکام زندگی گزار کر بے نام ونشان اس دنیا کی دلدل میں دب کر اپنا وجود مٹانا پڑے گا۔

داڑھی اور رومانٹک بیوی

خوبرو ماڈرن دوشیزہ نہایت پیار بھرے لہجے میں اپنے شوہر کو مخاطب کر کے بولی:
جان! تم کتنے سویٹ (Sweet) ہو' کتنے کیوٹ (Cute) ہو...... کتنے اچھے اور پیارے ہو...... کتنے ہینڈسم (Handsome) اور سڈول ہو...... کس قدر خوش گفتار اور خوش کردار ہو...... اور کتنے خوش شکل اور روشن خیال ہو...... لیکن...... لیکن...... کیا ہی اچھا ہو اگر تم مہذب بھی بن جاؤ...... یہ ایک داڑھی ہے کہ جو تم نے اس قدر بے تحاشا بڑھا رکھی ہے۔ جس نے تمہارے روشن چہرے اور گلاب سے رخساروں کو ڈھانپ لیا ہے۔ میں اس کے رکھنے پر نہ اس کی مخالفت کرتی ہوں اور نہ روکتی ہوں...... ایسا کر کے میں نے کافر تھوڑی ہونا ہے!! بس اتنا عرض کرتی ہوں...... کہ...... اس کو ذرا ''مہذب'' بنا کر رکھیں...... لاریب کہ داڑھی مسلمان کا ایک علامتی نشان ہے...... مگر...... اس کو بنا سنوار کر صرف اس قدر رکھنا چاہیے کہ دور سے دیکھنے والا یہ محسوس کر سکے کہ آنے والے کے چہرے پر ''کچھ'' ہے...... نہ کہ یہ جتنی بڑھتی جائے اس کو اس قدر ہی بڑھنے اور پھیلنے کا موقعہ دے کر بڑھاتا چلا جائے...... بلکہ آج کل کے مہذب اور ماڈرن معاشرے میں تو پرکشش اور مہذب بن کر رہنا چاہیے۔ اس لیے جانِ من......! اپنی تمام تر خوبیوں کے ساتھ اپنی داڑھی کو بھی مہذب اور خوبصورت بنا کر رکھیں۔

محترم بہنو اور بھائیو!...... یہ ہیں آج کل کے صلیبی نصاب تعلیم کی پروردہ اور تعلیم یافتہ ایک ماڈرن بیوی کے ماڈرن خیالات' جو وہ صلیبی و یہودی اور ہندووانہ کلچر سے متاثر ہو

کر اپنے دل و دماغ میں بٹھائے بیٹھی ہے۔ اس کی مخالفت بھی نہیں کرتی کہ مسلمانوں کے گھر پیدا ہوئی ہے۔ اس نے رہنا سہنا اور جینا مرنا بھی یہیں ہے۔ کھل کر مخالفت بھی نہیں کر سکتی کہ جس طرح ہمارے دوست بھائی سلیم مغل آف لاہور کی مخالفت دورہ ایران کے دوران ایک ماڈرن ایرانی نے کی۔ اس نے مشہد میں اس کی ''مہذب شدہ'' داڑھی کو دیکھ کر بھی نہایت خلوص بھرے انداز میں غصے سے دانت پیستے ہوئے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ماچس نکال کر ان کے سامنے پیش کر دی۔ وہ اُردو زبان نہ جاننے کے سبب غصہ سے کانپتی آواز اور جذبات سے لرزتے ہاتھوں سے اس کی داڑھی کی طرف اشارہ کر کے فارسی میں کہنے لگا ''برادرم!...... آتش...... آتش...... آتش ...'' اور اپنے ہاتھوں سے ماچس کی تیلی جلا کر داڑھی کی طرف بڑھاتے ہوئے اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگا: ''اگر تمہارے پاس ماچس نہیں تو یہ مجھ سے لے لو اور اس کو فوراً آگ لگا کر جلا دو۔ نعوذ بالله من ذالك الهفوات۔

لیکن اب جدید تعلیم کے تیزاب نے نئی نسل اور خاص طور پر صنف نازک کو اس قبیح سوچ وفکر اور عملی اظہار پر آمادہ کر کے یہ جرأت بخش دی ہے کہ وہ داڑھی جیسی سنت سے برأت کا ہر ممکنہ عملی اظہار کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس میں موجودہ میڈیا خاص طور پر ٹی وی، ڈش، کیبل، انٹرنیٹ وغیرہ نے اسلام اور اس کے حاملین کے خلاف خصوصی کردار ادا کیا ہے۔

ایک مثال آپ کے سامنے رکھتا ہوں، اس کی روشنی میں اسلامی اقدار اور اسلامی شعائر سے دوری و بیزاری کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ ہمارے ایک بھائی جو پاکستان کی ایک بہت بڑی کھاد فیکٹری میں کام کرتے تھے، کبھی چہرہ سنت رسول ﷺ کی ضوفشانیوں سے چمکتا دمکتا اور پر رونق تھا، چہرہ نہایت پر وقار و وجاہت و وقار کا آئینہ دار تھا لیکن آج کل وہ ممی ڈیڈی ٹائپ کلین شیو دیسی بابو بنے نظر آتے ہیں۔ بار بار دریافت کرنے پر ان کو اپنی حالیہ تبدیلی کی وضاحت نہ چاہتے ہوئے کرنی ہی پڑی، آپ ان کی زبان سے سنیں:

میں لوگوں میں معزز و محترم تھا، باوقار و بااعتبار تھا، لیکن اپنی بیوی کا ہمیشہ ہی سے

معتوب تھا‘ نہ کہ محبوب‘ میری بیوی نے میری سچل‘ نرم و ملائم‘ سنہری اور خوبصورت داڑھی کو ہمیشہ حقارت کی نظر سے دیکھا اور بیزاری کا اظہار کیا۔ وہ اکثر مجھے کہتی: ڈارلنگ! نارمل (Normal) ہو جاؤ‘ (یعنی داڑھی صاف کروا دو۔) لیکن میں کبھی Normal نہ ہوا۔ ایک دن میں نے زچ ہو کر ایک شرط لگا دی کہ تم نماز نہیں پڑھتی‘ اگر تم ایک سال تک بلا ناغہ مسلسل عین وقت پر نمازیں پڑھو تو میں تمہاری خواہش پوری کر دوں گا۔ اس نے شرط قبول کر لی اور عمل شروع کر دیا۔ اب کیا تھا......!! وہ دن میں پانچ مرتبہ وضو کرتی اور باقاعدہ نماز پڑھتی۔ مجھے بہت خوشی ہوئی کیونکہ یہ شرط عائد کرنے میں میری دلی تمنا بھی یہ تھی کہ یوں یہ نمازی بن جائے گی‘ نماز اس پر اثر کرے گی اور اس کے خیالات بدل جائیں گے‘ وہ نیک پارسا اور اللہ کی بندی بن جائے گی اور اپنی یہ غلط و غیر شرعی ضد بھی چھوڑ دے گی۔ یوں پورے ایک برس تک میری بیوی باقاعدگی سے فجر سے لے کر عشاء تک روزانہ پانچوں نمازیں پڑھتی رہی‘ جس دن ایک سال کی نمازیں مکمل ہوئیں اسی دن مجھے اپنی شرط یاد کرواتے ہوئے کہنے لگی: جانِ من!...... میں نے تمہاری شرط پوری کر دی‘ اب آپ کی باری ہے۔ لہٰذا مجبوراً زبان کا پاس کرتے ہوئے اور وعدے کا ایفاء کرتے ہوئے مجھے شرط کے دوسرے حصے کو پورا کرنا پڑا اور پھر میں نے داڑھی منڈوا دی۔ تب سے لے کر آج تلک میں یونہی داڑھی منڈواتا چلا آ رہا ہوں۔

یہ نمازیں جو اس نے شرط کے طور پر پڑھیں...... اس کے لیے مرنے کے بعد وبالِ جان بن جائیں گی۔ بے شک نماز برے کاموں اور فحاشیوں سے روکتی ہے لیکن اس کی نماز تو اسے لے ڈوبی‘ جو اللہ و رسول کی مخالفت کے لیے پڑھی گئی‘ اور جس کا مقصد صرف اتنا تھا کہ محبوب کائنات ﷺ کی محبوب سنت کو قتل کر دیا جائے...... آج ایسا دور آ گیا ہے کہ ہر مومن و محبِ رسول کو شادی سے قبل یہ دعا کرنی چاہیے:

اے کائنات کے پروردگار' اے علام الغیوب..... اے ستار قہار..... اے رحمٰن و رحیم مولا..... مجھے اپنے ساتھ' اپنے رسول کریمؐ اور ان کی اداؤں سے نہ صرف پیار کرنے والی بلکہ ان پر اپنی آن بان شان اور جان قربان کرنے والی شریک حیات اور جیون ساتھی عطا فرما۔ (آمین)

میں اپنے اس کالم کو اس عظیم خاتون کے موتیوں جیسے قیمتی الفاظ پر ختم کروں گا کہ جس کا خاوند موٹر سائیکل پر سفر کر کے روزانہ گھر آتا۔ ایک دن اس نے اپنے سرتاج کی طرف غور سے دیکھا اور تشویش و پریشانی میں ڈوبے متفکر لہجے میں کہا: میرے سرتاج!...... میں کیا دیکھ رہی ہوں؟ آپ کی داڑھی آج کچھ کم اور چھوٹی کیوں محسوس ہو رہی ہے؟...... کہیں!..... اس کے ساتھ کوئی ''ظلم'' تو نہیں کر بیٹھے۔ خاوند نے فخر سے یہ کہتے ہوئے جواب دیا: بیوی ہو تو آپ جیسی ورنہ نہ ہی ہو' اللہ کی بندی! سردیوں کا موسم ہے' روزانہ موٹر سائیکل' سر پر مفلر باندھ کر چلاتا ہوں اور اور یہاں تک پہنچتا ہوں' کپڑے (مفلر) سے سر پر دباؤ کی وجہ سے داڑھی دب گئی ہے' میں نے ایسا کوئی جرم نہیں کیا کہ اس کو قتل' زخمی یا کسی بھی طرح سے مجروح کیا ہو' تم بالکل بے فکر رہو اور پھر جیب سے کنگھی نکالی اور کنگھی کر کے دکھایا' تو وہ اللہ کی نیک بندی یہ دیکھ کر خوش ہوئی اور بولی:

اللہ آپ کو اجر دے۔ میں تو ڈر گئی تھی کہ کہیں آپ بھی شیطانی تہذیب کے بہکاوے میں آ کر کچھ کر نہ گئے ہوں۔ میں آپ کی بیوی اور خادمہ ہوں' مجھے اس پر فخر ہے۔ لیکن یاد رکھیں کہ یہ جیون یہ زندگی ایک مختصر سی کہانی ہے۔ یہ بہتی ہوئی ندیا کے پانی کی مانند ہے' جس کو کبھی قرار نہیں۔ کسی نے ہمیشہ یہاں پر نہیں رہنا' یہ دنیا تو ایک عارضی سرائے ہے' مسافر یہاں کچھ دیر کے لیے ٹھہرتے ہیں' اور آگے روانہ ہو جاتے ہیں۔ ہم دونوں بھی اسی عارضی دنیا کے مسافر ہیں کہ جن کے پاس زادِ سفر بھی نہیں ہے۔ اس لیے اس عارضی فانی' خود غرض اور حقیر دنیا کی مصنوعی' دلفریب اور دھوکے بھری رنگینیوں میں کھو کر ہم اس کے رنگ میں نہ

رنگے جائیں بلکہ اُس کے رنگ میں رنگے جائیں کہ جس کی نشاندہی قرآن نے (صبغۃ اللہ کے الفاظ میں) کی ہے اور پھر اس کی وضاحت و تشریح ہمارے پیارے نبیؐ نے اپنی سیرت کی شکل میں عملی طور پر ہمارے سامنے رکھ دی ہے۔ ہم دنیا کی مصنوعی اور دھوکے بھری رنگینیوں کے فریب سے بچ کر کیوں نہ اپنے جیون کی کہانی میں حقیقی رنگ بھریں اور اس کو مکمل کر کے سرخرو ہو کر جیون بخشنے والے بادشاہ کے دربار میں پہنچیں' اور اس کے منظور نظر و مقرب بن کر اپنی خوشیوں کی جنت بسائیں' کہ جسے کبھی بھی کوئی ہم سے نہ چھین سکے گا۔ بادشاہ حقیقی کی اس بخشی گئی بادشاہت و جنت کی صبحیں و شامیں کبھی ختم نہ ہوں اور ہمیشہ ہمیشہ ہم اس کے بادشاہ و ملکہ' راجہ و رانی بنے رہیں۔

آج ہماری بہنوں' بیٹیوں اور بیویوں کو ایسی ہی پاکیزہ سوچوں کے دھاروں پر اپنی فکروں کو دوڑانے کی ضرورت ہے۔ ایسے ہی عملی روشن کردار کو پیش کر کے دوسروں کے لیے خاص طور پر جوان ہوتی بچیوں کے لیے نمونہ و مثال بننے کی ضرورت ہے۔ ایسی ہی مومنات کو اللہ کریم اور اس کا رسول پسند کرتا ہے اور جنتوں کی حوروں کی سردار و ملکہ بننے کے اعزاز کی خوشخبری سناتا ہے۔ آپ حوروں کی ملکہ بننے کے لیے اپنے خاوند کو محبوب کائناتؐ کی اس ادا پر عمل پیرا ہونے پر آمادہ کیجیے اور اجر لیجیے۔

آپ کیسا بچہ چاہتے ہیں؟

بچہ اس کونپل کی طرح ہے جو ابھی نوزائیدہ ہو۔ اس بند کلی کی طرح ہے جو کھلنے کے لیے بے تاب ہو۔ کھلنے کے اس دورانیہ میں اس پر آب و ہوا اور ماحول مسلسل اثر انداز ہوتے ہیں۔ بالکل اسی طرح بچوں پر بھی ان کے ماحول اور سوسائٹی کا گہرا اثر پڑتا ہے۔ اردگرد کے ماحول کا اس کے دل و دماغ پر ایسا گہرا اثر ہوتا ہے جو آخری عمر یعنی بڑھاپے تک ختم نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ بچہ کے نام کا بھی اس کے مستقبل کی زندگی اور اس کی شخصیت پر اثر پڑتا ہے۔ لیکن ان تمام باتوں سے قطع نظر ہم اپنے بچوں کو ہندو و صلیبی تہذیب و تمدن کا ایسا فیڈر پلاتے ہیں کہ اس کے اثرات ہمیشہ کے لیے اس کی نس نس میں رچ بس جاتے ہیں۔ ہمیں اس کا علم بھی ہوجائے تو ہم اپنا طرزِ عمل درست کرنے کی بجائے اس مسئلہ کو نظر انداز کرتے ہیں' بلکہ اپنی اس ضد اور ہٹ دھرمی پر قائم رہتے ہیں کہ موجودہ حالات میں یہی طرزِ عمل درست ہے۔

راقم ڈاکٹر کامران صاحب آف چلڈرن ہسپتال شاہدرہ (برکت ٹاؤن) کے پاس اپنے بیٹے کو چیک کروانے گیا' وہاں موجود خاتون سے ڈاکٹر نے نسخہ پر درج کرنے کے لیے مریض بچہ کا نام پوچھا: ''بی بی! بچے کا نام کیا ہے؟'' بی بی نے بغیر کسی ہچکچاہٹ اور نہایت مسرور لہجے میں مسکرا کر کہا: ''ساجن!'' ڈاکٹر نے حیرانی اور بے یقینی سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے دریافت کیا: ''ساجن؟'' ''جی ڈاکٹر صاحب! ساجن نام ہے اس کا۔'' بی بی نے اطمینان سے جواب دیا۔ ڈاکٹر نے ناصحانہ انداز میں کہا: ''بی بی! اسے بیٹا بنا' ساجن نہ بنا' ایسا نہ ہو کہ کل کسی سجنی کے پیچھے لگ کر تجھے رلاتا پھرے' اور اس کے ساتھ کہیں چلتا بنے جبکہ

تو دیکھتی رہ جائے۔'' لیکن خاتون شرمندہ ہونے کی بجائے مسرور اور خوشیوں سے معمور تھی۔ جیسے اس نے کوئی کارنامہ انجام دیا ہو۔ دراصل اس نے کسی ہندی فلم میں ایسا دیکھ لیا اور اپنے بیٹے کا نام رکھ دیا۔

ذرا غور کریں! بڑا ہونے پر اس کی ماں اس کو اس طرح پکارے گی ''میرے ساجن'' اور اسی طرح اس کی بہن اور بیٹی بھی کہے گی: ''میرے ساجن''۔ کس قدر بیہودگی ہے یہ!! ایک احمق نے اپنی لختِ جگر نورِ نظر کا نام ''ریما'' رکھ دیا۔ کیا ایسے نام مستقبل میں مسائل کھڑے نہ کریں گے؟ آپ اس کا اندازہ اس بات سے لگائیں اور جواب دیں کہ آپ کی بچی کو اس کا نام خدیجہ' عائشہ یا فاطمہ لے کر جس احترام و سنجیدگی سے بلایا جائے گا کیا اسی ادب و احترام اور تقدس کی فضاء میں ریما' بابرہ وغیرہ کے نام سے بھی آپ کی بچی کو پکارا جاسکتا ہے؟ یقیناً نہیں!

پچھلے دنوں راقم بھائی چوک میں خلیفہ اشرف جراح سے ہڈی پر آنے والی ضرب پر پٹی کروا رہا تھا' اس دوران وہ کہنے لگے: ہم سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ ہندوؤں کی کافرانہ ثقافت کے اثرات اس قدر زہریلے انداز میں بھی ہمارے سامنے آسکتے ہیں۔ تفصیل بتاتے ہوئے کہنے لگے: کچھ عرصہ قبل ہم نے کیبل کا کنکشن لے لیا۔ پتھر کا ایک مجسمہ گھر میں پہلے سے لگا ہوا تھا۔ ایک دن میں صبح اٹھا تو دیکھا کہ بچہ زینت کے لیے گھر میں نصب آرائشی مجسمے (بت) کے سامنے تشہد کی حالت میں دوزانو ہو کر بیٹھا ہے۔ تقدس بھری نظریں مجسمے کی جانب ہیں...... اور ہاتھ دعا اور التجا کے انداز میں بلند ہیں...... اپنی اس کارروائی میں اس کی محویت اور خشوع کا عالم یہ ہے کہ اسے اپنے پیچھے میرے پہنچ جانے کی اطلاع تک نہ ہوئی۔ میں نے صرف اتنا سنا کہ وہ...... ''اے کالی ماتا!''...... ''اے کالی ماتا!''...... ''اے کالی ماتا!''...... کہہ کر اللہ جانے کیا کیا پکارتا جا رہا ہے' بالکل ویسے جیسے ہندو عبادت کرتے ہوئے مشکل کے وقت کالی ماتا کی پوجا کرتے ہیں۔ (یعنی لاشعوری طور پر وہ کالی ماتا کی پوجا پاٹ میں مصروف ہے۔)

اندازہ لگائیں! ...... ایمان و توحید ہی بندے کی اصل میراث ہے۔ شرک اور شرکیہ امور اور شرکیہ امور کے قریب لے جانے والے راستوں سے دوری ہی بندے کی دنیا و آخرت میں کامیابی کی ضمانت ہے۔ اگر ہم نے ایسی ہی ہندو کی مشرکانہ فلمیں دکھا دکھا کر بچے کو شرک سے آلودہ کرنے' ایمان کے صاف شفاف دودھ میں گوبر کی چھینٹیں گرانے کا اہتمام اس کے بچپن ہی میں کر دیا تو پھر یہ بچہ شجر نو بہار بن کر مہکی مہکی خوشبو کے پھول اور کلیاں کھلائے گا، اس کی امید رکھنا عبث ہے۔ اور یہ شرک کے کنویں میں گر کر آپ کو قیامت کے دن جہنم کے گڑھے سے نکالنے کا باعث بن سکے گا؟ اس کی امید رکھنا بھی عبث و فضول ہے۔

یہ دو مثالیں جب آنکھوں کے سامنے رو پذیر ہوئیں' تو دماغ کی سکرین پر ایک تیسرا منظر ابھرنے لگا کہ جس کو بندہ نے اپنے میٹرک کے زمانہ میں اخبار جہاں کے کٹ پیس کالم میں پڑھا تھا کہ ایک آدمی ایک دن صبح صبح سکول ٹائم اپنے کسی کام سے نکلا۔ وہ جا رہا تھا کہ راستے میں اپنے سے ذرا فاصلے پر ہٹ کر اس نے ایک ننھی منی بچی کو ننھے ننھے قدم اٹھاتے ہوئے دیکھا۔ اس کے کپڑے دھلے ہوئے' اجلے اور صاف شفاف' استری کیے ہوئے' سیاہ شوز پالش ہو کر چمکتے ہوئے ہیں' سر پر چھوٹا سا گول سکارف' کاندھے پر کتابوں والا ہلکا پھلکا بیگ ہے اور وہ درمیانی چال سے نہایت اطمینان سے سکول جا رہی ہے ...... لیکن وہ ...... ساتھ ساتھ ...... اپنی ننھی منی ...... چھوٹی اور توتلی سی ...... زبان سے کچھ گنگناتی بھی جا رہی ہے ...... میں نے کان لگا کر سننے کی بہت کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا' کہ وہ کیا گا رہی ہے۔ میں جلدی جلدی قدم اٹھاتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔ جب غور سے سنا ...... ننھی' پیاری' دل آویز' معصوم' مترنم سی آواز میرے کانوں تک پہنچی، اس کے الفاظ سن کر تو میرا کلیجہ خوشی سے اچھل کر سینے میں آ گیا ...... میں نے باہوش و حواس سنا کہ وہ اپنی عاجز اور عابد زبان سے:

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

کا دلنواز ترانہ الاپتی ہوئی اپنے سکول کی طرف بڑھتی چلی جا رہی تھی..... مجھے یقین نہ ہو رہا تھا کہ اس دور میں میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں..... پھر فوراً میرا ذہن اس کی والدہ یعنی اپنی محترم ومکرم بہن کی طرف گیا اور عقیدت واحترام سے اس کے لیے دل سے دعا نکلی کہ اللہ ایسی مائیں ہر بچے کا مقدر کر دے' ایسی بیویاں ہم سب کے نصیب میں کر دے۔ اللہ اپنی اس نیک بندی کو اور اس کی اس ''کلی'' کو کھل کر اس کلمہ کی خوشبو ہر طرف پھیلانے کی توفیق دے۔

بچی میرے تعاقب سے بے خبر اپنے سکول کو چلی جا رہی تھی کہ راستے میں ایک چوک آ گیا' بچی اس کے ایک راستہ پر مڑ گئی' میں بھی پیچھے تھا کہ چوک کی نکڑ پر مجھے مخالف سمت سے ایک بچہ آتا ہوا نظر آیا' جس کے بال پراگندہ' کپڑے گندے' منہ پر میل کچیل اور ناک بہہ رہی تھی۔ بچی مخالف سمت سے آتے ہوئے اس بچہ کے پاس سے اپنی لگن میں مگن گزر گئی۔ میں بھی پیچھے پیچھے مسحور انداز میں چل رہا تھا کہ اچانک میرے کانوں میں کسی بچہ کی ایک اور آواز پڑی۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا تو مخالف سمت سے آنے والا بچہ ہم سے کچھ دور جا چکا تھا اور چلتے چلتے آوارہ بھنورے کی طرح جھومتا' جھولتا' مخصوص انداز میں ہاتھ لہراتا ہوا وہ بھی کچھ گاتا جا رہا تھا۔ میں فوراً پیچھے مڑا اور اس بچے کے پیچھے چل پڑا' تاکہ دیکھوں کہ یہ بچہ کیا گا رہا ہے؟ اس کے قریب جا کر جب غور سے اس کے الفاظ اور گنگناہٹ کو سنا تو منہ کھلے کا کھلا رہ گیا اور میں بے یقینی سے اس کے معصوم چہرے کو تکنے لگا۔ وہ کہہ رہا تھا:

بہت خوبصورت ہے میرا صنم
قسم چاہے لے لو خدا کی قسم

میرا دل تھا کہ جیسے ابھی پسلیاں توڑ کر باہر نکل آنا چاہتا ہو اور اس کمسن معصوم بچے سے یہ پوچھنا چاہتا ہو کہ تجھے یہ سب کچھ کس نے سکھایا؟ غلیظ ہندو کا یہ غلیظ گانا تیرے دل و دماغ میں کس نے بٹھایا۔

محترم بہنو اور بھائیو!.....فضائیں بدل چکیں' ہوائیں بدل چکیں' کفریہ وملحدانہ تہذیب

وثقافت اور تمدن کی آندھیاں اور طوفان ہر گھر کے شیرازے کو اکھاڑ پھینکنا چاہتے ہیں۔ ایمان کے درخت کو جڑوں سمیت اکھاڑ کر اور جلا کر خاکستر کر دینا چاہتے ہیں۔اب فیصلہ آپ پر ہے کہ آپ اپنے بچے کو کیسا ماحول دیتے ہیں۔ یقیناً آپ جواب میں کہیں گے کہ ''ہم تو جی اپنا آپ فنا کر کے بھی بچوں پر قربان کر دینا چاہتے ہیں اور انہی کی بہتری کے لیے ہی تو سب کچھ کر رہے ہیں''...... تو یقیناً آپ ایسا کریں لیکن یہ دعویٰ اس وقت صداقت پر مبنی ہوگا' جب آپ کا عمل یہ ثابت کرے گا کہ آپ واقعی بچے کو بہتر ماحول دینا چاہتے ہیں۔ یاد رکھیں......! جس ماحول وتربیت سے آپ اپنے بچوں کے دامن کو بھریں گے' وہ وہی کچھ آنے والے کل میں اپنی اولاد کے سپرد کریں گے اور پھر یہی ورثہ آگے سے آگے منتقل ہوتا رہے گا۔ یوں آپ کے آخرت کے سیونگ اکاؤنٹ میں ثواب کی رقم مسلسل جمع ہوتی رہے گی...... آپ کا نام معاشرے میں عزت سے لیا جاتا رہے گا کہ یہ فلاں نیک بخت انسان کا فرزندارجمند ہے۔ یہ فلاں پاکباز نیک طینت انسان کی دختر سعادت مند ہے۔آپ کو اچھے الفاظ سے یاد رکھا جائے گا...... لوگ آپ کی مثال اپنی مجلسوں میں دیں گے اور پیغمبر آخر الزماں، سلطان مدینہ، شاہ امم جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے نیک اور کامیاب آدمی کی نشانی یہ بھی بتائی ہے کہ لوگ مرنے کے بعد اس کو اچھے الفاظ میں یاد کرتے ہیں...... ورنہ معاملہ اس کے بالکل برعکس ہوگا۔اب فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے کہ آپ کیسا بچہ چاہتے ہیں؟

قیامت کے دن ہاتھ سے پکڑ کر...... اللہ کریم سے سفارش کر کے...... جنتوں میں لے جانے والا...... یا...... وہاں اللہ کے دربار میں مقدمہ دائر کرنے والا کہ اے اللہ!...... میرے اس باپ نے بہتر اور سعادت بخش ماحول مہیا نہ کر کے مجھے مجرموں کی صف میں کھڑا ہونے کی راہ دکھائی' اسے بھی میرے ساتھ بھیج دے...... فیصلہ کرلیں!......ابھی وقت آپ کے پاس ہے......ابھی معاملہ آپ کے اختیار میں ہے۔

ان کا کیا بنے گا؟

ڈیڑھ ماہ قبل میرا محلہ دار چاچا خلیل ایک بچی کو ساتھ لے کر صبح صبح ہی میرے پاس پہنچ گیا' بچی کی عمر آٹھ سال کے قریب تھی، ننھی منی سی' چھوئی موئی سی، کومل کومل مگر مرجھائی ہوئی کلی کی طرح تھی...... سہمی سہمی، خوفزدہ سی آنکھیں کہ جیسے وحشت سے کھلی ہوئی تھیں...... پاؤں ننگے...... کپڑے پھٹے...... گردوغبار اور مٹی و دھوئیں سے اٹا ہوا جسم اور ننگا سر تھا...... ہونٹوں پہ پپڑیاں جمی ہوئی اور گلا خشک تھا...... ایک بازو کی ہڈی ٹوٹ کر ٹیڑھی ہی جڑ چکی تھی...... وہ کھڑی کھڑی بٹر بٹر مجھے دیکھے جا رہی تھی...... پھر نیچے زمین کی طرف اپنے پاؤں کی طرف گھورنے لگی...... میں نے کہا: چاچا خلیل! کچھ بتائیں ماجرا کیا ہے؟ یہ لڑکی کون ہے؟ آپ میرے پاس کیوں لے کر آئے ہیں؟ وہ کہنے لگے: طاہر بیٹا! اسی سے پوچھ لو۔ تو میں نے پیار سے بچی کو بٹھایا اور پوچھا: بیٹا! کیا نام ہے، کون سی کلاس میں پڑھتی ہو، کہاں سے آئی ہو، تمہارے ابو کیا کام کرتے ہیں؟ لیکن وہ میرے ہر سوال پر خاموشی کا بت بنی کھڑی تھی، میں نے اس کو بولنے کا حوصلہ دیا، دس روپے کا نوٹ دے کر کہا کہ ٹافیاں کھانا، یوں اپنے ساتھ اسے مانوس کرنے کی کوشش کی تاکہ وہ کچھ بولے، کافی کوشش کے بعد اس کا خوف کچھ کم ہوا اور اس نے اپنی بپتا ننھی زبان میں یوں سنائی:

ہم چھوٹے شر قپور میں رہتے ہیں' سات بہن بھائی ہیں، ہماری دوسری نئی ماں ہم کو بہت مارتی ہے، اس کے کہنے پر ابا بھی مارنے لگے ہیں، ادھر شاہدرہ لاہور میں کوئی عزیز فوت ہو گیا' اس کی تعزیت کے لیے امی اور ابا آئے، میں بھی ضد کر کے پیچھے آ گئی، جب ہم چالیسویں والے گھر پہنچے تو میری ماں نے مجھے گھر میں

داخل ہونے سے مار کر روک دیا پھر وہ پتا نہیں کہاں چلے گئے‘ مجھے ڈھونڈنے کے باوجود نہ ملے اور نہ انھوں نے مجھے تلاش کیا بلکہ مجھے چھوڑ کر واپس چلتے بنے۔

بچی چاچا خلیل کے پاس رہ کر بہت خوش تھی‘ صرف اس لیے کہ وہ یہاں پرسکون ماحول میں بچوں کے ساتھ گھل مل گئی تھی اور اب کھیل رہی تھی، وہ یہاں سے واپس اپنی نئی ماں کے پاس جانے سے خوفزدہ تھی۔ اس کے باپ نے دوسری شادی کی تھی اور اب وہ دوسری بیوی کے چونچلوں میں گم ہو کر اپنے حقیقی بچوں سے غافل ہو گیا تھا۔ چچا خلیل نے چند دن اپنے گھر میں رکھا پھر بعض معاشی مجبوریوں سے تنگ آ کر اس کو یتیم خانہ میں جمع کروادیا۔ اب وہ دنیاداری کے رشتوں سے دور، اپنوں سے، دور زندگی کے تلخ دن گزار رہی ہے۔

اسی طرح ایک دن شعبہ غازیان کے مسئول بھائی سلامت اللہ نے ایک ۱۲ سالہ لڑکے کو میرے سپرد کرتے ہوئے کہا کہ طاہر بھائی! اس کا کچھ کریں۔ لڑکا کیا تھا، ایک تنکا تھا کہ تیز ہوا آئے تو اڑ جائے، نہایت کمزور ہڈیاں نکلی ہوئیں اور آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئیں، کمزور و ناتواں۔ میں نے لڑکے سے کہا: بھائی! بلا تمہید بتاؤ معاملہ کیا ہے؟ اور میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟ وہ کہنے لگا:

> میں فیصل آباد کا رہنے والا ہوں، میرے باپ نے دوسری شادی کر لی اور ہم سے بالکل کٹ کر رہ گیا۔ ہم مریں یا جئیں‘ اسے اس سے کچھ غرض نہ تھی۔ میری ماں آخر عدم توجہی کا شکار ہو کر مر گئی۔ نئی والدہ کے حکم سے والد نے ہمیں سکول سے اٹھا لیا، اب ہم گھر میں نئی والدہ کی مار برداشت نہ کر سکتے تھے‘ لہٰذا والد نے ایک ورکشاپ میں کام پر لگا دیا، ہم قسمت کا لکھا سمجھ کر دونوں بھائی ورکشاپ میں صبح صبح منہ اندھیرے جاتے اور رات گئے واپس آتے، تھوڑی دیر سونے یا جھڑکیاں سننے کے بعد پھر ورکشاپ کی طرف چل پڑتے، یہی معمول تھا ہماری زندگی کا کہ ایک دن جب ہم گھر واپس آئے تو پتا چلا کہ نئی والدہ والد کو لے کر ہمیشہ کے لیے کہیں چلی گئی ہے‘ کچھ اپنا نشان چھوڑ کر نہیں گئی۔ ہم روتے رہے‘ ڈھونڈتے

رہے، لوگوں سے ان کا پتا پوچھتے رہے، کسی کو پتا ہوتا تو وہ بتاتا، آخر کار ہم اپنے نہال گئے' انھوں نے بپتا سنی تو کہا کہ ہمارا آپ سے رشتہ اس وقت تھا جب تک ہماری بیٹی اور تمہاری ماں زندہ تھی' اب وہ نہیں رہی لہٰذا تم اپنے والد کے پاس چلے جاؤ، ہمارے پاس تمہارے لیے جگہ نہیں ہے۔ ہم پھوپھیوں، مامیوں اور برادری کے سامنے روتے کرلاتے رہے' کسی نے نہ سنی۔ آخر ایک چچا نے ہمیں بطور ملازم رکھ لیا، اب ہم اس کے اشاروں پر اس کے گھریلو اور باہر کے کام کاج کرنے لگے، ہم اس کی ہر بات مانتے لیکن اس کے باوجود پتا نہیں اس کو کیوں اتنا غصہ آ جاتا کہ وہ بے تحاشا ہمیں مارنے لگتا، اسی مار کو برداشت کرتے ہوئے ہماری ہڈیاں بھی ٹوٹیں۔ آخر مار کو برداشت نہ کر سکنے کی بنا پر میں گھر سے بھاگ کر لاہور آ گیا۔ مینار پاکستان کے قریب فٹ پاتھ پر قائم کنٹین پر ایک ماہ کام کیا جب ایک ماہ گزر گیا تو میں نے اپنی مزدوری کا تقاضا کیا جس پر انھوں نے مجھے بہت مارا۔ وہاں یادگار پر مجھے ایک آدمی نے مجاہدین کے دفتر القادسیہ میں جانے کا کہا کہ وہاں آپ کو دو وقت کی روٹی کھانے کو مل جائے گی اور کوئی مارے گا بھی نہیں' لہٰذا میں یہاں پہنچ گیا ہوں، میری خواہش صرف دو وقت کی روٹی ہے' مہربانی فرما کر میری یہ استدعا پوری کر دیں، میں آپ کا احسان زندگی بھر نہ بھولوں گا۔

میری آنکھوں میں آنسو تیر گئے، میں نے پوچھا: تمہارے دوسرے بھائی کا کیا بنا؟ تو کہنے لگا: اس کو شیخوپورہ کے بدمعاشوں کا ایک ٹولہ اپنے ساتھ لے گیا ہے' وہ ضرور اس کو بدمعاش بنا دے گا، میرا اپنے بھائی کو ملنے کو بہت دل چاہتا ہے لیکن مجھے نہیں معلوم وہ اس کو کہاں لے گئے ہیں اور وہ کس حال میں ہے۔ میں نے مبشر احمد ربانی صاحب سے مشورہ کر کے شالامار باغ کے نزدیک مرکز کے ایک مدرسہ میں اس کو داخلہ دلوا دیا۔

دونوں کردار اپنی اپنی جگہ بظاہر پرسکون ہیں، ایک یتیم خانہ میں جبکہ دوسرا مدرسہ میں

لیکن دونوں کے دل جذبہ لاڈ اور پیار کے حصول کے لیے ہمہ وقت مچلتے ہیں..... ان کی زبانیں ہمیشہ ایسی ہستیوں کو ڈھونڈتی رہتی ہیں کہ جن کو وہ ابو جان اور امی جان کہہ کر پکار سکیں، ابھی تک ان کی زبانوں پر کوشش کے باوجود یہ الفاظ کسی کے لیے جاری نہیں ہو سکے۔

معاشرے میں ایسے کتنے ہی بچے ہیں کہ جو محبت کی آنچ پر پگھلنے کے لئے ہمیشہ بیقرار و مضطرب رہتے ہیں، ان کے ہونٹ شدت جذبات سے پھڑ کتے ہیں کہ وہ کسی کو ابو جان یا امی جان کہہ کر اپنے سوختہ و پژمردہ دل کو ٹھنڈک پہنچائیں۔

یہ پھول جو بکھر رہے ہیں..... مرجھا رہے ہیں..... مسلے جا رہے ہیں..... ان کا کیا بنے گا؟..... ان کا مستقبل کیا ہوگا؟..... ان کے ساتھ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ صرف اس لیے کہ جب کوئی نئی شادی کا شوقین دوسری شادی کر لیتا ہے تو وہ پہلی بیوی اور اس کے بچوں کو یکسر بھول جاتا ہے..... نئی کو بساتا ہے' پرانی کو رلاتا ہے..... ایک کو بناتا سنوارتا ہے تو دوسری کو اجاڑتا ہے..... اس میں کوئی شک نہیں کہ دلوں کے میلان پر کسی کا اختیار نہیں، کسی طرف بھی جھک سکتا ہے،..... لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ پرانے خاندان کو یکسر بھول کر کسی ایک ہی کی ناز برداریوں میں لگ جائے۔ اس کے ایسا کرنے سے کتنے پھول مسلے جاتے ہیں، کتنی کلیاں پامال ہو جاتی ہیں، یہ کوئی غیر نہیں ہوتے، اس کا اپنا خون ہوتے ہیں لیکن یہ کتنا بدقسمت ہوتا ہے کہ جو اپنے خون کے لیے بھی جوش نہیں مارتا، وہ ان کو دنیا کی اندھی دوڑ میں اکیلا چھوڑ کر اپنی مصنوعی خوشیوں کے حصول میں مگن ہو جاتا ہے۔

میں دوسری شادی کا مخالف نہیں بلکہ شدید قسم کا حامی ہوں لیکن اپنے تجربے کی بنا پر ایک قید لگایا کرتا ہوں' وہ یہ کہ آپ دوسری شادی ضرور کریں اگر آپ اپنے بچوں اور سابقہ بیوی کو پہلے جتنی ہی محبت دے سکتے ہیں، پہلے جتنا ہی خیال کر سکتے ہیں..... پہلے جتنے حقوق کی ادائیگی کا مظاہرہ کر سکتے ہیں۔ نہیں، نہیں بلکہ اگر ان کے لیے پہلے سے بھی زیادہ محبت ہو تو زیادہ بہتر ہوگا۔ میں کہتا ہوں کہ آپ دوسری شادی تب کر سکتے ہیں جب آپ اپنے سابقہ بیوی بچوں کو لاڈ پیار اور حقوق پہلے سے زیادہ دے سکتے ہوں' اگر ایسا نہیں کر سکتے تو پھر یہ

غلطی کرنا یقیناً کئی ننھی جانوں سے کھیلنے کے مترادف ہوگی۔

میرے ایک دوست ابوعمر قریشی نے بتایا کہ جب ان کی دوسری شادی ہوئی تو ان کی سابقہ بیوی اور بچوں نے ان کے رویے کو اپنے ساتھ پہلے سے کہیں زیادہ سازگار، خوشگوار، خوش کن اور مہربان پایا تو ان کی پہلی بیوی کہنے لگی: اگر دوسری شادی کرنے کے بعد قریشی صاحب کا رویہ پہلے سے بھی اتنا شاندار ہوگیا ہے تو میں برملا کہتی ہوں اگر ان کا رویہ ایسے ہی رہے تو بے شک وہ تیسری بھی کرلیں، مجھے اعتراض نہ ہوگا۔

سوچ لیں کہ ان ننھی کونپلوں کا کیا بنے گا..... کہیں یہ ہیرے مٹی میں رل تو نہ جائیں گے..... آپ ان کو اپنے پیچھے اپنے حق میں رحمت ومغفرت کی دعائیں کرنے والا چھوڑیں نہ کہ نفرت کرنے والا اور ہر جگہ آپ کا ذکر نفرت اور ذلت آمیز لہجے میں کرنے والا۔

ڈالی سے ٹوٹے پھول

ننھے ننھے نرم و نازک سے ہاتھ تھے' اس بچے کے جو میرے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے کپڑے ہاتھ اور منہ ورکشاپوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی مانند تیل اور گریس کے آمیزے سے لتھڑ کر میلے کچیلے، گندے اور کالے ہو چکے تھے۔ یہ ننھی سی جان شام کے وقت اپنے کام سے اس طرح تھک کر نڈھال ہو چکی تھی جیسے ایک آپریشن کیا گیا مریض ہوش میں آنے کے بعد محسوس کرتا ہے۔ یہ بچہ ایک ان کھلی کلی تھی' جو میرے سامنے کھڑا تھا' بھوک سے نڈھال شاید یہ تصور ذہن میں سمائے کہ جونہی گھر جاؤں گا تو پیار' شفقت اور محبت بھری ممتا کے محبت بھرے ہاتھوں سے چند نوالے کھاؤں گا' تو تمام تھکاوٹ کافور ہو جائے گی' اور کٹے پھٹے، دردوں سے چور جسم کو راحت و آرام اور سکون کی دولت مل جائے گی۔ میرے سامنے کھڑے اس کومل سے چہرے پر معصومیت ہی معصومیت تھی۔ یہ چھوٹا سا خوبصورت لیکن ڈرا سہما' خوفزدہ' احساس کمتری کا شکار' مسکین سا' محرومیوں کا شکار' محبتوں اور لاڈ کا متلاشی' یتیمانہ صورت بنائے' اپنی ہی ادھیڑ بن میں گم سم کھڑا ...... مجھے اپنی طرف مسلسل متوجہ پا کر کہنے لگا:

''بھائی جان! میرے لائق کوئی خدمت؟'' ...... میں نے کہا: ''نہیں نہیں! کچھ نہیں ...... ہاں! ایک بات بتاؤ گے؟'' ''اگر مجھے پتا ہوگا تو ضرور بتاؤں گا۔'' بچے نے جواب دیا۔ میں نے پوچھا: تم اتنی چھوٹی عمر میں پڑھنے لکھنے کی بجائے لگتا ہے کوئی اور کام کرتے ہو' سکول نہیں جاتے' کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو اور کیا کام کرتے ہو؟'' ...... بچہ میرے سوالات سن کر سوچ کے سمندر میں اتر گیا' سر جھکا لیا' پھر تھوڑی دیر بعد سر اٹھا کر یوں گویا

ہوا:

بھائی جان! میں سکول جاتا تھا' لیکن اب نہیں۔ اب میں بلال گنج لاہور کی کباڑی مارکیٹ میں ایک خرادیے کے پاس کام سیکھ رہا ہوں۔ پہلے ایک موٹر مکینک کے پاس کام پر گیا، وہ مارتا بہت تھا، مجھ سے اس کی مار برداشت نہ ہوتی تھی اس لئے اسے چھوڑ کر اس کام پر آ گیا ہوں۔ مارتا تو یہ استاد بھی ہے' لیکن اس کی نسبت بہت کم۔ باقی میری ذات سید ہے۔ لاہور کے ایک قریبی شہر...... کا رہنے والا ہوں' لیکن فی الحال لاہور میں شاہدرہ ٹاؤن میں رہتا ہوں۔

میں نے کہا: ننھے بھائی! یہ عمر تو تمہاری روٹھنے کی ہے' ناز و نخرے کرنے کی' ضدیں کرنے اور مطالبے منوانے کی ہے' بھاگنے دوڑنے اور کھیلنے کودنے کی ہے' ماں باپ کے ہمراہ سیریں کرنے کی' تتلیوں کے پیچھے بھاگنے' ان کو پکڑنے اور پھر باغوں پارکوں سے پھول کلیاں جمع کرنے کی ہے' دوستوں کے ساتھ گھومنے پھرنے کی ہے...... جبکہ تم اپنی ننھی سی نازک جان لے کر اتنا سخت خراد کا کام سیکھ رہے ہو' ماریں کھا رہے ہو...... وجہ کیا ہے؟ کیا والدین نے غریب ہونے کی بنا پر کام پر لگا دیا ہے؟ یا...... اللہ نہ کرے ماں باپ دنیا میں نہیں رہے؟...... یہ سن کر بچے کی روشن و شفاف آنکھوں میں ننھے ننھے موتیوں جیسے قطرے جھلملانے لگے' لیکن اس نے ان کو پلکوں کے حصار سے باہر نہ آنے دیا اور رندھی آواز میں بولا:

بھائی جان! میرے ماں باپ زندہ ہیں' غربت کا بھی کوئی مسئلہ نہیں' دراصل میں اپنی ماں...... پیاری ماں کے لئے یہ محنت مزدوریاں کر رہا ہوں...... اس لئے کہ مجھ سے اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھے نہیں جاتے۔ پتا ہے کتنا پیار کرتی ہے میری ماں مجھ سے!! جب میں لاہور سے کبھی چھٹی پر جاتا ہوں اور جونہی میں گھر میں داخل ہوتا ہوں تو وہ دیوانہ وار بھاگتی ہوئی آتی ہے...... مجھے پکڑ کر اپنے سینے سے لگا لیتی ہے...... اور پھر میرے ماتھے' چہرے' رخساروں اور ہاتھوں پر بوسوں کی

برسات شروع ہو جاتی ہے...... اور یوں کتنا ہی وقت مجھ پر اپنی محبتیں نچھاور کرنے کے بعد اچانک ماں کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی ہے اور پتا نہیں وہ کیا سوچ کر ہچکیاں لینا شروع کر دیتی ہے۔ بس اس کا رونا مجھ سے دیکھا نہیں جاتا...... اور اس کو رونے سے بچانے کے لیے میں طالبعلم بننے کی بجائے چھوٹی عمر میں مزدور بن گیا ہوں۔

تمہاری ماں روتی کیوں ہے؟ کیا تمہارے ابو جان ان کو چپ نہیں کرواتے اور تمہیں سکول نہیں بھیجتے؟ میں نے اس کی بات کاٹ کر سوال کیا:

بھائی جان! ابو ہی نے تو ان کو آنسو دیے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ہم...... شہر میں رہتے تھے۔ میرے دو چھوٹے بہن بھائی بھی ہیں۔ ابو اکثر امی سے لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔ ان کو بات بات پر کوستے اور بات بات پر آسمان سر پر اٹھا لیتے' گھر کے برتن توڑتے' نقصان کرتے حتیٰ کہ امی جان کو بھی مارنے لگتے۔ ہم تینوں بہن بھائی سہم کر ایک طرف کونے میں چھپ جاتے۔ یوں مار کھاتے کھاتے میری امی نے ایک عرصہ گزار دیا۔

امی کبھی ابو کے سامنے بولتی نہ تھیں' بلکہ ہمیشہ ان کی نوکروں کی طرح خدمت میں لگی رہتیں۔ رات دن اپنا چین وسکون برباد کر کے' صحت تباہ کر کے ان کی خدمت میں مصروف رہتیں کہ وہ ان سے راضی ہو جائیں اور ایک بار ان کو ہنس کر بلائیں' لیکن ابو جان کے تیور ہمیشہ چڑھے رہتے اور غصہ تھا کہ کبھی ختم نہ ہوتا۔ وہ ہر وقت دھاڑتے مارتے اور گالیاں دیتے رہتے۔ ایک دن ابو جان نے امی جان کو اتنا مارا کہ امی کی برداشت سے باہر ہو گیا۔ وہ اپنی جان بچانے کے لیے غصے میں گھر سے نکلیں اور ہمیں ساتھ لے کر میرے نانا ابو کے گھر آ گئیں۔ ان کے ذہن میں تھا کہ ابو جب بچوں کی جدائی محسوس کریں گے تو انہیں نہ مارنے کا وعدہ کر کے واپس لے جائیں گے اور وہ بغیر کچھ کہے سنے ان کے ساتھ چلی جائیں گی' لیکن

یہ امی جان کی خام خیالی تھی...... ابو کو جب پتا چلا تو وہ اور بھی بگڑ بیٹھے' وہ امی کو منانے نہ آئے۔ کچھ عرصہ انتظار کرنے کے بعد امی نے سوچا کہ میری قسمت ہی میں شاید محبت کی جگہ دکھ لکھے ہیں اور وہ اللہ پر بھروسا کرتے ہوئے خود ہی ہمیں ساتھ لے کر ابو کے پاس جانے لگی تو نانا ابو اور ماموں آڑے آ گئے۔ وہ کہنے لگے: ایسے وہ کسی دن کوئی ایسی ضرب لگائے گا کہ تم مر جاؤ گی' وہ کم از کم لینے آئے تو ہم اسے سمجھائیں اور پھر تم باوقار انداز میں چلی جانا۔ یوں امی جان رک گئیں۔ وہ دن گیا اور یہ دن آیا' نہ تو ابو کو ہم معصوموں کی یاد نے ستایا اور نہ امی کی وفا یاد آئی...... وہ ہمیں لینے نہیں آئے اور اپنی انا کا مسئلہ بنا کر اب تک اپنے عیش میں جی رہے ہیں۔

کچھ دیر خاموش رہنے اور سوچنے کے بعد یہ معصوم دوبارہ یوں گویا ہوا:

میری امی پانچ نمازوں کے علاوہ بھی ایک نماز پڑھتی ہے' جو آدھی رات کے بعد شروع ہوتی ہے اور نماز کے بعد گھنٹہ آدھ گھنٹہ ہاتھ اٹھا کر دعا کرتی رہتی ہے۔ ابو کے لیے بھی اور ہمارے لیے بھی۔ وہ راتوں کو مسلسل روتی ہے۔ صبح کی نماز پڑھتی ہے اور بیل کی طرح کام میں جت جاتی ہے۔ امی کی آنکھیں عموماً سرخ رہتی ہیں۔ اب تو میرے ماموں بھی میری امی اور میرے دونوں بہن بھائیوں کو بوجھ سمجھنے لگے ہیں۔ وہ ہمیں اور امی کو ڈانٹتے ہیں اور طرح طرح کی طعنوں والی باتیں کرتے ہیں۔ صرف مشکل سے وہ ان کو دو وقت کی روٹی اور کچی لسی کے چند گلاس پینے کو دیتے ہیں۔ امی اپنی کسی ضرورت کے تحت ان کے آگے ہاتھ بھی نہیں پھیلا سکتی۔ اگر کہیں چھوٹی بہن چاندنی بیمار بھی ہو جائے تو دوائی لینے کے لیے چند روپے دینے سے بھی کسی نہ کسی بہانے سے ٹال دیتے ہیں۔

امی کا بہت دل چاہتا ہے کہ لاہور آ کر مجھے دو مہینے بعد دیکھ جایا کرے' لیکن اس کے پاس چونکہ یہاں آنے کا کرایہ نہیں ہوتا اس لئے بس روتی رہتی ہے جو اس کا

مسلسل کام بن کر رہ گیا ہے۔ اس کا یہ رونا مجھ سے دیکھا نہیں جاتا' اسی لئے میں یہاں آ گیا ہوں کہ کچھ کام سیکھ کر پیسے کماؤں اور اپنی پیاری سی امی کے ہاتھ پر رکھ کر کہوں: لو امی جان! اب برف کے ٹھنڈے گولے کھاؤ' شربت کا گلاس پیو' ٹافیاں کھاؤ اور بے شک نیا سوٹ سلوا لو اور چاندنی (چھوٹی بہن) کے لیے ایک پونی خرید لو یا ببلو (بابر) کے لیے جھنجھنا اور لٹو یا کھلونا' موٹر گاڑی خرید لو' بلکہ یہ پرانی چپل چھوڑ کر نئی بند جوتی گرگابی خرید لو...... یہ خواہشات و آرزوئیں پوری کرنے کے لیے لاہور آیا ہوں۔ ان عزیزوں کی مہربانی ہے جنہوں نے مجھے رہنے کے لیے چھت مہیا کی ہے کہ میں صبح ۹ بجے جاتا ہوں اور رات کو ۱۱ بجے واپس آ کر اس چھت کے نیچے سو جاتا ہوں۔

اب اس کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی' وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولا:

اتوار والے دن ماں اور بہن بھائیوں کو یاد کر کے روتا ہوں۔ یہی میری زندگی کا معمول ہے۔ ماں مجھے کبھی کسی صورت اپنے سے جدا نہ کرتی۔ اسے مجھ کو یہاں بھیجنے پر ایک اور بات نے بھی آمادہ کیا۔ وہ یہ کہ میرے ابو نے کئی دفعہ پیغام دیا کہ بچے مجھے دے دو۔ میری ماں نے ہمیشہ یہ جواب بھیجا کہ بچوں کے ساتھ مجھے بھی بلا لو' میں بچوں کی آیا بن کر نوکروں والی زندگی گزار لوں گی' بچے تو میرے جگر کے ٹکڑے ہیں' میری زندگی کا سہارا اور جینے کا مقصد ہیں' ان کا پالنا پوسنا ہی تو میری زندگی کی مصروفیت اور مقصد ہے' میں اپنے دل کے ٹکڑوں کو اپنے سے جدا نہیں کر سکتی۔ اس پر ابو نے دھمکی دی کہ وہ بڑے بچے (یعنی مجھ) کو اٹھوا لے گا۔ اس بات کے ڈر سے کہ اگرچہ میرا بیٹا میری آنکھوں سے دور رہے گا لیکن ہو گا تو کسی کی دستبرد سے محفوظ۔ مجھے نہ چاہتے ہوئے امی نے یہاں بھیج دیا۔ ویسے میں بھی اپنی ماں کو چھوڑ کر کبھی بھی اپنے باپ کے پاس نہیں جا سکتا اور نہ جانا ہی چاہتا ہوں' کیونکہ میں ماں کو کسی صورت نہیں چھوڑ سکتا۔ پہلے ہی اس نے کون سا کوئی

سکھ کا لمحہ دیکھا ہے۔ میری ماں جتنا پیار کرنے والی ہے' ایسی کوئی ماں نہ ہوگی' نہ اتنی اچھی اور محبت نچھاور کرنے والی۔ میری ماں مجھے ساری دنیا سے زیادہ پیار کرتی ہے۔ اب میری خواہش ہے کہ میں اپنی ماں کے آنسوؤں کے روکنے کا باعث بن سکوں۔

میں اس معصوم کے عظیم ارادوں کو سن چکا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اس ننھے فرشتے کو کیسے بتاؤں کہ مائیں ہوتی ہی ایسی ہستی ہیں کہ دنیا میں ان جیسی کوئی اور ہستی آج تک پیدا ہی نہیں ہوئی...... اور اے معصوم! تو کیا جانے کہ ماں کیسی بھی ہو وہ اپنے لخت جگر پر قربان ہو جانا اپنی سعادت و کامیابی سمجھتی ہے' اور ماں نام ہی پیار، محبت اور مہر و وفا اور لاڈ پیار کی طغیانی کا ہے...... ماں نام ہے ایک پیہم تڑپ کا...... مسلسل سلگنے کا...... ماں نام ہے موجوں کی روانی...... شفقتوں کی فراوانی...... قربانیوں کی ارزانی...... محبتوں الفتوں کی سرشاری کا...... ماں نام ہے آہِ سحرگاہی کا...... ماں نام ہے آنسوؤں کا جو اپنے لئے نہیں دوسروں کے درد اور تڑپ میں بہتے ہیں...... ماں نام ہے ایک روح پرور مسکان کا...... ماں نام ہے اپنے جگر گوشے کے لیے مر مٹنے کا...... تمہاری ماں بھی ایک عظیم ماں ہے...... اور ایسی ماؤں سے متعلق ہر بیٹا یہی کہتا آیا ہے کہ اس کی ماں جیسی دنیا میں کسی کی ماں نہ ہوگی۔ ماں کی عظمت کی پہچان کے لیے ازل سے پایا جانے والا یہ احساس ہی کافی ہے۔

اے بھائیو!...... مائیں تو اولاد کے لیے محبت کا ہمیشہ کھلا رہنے والا پھول ہیں۔ شاید اسی لئے رب کائنات نے بندے سے اپنی محبت کا تقابل ماں کی محبت کے ساتھ کیا ہے' جس کا خلاصہ ہے کہ اللہ بندے سے اس کی ماں سے بھی زیادہ محبت کرتا ہے...... مائیں تو مائیں بن کر دکھا دیتی ہیں تم بھی باپ بن کر دکھایا کرو۔ تمہیں تمہاری نخوت' غرور و تکبر' مرد ہونے کا بے جا احساس برتری' کہیں تمہاری نسل ہی تباہ نہ کر دے۔ دیکھو!...... تمہارے بے جا غصے، لڑائی جھگڑے اور جاہلانہ رویے سے گھر کیسے برباد ہو جاتے ہیں' پھول اپنی ڈالی سے ٹوٹ کر گر پڑتے ہیں۔ جن بچوں کے متعلق بھی تو یہ برداشت نہ کرتا تھا کہ کوئی ان کو اونچی آواز سے

مخاطب کرے آج وہ در در ٹھوکریں کھاتے' لوگوں سے تھپڑ کھاتے' گالیاں سنتے' گرتے پڑتے اور روتے سسکتے جی رہے ہیں۔کوئی ان کے زخموں پر مرہم رکھنے والا نہیں ہے۔

دیکھ..... آج تو نے مرد ہونے کے جاہلانہ احساس برتری کے تحت کسی کی لاڈلی بیٹی (اپنے جیون ساتھی) کے نازک دل پر کاری گھاؤ لگایا ہے..... ایسا نہ ہو کل اسی سوچ کے زیراثر کوئی جاہل اجڈ مردانگی کے نام پر شیطانگی کا مظہر..... تیری پھول سی پیاری بیٹی کے محبتوں کے منتظر دل پر کوئی گھاؤ لگا جائے..... اور وہ کانٹوں پر مرغ بسمل کی طرح تڑپے..... اور تجھے بھی تڑپائے..... اور اس وقت تو نادم ہو کر اپنی غلطی کا اعتراف کرے..... لیکن اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت..... تب تو تیرے عمل کی فصل پک چکی ہوگی' جو بویا اسے کاٹنے کا وقت ہوگا' جزا سزا کا وقت۔ اب تو تجھے تیرے کیے کا پھل ملنے کا وقت ہے۔ اگر جیون ساتھی سچ مچ ناراض ہو جائے تو اسے منا' کیونکہ اس کا تم پر حق ہے' شوخیوں کے سلسلے اسی طرح چلتے ہیں' زندگی کی شاہراہ اسی طرح گل وگلزار ہوتی ہے' ورنہ زندگی بے رنگ و بے کیف ہو جائے۔ ساتھی ناراض اس لئے ہوتا ہے کہ کوئی اسے منائے۔ وہ ناراض ہی اسی لئے ہوتا ہے۔ اسے یہ احساس ہوتا ہے کہ کوئی اسے پیار کرنے والا' چاہنے والا ہے' کہ جس کے نام اس نے اپنا سارا جیون کر دیا ہوتا ہے۔ یاد رکھ! اگر تو ان ننھے پھولوں کو ڈالی سے توڑے گا تو کل کلاں خود بھی ڈالی سے ٹوٹ کر خزاں کا شکار ہو کر بے نام ونشان ہو جائے گا۔ تو مرتے وقت پانی کے گھونٹ کو ترسے گا لیکن کوئی تیرے منہ میں پانی ڈالنے والا اور جنازے کو کندھا دینے والا اپنا نہ ملے گا۔ الامان والحفیظ۔

❀❀❀❀

بلیوں کے بچوں کا درد رکھنے والو!

یہ 17 پرنس روڈ Woking Surrey لندن ہے۔ یہاں ایک گھر میں ایشیائی جوڑا سعید اکبر اور بشریٰ بہن کے نام سے رہائش پذیر ہے۔ یہ لوگ پاکستان میں حکیم عبدالعزیز فیروز پوری کے رشتہ میں بہنوئی اور بہن ہیں۔ ایک دن انہوں نے بلی کے دو نوزائیدہ بچے اپنے گھر میں چلتے پھرتے دیکھے تو بہت پریشان ہوئے۔ کیوں پریشان ہوئے؟ صرف اس لئے کہ یہاں اگر کوئی بلی یا اس کا بچہ کسی کے گھر میں بے احتیاطی کی بنا پر مر جائے تو گھر والے پر قتل کا کیس پڑ جاتا ہے۔ اگر کوئی مری ہوئی بلی یا بلی کے بچوں کو کوڑے کے ڈرم میں پھینکتا ہے تو کوڑا اٹھانے والا خاکروب تھانے میں رپورٹ کر دیتا ہے اور گھر والوں کی شامت آ جاتی ہے۔ لہٰذا اس پاکستانی جوڑے نے فوری طور پر پولیس اسٹیشن رابطہ کیا۔ پولیس اسٹیشن والوں نے انہیں فوری ہدایات جاری کیں اور کہا کہ فوراً فلاں جگہ مارکیٹ میں جائیں اور نوزائیدہ بلیوں کے لئے سپیشل تیار کی گئی خوراک لا کر ان کو کھلائیں اور دیکھیں! کہیں ان کو کچھ ہو نہ جائے۔ آپ ان کی عمر کا اندازہ لگا کر مارکیٹ میں بتائیں۔ اگر ایک ہفتہ کے بچے ہوں گے تو ان کی علیحدہ خوراک ملے گی' اگر دو یا تین ہفتوں کے ہوں گے تو ان کی علیحدہ اور مختلف تیار شدہ خوراک ملے گی۔ اتنی دیر میں ہم بھی ایمرجنسی طور پر کچھ کرتے ہیں۔

یہ ہدایات سننے کے بعد ان لوگوں کی فوراً مارکیٹ کی طرف دوڑ لگ جاتی ہے اور وہ ان کی عمر کے مطابق تیار کی گئی خوراک لا کر ان کو کھلاتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد گھر کے باہر یکدم جیپوں کے رکنے اور ان کے ٹائر کے چرچرانے کی آوازیں آتی ہیں اور پھر دونوں جیپوں کا عملہ اتر کر گھر میں داخل ہو جاتا ہے۔ ایک جیپ میں پولیس کا عملہ جبکہ دوسری میں ویٹرنری

ہسپتال کا عملہ ہے۔ سب تیز تیز قدموں کے ساتھ چلتے ہوئے بلی کے بچوں کے پاس پہنچتے ہیں۔ ماہر ڈاکٹر ان کا میڈیکل چیک اپ کرتا ہے۔ مناسب دوائیاں دے کر اپنی تحویل میں لے لیتا ہے۔ پھر علاقے میں اعلان کیا جاتا ہے کہ کون ہے جو ثواب کی خاطر ان بچوں کو لے پالک رکھنا چاہتا ہے۔ ایک مختصر خاندان ان کو اپنا لیتا ہے۔ ڈاکٹر ان کو ہدایت کرتا ہے کہ اگر کسی قسم کی پریشانی یا مسئلہ ہو تو ہمیں اطلاع کریں' ہم ہر ممکن تعاون کریں گے۔ پھر مذکورہ پاکستانی جوڑے کو ہدایت کی جاتی ہے کہ جب بلی واپس تمہارے گھر آئے تو ہمیں اطلاع کی جائے۔ ہم اس کو پکڑ کر اس کا رحم واش کریں گے' تاکہ وہ آئندہ سے بچے پیدا نہ کر سکے۔ اس لئے کہ جب وہ اس قابل ہی نہیں کہ بچے پیدا کر کے ان کی دیکھ بھال کر سکے اور وہ ان کو بے یارومددگار چھوڑ کر چلتی بنتی ہے تو اس کا علاج صرف یہ ہے کہ اس کے ہاں اولاد ہی نہ پیدا ہونے دی جائے۔

مشہور ہے کہ بلی بچوں کو پیدا ہونے کے بعد سات گھروں میں پھراتی ہے۔ وہ بلی یورپ کی ہو یا ایشیا کی، اس کا معمول یہی ہے۔ ایسے ہی یہ بلی بچوں کو گھماتی پھراتی ہوئی اس گھر لائی تھی کہ وہ حکومت کے ہتھے چڑھ گئے۔ بلی بعد میں جب ان کے گھر آئی تو وہ بچوں کی گمشدگی کے صدمے سے نڈھال ہو گئی۔ جب انہوں نے اسے پکڑنے کی کوشش کی تو وہ جواب میں غرانے اور حملہ آور ہونے لگی۔ اس کی مزاحمت دیکھ کر انہوں نے اسے پکڑنے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور سوچا کہ اگر عملے والوں نے پوچھا تو ہم کہیں گے کہ وہ یہاں آئی ہی نہیں تو اس کو پکڑیں کیسے؟ یوں حکومت کی گرفت سے بچ جائیں گے۔

قارئین! ظاہری طور پر یہ رویہ، یہ عمل اور یہ کارروائی دیکھ کر تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ کتنے رحم دل اور حساس لوگ ہیں۔ انسانیت کے علاوہ حیوانوں کا بھی کس قدر درد رکھتے ہیں۔ انسانوں کے علاوہ ان کو حیوانوں کے حقوق کا بھی بہت خیال اور پاس ہے کہ ان کے درد میں یہ خود تکلیف برداشت کرتے ہیں۔

اب آپ دوسرا منظر دیکھیں: اسرائیل میں یہی لوگ ننھے ننھے نرسری کے بچوں کو قتل و

غارت گری کی ٹریننگ دے رہے ہیں اور یہ سبق ان کے ذہنوں میں راسخ کررہے ہیں کہ کوئی عرب، فلسطینی یا غیر اسرائیلی ایسے ہی ہے جیسے ایک جانور! کہ جسے مارنے کے بعد کوئی افسوس نہیں ہونا چاہیے۔ ۲۰۰۱ء میں اسرائیلی سکولوں کے ۶۲ طلبہ نے اس صورت حال سے تنگ آکر حکومت کو خط لکھا کہ ہم سکول میں پڑھنے جاتے ہیں' مسلح ٹریننگ لے کر فلسطینیوں کو مارنے کے لیے داخل نہیں ہوئے۔ صرف اس خط لکھنے پر ان طلبہ کو گرفتار کرلیا گیا۔ ایک سال مقدمہ چلا اور پھر کورٹ مارشل کی سزا سناتے ہوئے دو سال مزید قید کردیا گیا اور پھر یہ کہیں ستمبر ۲۰۰۴ء میں جا کر رہا ہوئے۔

ان دنوں یروشلم کے ایلیف پریپ سکول کا طالب علم ''یونی'' جیل کی سزا کاٹ رہا ہے۔ جرم کیا ہے؟ سن لیجیے! اس نے ایک دن اس بس میں سوار ہونے سے انکار کردیا جو اسے اور اس کے ساتھیوں کو ٹریننگ کے بعد ڈیوٹی کے لیے فلسطینی مسلمانوں کے خلاف کارروائی کے لیے لے جارہی تھی۔ وہ بس سے کود گیا اور پھر اس نے انسانی تاریخ میں صابرہ و شتیلا کیمپ میں ظلم کی تاریخ رقم کرنے والے وزیراعظم ایریل شیرون کو خط لکھا کہ میرا سکول انسانوں کو خونخوار بنانے کا ایک ادارہ ہے۔ میں یہاں ایک بہترین شہری بننے کے لیے داخل ہوا تھا' ایک خونی درندہ بننے کے لیے نہیں۔ سکول کی انتظامیہ نے اسے ایک ''پرابلم طالبعلم'' (یعنی احمق طالب علم) قرار دیا اور اسے ڈپلومہ دینے سے انکار کردیا۔ اس نے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا تو اسے ماہر نفسیات کے پاس بھیج دیا گیا' جیسے کہ وہ پاگل ہو کہ جس کے علاج کی ضرورت ہو۔ پھر مذہبی پروہتوں کے سپرد کردیا گیا۔ پھر سزا کے لیے آرمی کے ڈی بریفنگ کیمپوں میں بھی بھیجا گیا۔ آخر کار اسے سات قسم کی مختلف سزائیں سنائی گئیں۔ آج کل وہ یروشلم میں جیل کاٹ رہا ہے۔ اسے یہ رعایت دی گئی ہے کہ اگر وہ اب بھی اپنی رائے اور سوچ بدل لے تو رہا ہوسکتا ہے۔ اس کے یہودی والدین بھی اس کو سمجھا سمجھا کر تھک گئے ہیں۔ آج وہ اپنے بچے کی دماغی صحت کی دعا کرتے نظر آتے ہیں۔ یونی کے والدین نے اپنے بچے کی ایک ویب سائیٹ بنائی ہے۔ کسی انسانی حقوق کے نمائندے، اسرائیل سے دوستی کا ہاتھ ملانے کے لیے بیقرار انسان

اور کسی روشن خیال نادان کو یقین نہ آئے تو Ybronner @ post.tua.cec.ie, پر رابطہ کر سکتا ہے۔[1]

میرے بھائیو!...... یہ وہ چند اسرائیلی یہودی بچے ہیں کہ جو صرف اس وجہ سے اپنی حکومت کے عتاب کا شکار ہیں کہ انہوں نے مسلمانوں کے معصوم و مظلوم بچوں کے گلوں کو بندوقوں کی سنگینوں سے کاٹنے سے انکار کر دیا ہے۔ باقی یہودی صلیبیوں سے مل کر کس حد تک مسلمانوں کا خون بہا رہے ہوں گے، اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

اب آخر میں ایک چھوٹا سا تیسرا، ہیبت ناک منظر!

مقبوضہ کشمیر میں بھارتی فوجیوں نے مل کر ایک معصوم مسلمان بچی کو ہوس کا نشانہ بنایا اور ریپ کے بعد اس بچی کو ہمیشہ کے لیے موت کی نیند سلا دیا۔

قارئین!..... یہودی اپنے بچوں کو سزائیں دے رہے ہیں، کیوں؟ اس جرم میں کہ وہ مسلمانوں اور ان کے بچوں کو ذبح کرنے سے انکاری کیوں ہیں؟ وہ مسلمانوں کے قتل و غارت سے باغی بچوں کو عبرت کا نشانہ بنا رہے ہیں۔ صلیبی ان کے ان ظلم کے تربیتی کیمپوں کو جانتے ہیں جو عرف عام میں کنڈر گارڈن اور دوسرے یورپی ماڈرن سکولوں میں نرسری اور پریپ کے ننھے طالب علموں کو مسلمانوں کے قتل عام کی تربیت دے رہے ہیں۔ وہ ان کو روکنے کی بجائے ان کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں' مدد کر رہے ہیں، سپورٹ کر رہے ہیں، بلکہ اسرائیل کے ناپاک وجود کو تسلیم کروانے کے لیے مسلمانوں پر دباؤ ڈال رہے ہیں۔ وہ ظاہر یہ کرتے ہیں کہ بلیوں اور کتوں کے لئے بھی ان کے دل میں ہمدردی اور رحم دلی کے جذبات ہیں تو پھر مسلمانوں کے خلاف ان کارروائیوں پر وہ کیوں خاموش ہیں؟ لندن کی بلی کا بلونگڑا گم ہو جائے تو وہ مارے مارے پھرتے ہیں' تمام حکومتی مشینری حرکت میں آ جاتی ہے لیکن اس جہاں میں امت مسلمہ کی ماؤں کے کتنے ہی ننھے منے پیارے پیارے راج دلارے کھو گئے ..... اور کتنے ہی صلیبیوں و یہودیوں کی گولیوں کا نشانہ بن کر ہمیشہ کے لیے اپنی ماؤں

[1] اس ویب سائیٹ کی تفصیلات اخبارات میں آنے کے بعد اس کو زبردستی بند کر دیا گیا۔

سے بچھڑ گئے۔ کشمیر میں کتنی ہی معصوم مسلمان کلیاں مسل دی گئیں ..... لیکن ان کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی ..... کیوں؟ اس لئے کہ یہ بچے' امت محمد ﷺ کے بچے ہیں ..... لا الہ الا اللہ پڑھنا اور محمد رسول اللہ پکارنا ان کا جرم ہے ..... اور ..... مسلمان ہونا ان کا اصل جرم اور گناہ ..... اسی لئے تو ان کے بلیوں کے لیے بیقرار ہو جانے والے دل مسلمان بچوں' بوڑھوں اور عفت مآب خواتین کے قتل پر نہیں تڑپتے ..... تڑپنا تو دور ..... وہ تو پوری دنیا سے ان کو ختم کرنے کے لیے سرگرداں ہیں ..... وہ فلسطین ہو، بوسنیا ہو، چیچنیا ہو، فلپائن ہو، برما ہو یا کشمیر، ہر جگہ سے ان کا وجود مٹانے پر تلے ہوئے ہیں۔ روشن خیالوں، مرعوب انسانوں، ترقی پسندوں اور کفار کا دباؤ برداشت کرنے والوں سے سوال ہے کہ ایسے حالات میں کیا اب بھی جہاد فرض نہیں ہوا؟

اگر اب نہیں تو کب جہاد فرض ہے؟

ننھے غنچوں کی باغبان

''چھٹانک بھر کی چڑیا کے سینے میں بھی ایک ننھا سا حساس اور ماں کی مامتا کے طوفانی جذبات سے معمور دل تڑپتا ہے۔ انگلی کے پوٹے جتنے ننھے منے بچے جب آنکھیں کھولتے ہیں تو یہ ان پر اپنی مہر و وفا کی چھاؤں کرتی ہے' چہکارتے اور ممتا کو پکارتے بچوں پر گھونسلے میں پہرا دار بن کر بیٹھ جاتی ہے' ان کی تکلیف دہ گیلی جگہ بدلتی ہے، ان کو سلاتی ہے' دانا دنکا کھلاتی ہے' کبھی ایک وقت کیلئے اپنے ساتھی کو ان کی نگرانی پر مامور کر کے خود دانا دنکا تلاش کر کے لاتی اور کھلاتی ہے' اپنے ننھے منے بچوں کے لاڈ اور چاؤ دیکھتی ہے، ان کے پر مکمل ہونے لگتے ہیں تو ان لمحات میں اس کو بہت فکر ہوتی ہے کہ کہیں وہ نیچے گر کر چوٹ نہ لگوا لیں، لہٰذا وہ ان کی دیکھ بھال اور حفاظت کیلئے کبھی دائیں بھاگتی ہے اور کبھی بائیں' کبھی اس ٹہنی پر تو کبھی اس ٹہنی پر، کبھی اس جھاڑی میں تو کبھی اس درخت پر، یوں ممتا کی مہر و وفا کی فراوانیوں اور طغیانیوں کے بہتے دھاروں میں بچے اڑنے کے قابل ہو جاتے ہیں تب کہیں جا کر ماں کی جان میں جان آتی ہے۔

اچانک ایک دن یہ بچے نامعلوم منزلوں کی طرف لمبی اڑان بھر کر اس جیون کے بہتے دھارے میں شامل ہو جاتے ہیں اور ماں کی ممتا شام کے وقت ان کے لوٹ آنے کا انتظار کرتی رہ جاتی ہے۔ اب گھونسلہ پھر سے خالی ہو جاتا ہے اور جانے والے اپنے ساتھ اپنی ممتا کا چین وقرار، آرام و راحت لے جاتے ہیں اور یادوں کی بارات چھوڑ کر کبھی نہ ملنے کا سندیسہ دے کر گمنام منزلوں کی جانب چلے جاتے ہیں۔''

یہ تمثیل بیان کرنے کے بعد میرے پاس بیٹھی آنکھوں سے رم جھم آنسوؤں کی جھڑی لگاتی ماں نے کہا: بیٹا! چھوٹے چھوٹے بچے تھے کہ میرا سرتاج اچانک سر میں درد اٹھنے کے نتیجے میں، مجھے اس دنیا میں تنہا چھوڑ کر چلتا بنا۔ ابھی بھری جوانی اور صحت کی فراوانی تھی۔ کئی رشتے آئے لیکن میں یہ کہہ کر رد کر دیتی کہ میری ان ننھی کونپلوں (بچوں) کا کیا بنے گا؟ میں لوگوں کے گھروں میں نوکرانی بن کر صفائی کا کام کرتی، پھر گھر واپس آ کر کپڑوں کی سلائی کا کام کرتی۔ یوں میں نے خوب محنت مزدوری کرتے ہوئے رات دن ایک کر دیا اور اپنے بچوں کو باپ کے علاوہ کسی چیز کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔ جب کبھی مجھے کوئی کہتا کہ تم گوشت پوست کی انسان ہو یا لوہے کی مشین کہ تھکتی ہی نہیں' تو میں اسے یہ کہہ کر چپ کروا دیتی کہ جب میرے یہ پتر گبھرو جوان ہو جائیں گے تو میں خوب راحت اور آرام کروں گی۔ راج کروں گی۔ بہوؤں بچوں والی ہو جاؤں گی۔ میری محنت رنگ لائی میرے بیٹے اونچے لمبے، کڑیل گبھرو طاقتور وتوانا جوان بن گئے۔ یہ جوان و طاقتور ہوتے گئے اور میں بوڑھی اور کمزور ہوتی چلی گئی۔

آج سوچتی ہوں ایسا نہ ہی ہوتا تو اچھا تھا۔ پھر آنکھوں کے آنسو دوپٹے میں جذب کرتے ہوئے بولی: رات ایک بیٹا شراب پی کر اپنے شرابی ساتھیوں کو گالیاں دینے لگا تو انہوں نے مل کر مارنا شروع کر دیا۔ میں اپنا دوپٹا ان لوگوں کے پاؤں پر رکھ کر منتیں کر کے اس کی جان بچا کر گھر لائی تو اس نے مجھ پر تشدد کرتے ہوئے گھر کا دروازہ توڑ دیا۔ اب تک میں ہی سب کو محنت مزدوری کر کے کھلاتی ہوں۔ ایک بیٹا جو فرنیچر کا کام کرتا ہے اور کچھ پیسے کماتا ہے' اس سے میں نے کہا کہ مجھ سے اب لوگوں کے گھروں میں کام نہیں ہوتا کچھ پیسے دے تاکہ میں اپنی بیماری کیلئے دوائی لے سکوں۔ وہ بگڑ کر بولا: میں نے تم لوگوں کا ٹھیکہ لے رکھا ہے؟ اور پھر ناراض ہو کر گھر سے ایسا گیا کہ اب تک واپس نہیں آیا۔ میرے مرحوم شوہر کا دیا ہوا یہ گھر چونکہ دو منزلہ ہے' گزر بسر کیلئے میں نے ایک منزل کرایہ پر دے رکھی ہے۔ بڑے بیٹے کہ جس کی تھوڑا عرصہ قبل شادی کی ہے، نے اصرار کیا کہ کرایہ پر چڑھائی منزل خالی کرواؤ، وہاں ہم رہیں گے۔ میں نے کہا: بیٹا! تمہارے باقی تین بھائی اور دو بہنوں کی

کفالت کی ذمہ داری چونکہ مجھ پر ہے' اگر کرایہ داروں کو نکال دیا تو یہ قلیل آمدنی بھی ختم ہو جائے گی اور بہت مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ بیٹے نے طیش میں آ کر...... ہاتھ اٹھایا...... اور میں ممتا کی ماری، قسمت کی ہاری کے منہ پر زناٹے دار تھپڑ مارنا شروع کر دیے۔ پھر ڈنڈا اٹھایا اور میرے ناتواں بوڑھے جسم پر برسانا شروع کر دیا۔ یوں مار مار کر میرے جسم کو سُجا دیا۔ میں کس سے فریاد کرتی، کون آگے بڑھ کر مجھے بچاتا کہ جس بیٹے سے کسی ظالم کے ظلم کے خلاف فریاد کرنی تھی وہی تو ظلم کے پہاڑ توڑ رہا تھا' کیونکہ اس کی بیوی نے کہا تھا کہ ہم نے ہر صورت یہاں رہنا ہے...... کیا فائدہ ملا مجھے اتنے لمبے جان لیوا انتظار کا؟ ان کو بڑا کرنے کا؟ صرف یہ فائدہ کہ تین تھپڑ، لاتیں اور ٹھڈے...... پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور میرا دل گھبرانے لگا۔ میں اس کو تسلیاں دینے لگا۔ لیکن دل و دماغ میں اللہ کا قائم کردہ حق و باطل کا معیار کرنے والا ترازو اس بات کو پاس نہ کر رہا تھا۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ بیٹا اپنی ماں کے منہ پر اور جسم پر تھپڑ بھی مار سکتا ہے۔ تاہم میں آنسو بہاتی، اس ماں کو بھی جھٹلا نہیں سکتا تھا۔ دو ہفتہ تک انھی مثبت و منفی سوچوں کے ادھیڑ بن میں مصروف رہا کہ ایک دن میری ڈاک میں آنے والے ایک خط نے میرے اندر زلزلہ بپا کر دیا۔ مجھے ماننا پڑا کہ ایسا ہوتا ہے...... ہو رہا ہے...... اور نجانے کب تک ہوتا رہے گا کہ...... کونپلوں کی اس مہربان اور باغباں ہستی کو کبھی کبھی غنچے بھی آگ لگا دیتے ہیں۔ وہ خط میں آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔ آپ بھی پڑھیں اور یقیناً آپ کانپ اٹھیں گے۔ سرگودھا کی ایک اماں جان جو مجھے اپنا دکھ سنانا چاہتی تھی، لیکن لکھ نہ سکتی تھی ایک بہن (ام ن) کے پاس پہنچیں اپنا دکھڑا سنایا تو یہ بہن بھی رونے لگی اور ساتھ ہی قلم کو حرکت دینے لگی اور تحریر یوں بنتی گئی:

بھائی محمد طاہر نقاش

السلام علیکم!

- اس دور میں کیا ماں کی یہی حیثیت رہ گئی کہ وہ بچے کو جنم دے کر اس کو پال پوس کر بڑا کر کے اس کا خیال رکھے' اس کی خدمت میں دن رات ایک کر دے' اس کی خوراک کا' اس کی صفائی کا خیال رکھے اور بچہ بڑا ہو کر ماں ہی کو گھر سے دھکے

دے کر نکال دے۔ بھائی جو کچھ لکھ رہی ہوں اس کو غور سے پڑھنا اور بتانا کہ ماں کے ساتھ ایسا بھی ہونا چاہیے؟

میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے تو مائی نصیراں کو اپنے گھر آتے جاتے دیکھا مگر اس نے آج تک اپنے اکلوتے بیٹے کی چغلی نہیں کھائی۔ 64 سالہ مائی نصیراں کا ایک ہی بیٹا اشرف ہے۔ گرمیوں کے دن تھے' میری ماں نے مجھے اٹھایا کہ اٹھ کر نماز پڑھ لو۔ میں نے ظہر کی نماز پڑھنے کے بعد قرآن پڑھنا شروع کر دیا۔ ابھی تھوڑا سا پڑھا تھا کہ مائی نصیراں آئی اور روتی ہوئی میرے پاس بیٹھ گئی۔ میں نے قرآن شریف بند کر کے مائی نصیراں سے پوچھا: اماں کیا ہوا ہے؟ وہ روتے ہوئے کہنے لگی: کیا کرنا ایسے بیٹے کا جو بیوی کی باتوں میں آ کر اپنی ماں کو مارتا پیٹتا ہے۔ میں نے پوچھا: آپ نے ان باتوں کا ہم سے ذکر تو کبھی نہیں کیا؟ کہنے لگی: بیٹا! کون سی ایسی ماں ہے جو اپنے بیٹے کو برا بھلا کہے۔'' اور لوگوں کو بتا کر اس کی عزت میں فرق لائے ذرا آگے بڑھ کر دیکھ لو میرے بیٹے نے میری پیٹھ پر ڈنڈوں کے نشان ڈال دیے ہیں۔ یہ ڈنڈے خود میرے بیٹے نے مجھ پر برسائے ہیں!!!...... اتنا کہہ کر مائی نصیراں بہت روئی، میں نے اس کی پیٹھ پر مار کے واضح نشانات دیکھے۔ اماں کی یہ حالت دیکھ کر مجھے بھی رونا آ گیا۔ میں نے روتے ہوئے پوچھا: اماں جان! آخر اشرف نے آپ کو کیوں مارا ہے؟ رو کر کہنے لگی: بیٹا میں سو رہی تھی' بہو نے آ کر کہا: ماں! چائے پکا دو۔ میں تھکی ہاری قسمت کی ماری نے کہہ دیا: بہو! میری طبیعت ٹھیک نہیں، میں بیمار ہوں' آج تم خود پکا لو۔ یہ سننا تھا کہ میری بہو مجھے زور سے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے کہنے لگی: تیری یہ ہمت کہ اب تو مجھے حکم کرے؟ اس کے بعد بہو زور زور سے رونے لگی' بین کرنے لگی۔ رونے کی آواز سن کر اشرف آ گیا تو وہ اس سے کہنے لگی: دیکھ دیکھ اپنی ماں کو...... یہ اب مجھ پر حکم چلاتی ہے۔ میرے بیٹے نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، ڈنڈا اٹھایا اور مجھے مارنا شروع کر دیا۔ میں رو رو کر ہاتھ جوڑ جوڑ کر کہتی رہی: بیٹا! میری بات تو

سنو...... بیٹا میری بات تو سنو' مگر میرے بیٹے نے میری ایک نہ سنی اور مجھے بہت مارا۔ پھر مجھے رو کر کہنے لگی: بیٹا یہ نئی بات نہیں، میرے ساتھ آئے روز ایسا ہوتا ہے۔ اور ایک عرصے سے میں یہ ستم سہہ رہی ہوں کہنے لگی: بیٹا تجھ کو تو پتا ہوگا کہ یہ ایک سال کا تھا جب اس کا باپ کرنٹ لگنے سے مر گیا تھا۔ پھر میں نے خود لوگوں کے گھروں میں محنت مزدوری کر کے اس کو پڑھایا لکھایا۔ اس کی جائز ناجائز ہر خواہش کو پورا کیا۔ جب اشرف بیمار ہو جاتا تو میری جان کو بن جاتی تھی' میں اللہ سے رو رو کر دعا کرتی کہ اللہ! اشرف کی بیماری مجھے لگا دے مگر میرے اشرف کو کچھ نہ ہو۔ بیٹا! یہ وہی اشرف ہے جو کہا کرتا تھا: ماں مجھے اکیلا مت چھوڑ کر جایا کرو' ماں! اگر تجھ کو کچھ ہو گیا تو میں تو جیتے جی مر جاؤں گا۔ یہ وہی اشرف ہے جو آج اپنے ہاتھوں سے مجھ کو ڈنڈے مارتا ہے۔ مارتا پیٹتا ہے' اتنی بات کرنے کے بعد مائی نصیراں بلک بلک کر رونے لگی اور پھر دیر تک آنسو بہاتی رہی۔ کوئی اسے چپ کروانے والا نہ تھا کہ جس بیٹے نے چپ کروانا تھا وہی تو رلاتا تھا۔

آپ کی بہن

(ام ن) سرگودھا

کسی شاعر نے شاید کسی ایسے ہی موقعہ پر کہا تھا:

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو میرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

ایسے لوگوں کے لیے اللہ کی طرف سے یہ سزا اٹل ہے کہ جو ماں کے گلشن کو اجاڑتے ہیں' س کے دل کے چمن کو جلاتے ہیں وہ کبھی بھی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے اپنی زندگی کو خوشگوار وخوش کن و پر راحت نہیں بنا سکتے' بلکہ ان کی یہ زندگی بھی ناکام و نامراد' ذلتوں بھری گزرتی ہے اور آخرت میں ذلت و رسوائی کے ساتھ بھڑکتی آگ کا عذاب ان کا نصیبہ بن جاتا ہے۔ اور یہ بات مشاہدہ میں آتی ہے کہ ماں کا گستاخ ہمیشہ عبرتناک اور خوفناک موت کا شکار ہوتا ہے۔

ماؤں کا سکھ چین چھیننے والے درندے

یہ عورت چونگی امرسدھو (لاہور) سے اس ٹیوٹا پر سوار ہوئی تھی۔ گاڑی مزنگ کے پاس پہنچ چکی تھی۔ اس نے ایک ننھے بچے کو خوبصورت بے بی کمبل میں لپیٹ کر سینے سے لگایا ہوا تھا۔ وہ اب تک اسے مسلسل اپنے سینے کے ساتھ چمٹائے ہوئے تھی۔ ایک عورت یہ منظر دیکھ کر اس سے کہنے لگی: ''بہن! تم نے اپنے لاڈلے کو کمبل میں لپیٹ کر اٹھا رکھا ہے، سانس لینے کیلئے بھی منہ کھلا نہیں چھوڑا۔ کہیں اس کا سانس ہی نہ رک جائے۔ خیریت تو ہے...... اور کیا بات ہے کہ جب سے آپ گاڑی پر سوار ہوئی ہیں اب تک بچے نے نہ حرکت کی ہے اور نہ رویا ہے...... خیریت تو ہے؟ ذرا کمبل اٹھا کر دیکھ ہی لو، کہیں اس کا دم ہی نہ گھٹ جائے۔''
...... یہ سننا تھا کہ اس عورت کا رنگ اڑ گیا...... اور وہ ہکلاتے ہوئے کہنے لگی: گاڑی روکو...... گاڑی روکو...... میں نے یہاں اترنا ہے...... مجھے اتار دو...... جلدی گاڑی روکو...... عورت کسی سے آنکھ ملا کر بات نہ کر رہی تھی...... لوگوں کو شک ہو گیا...... گاڑی رکی...... تو کسی نے سب کے دل کی بات یوں کہہ دی...... محترمہ! ذرا بچے کے منہ سے کپڑا تو ہٹاؤ...... کیوں اٹھاؤں؟ آپ کو کیا ہے؟ بچہ تو میرا ہے...... آپ کا کیا حق بنتا ہے؟ میں خود ہی اتر کر ایک طرف جا کر دیکھ لوں گی...... میں اسے ڈاکٹر کے پاس لے جا رہی ہوں۔ کچھ لوگوں نے کہا: یہ عورت جھوٹ بولتی ہے۔ خود دیکھیں! جب لوگوں نے زبردستی کر کے اس کے ہاتھ سے بچہ لیا...... اور پھر اس کمبل کو کھول کر اس کے منہ سے کپڑا ہٹایا...... تو سب کی چیخیں نکل گئیں...... کلیجے حلق میں آ گئے...... دل ڈوبنے لگے...... آنکھیں پتھرا گئیں...... اور خوف و وحشت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

سامنے ...... کمبل کے اندر ...... کسی بدنصیب ماں کا ننھا منا ...... معصوم ...... مرجھائی مسکراہٹوں کا مالک ...... کسی کی دل بستگی کا سامان ...... کسی کی آنکھوں کا چین اور دل کا قرار ...... کسی کے سونے آنگن کا مہکتا پھول ...... کسی کے قہقہوں بھرے چمن کی کلی تھی ...... جو اب مسلی جا چکی تھی ...... ایک ننھا منا بچہ جو ہمیشہ کے لیے اپنی محزون و مغموم ماں سے دور بہت دور جا چکا تھا ...... کبھی نہ واپس آنے کے لیے ...... اس کی روشن آنکھیں اور ہونٹ نہایت درندگی اور سفاکی سے موٹے دھاگے کے ساتھ سی دیے گئے تھے ...... اس کا نرم و نازک پیٹ کاٹنے کے بعد پھر سے سی دیا گیا تھا ...... یوں یہ کٹا پھٹا اور پھر سلا ہوا بچہ سامنے تھا ...... پتا چلا کہ اس کے جسم میں ہیروئن بھر کر دوسری جگہ پہنچائی جا رہی تھی۔

اس ویگن میں سوار میرے دور کے ایک عزیز نے جب یہ واقعہ سنایا تو مجھے چند دن قبل اپنے بیٹے کے ساتھ رونما ہونے والا واقعہ یاد آ گیا کہ جب وہ گھر سے باہر نکل کر گلی میں چلا گیا' ماں نے بچے کو گم پایا تو ماریہ بیٹی سے کہا: بھاگ کر جاؤ اور گلی میں دیکھو ابوبکر کہیں دور نہ نکل جائے اور گم نہ ہو جائے۔ بیٹی نے واپس آ کر بتایا کہ میں پوری گلی میں دیکھ آئی ہوں وہ کہیں نہیں ملا۔ ماں نے بچی کو دوبارہ دوسری گلی میں دوڑایا۔ اسی طرح کچھ اور بچوں کو بھی مختلف سمتوں میں روانہ کر دیا کہ سب مل کر اس کو تلاش کر سکیں۔ اب ماں نے بیٹی کے باہر جاتے ہی خود مالک کائنات کے دربار میں ہاتھ اٹھا کر رونا شروع کر دیا: الٰہی! میرے بچے کو کچھ نہ ہو۔ اسے صحیح سلامت واپس لوٹا دے۔ میں نے تو اسے تیری حفظ و امان میں دے رکھا ہے اور تیری سپردگی اور حفظ و امان میں دی گئی چیز کبھی ضائع نہیں ہوتی۔

ادھر دوسرے چوک میں لمبی لمبی مونچھوں اور ایک خوفناک چہرے والے شخص نے ابوبکر کو پکڑ کر اپنی موٹر سائیکل پر بٹھا لیا تھا۔ منہ میں پان ہے، لمبے بال، بدمعاشوں والی وضع قطع کا لباس پہنے موٹر سائیکل سٹارٹ کرنے لگا ہے۔ وہ بچے کو چومتا جا رہا ہے اور کہتا جا رہا ہے کہ اگلے چوک میں تمہارے پاپا کھڑے ہیں، میں تجھے ان کے پاس لے کر جا رہا ہوں، وہ تجھے بلا رہے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اسے مانوس کرنے کے لیے میٹھی میٹھی باتیں کرتا جا رہا

ہے اور چومتا جا رہا ہے۔ بچہ ہے کہ سہما ہوا خاموش بیٹھا ہے۔ اتنے میں میری بچی ماریہ بھی ڈھونڈتی ڈھونڈتی وہاں پہنچ جاتی ہے اور دیکھتی ہے کہ ایک سٹارٹ موٹرسائیکل پر ابوبکر بیٹھا ہے اور ایک ہٹا کٹا مونچھوں والا آدمی اسے کہیں لے جا رہا ہے' تو اس نے بھاگ کر موٹرسائیکل روکا اور اس کی چابیاں نکال کر کہا: یہ میرا بھائی ہے' آپ اسے کہاں لے کر جا رہے ہیں؟ نیچے اتاریں اس کو۔ اس نے بچی کے دو تین تھپڑ مارے، چابیاں چھین لیں اور کہنے لگا: بکواس کرتی ہے کہ میرا بھائی ہے' ایسے ہی چلتے پھرتے اپنا بھائی بنا لیتی ہیں۔ ماریہ نے کہا: انکل یہ میرا بھائی ہے، میری امی اس کو گم پا کر رو رہی ہیں۔ دیکھیں میں ہاتھ اس کی طرف بڑھاؤں گی تو یہ فوری میری طرف لپکے گا۔ چلو چلو تمہارا بھائی ہے۔ جاؤ! اپنی ماں کو یہاں لاؤ اور اسے دکھا لو، تسلی کروا لو، یہ تمہارا بھائی نہیں ہے۔ ''پیچھے ہٹو' جانے دو مجھے۔ نہیں تم چور ہو، میرے بھائی کو اٹھا کر لے جانا چاہتے ہو'' ...... آدمی دھمکیاں دے رہا تھا جبکہ ننھی ماریہ کی تھپڑ کھانے کے بعد اب خوف سے ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ وہ کہہ رہی تھی: میں اگر اپنی امی کو بلانے چلی گئی تو تم میرے بھائی کو لے کر کہیں بھاگ جاؤ گے' اس لیے میں نہ جاؤں گی۔ آپ میرے بھائی کو موٹرسائیکل سے نیچے اتاریں۔ محلے کا ایک لڑکا کہ جس کی چھوٹی بہن ماریہ کے ساتھ اقراء دارالاطفال میں پڑھتی تھی' وہ آگے بڑھا اور کہا: یہ بچی سچ کہتی ہے۔ یہ اس کا بھائی ہے۔ ان کا نکڑ والا مکان ہے۔ پھر اس کے دوست بھی آ گئے۔ تھوڑی دیر بعد کچھ اور لوگ وہاں جمع ہو گئے۔ وہ بدمعاش دھمکیاں دینے لگا۔ جب دیکھا لوگ زیادہ جمع ہو گئے ہیں اور پکڑے جانے کا اندیشہ ہے تو یہ کہتے ہوئے کہ ''مائیں ہیں کہ اپنے بچوں کو سنبھالتی نہیں، بچے لینے ہی کا شوق ہوتا ہے، سنبھالنے کا نہیں۔'' ابوبکر کو نیچے اتارا، اور یہ جا وہ جا ...... فرار ہو گیا۔ دوسرے دن ہم نے سنا کہ مسجدوں سے ایک اعلان ہو رہا تھا کہ پانچ سالہ عثمان کل سے گم ہے' فلاں فلاں نشانیاں ہیں' کپڑے ایسے ہیں وغیرہ، جس کو ملے وہ فلاں جگہ پہنچا دے یا اطلاع کرے۔

لیجئے ایک اور ماں کا جگر گوشہ اس سے دور ہو گیا تھا ...... اور اسے انتظار کے اندھے

آتش فشاں کنویں میں پھینک گیا تھا......اور اللہ جانے وہ کہاں تھا اور کن حالات میں تھا۔

یہ تو بچوں کا معاملہ ہے'محسن بھائی تربیت یافتہ ہیں، دورہ عامہ کیا ہوا ہے، گاؤں سوہادا ڈھلواں کے رہنے والے ہیں، پچھلے دنوں بی اے کے پیپر دینے کے لیے لاہور چوبرجی اپنے عزیزوں کے پاس آ کر ٹھہرے ہوئے تھے، ایک دن صبح کے وقت فجر کی نماز مسجد میں پڑھنے جا رہے تھے کہ دیکھا پیچھے کچھ فاصلے پر دو داڑھی والے افراد ہاتھوں میں تسبیحیں' سروں پر ٹوپیاں پہنے آ رہے ہیں۔ وہ قریب سے گزرنے لگے تو ایک نے ایک کپڑا (رومال) نکال کر اس کے سامنے لہرایا تو وہ چکرا کر گر گیا۔ ملاقات کے وقت اس نے بتایا کہ پھر اس نے محسوس کیا کہ اسے کوئی اٹھا کر گاڑی میں ڈال رہا ہے۔ اس کے بعد اسے کچھ ہوش نہ رہا۔ ہوش اس وقت آیا جب اسے کہا جا رہا تھا کہ اٹھو اور چلو۔ سامنے پہاڑ تھا۔ وہ پہاڑ پر چڑھنے لگے۔ سات مزید اغواء شدہ جوان اس کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ چار مسلح افراد انھیں حراست میں لے کر اوپر چڑھ رہے تھے۔ ایک ان میں سے محسن کو مخاطب کر کے کہنے لگا: دھیان سے چڑھنا ہم نے تمہارا دس لاکھ لیا ہے اور دس ابھی باقی ہے۔ محسن کہتا ہے کہ میں سمجھ گیا کہ میں اغوا ہو کر علاقہ غیر میں پہنچا دیا گیا ہوں۔

پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ کر دو افراد کہیں قریب سے کھانا لینے چلے گئے۔ اب پہرے پر دو رہ گئے۔ ایک قریب ہی پیشاب کرنے چلا گیا اور آخری شخص لڑکوں پر گن تانے کھڑا ہو گیا۔ میں نے دورہ خاصہ کیا ہوا تھا، یعنی کمانڈو ٹریننگ لی ہوئی تھی، باقاعدہ تربیت یافتہ تھا، میں نے اس موقعہ پر اللہ سے مدد مانگی اور آگے بڑھ کر اس کو زور سے دھکا دیا، وہ سینکڑوں فٹ گہری کھائی میں جا گرا اور میں وہاں سے واپس بھاگ کھڑا ہوا۔ تھوڑی دیر بعد میرے پیچھے خوفناک فائرنگ ہوئی لیکن اللہ نے مجھے محفوظ رکھا۔ اب جو پہاڑ راستے میں آتا اس کو کراس کر کے آگے بھاگ پڑتا۔

میں رات دس بجے کا بھاگا صبح ساڑھے پانچ بجے ایک سڑک پر پہنچا، وہاں میں سڑک کے قریب جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھ گیا۔

جب سورج طلوع ہوا تو دور سے ایک سواریوں سے بھری گاڑی آتی ہوئی نظر آئی۔ میں سڑک پر آ گیا اور التجا کے لہجے میں دونوں ہاتھ باندھ کر سڑک کے درمیان کھڑا ہو گیا۔ گاڑی آئی اور رک گئی، میں نے ان کو سارا ماجرا بتایا اور کہا کہ اللہ کے واسطے مجھے پشاور تک پہنچا دیں، میں کبھی بھی آپ کا یہ احسان نہ بھولوں گا۔ ڈرائیور کہنے لگا: اگر تو تم بھاگ کر آئے ہو تو پھر تمہاری تلاش شروع ہو چکی ہو گی اور راستے میں گاڑی کی تلاشی بھی ہو گی' اگر تم ہمارے ساتھ ہو گے تو پھر ہماری بھی شامت آ جائے گی۔ میں نے ہاتھ باندھتے ہوئے کہا: مجھے چھوڑ کر نہ جائیں' ورنہ وہ لوگ مجھے گولیوں سے بھون دیں گے، میں رو دیا، ڈرائیور کو ترس آیا تو اس نے سواریوں سے مشورہ کیا، سواریوں نے کہا: اللہ ہمارے ساتھ ہے، ہم تمہاری مدد کریں گے، تم اس لڑکے کو بچانے کی کوشش کرو۔ ڈرائیور نے کچھ سوچ کر گاڑی کی چھت والے بکس کو کھولا' اس میں مجھے لٹا کر اوپر لکڑی کے تختے میں سانس لینے کے لیے ایک سوراخ کر کے باہر سے بکس کو تالا لگا دیا اور اس پر مزید سامان رکھ دیا تا کہ کسی کو شک نہ ہو۔ ابھی گاڑی تھوڑی دور ہی گئی تھی کہ کچھ مسلح لوگوں نے گاڑی کو گھیر لیا اور اس کی تلاشی لی۔ ڈرائیور اور سواریوں سے اپنے مفرور ملازم کے متعلق پوچھا کہ کسی نے اس کو بھاگتے ہوئے دیکھا ہو یا اس کے متعلق کچھ جانتا ہو۔ سب نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ گاڑی چل پڑی اور راستے میں پانچ مختلف جگہ مجھے پکڑنے کے لیے اس کی تلاشی لی گئی لیکن میں نہ ملا اور پھر پشاور پہنچ گیا۔

سواریاں اتارنے کے بعد ڈرائیور نے گاڑی مرمت کروانے کے بہانے سے گاڑی اڈے سے باہر نکالی اور راولپنڈی جانے والے ایک ڈرائیور سے علیحدگی میں میرا مسئلہ بیان کیا۔ اس نے تعاون کا یقین دلایا۔ اب دونوں گاڑیاں لا کر ساتھ ساتھ کھڑی کی گئیں اور میں ایک دفعہ پھر اوپر ہی اوپر خفیہ طریقے سے سابقہ گاڑی کے چھت کے بکس سے نئی گاڑی کے چھت کے بکس میں منتقل ہو گیا۔ اس گاڑی کی چھت پر چھپ کر میں راولپنڈی اور پھر وہاں سے گرتا پڑتا لاہور اپنے گاؤں پہنچ گیا۔ میرے کولہوں پر بے ہوشی کے انجکشن لگا لگا کر انہوں نے زخمی کر چھوڑا تھا۔ میں دو دن یہاں بے ہوش رہا اور اب کچھ قوت و طاقت بحال

ہونے پر چھ سات افراد کی نگرانی میں پیپر دینے جا رہا ہوں۔

میں ایک ایسی حرماں نصیب ماں سے واقف ہوں کہ جس کا بچہ بچپن ہی میں گم ہو گیا اور آج تک واپس نہیں آیا۔ ۲۲ سال گزرنے کے بعد بھی وہ اپنے لختِ جگر کے جان لیوا انتظار میں تڑپ رہی ہے، کسی جوان کو دیکھتی ہے تو کہتی ہے: اگر میرا بچہ آج ہوتا تو بالکل اس جوان جیسا ہوتا، یا کسی کو کہتی ہے کہ تیری شکل وصورت میرے گمشدہ لختِ جگر سے ملتی ہے۔ جب اسے کہا جاتا ہے کہ ماں اب جانے بھی دو، عرصہ ہو گیا اللہ جانے وہ کہاں مر کھپ گیا اور تم مرنے کے قریب ہو گئی ہو اور اس کو یاد کر کے روتی رہتی ہو، تو وہ جواب دیتی ہے: بیٹا! اگر وہ مر جاتا تو میں صبر کر لیتی ...... لیکن وہ پتا نہیں کہاں ہے؟ ...... کس حال میں ہے؟ ...... چونکہ اس کے زندہ ہونے کی امید ہے، اس لیے میں ہمیشہ اس کی راہ دیکھتی ہوں ...... جب دروازہ کھٹکتا ہے تو سمجھتی ہوں شاید وہ آ گیا ہے ...... میں کیسے بھول جاؤں اسے ...... اس نے میری کوکھ سے جنم لیا ہے ...... اس کو میں نے اپنا دودھ بوند بوند کر کے پلایا تھا ...... میرا دل تھا وہ ...... کیا پتا وہ کب واپس آ جائے ...... اور ''ماں'' کہہ کر میرے سینے سے لگ کر ٹھنڈ ڈال دے ......

چند روپوں کی خاطر معصوم بچوں کا سودا کرنے والو! ...... تم کب تک ان ماؤں کو تڑپاتے رہو گے۔ یہ زندگی تم ان دکھیاروں کی بددعائیں لے کر کسی موذی مرض کا شکار ہو کر گزار دو گے اور مر جاؤ گے، تو کیا یہ جمع شدہ روپے آپ کے سکون وچین اور آرام وراحت اور عیش کا باعث بنیں گے؟ یا دہکتی وسلگتی اور بھڑکتی دلوں تک پہنچ جانے والی شعلے مارتی آگ کا باعث بنیں گے؟ تم نے کبھی سوچا ہے کہ مائیں تم سے کتنا ڈرتی ہیں ...... وہ بے چاری کیا کریں، کدھر جائیں؟ کہاں چھپائیں اپنے بچوں کو؟ کہ ان کی بھینی بھینی اور مہکی مہکی خوشبو ہی تو انہیں جینے پر آمادہ کرتی ہے، ان کے چمن کو ...... ان کے گلشن کو اور ان کے مہکتے آنگن کو ویران کر کے ...... کیا تم اپنی قبر کو روشن اور ٹھنڈا کر رہے ہو؟

اور پھر شہ رگ کٹ گئی......

''آپی ابھی آپ نے دوسرے گھر نہیں جانا، یہیں رکیں، میں ہمسائیوں سے مل کر، سلام لے کر آتا ہوں، پھر آپ مجھے اللہ حافظ کہہ کر الوداع کریں گی تو میں نانی جان کو ملنے جاؤں گا۔'' شایان نے نہایت پیار اور معصومیت سے اپنی آپی سے التجا کی۔ ''اچھا جاؤ جلدی مل کر آؤ' میں انتظار کرتی ہوں۔'' شایان ہمسائیوں سے سلام لے کر آیا، آپی نے الوداع کہا تو وہ اپنے ابو اور امی کے ساتھ موٹر سائیکل پر سوار ہو کر اب اپنی پیاری نانی جان کی طرف جا رہا تھا۔ نئے خوبصورت کپڑوں کے ساتھ اس کے سر پر پہنی ٹوپی اسے بہت سج رہی تھی۔ شایان کے ابو جان، امی جان اور چھوٹے بھائی ریس کورس جانے والی سڑک پر سفر کر رہے تھے۔شایان کا والد یہ سوچتے ہوئے موٹر سائیکل چلا رہا تھا کہ ابھی ہم جب اس کی نانی جان کو ان کے ۱۳ سال بعد کینیڈا سے واپس آنے والے بیٹے کی شادی کی مبارکباد دیں گے تو وہ کتنی خوش ہوں گی۔ شایان کے ماموں اس کو پہلی دفعہ ٹیں ٹیں باتیں کرتے ہوئے دیکھ کر کس قدر خوش ہوں گے۔

ان خیالات کے سلسلہ کو شایان کی شوخ آواز نے توڑ دیا: ابو جان! وہ دیکھو! سامنے کتنی بڑی پتنگ سڑک کے اندر لگائی گئی ہے،ابو وہ دیکھیں! کتنی زیادہ پتنگیں لگی ہیں، پھر وہ اپنی توتلی زبان میں اپنے ابو سے کہتا چلا گیا...... دیکھیں! دیکھیں!...... کتنی زیادہ لائٹیں لگائی گئی ہیں...... سڑکوں کو کتنا زیادہ سجایا گیا ہے...... کتنا اچھا منظر بن گیا ہے۔ ہاں بیٹا! یہ سب بسنت منانے کی حکومتی تیاریاں ہیں۔ یہ سب کچھ بسنت کے لیے کیا جا رہا ہے۔شایان کے والد نے بتایا تو شایان فوراً کہنے لگا: پیارے ابو جان! ریس کورس بسنت کے لیے لائٹوں'

پتنگوں اور جھنڈیوں سے سجا ہے۔ہمیں بھی دکھا دیں ..... اور ہاں مجھے نہیں پتا، آج ہمیں چڑیا گھر کی بھی سیر کرائیں۔ دیکھیں ناں مان جائیں ابو جان! ساڑھے تین سال کے معصوم نے اپنے والد کے سامنے اپنی روشن آنکھیں چمکاتے ہوئے اصرار کیا۔اچھا بابا! سب کچھ دکھا دیں گے اپنے ننھے شہزادے کو۔ پہلے نانی اماں کے پاس چلیں گے باقی سب کچھ بعد میں دیکھیں گے۔ ابو جان! پہلے تو ہم کبھی بھی اس سڑک سے نانی جان کے گھر کو نہیں گئے۔ آپ پہلے والے راستہ ہی سے چلیں، ہم اس روڈ سے نہیں جائیں گے۔ بیٹا! دیکھو یہ سڑک کتنی صاف ستھری اور خوبصورت ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ سبزہ اور درخت کتنے اچھے لگ رہے ہیں۔ ادھر ٹھنڈی ہوا بھی چل رہی ہے۔ آج ہم اس راستہ سے چلیں گے۔ٹھیک ہے ابو جان جیسے آپ کی مرضی۔ یہ کہہ کر شایان اردگرد اور آسمان پر اڑنے والی پتنگوں کو دیکھنے لگا......

موٹرسائیکل بھاگ رہی تھی ..... شایان کی ننھی زبان اردگرد کے ماحول پر معصوم تبصرے کرتی جا رہی تھی ..... موٹرسائیکل پر ابو کے پیچھے بیٹھی امی جان بھی شایان کی معصوم، دلچسپ اور میٹھی میٹھی باتیں سن کر لطف اندوز ہو رہی تھی ..... کہ ..... اچانک ..... سامنے سے ..... ایک کٹی پتنگ کی ڈور ..... تیزی سے لکڑی کاٹنے والے آرے کی طرح ..... گردش کرتی ہوئی ان کی طرف بڑھی اور پھر ..... کچھ پتا نہ چلا کہ کیا ہو گیا ..... چشم زدن میں خون کا فوارہ ابلا ..... اور گردن کٹ کر باپ کے ہینڈل پکڑے بازو کے ساتھ آ لگی ..... اب ڈور اس کے پیچھے بیٹھے چھوٹے بھائی کو کاٹ رہی تھی ..... باپ نے چیخ کر ڈور پکڑی اور اس کی گردن سے دور ہٹائی ..... وہ سیدھی باپ کی گردن کی طرف بڑھی ..... پیچھے بیٹھی شایان کی والدہ نے جان پر کھیل کر ڈور کو پکڑا اور جرأت سے فضا میں اچھال دیا ..... موٹرسائیکل لڑکھڑائی اور گرتے گرتے بچی ..... بریک لگتے ہی دیکھا تو شایان کی گردن کٹ چکی تھی ..... صرف گوشت کا ایک چھوٹا سا لوتھڑا کٹنے سے بچ رہنے کی بنا پر اس کے ساتھ لٹک رہا تھا ..... ہائے میرا لعل! ..... ہائے میرا بیٹا! ..... میرا جگر ..... کیا ہوا تجھے؟ ..... بولتا کیوں نہیں؟ لیکن شایان کی کلکاریاں، چہکاریں خاموش ہو چکی تھیں ..... باپ اسے جنازے کی طرح بازوؤں پر اٹھا

کر سڑک پر بھاگ رہا تھا......

ماں دوسرے بچے کے چہرے اور گردن پر بہہ پڑنے والے خون کو بھول کر...... اسے سینے سے لگائے...... غشی کے دوروں میں...... شدت غم وخوف سے چلا رہی تھی...... لوگو! میرے بیٹے کو بچاؤ...... باپ پوری آواز سے چلا رہا تھا...... میرا لخت جگر مر رہا ہے...... کوئی اسے ہسپتال پہنچا دے...... اللہ کا واسطہ ہے کوئی تو گاڑی روکے...... گاڑی روکو! میری دنیا اجڑ رہی ہے...... ہائے میرا بچہ مر گیا...... باپ کی قمیص ڈور کٹنے کے بعد بہنے والے خون سے تر ہو چکی تھی...... اب خون سڑک پر گر رہا تھا...... باپ کے نالے اور فریادیں...... فضا میں بلند ہو رہے تھے...... لیکن شاید سب کو جلدی تھی...... ہر کوئی بہت مصروف تھا...... سو سب آنکھ جھپکتے ہی گزرتے جا رہے تھے...... کوئی اس کی طرف توجہ نہ دے رہا تھا...... یہ شایان کو ہاتھوں میں اٹھائے...... کٹی گردن کو سہارا دیے...... دھاڑیں مار مار کر روتا سڑک میں کھڑا بے یارومددگار تھا...... اچانک ایک مولانا صاحب نے یہ منظر دیکھتے ہی پوری قوت سے بریک لگائی...... ان کے ساتھ بھی ایک بچہ بیٹھا تھا...... جلدی اندر بیٹھیں...... یہ کہہ کر بیٹھتے ہی انہوں نے گاڑی فل سپیڈ میں چھوڑ دی...... اب سب لبرٹی میں واقع فضل ہسپتال کی ایمرجنسی میں بھاگے چلے جا رہے تھے...... ڈاکٹروں نے جلدی جلدی پکڑا...... سٹریچر پر لٹایا...... نبض چیک کی...... گردن کا معائنہ کیا...... اور پھر...... آہستہ سے...... نہایت افسوس سے نفی میں سر ہلا دیا...... بھائی آپ کا بچہ تو...... ڈور لگتے وقت ہی اس دنیا کو چھوڑ گیا ہے...... نہیں نہیں...... ایسا نہیں ہو سکتا...... ابھی تو میرا بیٹا چہک رہا تھا...... مہک رہا تھا...... لہک رہا تھا...... اللہ واسطے آپ لوگ توجہ سے دیکھو تو......؟ لیکن ڈاکٹروں کا فیصلہ وہی تھا۔ شایان ہمیشہ کے لیے اس دنیا کو چھوڑ چکا تھا...... باپ کے شفیق بازوؤں میں...... خون سے لت پت...... لٹکتی ہوئی...... کٹی ہوئی، نرم و نازک گردن کے ساتھ...... جھول رہا تھا...... ایسے لگ رہا تھا کہ اس کے ابو اور امی جان بھی...... ابھی بیہوش ہو کر گر پڑیں گے...... آخر ان کو ان کے گھر پہنچا دیا گیا۔

ہمیں اس سانحہ کا علم ہوا تو فوراً شایان کے گھر پہنچ گئے۔ باپ سے پوچھا: بیٹے نے ذور سے گردن کٹتے وقت چیخ ماری ہو یا کوئی آخری بات کی ہو؟ مثلاً ہائے ابو! میں مر گیا وغیرہ تو وہ دھاڑیں مارتے ہوئے بچوں کی طرح بلکتے ہوئے کہنے لگا: نہیں! میرے بیٹے نے تو ''اف'' تک نہ کی اور کٹ گیا، ہمیں تو اس وقت پتا چلا جب ایک سیکنڈ میں گردن کٹ کر میرے بازو پر گر گئی ...... پھر آنسو بہاتے ہوئے کہنے لگا: میں سعودیہ واپس جانے لگا تو میرے بیٹے نے اپنے ننھے ننھے بازو میری گردن میں ڈال کر کہا: بابا جان! ہمیں چھوڑ کر ابھی آپ واپس نہ جائیں، کچھ دیر اور رک جائیں ناں۔ میں اس معصوم کو خوشیاں دینے کے لیے رک گیا۔ کیا علم تھا یہ آخری ملاقات ہوگی۔ یہ اس کی آخری خواہش تھی۔ جب کبھی میں اس کی والدہ سے کسی بات پر لڑ پڑتا تو توتلی زبان میں مجھے روکتے ہوئے کہتا: پاپا! آپ پاگل ہیں جو امی سے لڑتے ہیں۔ مت لڑا کریں امی سے۔

ماں جو اس کے شوکیس میں سجے کھلونوں کو دیکھ کر رو رہی تھی اور شدت غم سے بالکل گم سم ہو چکی تھی، کہنے لگی: میرا بیٹا کہتا: امی جان! آپ مجھے مارتی ہیں، میں امریکہ سے آنے والے ماموں سے آپ کی شکایت کروں گا۔ وہ میرے آنگن کو اپنی کلکاریوں سے آباد رکھتا تھا، اب کہاں سے سنوں گی میں اس کی معصوم باتیں، ضدیں، شکوے شکایتیں، فرمائشیں اور مختلف لوگوں کے حق میں سفارشیں۔

دادی نے روتے ہوئے کہا: میرے پاس آکر پیار سے میرا ہاتھ مضبوطی سے اپنے چھوٹے چھوٹے نرم و نازک ہاتھوں میں پکڑ کر مجھے کھینچتا اور کہتا: دادی اماں! مجھے نہیں پتا، چلو پہلے ناشتہ کرو۔ اب کون مجھے کہے گا کہ دادی اماں ناشتہ کر لو اور کون مجھے پکڑ کر صحن میں خراماں خراماں چھوٹی چھوٹی چوکڑیاں بھر کر اکڑ کر چلا کرے گا۔ میں نماز پڑھتی تو میرے ساتھ کھڑا ہو جاتا اور جلد ہی کہتا: میں نے پڑھ لی ہے۔ اگر کوئی گالی دیتا تو کہتا: گالی نہیں دیتے اللہ ناراض ہو جائے گا۔

شایان کی نانی نے روتے اور سسکتے ہوئے کہا: ابھی اس نے دو دن پہلے ہی ٹیوشن پر

جانا شروع کیا تھا۔ کہتا تھا: میں ابھی چھوٹا ہوں اس لیے سکول نہیں جاؤں گا۔ وہ تو ہمارے گھر کا باتیں کرنے والا طوطا تھا' جواب ہمیشہ کے لیے اڑ کر کسی اور جہان کا باسی ہو گیا ہے اور ہم سے بہت دور چلا گیا ہے۔

اہل محلّہ بھی رو رہے تھے۔ محلّہ کے ایک دکاندار نے اس کی محبت میں اپنی دکان کا پتنگ بازی کا پچاس ہزار روپے کا سامان جلا کر آئندہ سے اس قاتل کاروبار سے توبہ کی۔

سوال یہ ہے کہ کیا آپ کا اپنا یا آپ کی بہن کا بھی ایسا ہی کوئی معصوم شایان ہے...... کیا آپ چاہتے ہیں کہ اس کی گردن ...... اس کی شہ رگ ...... آپ کے سامنے بے دردی سے کاٹ دی جائے ...... نہیں؟ ...... تو پھر آج ہی سے اس شیطانی کھیل کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دیں ...... اگر ایسا نہ کیا تو پھر اللہ نہ کرے کسی تیز دھار ڈور کے اوپر آپ کے شایان کا بھی نام لکھ دیا جائے گا ...... پھر آپ کا مہکتا آنگن بھی اس مہکتے پھول کی خوشبو سے ہمیشہ کے لیے خالی ہو سکتا ہے۔

یہ فعل اور رسم بد ترک کر کے کسی کے شایان کو بچائیں تو آپ کا ذی شان اور بچہ بھی محفوظ ہو جائے گا۔ ایک مسلمان ہونے کے ناطے یہی آپ کے شایان شان ہے۔ ورنہ کسی بھی وقت جزا و سزا کا قانون حرکت میں آ سکتا ہے۔ اس کے گھر میں دیر تو ہو سکتی ہے مگر اندھیر نہیں۔

زندگی افسانہ بن کے رہ گئی ہے

شام کا وقت تھا، ہر طرف اندھیرا چھا چکا تھا، ہم لٹے پٹے تباہ حال زخموں سے چور چور زلزلہ زدگان کی خیمہ بستی میں داخل ہوئے۔ ہمارے رہبر نے بتایا کہ آپ کی ملاقات ایک ایسی بچی سے نہ کرواؤں کہ جس کا بازو کاٹ دیا گیا ہے...... بازو کاٹ دیا گیا ہے!!...... مگر کیوں؟ کہنے لگا: یہ تو آپ اسی سے پوچھ سکتے ہیں۔ ہاں ہم اس بچی سے ضرور ملیں گے۔ وہ ہمیں سیدھا ایک خیمے کے سامنے لے گیا۔ اطلاع دی گئی تو اجازت ملنے پر ہم خیمہ میں ایک چھوٹے سے خاندان کے سامنے بیٹھے تھے۔ ان میں تین بچیاں شبانہ، فرزانہ، افسانہ اور دو بھائی عبدالباسط اور واجد غم واندوہ اور خاموشی کا پیکر بنے بیٹھے تھے۔ ان کا تعلق مظفر آباد کے گاؤں منڈگراں سے تھا۔

جھکی نگاہیں، اداس سوچیں، بھیگی پلکیں، بستر سے ٹیک لگائے زندگی کے سولہویں سال میں داخل ہونے والی یہ بچی افسانہ اپنے بازو کو چادر میں چھپائے، سر ڈھانپے، خاموش، اجڑے مسافر کی مانند بیٹھی تھی۔ ہم نے کہا: افسانہ بہن! آپ نے یہ بازو پر چادر کیوں ڈال رکھی ہے؟ وہ دھیمے لہجے میں بولی: بھیا! یہ سارا بازو تو کٹ چکا، بس تھوڑا سا کندھے کے قریب سے باقی بچا ہے۔ پھر اس نے چادر ہٹائی تو ہم یہ دیکھ کر غم واندوہ میں ڈوب گئے کہ یہ تو ایک ٹنڈ منڈ بازو تھا۔ زندگی کی بہار پر خزاں کی پرچھائیاں تھیں۔ مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے یہ بہن کہہ رہی ہو اس رنگین اور خوشیوں سے معمور دنیا میں میں کیسے شریک ہو سکتی ہوں؟ میں نے کہا: بہن! ہمیں بتائیں آپ کا یہ بازو کیسے کٹ گیا...... تو وہ سوچوں میں ڈوب گئی۔ میں نے دیکھا جیسے وہ ماضی قریب کے دھندلکوں میں کھو گئی ہو۔ اس کے دل و دماغ کے پردہ

سکرین پر وہ خوفناک فلم چل پڑی ...... خیمے کے خاموش ماحول میں اس کی آواز دور کسی گہرے کنویں سے آتی ہوئی سنائی دی۔ وہ کہہ رہی تھی ......

میں اپنے گھر کے آنگن کی دیوار پر مٹی کا لیپ کر رہی تھی۔ یہی کچا گھر ہی ہماری جنت تھی۔ اس کی لپائی کرنے کے بعد ہم سمجھتے تھے کہ امیر لوگوں کے بنگلے سے بھی زیادہ خوبصورت ہوگیا ہے۔ آج میں ایک بار پھر لپائی کرتے ہوئے اپنے گھر کو خوبصورت بنا رہی تھی ...... کہ میرے پاؤں کے نیچے زمین لرزنے لگی۔ وہی دیوار جس پر میں نہایت پیار سے لپائی کر رہی تھی میرے ہاتھ کو خلا میں چھوڑ کر پیچھے ہٹ گئی اور پھر میرے ہاتھ کے ساتھ آ ٹکرائی ...... میں لڑکھڑائی، چکرائی ...... اور ایک زور دار دھچکا لگنے پر ...... اوندھے منہ ...... زمین پر آن گری۔ ابھی میرا سر زمین سے ٹکرایا ہی تھا ...... اور میں سنبھلنے بھی نہ پائی تھی ...... اور نہ اٹھ ہی پائی تھی کہ ...... دھڑام سے دیوار میرے کمزور جسم پر آن گری۔ مجھے ایسے لگا کہ جیسے کسی نے لوہے کے ہتھوڑوں کی ضربوں سے میرے جسم کو چور چور کر دیا ہو۔ میری آنکھیں تکلیف کی شدت سے بند ہونے لگیں۔ پھر میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور میں بیہوش ہوگئی۔

میرے والد گھر سے باہر گئے ہوئے تھے۔ جب زلزلہ تھما تو وہ پوری شدت کے ساتھ گھر کی طرف سرپٹ دوڑ پڑے۔ گھر پہنچ کر دیکھا تو دیوار کا ملبہ زمین پر پڑا تھا۔ اس میں انہیں میرا سر نظر آیا۔ وہ دیوانوں کی طرح ملبہ ہٹانے لگے۔ میرے چچا بھی ساتھ مل گئے اور انہوں نے مجھے ملبے سے نکال لیا۔ میرا پورا جسم خون سے لت پت تھا۔ میرا ایک بازو بھاری پتھروں کے نیچے کچلا جانے کی بنا پر قیمہ بن گیا۔ اس کی ہڈی ٹکڑے ٹکڑے ہو چکی تھی۔ مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ بازو کٹ چکا تھا اور گوشت کے ایک ریشہ کے ذریعہ جسم کے ساتھ لٹکا جھول رہا تھا۔ میرے بدنصیب باپ اور چچا نے مجھے میت کی طرح اپنے بازوؤں پر اٹھاتے ہوئے لا کر میدان میں لٹا دیا۔ اب مجھے ہوش آ چکا تھا۔ تکلیف کی شدت کی بنا پر مجھے دورے پڑ رہے تھے۔ دل ڈوبتا جا رہا تھا۔ میرا باپ میرے منہ میں پانی ڈال رہا تھا۔ میں نے ہوش

میں آتے ہی دیکھا کہ میرے بازو پر کپڑا ڈالا ہوا ہے۔ میں چیخے جا رہی تھی: ابو جان! میرا بازو ختم ہو گیا، ٹوٹ گیا، ابو! میرا بازو کٹ گیا ہے..... میرا بازو ختم ہو گیا ہے..... اب میں کیا کروں گی؟..... ابو! مجھے فوراً کسی ڈاکٹر کے پاس پہنچاؤ ورنہ میں ساری زندگی کے لیے اپاہج ومعذور ہو جاؤں گی۔ ابو جان! جلدی کیجئے۔ ابو جان روتے ہوئے کہنے لگے: پہاڑوں کے پھٹنے سے راستے بند ہو چکے ہیں۔ تمام راستے سلائیڈنگ کی وجہ سے منقطع ہو گئے ہیں۔ میری بچی، میری جان! میں تجھے کہاں لے جاؤں؟ اب اللہ کی مدد کا انتظار کرتے ہیں' شاید وہ ہماری مدد کے لیے کسی کو بھیج دے۔ فوج کے کسی امدادی ہیلی کاپٹر کا انتظار تھا لیکن وہ نہ آیا اور شام ہونے کو آ گئی پھر یکدم طوفان آ گیا۔ تیز آندھی اور ساتھ ہی بارش شروع ہو گئی۔ سر پر چھت نہ تھی۔ میدان میں مجھے لٹایا ہوا تھا۔ باپ نے میرے دوپٹے کو میرے سر اور منہ پر ڈال دیا، میں اس طوفانی بارش میں خون میں لت پت بیہوش پڑی تھی۔ میرا شفیق باپ برستی بارش میں بھی مجھ پر شجر سایہ دار بنا ہوا تھا اور ہاتھ اٹھا اٹھا کر روتے ہوئے اللہ کے حضور التجائیں کر رہا تھا یا اللہ! میری افسانہ کو بچا لینا۔

مجھے ہوش آتا تو میں ہائے درد، ہائے درد کہہ کر پھر بیہوش ہو جاتی۔ اب اولے پڑنے لگے۔ میرا شفیق باپ مجھ پر جھک گیا اور اولوں کو اپنے جسم پر سہنے لگا' تاکہ میرا چہرہ اور زخمی بازو اولے لگنے سے مزید خراب نہ ہو جائیں۔ اسی طرح بارشوں، طوفانوں، سرد برفانی ہواؤں، بھوک پیاس اور درد والم کا مقابلہ کرتے ہوئے دو دن گزر گئے لیکن کوئی ہماری مدد کو نہ پہنچا اور نہ کوئی ہیلی کاپٹر ہی ادھر آیا۔ میرے باپ سے میرا کراہنا دیکھا نہ جاتا تھا لیکن وہ مجبور تھا۔ ہر طرف کے راستے بند ہو جانے کی بنا پر ہم پہاڑوں کے قیدی بن کر رہ گئے تھے۔

تیسرے دن میرے باپ نے بچ جانے والے رشتہ داروں، عزیزوں اور واقف کاروں کے سامنے ہاتھ جوڑ کر میری زندگی بچانے کی بھیک مانگنا شروع کی۔ وہ کہہ رہا تھا: میری بچی کا کچھ کرو ورنہ وہ مر جائے گی۔ وہ کہتے: ہم کیا کریں، ہمارے اپنے زخمی ایسے ہی پڑے ہیں۔ آخر کچھ لوگوں کو ترس آیا انہوں نے ابو اور چچا کے ساتھ مل کر مجھے چارپائی پر ڈالا اور

جنازہ کی طرح اٹھا کر پہاڑوں پر چڑھ گئے۔ یوں پہاڑوں کو روندتے' کراس کرتے ہوئے لمبا راستہ طے کرنے کے بعد یہ ۶ آدمی مجھے شہید گلی کے قریب لے آئے۔ یہاں ہم نے فرشتے دیکھے، ہاں رحمت وشفقت کے فرشتے، جن کے چہروں پر سجی داڑھیاں بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ ان کے شفاف کپڑے خون سے بھرے تھے۔ وہ پہاڑوں سے اترنے والے لوگوں کو برق رفتاری سے اٹھا کر اپنی گاڑی میں لٹا رہے تھے۔ گاڑی فراٹے بھرتی بھاگ جاتی اور اس کی جگہ نئی گاڑی آ کھڑی ہوتی۔ ان کو دیکھتے ہی میرے باپ نے کہا: بیٹا روؤ مت، اللہ نے فرشتے بھیج دیے ہیں۔ اب تُو جی سکے گی، مرے گی نہیں۔

ان باریش جوانوں کی نظر جونہی ہم پر پڑی وہ لپک کر ہم تک پہنچ گئے۔ مجھے دیکھتے ہی ابو سے مخاطب ہوئے: چاچا جان! بہن کو گاڑی میں لٹائیں' چنانچہ مجھے گاڑی میں لٹا دیا گیا اور وہ گاڑی دوڑاتے چھلہ بانڈی میں قائم جماعت الدعوۃ کے ریلیف کیمپ میں لے آئے۔ ڈاکٹروں نے مجھے فوراً چیک کیا، فرسٹ ایڈ دی اور کہا کہ بیٹی کو فوراً ہیلی کاپٹر کے ذریعے پنجاب کے کسی بڑے ہسپتال میں پہنچایا جائے، چنانچہ یہ فرشتہ صفت جوان مجھے گاڑی میں ڈال کر ہیلی پیڈ پر لے گئے اور ہیلی میں سوار کر کے کسی انجانی منزل کی طرف روانہ کر دیا۔ میں ہیلی کے اڑتے ہی بیہوش ہوگئی جبکہ ابو امی اور بہن بھائیوں کو جماعت والے اپنے کیمپ میں واپس لے گئے۔ اب میں اکیلی ہواؤں کے دوش پر سفر کرتے ہوئے زندگی کی تلاش میں رواں دواں تھی۔

جب میری آنکھ کھلی، ہوش آیا تو میں نے اپنے آپ کو ایک ہسپتال کے بیڈ پر لیٹے پایا۔ معلوم ہوا یہ راولپنڈی کا ہسپتال ہے۔ میں نے اپنے سراپے کا جائزہ لیا تو اپنا بازو غائب پایا۔ نرس نے بتایا تمہاری زندگی بچانے کے لیے تمہارا بازو کاٹنا ضروری تھا۔ اب میں ایک ٹنڈ منڈ درخت کی مانند ہوا کے تھپیڑے سہنے کے لئے زندگی کے لق و دق صحرا میں کھڑی رہ گئی تھی۔ میں اپنے کٹے بازو کو دیکھ کر رو دی۔ میں مسلسل رو رہی تھی لیکن مجھے چپ کرانے کے لیے کوئی میرے پاس نہ تھا۔ والدین اور بہن بھائی جماعت کے کیمپ میں مجھ سے بے خبر مگر

منتظر و پریشان بیٹھے تھے۔

میں ڈاکٹروں سے رو رو کر التجائیں کرنے لگی کہ میرے والد کو میرے پاس بلاؤ، میں اکیلی ہوں۔ کسی کو معلوم ہی نہ تھا کہ میرا والد کون ہے اور کہاں ہے؟ لہٰذا وہ چپ چاپ گزر جاتے۔ یوں روتے دھوتے چھ دن گزر گئے۔ ایک دن میں نے کسی کی منت کر کے ایک عزیز کے گھر فون کروایا کہ میں راولپنڈی کے فلاں ہسپتال میں ہوں اور آپ کو یاد کر کے رو رہی ہوں۔ میرے والد کو اطلاع ملی تو وہ بیقراری کے عالم میں فوراً میرے پاس پہنچ گئے اور مجھے زندہ دیکھ کر اللہ کا شکر ادا کرنے لگے۔ ہسپتال والوں نے کہا: اپنی بیٹی کو لے جاؤ اور اب اس کے زخموں کی پٹی اور دیکھ بھال کسی اچھے ڈاکٹر سے کرواتے رہنا۔ باپ مجھے ساتھ لے کر مظفر آباد جماعت الدعوۃ کے کیمپ میں آ گیا۔ جماعت والوں نے ہمیں علیحدہ خیمہ، راشن، بستر، کپڑے اور برتن وغیرہ دے دیے اور جماعت کے ڈاکٹر میری نگہداشت اور علاج کرنے لگے۔

اب میں صحت یاب ہو چکی ہوں۔ میرے زخموں پر پٹی کی جا رہی ہے۔ یہ ظاہری زخم تو مندمل ہو چکے ہیں لیکن ایک گہرا گھاؤ جو مجھے اندر سے لگا ہے، اگرچہ بازو کٹ جانے کے بعد میں اسے تقدیر کا لکھا سمجھ کر صبر کر چکی ہوں ...... لیکن پھر بھی ایسی سوچیں مجھے گھیر لیتی ہیں کہ ہمارے اس معاشرے میں ایسے شخص کو معذور و کمتر سمجھا جاتا ہے۔ اگر مرد بھی ہو اور وہ اپاہج ہو تو دوسرے درجے کا شہری سمجھا جاتا ہے، کوئی اسے قبول نہیں کرتا، وہ معاشرے کے رحم و کرم پر ہوتا ہے ...... تو پھر بچیاں ...... حوا کی بیٹیاں ...... جو مجھی ہی پرایا دھن جاتی ہیں ...... آج کے ماڈرن دور میں تو اچھی اچھی پڑھی لکھی لڑکیوں کو بھی قبول نہیں کیا جاتا ...... تو میرے جیسی غریب و پسماندہ لڑکی کا مستقبل کیا ہوگا؟ ...... کون مجھے قبول کرے گا؟ ...... کیا بنے گا میرا؟ میں نے تو زندگی کے سہانے سپنے سجا رکھے تھے ...... بڑے حسین خواب تھے میرے ...... انہی خوابوں کی تعبیر کے لیے ہی تو اپنے گھر، اپنے آنگن ...... اپنے آشیانے کی لپائی کر رہی تھی ...... سجا رہی تھی ...... چمکا رہی تھی ...... لیکن میرے گھر کا آنگن ہی میری

تمناؤں، خواہشات اور خوشیوں کا مدفن بن گیا۔ اپنے خوابوں کے بکھرے حسین مستقبل کے ساتھ ...... اپنے کٹ جانے والے بازو ...... تباہ شدہ گھر کے ساتھ میری زندگی بھی ایک افسانہ بن کر رہ گئی ہے ...... میں افسانہ کہیں فسانہ نہ بن جاؤں۔ اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کی دعاؤں کے نتیجے میں اب ان کے درمیان واپس آ چکی ہوں۔ وہ سب مجھے دیکھ کر بہت خوش ہیں لیکن میں اپنے مستقبل سے پریشان ہوں۔ زندگی کے باقی دن اب جماعت کے کیمپ میں گزر رہے ہیں۔ یہ لوگ غموں، پریشانیوں دکھوں اور تکلیفوں سے ہمیں نکالنے اور ہماری دلجوئی کے لیے دن رات ایک کیے ہوئے ہیں۔ میں ان کے لیے دعا گو ہوں کہ اللہ ان کو ہمیشہ قائم رکھے، عزت دے اور اپنے لئے دعا گو ہوں کہ اے کائنات کے مالک! مجھے اپنے پیارے والدین کے لیے پریشانی و آزمائش نہ بنانا' ان کو میرے غم میں نہ گھلانا اور مجھ افسانہ کو فسانہ بننے سے بچانا۔ آمین!

ثوبیہ کہاں ہے؟

میں (خانی زماں پاج گراں مظفر آباد) مکان کے سامنے کھڑا تھا، دیکھا کہ دیواریں میری طرف گرتی چلی آ رہی ہیں، میں بھاگ کھڑا ہوا۔ دیواریں گر پڑیں، سب گھر والے نیچے دب گئے۔ واپس پلٹا، لوگوں کو ساتھ ملا کر ملبہ ہٹانے لگا، ۱۳ سالہ صائمہ بیٹی کو نکال لیا۔ جب پورا ملبہ ہٹا لیا تو میں نے دیکھا کہ میں تو لٹ چکا تھا...... میری شریک حیات، بیٹی، پیارا بھائی، خالہ اور ماموں جان سب مجھے چھوڑ کر دوسرے جہاں جا چکے تھے۔ چار بچے (قمر زمان عمر ۱۲ سال، نجاد ۱۱ اور صائمہ ۱۳ سال) سکول سے واپس آ چکے تھے' لیکن ان میں میری پیاری بیٹی' ۱۵ سالہ ثوبیہ موجود نہ تھی۔ اس کا سراغ لگانے کے لئے چند افراد کو دوڑایا' لیکن سب ناکام واپس آ گئے۔ شام کو مجاہدین نے آ کر بتایا کہ آپ کی بچی فلاں سکول کے باہر شدید زخمی تھی، اس کے منہ میں پانی ڈالتے تو منع کرتی اور کہتی: میرے پیارے باپ کو میرے زخمی ہونے کی اطلاع فلاں فون نمبر پر دے دو۔ یہی کہتے کہتے اس کی سانسیں اکھڑ گئیں اور وہ بہت دور چلی گئی...... ٹیلی فون کا نظام تو تباہ و برباد ہو چکا تھا اس لئے ہم خود آپ کے پاس پہنچے ہیں۔ ہائے میری لاڈلی بیٹی مجھ سے بچھڑ گئی۔ آج ہی سکول جانے سے پہلے دس روپے مانگ رہی تھی اور کہہ رہی تھی: بابا! آج مجھے خوف آ رہا ہے، سکول نہیں جانا چاہتی، مجھے سکول نہ بھیجو، ہائے اللہ!...... میں نے اس بچی کو زبردستی ڈانٹ کر سکول بھیج دیا۔ وہ جاتے جاتے اپنی دادی سے پرجوش انداز میں کہہ رہی تھی: دادی اماں! دیکھنا ذرا، اس دفعہ رمضان المبارک میں اگر آپ ایک دفعہ قرآن ختم کریں گی تو میں دو دفعہ ختم کروں گی اور حسرت بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی'' کاش! میں حافظہ (حافظ قرآن) بن جاؤں''۔

میں مجاہدین کی اطلاع پر اڑ کر سکول سے ملحقہ مکان میں پڑی لاشوں سے اپنی پھول سی ثوبیہ کو اٹھا لایا لیکن اس زلزلہ زدہ کٹی پھٹی زمین میں کوئی اس کا جنازہ اٹھانے اور پڑھنے والا بھی نہ بچا تھا...... کوئی اس کی قبر بنانے والا موجود نہ تھا۔ کوئی جنازہ پڑھنے اور پھر دفنانے والا نظر نہ آتا تھا۔ میرے گھر میں پانچ میتیں بے گور و کفن پڑی تھیں، لوگوں کے سامنے ہاتھ باندھ کر منتیں سماجتیں کر رہے تھے کہ ہماری میتوں کو کفنا دفنا دو، لیکن ہر کوئی بے اعتنائی سے کہتا: بابا! میں کیا کروں؟ میرے تو اپنے جنازے پڑے ہیں' میں تمہاری میتوں کا کیا کروں؟ کوئی ہماری سن نہیں رہا تھا۔ ہم اس لئے بھی پریشان تھے کہ ہماری میتوں کو ابھی تک کفن نہیں دیا گیا تھا۔ اس لئے کہ ہمارے پاس تو اب کفن بھی نہیں تھا۔ ایسی حالت میں مجاہدین فرشتے بن کر اپنی گاڑیاں لے کر آئے۔ انہوں نے ہماری دبی ہوئی باقی لاشوں کو بھی نکالا، زخمیوں کی مرہم پٹی کی اور ہمیں کفن مہیا کیے...... اور پھر انہوں نے ہماری میتوں کے لئے قبریں کھودیں، میتوں کو کفنایا، خود ہی صف باندھ کر ان پر جنازہ پڑھا، پھر ان کو دفنا کر دعا کی......

جنازہ پڑھا کر ہم واپس آئے تو میری بھتیجیاں رو رو کر کہنے لگیں: تایا ابو! امی تو چھوڑ گئی ہے...... کہیں آپ بھی ہمیں چھوڑ نہ جانا...... جہاں جا رہے ہو ہمیں بھی وہاں ساتھ ہی لیتے جاؤ...... یہ زمین پھر ہل رہی ہے...... یہ ہمیں کھا لے گی...... یہ پہاڑ ہم پر گر جائے گا...... ان حالات میں یہ مجاہدین ہمیں شوائی نالہ چھلہ باندی میں اپنے (جماعۃ الدعوۃ کے) کیمپ میں لے آئے ہیں۔ انہوں نے ہمیں خیمہ، بستر، کھانا پینا، ادویات' راشن' کپڑے اور جوتے وغیرہ سب کچھ دے دیا ہے، بدلے میں ہم لٹے پٹے ان کو صرف دعائیں دے رہے ہیں۔

اب ہم یہاں آرام سے رہ رہے ہیں۔ میری چھوٹی بچیاں، پیار اور لاڈ کرنے والی بڑی بہن کو یاد کر کے روتی ہیں اور مجھ سے پوچھتی ہیں: بابا! ثوبیہ باجی کہاں ہے؟ امی کہاں ہے؟ میں ان کو کیا بتاؤں؟ میری ننھی پہلی کلاس کی طالبہ عروسہ جو ثوبیہ کے بغیر سوتی نہ تھی، اب اسے خاص طور پر سوتے وقت ثوبیہ نظر نہیں آتی تو روتی اور کہتی ہے: مجھے ثوبیہ لا کر دو۔ میں اسے کہاں سے لا کر دوں؟ ثوبیہ!!...... ''وہ تو یقیناً جنتوں کی مہمان بن چکی ہے، اب تو اسے اکیلے سونے کی عادت ڈالنی پڑے گی......

اب ہم پکے سکول میں کبھی نہ پڑھیں گے!!

''آج ٹیسٹ ہوگا، تمام طالب علم اپنے کلاس روم سے باہر آ جائیں اور لائنوں میں بیٹھ جائیں'' ٹیچر صاحب ہمیں حکم دے رہے تھے۔ میں (محمد وقاص) چھٹی کلاس کا طالب علم تھا، حکم ملتے ہی میں بھی گورنمنٹ ہائی سکول بٹل کے دوسرے طالب علموں کی طرح باہر آ کر ٹیسٹ میں شریک ہوگیا۔ پیپر تقسیم ہو چکے تھے، تمام لڑکے لائنوں میں بیٹھے خاموشی سے پیپر حل کر رہے تھے' ٹیچر صاحب ہماری نگرانی کر رہے تھے کہ...... اچانک ہمارے گتے (کلپ بورڈ) ہمارے ہاتھوں میں ہونے کے باوجود ادھر ادھر حرکت کرنے لگے۔ ہم نے دیکھا زمین تیزی سے ہل رہی تھی، ساتھ ہی ہم بھی حرکت کر رہے تھے اور ادھر ادھر ایک دھچکے سے گر رہے تھے، پھر زلزلے کا ایک زوردار جھٹکا لگا...... اور گتے ہمارے ہاتھوں سے چھوٹ کر ہلتی ہوئی زمین پر جا گرے۔ ہم حیران و پریشان اور خوفزدہ ہو کر ادھر ادھر دیکھ رہے تھے کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ ٹیچرز چلائے ''بھاگو بچو! باہر بھاگو، زلزلہ آ گیا ہے'' پھر اتنا کہتے ہی انہوں نے سکول سے باہر دوڑ لگا دی۔ میں بھی کچھ لڑکوں کے ساتھ بھاگم بھاگ سڑک پر آ گیا۔ چھوٹے چھوٹے بچے بھی جلدی سے اٹھے اور باہر کی طرف لپکے...... لیکن ان سے زور سے اور تیزی سے بھاگا نہیں جا رہا تھا...... ابھی وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے بھاگ ہی رہے تھے کہ...... بھاری بھرکم بلڈنگ دھڑام سے ان پر آن گری...... ایک پل میں روتی ہوئی معصوم آوازیں دب گئیں...... ٹیچروں نے بڑے لڑکوں کو پکارا کہ چھوٹے بچوں کو ملبے سے نکالو...... لڑکے جلدی جلدی مل کر ملبہ ہٹانے لگے۔ اب سب استاد...... زندہ بچ جانے والے اور ملبے کے نیچے دب کر زخمی ہونے والے بچے...... سب ہی دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ وہ

بلند آواز سے اللہ کا ذکر کر رہے تھے۔ ۵۰ بڑے طالب علم اور قریبی دکاندار مل کر بچوں کو ملبے سے نکال رہے تھے' جبکہ باقی تمام طالب علم جان بچانے کے لیے کہیں دور بھاگ گئے تھے۔ اینٹیں، سریہ اور سیمنٹ کے بلاک اٹھا اٹھا کر بچوں کو نکالا جا رہا تھا۔ چھوٹے چھوٹے بچے بری طرح کچلے جا چکے تھے۔ وہ شدید زخمی اور لہولہان تھے۔ ان کو نکال کر سڑک پر لا کر لٹایا جا رہا تھا۔ سڑک خون سے سرخ ہو چکی تھی۔ کچلے جانے کے بعد جو بیہوش تھے وہ آنکھیں بند کیے بے سدھ پڑے تھے...... اور جو ہوش و حواس میں تھے وہ درد سے کراہ رہے تھے...... میں دیکھ رہا تھا کہ ننھے بچوں کے پیٹ پھٹ چکے تھے...... ٹانگیں ٹوٹ چکی تھیں، ہر طرف خون ہی خون بکھرا پڑا تھا...... جن کے پیٹ پھٹ چکے تھے' ان کی زبان لڑکھڑا رہی تھی اور منہ سے کوئی بات نہ نکل رہی تھی...... ان کے منہ میں پانی ڈالا گیا لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا...... یوں وہ سب سسک سسک کر مر گئے۔ کچھ کو اٹھا کر قریبی گاؤں تلگراں لے جایا گیا جبکہ باقی بچنے والوں میں سے چند ایک کے تو ماں باپ یا عزیز آئے اور ان کو اٹھا کر لے گئے' اس کے علاوہ دوسرے وہاں پڑے سب بچے اللہ تعالیٰ کے پاس چلے گئے۔

جب میں نے یہ مناظر دیکھے تو ہوش و حواس کھو بیٹھا، جب مجھے ہوش آیا تو خوفزدہ ہو کر گھر کی طرف بھاگا' دیکھا کہ گھر ٹوٹ پھوٹ کر گر چکا تھا' لہٰذا اب ہم والدین کے ساتھ جماعت کی خیمہ بستی میں آ گئے ہیں۔ یہاں میں جماعت کے عارضی خیمہ سکول میں پڑھنے جاتا ہوں۔ اگر کوئی دوبارہ ہم کو سکول تعمیر کر کے اس میں پڑھنے کے لیے جانے کو کہے تو ہم اب کبھی بھی پکے سکول میں نہ جائیں گے اور نہ اب ہم پکے مکانات بنا کر اس میں رہیں گے، بلکہ خیموں میں رہ کر ہی زندگی گزار دیں گے...... عمارتوں سے اب ہمیں ہر وقت بہت خوف آتا ہے۔ میرے سکول میں ۵۰ بچے میرے سامنے قیمہ بن کر مر گئے۔ میں ڈرتا ہوں کہ اگر میں دوبارہ پکے سکول میں گیا تو کہیں میرے ساتھ بھی ایسا ہی نہ ہو جائے۔

یتیموں اور بیواؤں کا غم

''مظفر آباد، بالا کوٹ اور زلزلہ سے متاثرہ دیگر علاقوں میں ہم نے بیوگان اور یتیموں کو ترجیحی بنیادوں پر امداد فراہم کی ہے۔ ہم نے ان کو خشک راشن خوراک بستر اور خیمہ جات ان کے گاؤں میں ان کی جائے رہائش پر پہنچائے ہیں۔ اب ہم یتیموں اور بیوگان کیلئے 5 ہزار فٹ کی بلندی پر برفباری سے قبل گھر تعمیر کر رہے ہیں۔ اب تک بالاکوٹ کے گردونواح میں اتنے گھر تعمیر ہو چکے ہیں۔''

ایسی باتیں ہمارے ساتھ بالا کوٹ میں مصروف ریلیف آپریشن کا ایک ذمہ دار بھائی ابوعبداللہ کر رہا تھا۔ ہم چلتے جا رہے تھے، اس کی باتیں سنتے جا رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ سوچتے جا رہے تھے کہ اس وقت سب ہی ایسی باتیں کر رہے ہیں کہ ہم نے یہ کر دیا، ہم نے وہ کر دیا، یا ہم ایسے کریں گے۔ کئی ایک نے تو ملک بھر میں بورڈ لگا رکھے ہیں جن پر اپنی زلزلہ سے متاثرہ علاقوں میں کارکردگی ظاہر کی گئی ہے لیکن ایسی کئی تنظیموں کو جب مظفر آباد جا کر دیکھا تو سمجھ آئی کہ شور زیادہ ہے اور زور کم۔ ایسے ہی یہ ساتھ چلنے والے بھائی بھی اپنی کارکردگی ظاہر کر رہے ہوں گے۔ میرے ساتھ چلنے والے بھائی صاحب کا تعلق جماعت الدعوۃ سے تھا۔ اس جماعت کا ملک میں اگرچہ بہت شاندار کردار ہے لیکن اللہ جانے کیوں تنقیدی انداز میں یہ سوچیں میرے ذہن میں گھوم گئیں اور میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا:
بھائی صاحب! میرے ساتھ شبیر سلفی بھائی ہیں، ان کے پاس ڈیجیٹل کیمرہ ہے، ہم آپ کے ان گھروں کی تصویریں لینا چاہتے ہیں جو آپ نے یتیموں اور بیوگان کیلئے تعمیر کیے ہیں۔ کیا آپ ہمیں وہ گھر دکھا سکتے ہیں!؟ میری توقع کے خلاف اس بھائی نے فوری جواب دیا

کہ کیوں نہیں، آیئے ابھی چلتے ہیں۔ اور پھر جماعت کا یہ بھائی ہمیں گاڑی میں بٹھا کر بالا کوٹ سے باہر مانسہرہ کی طرف چل پڑا۔ گاڑی فراٹے بھرتی بھاگتی چلی جا رہی تھی اور اب ہم اپنی سوچ کو کچھ تبدیل کر چکے تھے کہ یہ آدمی سچ ہی کہتا ہوگا، اسی لئے تو فوراً چل پڑا اور ابھی یہ ہمیں کہیں گاڑی سے اتار کر نئے تعمیر شدہ مکان دکھا دے گا اور ہم واپس بالا کوٹ آ جائیں گے۔ انہی سوچوں میں مگن تھا کہ بھائی عبداللہ کی آواز آئی کہ اتریے جناب! میں نے چونک کر دیکھا گاڑی پہاڑوں کے اوپر جاتے ہوئے ''اپر بھیڑیاں'' کے ایک راستے کے سامنے رکی ہوئی تھی۔

اب ہم پہاڑ پر چڑھنے لگے۔ دل میں تھا کہ ہم پہنچ گئے ہیں لیکن یہ کیا!! ہم اوپر ہی اوپر چڑھتے چلے گئے۔ آخر ٹانگیں لڑکھڑانے لگیں۔ سانسیں پھول گئیں۔ ہمت جواب دے گئی۔ ایک عرصہ بعد پہاڑوں پر چڑھے تھے۔ بھائی عبداللہ نے پوچھا: طاہر بھائی تھک تو نہیں گئے؟ میں نے برجستہ جواب دیا: ''نہیں تو، ابھی تو ہم جوان ہیں، آپ جہاں چاہیں لے چلیں، ہم تیار ہیں۔'' ہم نے یہ بات یہ سوچ کر کہی تھی کہ شاید اب منزل مقصود پر یا اس کے قریب پہنچ چکے ہیں لیکن منزل ابھی بہت دور تھی۔ شبیر احمد سلفی بھائی نے تو صاف لفظوں میں بغیر جھجک کے اعتراف کر لیا کہ ہم تھک گئے ہیں چلا نہیں جا رہا۔ ہمیں کراچی کے ابومجاہد ندیم بھائی کا بالا کوٹ کے لئے روانہ ہونے والے الدعوۃ سرجیکل موبائل ہسپتال کی تصویر لینے کے لئے 28 گھنٹے کا تھکا دینے والا سفر اس کے مقابلہ میں بہت ہلکا نظر آیا۔

بہر حال اس طرح ہم دل ہی دل میں اپنی تحقیق کے جذبے کو کوستے ہوئے اوپر ہی اوپر چڑھتے گئے۔ ایک جگہ بھائی نے بتایا کہ لیجئے تصویر لیجئے تو ہماری جان میں جان آئی۔ یہ پہاڑی علاقے میں جماعت کی طرف سے بڑے سائز کی ایک نئی تعمیر ہونے والی مسجد تھی۔ تصویر کے بعد پتہ چلا کہ بیوگان کے تعمیر ہونے والے گھر ابھی اوپر ہیں تو ایک دفعہ پھر واپس جانے کی امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ مرتے کیا نہ کرتے، دل کڑا کر کے اوپر چڑھتے گئے۔ آخر ہم منزل مقصود پر پہنچ ہی گئے۔ یہ سطح سمندر سے پانچ ہزار فٹ بلند ایک گاؤں تھا۔ سامنے

ایک ادھیڑ عمر خاتون سر پر ایسے پٹکا باندھے بیٹھی تھی جیسے سر میں شدید درد ہو یا جیسے لٹا پٹا مسافر سوچوں میں گم بیٹھا ہو۔ جماعت کے کارکن بھائی عبداللہ نے دور سے ہی آواز لگائی ''پردہ'' پھر آناً فاناً خواتین پردے میں ہو گئیں۔ دو بزرگ ہمارے استقبال کیلئے آگے بڑھے۔ چند افراد اور بھی آ گئے جو لوہے کی چادروں سے نئے تعمیر ہونے والے کمروں کے ساتھ ایک اور کمرے کا اضافہ کرنے کیلئے لکڑی کے پھٹے لگا کر نیا کمرہ بنا رہے تھے۔ انہوں نے آتے ہی بھائی عبداللہ سے کہا: عبداللہ بھائی! ہم نے آپ کی مکان کیلئے دی گئی جستی چادروں سے چند چادریں بچا کر اور لکڑی کے تختے ان کے ساتھ ملا کر ایک مزید کمرہ بنا لیا ہے۔ عبداللہ کہنے لگا: بھائی آپ کی چیز ہے، ہم نے تو آپ کو دے دی تھی' اب آپ جس طرح چاہیں اسے استعمال کریں' ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔

اب ہم دو کمروں پر مشتمل بیوہ کے گھر میں کھڑے تھے۔ ایک کمرے کا ایک دروازہ باہر کھلتا تھا اور ایک دوسرے کمرے کے اندر۔ ایک کمرے کے اندر چولہے میں لکڑیاں سلگ رہی تھیں' جس کی وجہ سے برفیلے موسم میں کمرہ گرم ہو چکا تھا۔ چولہے کے اردگرد چند رقابیاں تھیں جن میں سالن تھا۔ ایک کمرے میں ایک چار پائی اور گرم بستر پڑا تھا۔ ایک طرف لکڑی کی ٹوٹی پھوٹی الماری پڑی تھی۔ یہ کل متاع تھی اس اجڑے آشیانے کی۔ اگرچہ یہ علامتیں بتا رہی تھیں کہ زندگی کا سلسلہ رواں دواں ہے...... لیکن اس گھر کی اصل رونقیں تو اس وقت تھیں جب اس گھر کا مالک زندہ تھا۔ جب اس کی موجودہ مالکہ اور اس وقت کی ملکہ کا سہاگ قائم تھا...... جب اس کے قہقہے گونجتے تھے اور سہاگن فخر سے مسکراتی تھی، شرماتی تھی۔ جب باپ بچوں کے ساتھ مل کر قہقہوں کی کہکشاں برپا کرتا تھا...... جب کسی کو کسی مسئلہ اور معاملہ کا فکر نہ تھا۔ یہ سب اس مرد صالح کے ذمہ تھا...... لیکن اب تو اس گھر میں خاموشیوں کا راج ہے، غموں کا بسیرا ہے، اب یہ گھر صرف اداسیوں کا مسکن ہے...... سوچوں نے یہاں ڈیرا ڈال رکھا ہے، فکر و پریشانیاں ہجوم کر کے آ دھمکی ہیں...... لیکن ننھے منے، معصوم فرشتوں اور مغموم بچیوں کے چہروں پر پھر بھی اطمینان کی ایک جھلک ہے، سکون

کا ایک پھیرا ہے...... کہ زلزلہ سے لٹی پھٹی، اجڑی دنیا میں گھر کے برباد ہو جانے پر...... مویشیوں کے ہلاک ہو جانے پر...... روزمرہ کے استعمال کے سامان کے ناپید ہو جانے پر...... اور اس بھری دنیا میں بے گھر ہو جانے پر کسی نے ان کو مکان بنا کر تو دے دیا...... کہ جس میں وہ اس مہلک برفانی طوفانوں اور بارشوں سے محفوظ رہ کر زندگی گزار سکیں گے۔

ہم نے ایک بیوہ اماں جان سے گفتگو کرنے کا ارادہ کیا لیکن اسے گم سم مغموم اور صدمے سے نڈھال دیکھ کر ایسے لگا جیسے وہ اس دنیا میں موجود نہ ہو اور اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھی ہو، جیسے کہ اس کی کائنات اجڑ چکی ہو...... ہاں! ایک سہاگن کیلئے اس کا سہاگ اس کی کل کائنات ہی تو ہوتا ہے...... اس کا یہ سہاگ اجڑ چکا تھا...... البتہ اس کے بچوں کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ جانے کے بعد ان کو سر چھپانے کیلئے ایک چھت ضرور مل گئی تھی۔ ان کے لئے یہی نعمت اب بہت بڑا خزانہ تھا۔

ہم نے اس انتہائی بلندی پر اونچے نیچے گاؤں میں دیکھا کہ واقعی جماعت الدعوۃ نے یتیموں اور بیوگان کو ترجیح دیتے ہوئے ان کے لئے جستی چادروں کے مکان بنائے ہیں۔ ہم نے مکانات کی تصاویر لیں تو گاؤں کے لوگوں نے نہایت اصرار کے ساتھ ہمیں روک لیا اور چائے اور بسکٹ سے ہماری تواضع کی۔ اس موقعہ پر ہم نے چند معصوم یتیم بچوں کو اپنے پاس بلایا۔ ان میں سے محمد مظہر ولد غلام ربانی گورنمنٹ ہائی سکول بالاکوٹ کا چھٹی کلاس کا طالب علم ہمارے سامنے بیٹھا تھا۔ ہم نے اس کے والدین اور بہن بھائیوں کے متعلق دریافت کیا تو وہ کہنے لگا: ہم تین بہن بھائی ہیں۔ بھائیوں میں بڑا ہوں۔ بہن ٹی بی کی مریضہ ہے۔ صبح میں سکول چلا گیا تو والد اور والدہ گھاس کاٹنے کیلئے جنگل چلے گئے۔ وہ گھاس کاٹ رہے تھے کہ اس دوران زلزلہ آ گیا۔ پہاڑ سرکا، سلائیڈنگ ہوئی، پہاڑ کا ملبہ نیچے جنگل میں چلا آیا اور میرے ابو امی جو گھاس کاٹ رہے تھے وہ اس کے نیچے دب گئے اور اللہ تعالیٰ کے پاس چلے گئے' یوں ہم یتیم ہو گئے، اس عیدالفطر پر ہم بہن بھائی مل کر بہت روئے کیونکہ کوئی ہمیں تیار کرنے والا نہ تھا، نہ ابو نظر آ رہے تھے نہ امی نظر آ رہی تھیں۔ ہمیں اب روزانہ صبح و شام

والدین بہت یاد آتے ہیں۔ رات کے وقت ہم امی جان کے اردگرد چولہے کے پاس بیٹھے ہوتے تھے، وہ ہمیں کھانا دیتی تھیں، ابو پاس بیٹھ کر کھانا کھلاتے تھے، ہمارے بستر بچھاتے تھے، باتیں سناتے، نماز پڑھواتے'یوں گھر میں خوب رونق ہوتی تھی، صبح کے وقت امی دودھ دوہتی اور مکھن کھلاتی...... لیکن اب سب رونقیں ختم ہو چکی ہیں۔ ہمارے گھر میں خاموشی چھائی رہتی ہے۔ ابو امی کے مرجانے کے بعد دنیا اندھیر ہو چکی ہے۔ بیمار بہن امی ابو کو یاد کر کے روتی رہتی ہے۔ یوں اس نے والدین کی جدائی کے غم کو ایک نئی ٹی بی کی صورت میں گلے لگا لیا ہے۔

قریب بیٹھے ایک دوسرے یتیم بچے نے بتایا کہ اس کے والد بھی گھاس کاٹنے جنگل میں گئے لیکن پہاڑ کے نیچے دب کر فوت ہو گئے ہیں۔ ہماری والدہ ہم بہن بھائیوں سے چھپ چھپ کر روتی رہتی ہے، جب کبھی اچانک ہم سامنے آ جاتے ہیں تو ہمیں دیکھتے ہی اپنے آنسو صاف کر لیتی ہے۔

اسی طرح وہاں بیٹھے ہم یتیموں کی باتیں سن رہے تھے اور یوں ان کے دکھوں کی داستان سنتے چلے گئے، ہم سوچ میں پڑ گئے کہ جماعت الدعوۃ نے اپنی طاقت کے مطابق ان یتیموں، بیواؤں، بے سہارا اور مستحق لوگوں کو تین ہزار سات سو پچاس گھر بنا کر چھتیں تو مہیا کر دی ہیں لیکن ان کو ماں باپ کا پیار شفقت اور لاڈ کون دے گا؟ ان کے مستقبل کا کیا بنے گا؟ کون ان کو تعلیم دلوائے گا؟ کون ہنسائے گا ان کو......؟ ہماری تسلی ہو چکی تھی کہ واقعی یتیموں اور بیواؤں کے لئے جماعت نے بالاکوٹ کے گردونواح میں مکانات تعمیر کر دیئے ہیں، اور ہم پہاڑ سے ان یتیموں کے مستقبل کے بارے میں سوچتے ہوئے نیچے اتر رہے تھے۔ ہم نے عبداللہ بھائی سے اپنی تشویش کا اظہار کیا تو انہوں نے بتایا کہ ہم نے یتیموں کی کفالت کا راولپنڈی میں ایک وسیع منصوبہ بنایا تھا لیکن اس مسئلہ میں ہماری پیشکش کو حکومت کی طرف سے ٹھکرا دیا گیا لیکن بعض اللہ کے بندوں نے ان کی کفالت کا منصوبہ بنایا ہے آپ ان سے اس کی تفصیلات جان سکتے ہیں۔

مانسہرہ واپسی پر ہم نے یتیموں کی کفالت کا منصوبہ بنانے والے جناب ابو شعیب بھائی سے ملاقات کی تو انہوں نے بتایا کہ ہمارا کسی سیاسی و مذہبی تنظیم سے تعلق نہیں پھر بھی چند صاحب ثروت احباب نے مل کر اپنی دولت یتیموں کی مسکراہٹ واپس لانے کے لئے خرچ کرنے کا پختہ عزم کیا ہے۔تفصیلات بتاتے ہوئے کہنے لگے کہ ہم نے ایک ہزار یتیموں کی کفالت کا منصوبہ بنایا ہے ان کی دنیاوی و مذہبی تعلیم ہمارے ذمہ ہوگی' ہم ان کو رہائش، خوراک، لباس، کمپیوٹر تعلیم کے علاوہ پانچ سو روپیہ ماہانہ جیب خرچ بھی دیں گے۔اس یتیم کے متاثرہ خاندان کو پانچ ہزار روپیہ بھی مہیا کریں گے' ان کے میڈیکل اور سفر کے اخراجات بھی برداشت کریں گے وغیرہ۔

یہ ساری تفصیلات سن کر میں سوچ میں پڑ گیا کہ جب ہمارے اپنے وطن میں ایسے درد مند لوگ ہیں کہ جو یتیموں اور بیواؤں کو سہارا دینے کی تڑپ رکھتے ہیں تو پھر ہم ان کو نظر انداز کر کے غیروں کی طرف بھیک مانگنے کے سے انداز میں کیوں دیکھتے ہیں؟

یا جبار!...... جینے نہیں دیتے ہمیں اسلام کے غدار

پچھلے دنوں راقم کا مضمون ''امی جان آپ کہاں ہیں؟'' شائع ہوا تو بہت سارے لوگوں نے رابطہ کر کے بتایا کہ مضمون پڑھ کر وہ بہت روئے۔ یوں ہر ایک نے اس کے بعد زلزلہ زدگان کے یتیم بچوں کو اپنانے اور ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت وغیرہ کی خواہش کا اظہار کیا۔ ان کے جذبات یہ تھے کہ ہم ان بچوں کو اپنے بیٹے اور بیٹیاں بنا کر رکھیں گے۔ ایک بہن نے کہا کہ سنا ہے حافظ سعید امیر محترم نے ۲ ہزار بچوں کی پرورش کا ذمہ لیا ہے' جو پہنچنے ہی والے ہیں۔ ان میں سے ایک بچہ اور بچی ہمیں دے دیں۔ ہم ان کی پرورش کریں گے۔ میں ان کو کیا بتاتا کہ جماعت نے اس کے متعلق پالیسی وضع کی تھی' لیکن حکومت کی سرد مہری اور عدم تعاون کی بنا پر جماعت کوئی اہم اور کلیدی کردار ادا نہ کر سکی۔ ورنہ جماعت نے تو دارالایتام قائم کر کے ان کو بسانے کے لیے کئی ایکڑ اراضی بھی راولپنڈی میں مختص کر دی تھی۔ اگر حکومت تعاون کرتی تو ہم اس معاملہ میں ایک اہم اور انمٹ کردار ادا کرتے۔

عجب المیہ ہے کہ مظفر آباد اور بالاکوٹ میں یتیم اور بے سہارا ہونے والے بچوں کو کلمہ گو امت محمدیہ کے علمبردار لواحقین میسر نہیں آ رہے۔ ان کو ایک گھناؤنی سازش اور منصوبہ بندی کے تحت اغوا کیا جا رہا ہے۔ اس میں کچھ اپنے بھی ملوث ہیں اور بیگانے تو ہیں ہی۔ پچھلے دنوں نوائے وقت مظفر آباد ایڈیشن میں خبر آئی کہ بالاکوٹ میں ایک ٹرک ڈرائیور نے ۵۰ یتیم بچوں کو بہتر مستقبل کا جھانسہ دے کر اغوا کیا اور گوجرانوالہ نہر پر اتار کر رفو چکر ہو گیا۔ وہ دو دن وہاں اپنی ماؤں کو پکارتے امی جان! آپ کہاں ہیں؟ ہمارے پاس آ جائیں...... بھوک پیاس سے بلکتے ہوئے بیمار ہو گئے۔ ٹرک ڈرائیور کا پتا نہ چلا کہ وہ کتنے بچے اور بچیاں

ساتھ لے گیا اور کہاں چلا گیا؟

اس طرح زلزلہ کے فوراً بعد ایک دل ہلا دینے والی خبر تھی کہ زلزلہ کے بعد یتیم ہو جانے والی امت محمد (ﷺ) کی بچیوں کو اغوا کرنے کے لیے بازار گناہ لاہور کا ایک گروہ وہاں پہنچ گیا اور رنگے ہاتھوں پکڑا گیا۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہم ان بے سہارا و یتیم بچیوں کے سروں پر دوپٹا اور شفقت کا ہاتھ رکھنے کی توفیق نہیں رکھتے تو کم از کم اس شقاوت قلبی، بدبختی و ناہنجاری اور بے غیرتی کا ثبوت تو نہ دیں۔

پچھلے دنوں جب ہم مظفر آباد پہنچے تو ایک روح فرسا خبر نے ہمارا استقبال کیا۔ جماعۃ الدعوۃ میڈیا سیل مظفر آباد کے ذمہ دار بھائی سلمان نے ہمیں بتایا کہ پاکستان کی ایک نام نہاد انسانی حقوق کی تنظیم خاموشی سے دو یا تین ٹرک یتیم بچوں کے بھر کر لے گئی ہے۔ میرے حساس دل کی چیخیں نکل گئیں اور وہ پکار اٹھا کہ اے ننھے منے پھولو!...... اے کلیو!...... تمہاری خوشبو اگر تمہاری قربان ہو جانے والی ماؤں تک پہنچی ہوتی، وہ زندہ ہوتیں تو تمام سخت سے سخت حالات کا مقابلہ کر لیتیں لیکن تمہیں کبھی اس دنیا کی اندھی غار میں گم نہ کرتیں۔ اپنے آپ کو مار لیتیں، دکھ درد اور تکالیف و مصائب ہنس کر سہہ لیتیں، لیکن تمہاری مسکان اور تمہاری مسکراہٹ میں ذرہ بھر فرق نہ آنے دیتیں۔ آج تمہاری مائیں مٹی کے نیچے کیا جا سوئیں کہ حکومت بھی تم سے آنکھیں پھیر گئی۔ سب نے تمہیں بوجھ سمجھ کر منڈی میں بکنے والی گاجر مولیوں کی طرح بیچ ڈالا۔

ہم مزید آگے بڑھے تو ایک اور رونگٹے کھڑے کر دینے والی خبر نے ہمارے بڑھتے قدم روک دیے۔ وہ یہ کہ بعض گروہوں اور شخصوں نے اغوا کر کے اور اپنی تحویل میں لے کر ان سے بھیک مانگنے کا پیشہ کروا دیا ہے۔ بعض نے تو کہا کہ ان کے جسمانی اعضاء کو ناکارہ کر کے ان کو اپاہج و معذور بنا کر بھیک منگوانے کے پروگرام تشکیل پا رہے ہیں، لیکن ہم نے ماننے سے انکار کر دیا کہ ہم نہیں مانتے کہ دنیا میں اس قدر شقی القلب اور پتھر دل ظالم بھی ہو سکتے ہیں۔ بعض لوگوں نے بتایا کہ یتیم بچوں کی ایک بہت بڑی تعداد کو اسماعیلی فرقہ کے لوگ

علاج معالجہ کے بہانہ سے اٹھا کر لے گئے ہیں۔ ایسی ہی خبریں پڑھتے اور سنتے ہوئے میں اور شبیر احمد سلفی بھائی بالا کوٹ سے باہر مانسہرہ کی طرف موٹر سائیکل پر سروے مکمل کرتے ہوئے جا رہے تھے کہ ہم نے راستے میں "متاثرہ بچوں کا سکول" دیکھا تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ موٹر سائیکل روک کر ہم سکول میں چلے گئے۔ وہاں کے مہتمم کو ملے جس کا نام خالد گل تھا۔ یہ مذہب کے اعتبار سے عیسائی ہے اور چند خالی خیموں کو کیمپ کی شکل دے کر یہاں ایک سکول قائم کیے بیٹھا ہے۔ ہم نے اس سے دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ وہ آل پاکستان مینارٹیز الائنس کا چیف آرگنائزر ہے۔ اس کے سامنے کتنے ہی معصوم بچے اور بچیاں لائنوں میں بیٹھے تھے۔

ہم نے اس کے انسانیت (کے نام پر) جاری کام کو سراہا تو وہ خوشی سے بتانے لگا کہ ہمارے پاس ۵۰ ورکرز ہیں جو ان بچوں کی کفالت کے پروگرام کو یہاں چلا رہے ہیں۔ اس نے کہا کہ ہم یتیم بچوں کو گورنمنٹ سے لے کر ان کی مکمل کفالت کریں گے، ان کو تعلیم دیں گے، ان کے ہر طرح کے اخراجات برداشت کریں گے، حتیٰ کہ ان کو جوان کریں گے اور جاب (نوکری) پر بھی لگوائیں گے۔ اس نے حکومت کے ساتھ اپنے روابط کے متعلق بتاتے ہوئے کہا کہ ہم نے حکومت سے ۵۰۰ بچوں کی ڈیمانڈ کی تھی' حکومت اب تک ہمیں ۵۷۶ بچوں کی فہرست دے چکی ہے جبکہ مزید بچوں کو حاصل کرنے کے لئے ان کی سرگرمیاں جاری ہیں۔ اس نے کہا کہ حکومت نے ہمیں آفر کی ہے کہ ہم آپ کو ٹیچر مہیا کرتے ہیں' وہ یہاں تعلیم دیں گے، ان کو تنخواہیں بھی حکومت ہی دے گی، لیکن ہم نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ ہمیں آپ کی کسی قسم کی مدد کی ضرورت نہیں۔ ہم ٹیچرز خود ہی اپنی مرضی کے رکھیں گے، خود ہی ان کو تنخواہیں دیں گے اور ان کو کنٹرول بھی خود ہی کریں گے۔

حکومت کی طرف سے عارضی طور پر وہاں بھیجے گئے ایک مسلمان ٹیچر کو اس نے ہم سے بات کرنے کا موقعہ نہ دیا' بلکہ منع کر دیا کہ ان سے میں خود بات کروں گا۔ ایک موقعہ پر جب ہم نے اسے اس کے نام اور اس کی تنظیم کے متعلق کریدا تو وہ غصے میں آ کر کہنے لگا کہ

آپ اگر کسی ایجنسی سے تعلق رکھتے ہیں، کسی تنظیم سے تعلق ہے یا صحافی ہیں تو آپ کو سمجھ جانا چاہئے کہ ہم کون ہیں اور کیا کر رہے ہیں؟ پھر یہ اس طرح پوچھنے کی ضرورت کیا ہے؟

ہم اس کی اس دیدہ دلیری، جرأت اور چیلنج کرنے کے انداز پر حیران رہ گئے اور سوچنے لگے کہ غیروں سے کیا شکوہ کریں؟ جب اپنے ہی ان کے ساتھ ملے ہوئے ہیں اور مسلمانوں کے بچے مسلمانوں کو دینے کی بجائے صلیبیوں کے حوالے کر رہے ہیں۔ بقول شاعر...... ؎

دل کے پھپھولے جل اٹھے سینے کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

اب جب سب یتیم و بے سہارا بچے اسلام اور ملک دشمن عناصر اور این جی اوز اغوا کر کے لے جا چکی ہیں تو حکومت نے ایک سال کے لیے لاوارث بچوں کو گود لینے پر پابندی عائد کر دی ہے۔ یہ بات وفاقی وزیر شیر افگن نے قومی اسمبلی کو بتائی۔ یہ عجیب لوگ ہیں جو اپنوں پر تو پابندیاں لگا رہے ہیں جبکہ غیروں کو مکمل چھوٹ دے رکھی ہے۔ گویا پتھر بندھے ہوئے ہیں اور کتے کھلے ہوئے۔

ایسے لوگ جو یتیم، مسکین و لاوارث بچوں کا سودا کر رہے ہیں' ہم تو ان کو دین و ملک اور ملت اسلامیہ کے غدار ہی کہہ سکتے ہیں۔ ایسے حالات میں جبکہ اہل اسلام اور اہل درد کو ان لاوارث بچوں کو اپنانے سے روک دیا گیا ہے، ہم اپنے پروردگار کے دربار میں یہی عرض کریں گے کہ...... اے رب جبار و قہار! جینے نہیں دیتے ہمیں اسلام کے غدار...... اب تو ہی ان سے اور اسلام کے دشمنوں سے نبٹ اور ہمیں ہمت دے کہ ہم ان کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کر سکیں۔ آمین!

ہندو تہذیب اور ہم

ایک پاکیزہ معطر و مطہر خیالات و جذبات کی حامل طالبہ کی زندگی کا ایک منظر ملاحظہ کریں۔ وہ اکیڈمی میں دوران گفتگو کسی کو کوئی واقعہ سنا رہی تھی' ایک خفیہ پہلو اس وقت سامنے آیا جب اسی دوران اس نے کہا ''یہ میری ''دیدی'' (بہن) ہے۔ اب اسی گھر میں رہے گی اور اسی ''پریوار'' (خاندان) کا حصہ شمار ہوگی اور آپ دیکھیں گے کہ ایک دن لکشمی دیوی ثابت ہوگی' اس کے یہاں رہنے سے یقیناً ''آتما'' (روح) کو سکون ملے گا اور دنیا ہمارے لئے ''سورگ'' بن جائے گی۔'' ایک دوسری طالبہ نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا کہ تمہارے خیالات تو بہت اچھے ہیں لیکن تمہاری گفتگو سے ہندو طرز معاشرت اور کلچر میں رنگے ہونے کی بو آتی ہے۔ تم اپنی گفتگو میں اردو کی بجائے یہ ہندی زبان کے الفاظ کیوں استعمال کر رہی ہو؟ طالبہ یہ سن کر یکدم جھینپ جاتی ہے اور شرمندگی سے آہ بھرتے ہوئے افسوس سے کہتی ہے: ''آج سے چند سال قبل کسی عزیز کے گھر کچھ عرصہ ٹھہرنے کا موقعہ ملا' وہاں ٹی وی اور وی سی آر بھی تھا' جب وہ ہندوستانی فلم لگاتے تو مجھے بھی زبردستی بٹھا لیتے اور کہتے: اتنی عمر میں ہی مولویانی نہ بنو۔ اس وقت میرا شعور پختہ نہ تھا' بچپن تھا' لہٰذا بیٹھ جاتی۔ اس عرصہ میں جب تک میں ان کے ہاں مقیم رہی انہی ہندی فلموں کو دیکھنے کی وجہ سے میرے ذہن پر ان کے کرداروں کی گفتگو میں استعمال ہونے والے الفاظ و محاورات کا اثر ہوگیا اور وہ ذہن و قلب میں لاشعوری طور پر پختہ ہوگئے' جو اب بھی کبھی کبھی میری گفتگو میں شامل ہوجاتے ہیں' حالانکہ میں ان کو کسی منصوبے کے تحت یا سوچ سمجھ کر نہیں بولتی' اب بھی میری گفتگو میں باجی کی بجائے دیدی کا لفظ آجاتا ہے۔ اللہ مجھے اس سے پناہ میں رکھے۔''

قارئین! اس واقعہ سے آپ بخوبی اس اندوہناک حقیقت کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جب ایسی پاکیزہ بچیوں کے پھولوں اور کلیوں کی طرح نکھرے اور توحیدی فضاؤں میں معطر و مطہر اذہان وقلوب' شعوری یا لاشعوری طور پر ہندو تہذیب کے مہلک تیروں سے زخمی ہیں تو پھر عامۃ الناس اور دیگر لوگوں کا کیا حال ہوگا؟ اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

پچھلے دنوں ایک بہن کے گھر جانا ہوا تو ان کا بیٹا ڈیک پر ہندی گانے لگائے ہوئے تھا۔ حیرانی سے پوچھا ''آپ لوگوں نے روزہ نہیں رکھا؟'' جواب دیا گیا کہ ''کیوں نہیں' ہم بھی مسلمان ہیں' ہندو تھوڑی ہیں۔'' ''تو پھر آپ کے بیٹے نے روزہ رکھ کر بھی یہ گندے فحش اور حیا سوز گانے لگا رکھے ہیں؟'' انہوں نے جواب دیا ''بات دراصل یہ ہے کہ یہ میرا بیٹا اپنا کاروبار کر رہا ہے اور اس کی مجبوری ہے کہ یہ جب تک یہ گانے نہ لگائے اس سے کام نہیں ہوتا' باقی یہ شوق سے نہیں لگا رکھے کیونکہ ہم بھی روزہ سے ہیں۔ بس یہ مجبوری ہے جس کی بنا پر ایسا کرنا پڑا' ورنہ ہمارا روزمرہ کا کام بالکل ہی رک جائے۔''

اندازہ لگائیں جن لوگوں کا' جن مسلمانوں کا اوڑھنا بچھونا' اٹھنا بیٹھنا گانے کے بغیر نا مکمل ہے اور وہ اپنے روزمرہ معمول کے اور روزگار کے کام بھی اس وقت تک نہ کر سکیں جب تک وہ ہندو کا فرانہ تہذیب کا لبادہ نہ اوڑھ لیں...... تو ایسے مسلمانوں سے من حیث القوم یہ امید کی جا سکتی ہے کہ ظالم و جابر ہندو' یہودی اور امریکی فوجوں کے خلاف اپنے مظلوم بھائیوں کا دفاع کر سکیں اور ان کی مدد کر کے ان کے زخموں پر مرہم رکھ سکیں؟

آج خاص طور پر ہمارے نوجوان اس قدر ہندو تہذیب کے شکنجے میں جکڑے جا چکے ہیں کہ ان کی عیدیں ہوں یا رمضان المبارک کا مہینا' وہ بھی ہندو تہذیب اور کلچر کی چھاپ کے بغیر نہیں گزرتے۔ اس کا اندازہ ہمیں اس وقت ہوا جب پندرہ رمضان المبارک کو ایک پڑوسن نے امیرانہ اندازِ تفاخر میں میری اہلیہ سے مخاطب ہو کر کہا: ''کیا کریں بہن! گھر کا سارا کام تو نوکرانیاں کر دیتی ہیں' بچے سکول چلے جاتے ہیں' خاوند اور دیگر افراد اپنے اپنے کاموں پر نکل جاتے ہیں' میں پیچھے اکیلی رہ جاتی ہوں اور بہت بوریت کا شکار ہوتی ہوں کہ

اب کروں تو کیا کروں؟ وقت کیسے گزاروں؟ وقت ہے کہ کٹتا ہی نہیں۔ ہم ایک دو ہندی پکچرز جو خاندان کے ساتھ بیٹھ کر دیکھی جاسکتی ہیں' لاتے ہیں اور لگا کر وقت گزار لیتے ہیں۔ یوں روزہ بھی نہیں لگتا اور افطاری کا وقت ہو جاتا ہے۔'' اہلیہ نے اس کی یہ جاہلانہ باتیں سن کر نہایت دکھ کے ساتھ کہا: ''میری بہن! بہت افسوس کی بات ہے! آپ دیندار ہونے کے دعوے بھی کرتی ہیں اور روزہ رکھ کر قرآن کی تلاوت یا اذکار مسنونہ سے اپنی زبان کو تر کرنے کی بجائے' اور نوافل پڑھ کر دل و دماغ کو سکون و راحت پہنچانے کی بجائے ہندی فلمیں دیکھ کر یا کوئی میچ (یا فری سٹائل کشتیاں) دیکھ کر وقت گزارتی ہیں۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ اسلام نے خاتون کو اپنا وقت گزارنے کا کیا طریقہ سمجھایا ہے؟ اور خاص طور پر یہ کہ وہ اپنا رمضان کا مہینا اور یومیہ وقت کس طرح گزارے؟ اچھا مصرف نکالا ہے آپ نے رمضان اور وقت گزارنے کا' کیا جواب دیں گی آپ اللہ تعالیٰ کو اپنے اس طرز عمل کا؟ سوچ لیں!'' تو وہ صفائی پیش کرنے کے مصنوعی دانائی بھرے انداز میں کہنے لگی: ''دیکھو بہن! ہمیں دین سے دور نہ سمجھو' ہم بھی کلمہ پڑھنے والے ہیں' ہم نماز بھی پڑھتے ہیں' رمضان میں تو اس کا باقاعدگی سے اہتمام کرنے کی کوشش کرتے ہیں' صدقہ خیرات کرتے ہیں' نذر و نیاز دیتے ہیں اور جب موقعہ ملتا ہے تو تلاوت بھی کرتے ہیں..... البتہ یہ ہندی فلمیں وغیرہ تو ہم وقت گزارنے کے لیے دیکھتے ہیں۔ ہندوستانی تہذیب و کلچر چونکہ ہمارے رہن سہن' رسم و رواج' علاقائی و تہذیبی بیک گراؤنڈ کے تناظر میں ہمارے بہت قریب ہے' اسی بنا پر اور ان مشترکہ اقدار و روایات کی بنا پر یہ ہندی فلمیں پسند کی جاتی ہیں اور ان میں تو مسلمانوں کا بھی ذکر ہوتا ہے۔''

استغفر اللہ! یہ حال ہے ہماری تہذیب نو کی پروردہ خواتین کا کہ جنہوں نے نوجوان نسل کی تربیت کرنی ہے اور جن کے بطن سے ہم ایک بار پھر صلاح الدین ایوبی' محمود غزنوی' سلطان محمد الفاتح' طارق بن زیاد' موسیٰ بن نصیر اور محمد بن قاسم رحمہم اللہ کے پیدا ہونے کی امید لگائے بیٹھے ہیں۔ ان کی باتیں سن کر تو یوں لگتا ہے جیسے وہ زبان حال سے کہہ رہی ہوں:

ہم نے مُلّا سے بگاڑی ہے نہ شیطاں سے کبھی
دن کو مسجد میں رہے رات کو میخانے میں

کہا جاتا ہے کہ نام کا شخصیت پر اثر ہوتا ہے' آج اس مسلم معاشرے کی یہ بدقسمتی ہے کہ اس کے افراد نہ صرف ذہنی طور پر ہندو کلچر میں رنگے جا چکے ہیں بلکہ اب تو مسلمان والدین اپنے بچوں کے نام بھی ہندوانہ رکھنے لگے ہیں: پریتم' دلیپ' وجے' لکشمی' شاہ رخ' کامنی' کاجل' جیا' تبو' دیبا' بندیا وغیرہ' کیا یہ اسلامی نام ہیں؟ جو ہمارے کتنے ہی ناسمجھ اور نادان لوگ اپنے بچوں اور بچیوں کے رکھتے جا رہے ہیں۔ پھر ایسے ناموں کے حامل طالبعلم یا ایسے افکار کے حامل افراد کے بیٹے بیٹیاں اس کا اثر شدت سے قبول کرتے ہیں۔

اسی فکری المیہ کا یہ نتیجہ ہے کہ آج ہمارا نظام تعلیم بھی ہندو کلچر سے متاثر نظر آتا ہے جبکہ ہمارا تقریباً ہر چوتھا یا پانچواں طالبعلم اپنی کالج فائل یا سکول فائل پر کسی نہ کسی ہندو ایکٹر یا ایکٹریس کی تصویر سجائے خراماں خراماں سکول و کالج میں آتا جاتا نظر آتا ہے' یا وہ سینما یا ٹی وی کی سکرین کے آگے براجمان ہندی فلموں میں مگن ہے اور قوم کا یہ سرمایہ اپنے لب ولہجہ' شکل وصورت' رہن سہن' بودوباش' چال ڈھال، انداز فکر اور انداز گفتگو میں ان ہندو ایکٹریسوں کی مکمل نقل کرتے ہیں۔ اپنی اس حرکت پر مسلمان ہونے کے ناتے شرمندہ ہونے کی بجائے فخر وخوشی محسوس کرتے ہیں اور اپنے حلقہ احباب میں اپنے من پسند ہندو آئیڈیل ہیرو کے سانچے میں ڈھل جانے اور اس کا طرز زندگی اپنا لینے پر حتیٰ کہ لب ولہجہ تک اپنا لینے پر داد' واہ واہ اور حوصلہ افزائی کے طلب گار ہوتے ہیں۔

رمضان المبارک کے مبارک ومقدس مہینے کی ابتداء سے بھی چار دن پہلے پوری قوم اپنی دکانوں' مکانوں' گلی' محلوں' بازاروں اور سڑکوں پر سٹال لگا کر بیٹھ گئی۔ اس مقدس مہینا کی آمد پر لوگوں میں وہ کیا بانٹ رہے ہیں؟ وہ سٹالوں پر لگے ٹیبلوں پر آسانی سے نظر آجاتا ہے۔ یعنی ننگی اور گندی ہندو اداکاراؤں اور فاحشاؤں کی حیا سوز تصاویر' جن کو عید کارڈ کا نام دے کر اسلام کے اس عظیم ماہ مبارک اور عید جیسے بابرکت دن کے اسلامی چہرے کو داغدار

اور سیاہ کر دیا ہے۔ پوری قوم کے بچے جوان' بیٹے' بیٹیاں عید کارڈوں کے نام پر ہندو کلچر کا زہر اپنے گھروں کی زینت بناتے چلے جا رہے ہیں۔ اپنے ان گھروں سے حیا، عفت و عصمت اور غیرت کا جنازہ نکال کر گھروں کو تباہی کے دہانے پر لے جا رہے ہیں۔ کیا یہ من حیث القوم فکری زوال' فکری غلامی' فکری موت اور تباہی و بربادی کی نشانی نہیں ہے؟ کہ جب اسلام اور مسلمانوں کے دشمن ہی ان کے ہیرو بن جائیں تو پھر کون ان کو ذلت و پستی کے اندھے کنویں میں گرنے سے بچا سکتا ہے؟

ہندو تہذیب کا تیزاب ہمارے گھروں میں

المیہ یہ ہے کہ ہندو تہذیب و ثقافت اب ہماری اجتماعی زندگی کے ہر شعبے پر حاوی اور مسلط ہو چکی ہے اور پوری قوم کو اس طرح گھائل کر چکی ہے کہ ان کو اپنے زخموں کا احساس تک نہیں' بلکہ وہ تو ان تہذیبی زخموں کو اپنے لئے مرہم تصور کیے بیٹھے ہیں۔ پچھلے دنوں میں ٹیلیفون مرمت کروانے مکینک کے پاس گیا' تو وہاں ابھی کھڑا ہی ہوا تھا کہ یکدم پورا کمرہ ایک ہندوستانی گانے کی دھن سے گونج اٹھا اور ایسے لگا جیسے کسی نے بلند آواز میں ڈیک پر انڈین گانا لگا دیا ہو۔ میں حیرانی اور پریشانی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھنے لگا مگر کچھ نظر نہ آیا' لیکن نغمے کی دھن تھی کہ ابھی تک بجتی چلی جا رہی تھی۔ اچانک میری نظر اپنے قریب کھڑے شخص کے ہاتھ میں پکڑے چھوٹے سے جدید ماڈل کے موبائل پر پڑی تو پتا چلا کہ ڈیک جتنا بلند آہنگ میوزک کا شور شرابا تو اس موبائل سے برآمد ہو رہا ہے۔ میں نے عبداللہ منتظر بھائی سے اس کا اظہار کیا تو انہوں نے کہا کہ آپ ایک انڈین گانے کی دھن کہ جس کو ٹیلی فون سننے کے لیے بطور بیل استعمال کیا گیا' سے گھبرا گئے ہیں' ہماری قوم کے موبائل تو اجتماعی طور پر من حیث القوم انڈین نغموں اور دھنوں سے بھرے پڑے ہیں' موبائل کمپنیاں خود اپنے صارفین کو مہیا کر رہی ہیں۔ جب میں نہ مانا تو انہوں نے اپنے موبائل کے ذریعے میری تسلی کروا دی' ایک کوڈ ملایا تو اب سہولت مہیا تھی کہ آپ کون سے ہندوستانی گانے کی دھن سننا چاہتے ہیں مثلاً:

❀ کچھ کچھ ہوتا ہے.........

❀ چوڑی مزہ نہ دے گی کنگن مزہ نہ دے گا.........

❀ بہت خوبصورت ہے میرا صنم..........

❀ بولے کنگنا.......... استغفر الله من هٰؤلاء الهفوات

اندازہ لگائیں کہ ہم من حیث القوم تباہی کے کس دہانے پر آ کھڑے ہیں۔ ہمیں تو چاہئے تھا کہ ہم فون بیل کے لیے اذان‘ قرآنی آیات، احادیث مبارکہ یا جہادی نغموں اور ترانوں کو استعمال کرتے‘ لیکن ہم اسلامی ثقافت کو یکسر بھول کر ہندو کے ہندوانہ رنگ میں رنگتے چلے جا رہے ہیں۔ ان کمپنیوں نے بھی ایک ماہر نباض کی طرح عوام کی نبض پر ہاتھ رکھا اور ان کی بیماری جان گئیں‘ لہٰذا انہوں نے اس کا علاج بھی ویسا ہی اپنایا کہ ہندو کلچر کی گندی اور کڑوی گولی نگلنے کے لیے ان کے ہاتھوں پر رکھ دی۔ اب ڈھونڈنے سے بھی کوئی سنجیدہ اور مسلمان کے دل کو تسکین دینے والی بیل نہیں ملتی۔

پچھلے دنوں محترم امیر حمزہ حفظہ اللہ نے نیا موبائل سیٹ خریدا تو اب بیل سیٹ کرنے کا مرحلہ تھا‘ کوئی ایسی بیل نہ مل رہی تھی کہ جس کو ایک سنجیدہ مسلمان اپنے فون کی زینت بنا سکے‘ آخر انہوں نے گھوڑے کی آواز کو سلیکٹ کیا‘ صرف اس لئے کہ یہ جہاد کا نشان ہے‘ مجاہدین کی سواری ہے اور قرآن میں اللہ کریم نے اس کی جہادی سرگرمیوں کی بنا پر اس کی قسم کھائی ہے‘ لیکن اس طرح کا انتخاب کرنے والے افراد کہاں سے لائے جائیں‘ ادھر تو پوری قوم کے موبائل گھروں‘ بازاروں‘ محلوں حتیٰ کہ مسجدوں میں ہندوستانی نغموں اور گانوں سے گونج رہے ہیں۔

اس بار رمضان کا تیسرا جمعہ مولانا مبشر احمد ربانی حفظہ اللہ کی مسجد میں پڑھا، تقریر کا اختتام ہونے والا تھا‘ توبہ کا موضوع تھا‘ کچھ لوگ خشیت الٰہی سے رو رہے تھے‘ کچھ آخرت میں اللہ کے دربار میں اپنے اعمال کا حساب دینے کے متعلق پریشان اور فکرمند تھے کہ اچانک ایک موبائل فون کی میوزک پر مبنی بیل چیخ اٹھی۔ سب لوگوں کی توجہ منتشر ہوگئی۔ بیل بار بار بجتی رہی‘ اس اللہ کے بندے کو یہ توفیق نہ ہوسکی کہ وہ اس کو مستقل بند کر دیتا حالانکہ مبشر صاحب بیل ہونے کے بعد اس کے متعلق اسلام کی راہنمائی واضح کرتے ہوئے ایسی بیلوں سے روک رہے تھے۔ ایسی مثالیں آج کل مساجد میں عام دیکھنے میں آرہی ہیں‘ کتنا

بھیانک اور خطرناک انجام ہو رہا ہے ہمارے اسلامی کلچر کو خیر آباد کہہ کر ہندو کلچر کے تیزاب میں اپنے آپ کو ڈبونے کا۔ الامان والحفیظ

چند دن قبل میں گاڑی مرمت کروانے مکینک کے پاس گیا تو وہاں بھی فون بیل پر انڈین میوزک اور گانے کا استعمال دیکھ کر اس کو سمجھانے لگا کہ ہم مسلمان ہیں' ہمیں ایسی حرکتیں زیب نہیں دیتیں۔'' وہ ہنستے ہوئے کہنے لگا ''طاہر صاحب! آپ اسی پر پریشان ہیں' قوم تو بہت آگے نکل چکی ہے' میں نے حیرت سے پوچھا ''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' کہنے لگا ''بتاؤں گا نہیں بلکہ دکھاؤں گا' لو اپنی آنکھوں سے دیکھیں!'' پھر اس نے اپنے فون کا بٹن دبایا تو میرے سامنے سکرین پر ایک فاحشہ عورت کی نیم برہنہ تصویر تھی۔ میں نے اس کو کوستے ہوئے کہا: ''یہ کیا ہے؟'' کہنے لگا: ''یہ ایک انڈین اداکارہ کی تصویر ہے جو مجھے کسی نے میسج کے ذریعے بطور عید کا تحفہ بھیجی ہے۔'' اور پھر میری پریشانی دیکھ کر کہنے لگا: ''اسی پر پریشان نہ ہوں آج کل پوری قوم کے جوانوں کے ہاتھ میں موبائل سیٹ ہیں' ہر ایک کی پرائیویسی ہے' کوئی اس میں دخل اندازی کر سکتا ہے اور نہ مخل ہو سکتا ہے۔ اسی لئے اب نوجوان لڑکے اور لڑکیاں انڈین اداکاروں کی نیم برہنہ اور برہنہ تصاویر ایک دوسرے کے سیٹوں پر بطور تحفہ بھیج رہے ہیں اور ان کو ہر وقت اپنی آنکھوں کے سامنے سجا کر رکھنے کے لیے مستقل طور پر موبائل فون کی سکرین پر بطور سکرین سیور ایڈجسٹ کر لیتے ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ کوئی اس کو برا نہیں سمجھتا بلکہ کہتا ہے کہ ''ایسی کوئی بات نہیں صرف وقت کو انجوائے کر رہا ہوں۔'' اسی بنا پر ہمارے ایک دوست نے تنقیدی طور پر کہا کہ اب جس کے پاس موبائل ہے وہ ''بور'' نہیں ہو سکتا!! کیا مطلب ہے اس جملے کا؟...... یہی کہ قوم اس قدر قعر مذلت میں گر چکی ہے کہ انہوں نے اپنے دلوں کا سکون' ذہنوں کی راحت اور اپنا اٹھنا بیٹھنا' سونا جاگنا اور اپنے قیمتی وقت کا مصرف، اپنی افسردگی' پژمردگی' غم و پریشانی اور بوریت کا حل ہی کافرانہ تہذیب سے دل لبھانے کو بنا لیا ہے اور وہ بھی خاص طور پر دنیا کے بدترین اور غلیظ ترین کافر' ہندو کی گند کی' حیا باختہ اور فاحشہ تہذیب کو...... اللہ بچائے ہمیں' اس کے ایمان کے لیے مہلک اور جان لیوا تیروں سے۔ آمین!

جاتے جاتے...... دوستی کا یادگار تھپڑ

حالیہ پاک بھارت کرکٹ سیریز کے دوران چند لڑکیاں ہر میچ میں دیکھی گئیں، بھڑکیلے اور چست لباس والی ان پاکستانی لڑکیوں نے اپنے گالوں پر پاکستان اور بھارت کے پرچم بنا رکھے تھے...... بھارتی کھلاڑیوں کی کارکردگی پر ایسی لڑکیاں خوب دل کھول کر داد دیتی نظر آئیں۔ بعد میں پتا چلا کہ ان مسلمان بیٹیوں کو ہندوؤں کو خوش کرنے کے لئے تیار کیا گیا تھا...... تاکہ وہ یہ پرچموں والے گالوں کا منظر دیکھ کر اندازہ لگا سکیں کہ پاکستانی ان سے کس قدر محبت کرتے ہیں...... اس کے بعد ایک مخصوص طبقے نے ان سرحد پار سے آنے والے بھارتیوں کی ضیافت کے لیے رقص کی محفلیں منعقد کیں، جن میں سرعام پاکستانی لڑکیوں سے مجرا کروایا گیا تاکہ یہ پلید ہندو خوش ہو جائیں...... پھر ان کو شراب کے جام بھر بھر کر پلائے گئے...... سپیشل ہوٹل اور حویلیاں ان کے لئے بک کر دی گئیں...... میچوں کو فکس کیا گیا اور جان بوجھ کر ہار کر ان کو جتوا دیا...... کیوں؟...... جذبہ خیر سگالی کے تحت...... ہندو کو فاتح خود کو مفتوح، ہندو کو باعزت خود کو ذلیل کیا گیا...... تاکہ ہم ان کی نظروں میں اچھے بن جائیں...... وہ ہمیں اچھا سمجھنے لگیں، پھر پاکستانی ٹیم کے ہارنے پر خوشی کے شادیانے بجائے گئے' نعرے لگوائے گئے، ڈانس کروائے گئے کہ ہم پاکستانی ٹیم کے ہارنے اور ہندو ٹیم کے جیتنے پر بہت خوش ہیں...... ہم نے کہا: ان پاکستان کے بدخواہ لوگوں کے خلاف حکومت ضرور راست اقدام اٹھائے گی لیکن جب ہمیں یہ پتا چلا کہ یہ سب کچھ خود حکومت پاکستان ہی خیر سگالی کے جذبہ کے تحت کر رہی ہے، تاکہ انڈیا کو خوش کیا جا سکے تو ہم نے یہ سوچ کر لبوں پر قفل خاموشی چڑھا لیا کہ:

میر کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

زبان خاموش لیکن دماغ یہ سوچنے لگا کہ شاید یہ بے حمیتی و بے غیرتی پر مبنی پالیسی ہماری جرأت مند و غیرت مند حکومت کی کسی ڈپلومیٹک چال کی آئینہ دار ہو۔ شاید وہ اس کے ذریعہ کوئی بہت بڑا مقصد اور کامیابی حاصل کر لے...... شاید بھارتی عوام پاکستانیوں کے خلاف منفی سوچ ترک کر دیں یا عالمی سطح پر پاکستان کا ''امیج'' بہتر ہو جائے لیکن جونہی کرکٹ ٹیم اور ان کے ہم نوا شائقین وصحافی حضرات انڈیا پہنچے تو ہماری حکومت کے منہ پر دھڑا دھڑ تھپڑ جڑنے لگے۔ اسلام اور پاکستان کے خلاف نازیبا الفاظ اور تعصب پر مبنی گھٹیا جذبات و خیالات اور پیغامات قوم کے اذہان و قلوب میں راسخ و پختہ کرنے لگے، پاکستان اور پاکستانیوں کے خلاف ایسا زہر اگلنے لگے کہ غیرت وحمیت رکھنے والی قوت سماعت بھک سے اڑ جائے!

اب آپ پاکستان و مسلمانوں کی تذلیل کی کہانی کی ایک جھلک ہندوستانی میڈیا کی زبانی ملاحظہ کریں۔ بھارت میں چھپنے والے ہفت روزہ آؤٹ لک کے ۵ اپریل ۲۰۰۴ء کے شمارے کی سرورق سٹوری کا عنوان ہے (LA HORED) اس کے لکھنے والے مانو جوزف ہیں، جن کا کہنا ہے کہ پاکستان آنے والے ہر بھارتی کو ٹیکسی ڈرائیور اور ہوٹل کے ویٹر سے لے کر افسران اور پڑھے لکھے افراد تک سے پاک بھارت دوستی کی ضرورت اور بھارت کے لیے محبت کے سطحی جذبات والی تقریریں سننا پڑیں۔ اسی شمارے میں چھپنے والی ایک اور سٹوری "Pathan Suits Us Fine" کے مصنف درشان ڈیسائی نے لکھا ہے کہ کرکٹ سیریز ختم ہونے کے بعد بھارت میں موبائل فون کے ایس ایم ایس پیغامات کے ذریعے یہ نعرہ عوام میں پہنچایا گیا کہ ''جیت مبارک، سپنا سچا ہو گیا۔ کشمیر تو اپنا تھا، کراچی اور لاہور بھی اپنا ہو گیا۔'' یہ نعرہ بھارت کے کئی شہروں میں بھارتی ٹیم کی جیت کی خوشی میں نکلنے والے جلوسوں میں بھی لگتا رہا۔ یعنی ایک طرف پاکستانی قوم کی طرف سے نیک خواہشات

اور کرکٹ کے کھیل کو اچھی طرح سے کھیلنے کا جذبہ تھا، دوسری طرف بھارت میں منظّم طور پر کرکٹ ٹیم کے جیتنے کو سیاسی اور اخلاقی فتح کے طور پر پیش کیا گیا۔ بھارتی میڈیا نے پاکستانی سوسائٹی کی عجیب وغریب تصاویر اپنے قارئین کو پیش کیں۔ لاہور اور کراچی کے بارے یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی گئی کہ یہاں کی عورتیں شراب اور ڈانس کی پارٹیوں میں جانا پسند کرتی ہیں۔ شراب کا دھندا زور وشور سے چل رہا ہے اور ہر گھر میں اس کا استعمال ہوتا ہے۔ آؤٹ لک میگزین کے ۵ اپریل کے شمارے میں "Real Men Play At Night" کے عنوان سے مضمون ہے۔ اس میں لاہور کے معروف سیاستدان یوسف صلاح الدین کے گھر پر ہونے والی پارٹیوں کا ذکر ہے۔ مضمون کے مطابق ۲۴ مارچ کی رات کو یوسف صلاح الدین کی حویلی میں پارٹی ہوئی، جہاں دالان کے ایک کونے میں شراب کی بار بنائی گئی، ٹنڈولکر اور گنگولی کے سوا تمام بھارتی کرکٹرز وہاں موجود تھے۔ یہاں ڈانس فلور پر ہر پاکستانی لڑکی یوراج سنگھ کے ساتھ ڈانس کرنا چاہتی تھی۔ مضمون نگار فریحہ الطاف کے مطابق رات ڈیڑھ بجے جب وہ پارٹی میں پہنچی تو یہ زور وشور سے جاری تھی۔

یہیں ان کی ملاقات عمران خان سے ہوئی جو پارٹی میں آخر تک موجود رہے۔ اسی طرح کی پارٹی یوسف صلاح الدین نے ۲۱ مارچ کی رات کو بھی دی تھی۔ اس پارٹی میں بھارت کے قومی سلامتی کے مشیر برجیش مشرا، بھارتی وزیراعظم کے داماد رانجن بھٹاچاریہ، پاکستان کے وزیر خزانہ شوکت عزیز اور عمران خان نے شرکت کی۔ بھارتی مضمون نگار کے مطابق یہ شخصیات یوسف صلاح الدین کی حویلی میں ساری رات رہیں، جہاں پارٹی کے علاوہ کرن نامی خاتون کا ڈانس اور راحت فتح علی کی قوالی بھی ہوئی۔

اسی مضمون میں بھارتی خاتون فریحہ الطاف نے انکشاف کیا کہ لاہور کے ون ڈے میچوں کے دوران شہر میں مختلف باتیں گردش کرتی رہیں۔ ایک اطلاع یہ تھی کہ پاکستان کے فاسٹ باؤلر شعیب اختر ایک بھارتی خاتون کے ساتھ لاہور کی ہیرا منڈی میں واقع ایک ریسٹورنٹ میں پائے گئے۔ مضمون نگار کے مطابق یہ بھارتی خاتون پچیس ہزار روپے کے

عوض ایک رات گزارنے کے لیے مشہور ہے۔ اس مضمون میں فریحہ الطاف نے بتایا ہے کہ لاہور کی ایک پارٹی کے دوران ایک بھارتی مہمان انہیں کھینچ کر لے گیا اور لاہور کے شہریوں کے رویے کے بارے میں یہ گھٹیا جملہ کہا:

"Lahore is like a bitch in heat with no dog in sight"

قارئین غزوہ! اس فقرہ کا ترجمہ دل پر ہاتھ رکھ کر پڑھیں:

''لاہور ایک ایسی ہوس کی بھوکی گرم کتیا کی مانند ہے کہ جسے کوئی کتا نہ مل رہا ہو!!''

لیجیے جانے والے چلے گئے لیکن جاتے جاتے پھر ہمارے چہروں پر دوستی و محبت کے نام پر تھپڑ جڑ گئے۔ انہوں نے صرف اہل لاہور ہی کو ذلیل کتیا سے تشبیہ نہیں دی بلکہ تمام پاکستانیوں کو یہ گندی اور ننگی گالی دے کر ان کی توہین کی ہے، اس لئے کہ لاہور پورے پاکستان کا دل تصور کیا جاتا ہے۔ سچ کہا کسی نے کہ ایسے لوگوں سے دوستی کرنے کا سوچو بھی نہ کہ جو یہ بھی نہ جانیں کہ دوستی کا رشتہ ہوتا کیا ہے؟

جانے والے تو چلے گئے لیکن ہمارے باحمیت حکمرانوں کی وجہ سے ایسی تلخ یادیں چھوڑ کر گئے ہیں کہ جن سے غیور پاکستانیوں کے دل ودماغ پر ذلیل و کمینے اور مکار ہندوؤں کے لگائے ہوئے...... یہ زخم...... یہ چرکے...... یہ گھاؤ...... کبھی بھی مندمل نہ ہوسکیں گے۔

اے اہل پاکستان!...... جو آپ کو ایک غلیظ اور گندی ترین کتیا سے تشبیہ دے...... تو آپ اس کا کیا علاج کریں گے؟...... اس سے کس طرح نبٹیں گے؟...... اس کا جبڑا کس طرح توڑیں گے؟...... اس کی زبان گدی سے باہر کس طرح نکال پھینکیں گے...... سوچ لیں......! مجاہدین تو ساری دنیا کے سامنے ایک عرصہ سے اس غلیظ انسان نما جانور کا علاج تجویز کرتے آرہے ہیں۔

تلک لگائیے...... سر جھکائیے......اور ہندو بن جائیے

ہندوستان کا ایک چینل تھا جس کا نام ''آج تک'' تھا۔ اب اللہ جانے موجود ہے کہ نہیں۔ اس کے نمائندے نے پاکستان پہنچ کر بڑی دوڑ دھوپ کے بعد حافظ محمد سعید امیر جماعۃ الدعوۃ کا انٹرویو کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ چونکہ اس چینل والوں کا یہ دعویٰ ہے کہ ہم وہ کام کرتے ہیں جو آج تک کوئی نہ کر سکا۔ انہوں نے بڑے فخر سے حافظ صاحب کا انٹرویو اپنے چینل سے نشر کیا۔ انٹرویو نشر کرنے سے پہلے انہوں نے لشکر کا رعب و دبدبہ' تعارف و ہیبت اور انٹرویو کرنے میں ملنے والی کامیابی کی بڑی سنسنی خیز داستان دنیا والوں کو سنائی اور پھر حافظ صاحب کی آواز نشر ہونی شروع ہوئی جبکہ سکرین پر لشکر طیبہ کے انڈیا کے خلاف جہادی پوسٹرز' سٹکرز' بینرز اور امیر حمزہ صاحب کا مشہور جملہ ''کشمیر قرار داد مذمت سے نہیں بلکہ ہندو کی مرمت سے آزاد ہوگا'' دکھایا جاتا رہا...... اس لئے کہ آج تک کوئی بھی حافظ صاحب کی ویڈیو فلم نہیں بنا سکا اور یہ چینل بھی ناکام رہا تھا' صرف آڈیو کیسٹ میں انٹرویو کر سکا تھا...... اور آج تک تمام چینل ناکام ہیں۔ سوائے ایک اخباری رپورٹر کے کہ جس نے چپکے سے حافظ صاحب کی کسی موقعہ پر چوری چھپے تصویر اتار لی، اور وہ بھی آج اپنے تئیں شاداں و فرحاں ہے کہ میں نے وہ کام کر دکھایا کہ جو آج تک کوئی نہ کر سکا اور بعض اخبارات والے اسی تصویر کو بعض اوقات شائع بھی کر دیتے ہیں۔

بہر حال بات ''آج تک'' سے شروع ہوئی کسی اور طرف نہ نکل جائے۔ پچھلے دنوں 26 مارچ 2005ء کو امت مسلمہ نے ایک عجیب روح فرسا اور حیرت انگیز منظر دیکھا۔ دنیا والوں کا خیال ہے کہ انہوں نے اپنی ہوش میں ایسا منظر پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ ہوا یہ کہ پردہ

سکرین پر اچانک ''اسلام کے قلعہ'' پاکستان کے سربراہان نظر آئے۔ وہ ہندوؤں کی رسم ہولی میں شریک تھے' چشم حیرت دیکھ رہی تھی کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ چکر لگا رہے تھے ہندوؤں کے اس مندر میں ایک دوسرے پر رنگ بھی پھینکا گیا۔ اس موقعہ پر ایک ہندو پنڈت نے آگے بڑھ کر ملت اسلامیہ کے ان سپوتوں کو ہندوانہ رنگ لگائے اور ان کو نارنجی رنگ کے رنگین پٹکے پہنائے اور پھر یہیں پر ہی بس نہیں بلکہ اس نے ان کے ماتھوں پر خاص ہندوانہ ''نشان'' تلک بھی لگا دیا اور یہ سپوت تابعدار بچوں کی طرح سب کچھ بڑوں کے اشاروں پر کرتے رہے۔ چونکہ پاکستان میں بعض دوسری جماعتوں کے ساتھ ساتھ جماعت اسلامی خاص طور پر دو قومی نظریہ کی علمبردار سمجھی جاتی ہے اور ہندو ثقافت کے فروغ میں رکاوٹیں کھڑی کرتی رہی ہے' شاید اسی پس منظر اور مجلس عمل والوں کو ذہن میں رکھ کر ان ہندو پنڈتوں کے درمیان چودھری شجاعت حسین گرجے کہ ملاؤں نے خود کو دین کا ٹھیکیدار سمجھ رکھا ہے۔ یعنی اب ہم دین اسلام کی ایک نئی روشن خیال تشریح پیش کریں گے اور ملاں کی اجارہ داری ختم کریں گے۔ اسی تقریب میں صلیبیوں اور ہندوؤں کے درمیان کھڑے ہو کر سابق عساکر پاکستان اور جہاد افغانستان کے روح رواں ضیاء الحق کے بیٹے اعجاز الحق نے دین اسلام کی یوں تشریح کی کہ ''جس انداز سے کرسمس منائی گئی تھی آج ہولی اور ایسٹر بھی اسی جوش و جذبے سے منائی جا رہی ہے کیونکہ اسلام میں کسی چیز کی پابندی نہیں۔'' جناب نواز شریف دور کے وزیر اطلاعات مشاہد حسین نے یوں ترنگ لگائی کہ ''اس ملک میں (ہندو صلیبی) سب کو ساتھ لے کر چلا جائے گا'' مطلب یہ کہ ہم نے ہندوؤں صلیبیوں کو خوش رکھنا ہے ناراض نہیں کرنا۔ اسی لئے ہم اپنے آپ کو ان کے رنگ میں رنگ رہے ہیں۔ یہ تمام مقدس ہندووانہ رسومات ادا کر کے اگلے دن یہ لیڈران ہندوستان روانہ ہو گئے کہ ہمارے اس عمل سے ہندو بہت خوش ہوں گے۔

اگرچہ باحمیت و باغیرت لوگ یہ سمجھ رہے ہیں کہ آج تک ایسا پہلے کبھی نہ ہوا تھا' تو کسی حد تک ان کی بات درست ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ تاریخ میں ایسے بہت سے مواقع آئے کہ مسلمانوں نے ہندوؤں کو خوش کرنے کے لئے اپنے آپ کو ان کے رنگ میں رنگ

لیا لیکن کامیابی کی بجائے ہمیشہ ناکامی و نامرادی' بدنامی اور جگ ہنسائی حصے آئی۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ ہمارے حکمران ان سب سے بازی لے گئے ہیں۔

ماضی میں صرف محکوم ہندوؤں کو خوش کرنے کے لئے مسلم حکمرانوں نے ہندوستان میں ایسے ایسے اقدامات کیے کہ جن کے نتیجے میں ایک عام آدمی میں فرق کرنا مشکل ہوگیا تھا کہ وہ ہندو ہے یا مسلمان۔ یہاں تک ہی بس نہیں بلکہ ہندوستان کے فرمانروا مسلمان بادشاہوں نے ہندوؤں کی مذہبی علامتیں تک اپنا لیں۔ دلی کے اولین بادشاہوں نے تو ہندوؤں کو راضی کرنے کے لئے اپنے سکوں پر ہندو مذہب کی علامتیں اور نشان نقش کروا ڈالے۔ انہوں نے مسلم حکومت کے سکوں پر کمل کا پھول سواستک اور لکشمی دیوی کی تصویریں نقش کروائیں لیکن ہندو پھر بھی خوش نہ ہوئے اور ان کے خلاف سازشوں میں مصروف رہے۔

کشمیر کے سلطان زین العابدین نے تو ہندوؤں سے جزیہ لینا بھی بند کردیا اور ہندوؤں کے ادب' موسیقی اور تصاویر کو فروغ دے دیا...... لیکن ہندو پھر بھی راضی نہ ہوئے۔

اسی طرح اکبر نے ایک چاندی کا سکہ جاری کیا جس کو ''سیارام'' کے نام سے جانا جاتا تھا...... اکبر بادشاہ نے تو اپنے ماتھے پر تلک بھی لگانا شروع کر دیا اور یہ قانون بنا دیا کہ میرے خاندان میں تخت کا وارث وہ بن سکتا ہے کہ جو شریعت کے مطابق ختنہ نہ کروائے، اس لئے کہ ہندو ختنہ نہیں کرواتے۔ اس نے اپنا وزیر خزانہ بھی ایک ہندو راجہ ٹوڈرمل کو بنا دیا اور افواج کا سپہ سالار بھی ایک ہندو مان سنگھ کو بنا دیا۔ لیکن ہندو اس سے راضی نہ ہوئے بلکہ اس کے خلاف خفیہ ریشہ دوانیوں میں مصروف رہے۔

اسی طرح اورنگ زیب کہ جس کو اب بھی ہندو اپنا دشمن نمبر ایک بتاتے ہیں اور ہندوؤں کا دشمن ثابت کرنے کے لئے کتابیں لکھ لکھ کر اپنا موقف ثابت کرنے کی کوششیں کر رہے ہیں' اس اورنگ زیب نے تو مہاراجہ جسونت سنگھ اور راجہ جے سنگھ جیسے لوگوں کو حکومت کے کلیدی عہدے دے رکھے تھے۔ یہاں پر ہی بس نہیں بلکہ اورنگ زیب نے تو اپنی فوج میں بڑی تعداد ہندوؤں کی شامل کر ڈالی۔ پھر مزید روشن خیالی اور رواداری کا مظاہرہ کرتے

ہوئے دو قدم مزید بڑھائے اور ان کے رسوم و رواج اور مذہبی تہواروں کو بھی اپنا لیا۔ یوں اب مسلمان حکمرانوں کے زیرسایہ شاہی محلوں میں دسہرہ اور دیوالی اسی شان و شوکت سے منائی جانے لگیں کہ جس طرح عید اور بقرعید۔ لیکن ہندوؤں نے اس کے ساتھ پھر بھی وفا نہ کی اور اس کے خلاف ہر وقت سازشوں میں مصروف رہے اور اس کو اپنا سب سے بڑا دشمن قرار دیا۔

مسلمان حکمرانوں نے یوں اپنی مسلم شناخت مٹا کر ہندو ثقافت اور تمدن کو مکمل طور پر اپنا لیا لیکن ''الناس علی دین ملوکھم'' کہ لوگ بادشاہوں کے دین پر چلتے ہیں' کے تحت عام مسلمان بھی اپنی اسلامی شناخت بھلا بیٹھے اور ایسا وقت بھی آیا کہ ہندوستان کے مسلمان یہاں کی ہندو معاشرت اور باشندوں میں ایسے رچ بس گئے کہ ان میں یہ تمیز کرنا ممکن نہ رہا کہ کون ہندو ہے اور کون مسلمان۔ یوں اسلام کے ماننے والے نام کے مسلم اور عمل کے ہندو بن گئے لیکن ہندوؤں نے ان کو قبول نہ کیا اور مسلسل ان کے خلاف برسرپیکار رہے...... مسلمانوں کی ہندوؤں میں نفوذ پذیری کو مشہور انگریز مصنف William Bentick نے اپنی کتاب میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔

مسلمانوں نے یوں اپنی زندگی کا ہر معاملہ ہندوؤں کے مذہب کے مطابق کر لیا حتیٰ کہ جینے مرنے کے طریقے' رسوم و رواج اور عقائد بھی۔ یہ اسی طرز فکر اور عمل کا نتیجہ تھا کہ جب تاریخ اردو ادب کے رکن اور مشہور شاعر ن۔م۔ راشد 1975ء کو لندن میں فوت ہوئے تو انہوں نے مرنے سے پہلے وصیت کی کہ ان کی نماز جنازہ نہ پڑھی جائے اور ان کو مسلمانوں کی طرح دفنانے کی بجائے ہندوؤں کی طرح جلا دیا جائے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار

ہندوؤں کو خوش کرنے کے لئے اپنا تن من دھن قربان کرنے' اپنی مسلم شناخت کو ختم کرنے اور آخرکار ہندو نما مسلمان بن جانے کے بعد...... کیا ہندو ہماری اس روشن خیال اور رواداری سے متاثر ہو کر خوش ہو گئے...... بالکل نہیں...... ہماری ان کوششوں کا کیا نتیجہ نکلا؟ کچھ بھی تو نہیں۔ ہندو ہمیشہ ہمارا دشمن رہا اور اسلام و مسلمانوں کے خلاف ہر میدان میں

برسر پیکار رہا۔ جب انگریز ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام پر ہندوستان میں آیا تو اس کے ساتھ مل کر ہندوؤں نے مسلمانوں کو تہہ تیغ کرنا شروع کر دیا۔ 1857ء کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کی جاسوسی کر کے ان کو پھانسیوں پر لٹکوایا۔ بغل میں چھری منہ میں رام رام کے مصداق مسلمانوں کو کس قدر نقصان پہنچایا اس کی ایک مثال 1947ء میں قیام پاکستان کے وقت لاکھوں مسلمانوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر زمین پر ڈھیر کر دیا۔ اس وقت مسلمانوں کو ہندوستان سے پاکستان لانے والی ٹرین کے مسافر پٹڑی کے دونوں اطراف لگی مسلم لاشوں کے ڈھیر کو دیکھتے اور ہندوؤں کی دغابازی' مکاری اور سفا کی کی تصویر بنے' اس تلخ حقیقت کی منہ بولتی تصویر بن کر لاہور پہنچتے رہے کہ ہندو پر کبھی اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ قیام پاکستان کے وقت ہی ان درندوں نے مسلمانوں کو بے دردی سے کاٹ کر ان کی 25 ہزار بچیوں کو اغوا کر کے ان کی عصمت دری کی' کچھ کو قتل کر دیا باقی کو زبردستی یا تو اپنی رکھیل باندیاں اور بیویاں بنا لیا جو آج تک ہندو نسل کو مجبوراً جنم دے رہی ہیں یا پھر ان کو کوٹھوں کی زینت بنا دیا...... اور پھر 1971ء میں سازشوں کا چھرا چلا کر مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنا کر پاکستان کے ایک بازو کو کاٹ دیا اور اب یہی عمل ہندو سندھ میں را کے ذریعے دہرا رہا ہے۔

آج اسی ظالم پلید ہندو کو ہمارے حکمران سر پر بٹھا رہے ہیں۔ ان کو خوش کرنے کے لئے امت مسلمہ کی ان پاکباز بچیوں کہ جن کے باحیاء چہروں کو کبھی آسمان نے بھی برہنہ نہیں دیکھا' کے گالوں پر ہندوستان کے پرچم بنا کر سکرین پر ہندوؤں کو پیش کر رہے ہیں۔ امت مسلمہ کی بیٹی کی ایک پلید ہندو وزیر نور سنگھ کی بانہوں میں بانہیں ڈلوا کر ان کو ڈانس کرتے ہوئے دکھا رہے ہیں...... پھر ایک پاکستان کی نمائندہ اداکارہ خاتون کو ہندوستان میں ننگا کروا کر...... وہاں پاکستان کی ایک اور بیٹی کا بوسہ کروا کر...... اور مسلم بیٹیوں کی عزتوں کے قاتل بھارتی پنجاب کے وزیر اعلیٰ امریندر سنگھ ایک ہندوستانی کی آمد پر امت مسلمہ کی بیٹیوں کے ہاتھوں میں پاکستان کے بھی نہیں بلکہ ہندوستان کے پرچم تھما کر ہیرو کی طرح اس کا استقبال کروا کر...... یوں غیرت وحمیت' مسلم تشخص اور دو قومی نظریہ کو بحر الکاہل میں ڈبو کر

اور غرق کرکے حکمران کیا سمجھ رہے ہیں کہ وہ ہندو کو خوش کرلیں گے..... ان کو اپنا ہم نوا بنالیں گے..... کوئی فائدہ حاصل کرلیں گے..... متحد و متفق ہو جائیں گے..... یہ دیوانے کا خواب ہے، یہ ناممکن ہے، اس لئے کہ ہندو کبھی بھی اپنا تشخص نہیں کھو سکتا' وہ ہر حال میں ہندو ہے اور ہندو رہے گا اور بانی پاکستان محمد علی جناح کے الفاظ میں بھی ہندو مسلم کبھی ایک جگہ اکٹھے نہیں ہو سکتے' ان کی مبنی بر حقیقت ایک دلیل یہ ہے کہ گائے کو ہی لے لیجئے کہ:

Hindus are worshipping it and the Muslims are eating it.

مسلمان اور ہندو کیسے باہم متفق ہو سکتے ہیں کہ گائے جو ان کا دیوتا ہے کہ جس کی وہ پوجا کرتے ہیں یعنی ہندوؤں کے نزدیک وہ ان کا خدا ہے جبکہ مسلمان ان کے خدا (گائے) کو ذبح کرکے' کاٹ کر کھا جاتے ہیں۔ (تو ایسی دو قوموں میں باہمی یگانگت و اتفاق کیسے قائم ہوسکتا ہے جن میں ایک قوم دوسری کے خدا کی قاتل ہی نہ ہو بلکہ اس کو کاٹ کر کھا جاتی ہو۔)

اب ایک اور خبر گردش کر رہی ہے کہ کچھ دنوں بعد سابق صدر پاکستان اور اسلامی افواج کے سربراہ' جرنیل' متدین' جہاد پسند اور اسلام پسند حکمران جنرل ضیاء الحق کی بیٹی اور وفاقی وزیر برائے مذہبی امور جناب اعجاز الحق کی بہن زین کو ہندوستان کا ناچا' لفنگا' اداکار شتروگن سنہا راکھی باندھنے آ رہا ہے۔ یہ ہندو ضیاء الحق کے دور میں بھی پاکستان میں آتا رہا اور سرکاری خزانے پر عیش و گلچھرے اڑاتا رہا۔ یہ مکار و متشدد انتہا پسند اسلام و مسلمان دشمن اداکار شروع دن سے را کا ایجنٹ بن کر خفیہ مشن پر کام کر رہا ہے اور پاکستان کے خلاف جاسوسی کر رہا ہے۔ افسوس ہے کہ آج ہم اس قدر اسلامی حمیت اور غیرت سے دور ہو چکے ہیں کہ ہمیں بھائی بنانے کے لئے بھی پوری امت مسلمہ میں کوئی مرد صالح نظر نہ آیا' اگر آیا تو وہ بھی فلمی دنیا کا ایک ناچا کنجر کہ جو امیتابھ بچن سے بھی زیادہ پاکستان و مسلمان دشمن اور تشدد پسند ہے۔ وہ دندناتا آئے گا اور پاکستان کی بیٹی کہ جو فوجوں کے جرنیل کی بیٹی بھی ہے کو راکھی باندھے گا۔ تف ہے ایسے فکری زوال پر' کیا ہی گرا ہوا طرز عمل ہے ہندو کو خوش کرنے

کا۔

1985ء میں ایک دفعہ سابق صدر ضیاء الحق بھی دورہ برما کے موقعہ پر ایک ایسی غلطی کر بیٹھے کہ جس کا انہیں بعد میں بہت افسوس ہوا۔ ہوا یوں کہ جب وہ برما پہنچے تو وہاں کے باشندوں کو خوش کرنے کے لئے رنگون کے ایک مندر میں گئے اور وہاں نصب سنہری مورتی پر پھول چڑھائے اور اپنی کسی خواہش کو پورا کرنے کے لئے مندر کے باہر لگی ہوئی چالیس ٹن وزنی (خواہشات کی گھنٹی) کو تین بار بجایا۔ اس کے فوراً بعد روزنامہ جنگ نے اپنی 7 مئی 1985ء کی اشاعت میں اس خبر کو شائع کر دیا۔ اسلام کی حمیت سے لبریز مسلمانوں کے دل اس خبر سے کٹ گئے اور انہوں نے اپنے شدید ردعمل کا جب اظہار کیا تو ضیاء الحق بہت پریشان ہوئے اور اپنی غلطی پر بہت پچھتائے۔

اعجاز الحق صاحب کو چاہئے کہ وہ ماضی کے اس سانحہ سے سبق حاصل کریں اور یہ نہ کہیں کہ اسلام میں کسی چیز کی پابندی نہیں...... اس لئے کہ اسلام تو نام ہی پابندیوں کے مجموعہ کا ہے کہ آپ نے کن کن امور سے بچ کر زندگی گزارنی ہے اور مسلمان بن کر دنیا میں رہنا ہے' نہ کہ ہندو۔

اے صدر صاحب! اے وزیر اعظم صاحب! اے وزیر مذہبی امور صاحب!...... آپ قوم کے راہبرو راہنما کی کرسی پر براجمان ہیں۔ آپ پر قوم کو ایک محب وطن پاکستانی اور باحمیت مسلمان بنانے کی گراں ذمہ داری کا بوجھ ہے۔ آپ نے قوم کے اذہان وقلوب میں دوقومی نظریے کو راسخ کرنا ہے...... لیکن افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ آج تک کسی بھی مسلمان نے ہندو کے سامنے اتنی لچک نہیں دکھائی جتنی آپ دکھا چکے ہیں۔ آپ نے ان کو ہیرو بنا لیا ہے' سر پر بٹھا لیا ہے' اس قوم کو موسٹ فیورٹ نیشن ٹھہرا دیا ہے' دوقومی نظریے کو ڈبو دیا ہے' مسئلہ کشمیر کو سمندر میں غرق کر دیا ہے' مجاہدین کو مجرم بنا دیا ہے' جہاد کو روک دیا ہے' ایٹمی پروگرام پر رول بیک کر لیا اور بھی بہت کچھ، صرف اس لئے کہ ہندو آپ سے راضی ہو جائیں۔ ماضی کی بیان کردہ یہ تصویر آپ ملاحظہ کریں اور اس تلخ تاریخی حقیقت کا ادراک کر لیں کہ جس کو کبھی جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ آپ ''کوا چلا ہنس کی چال تو اپنی چال بھی بھول

گیا'' کے مصداق بن کر اپنا سب کچھ گنوا تو سکتے ہیں لیکن ہندو سے حاصل کچھ نہیں کر سکتے۔

یاد رکھیں!...... آپ ہندوؤں کے پاس جا کر ان کی شالیں پہن لیں' ہندوؤں کو ہر طرح کی آزادی دے دیں' اپنے ماتھوں پر ہندوؤں کا مذہبی نشان تلک بھی لگوا لیں' پھر ہولی بھی منا لیں...... مندر میں جا کر عبادتی تقریبات میں شامل ہو کر ان کے بتوں کی پوجا بھی کر لیں۔ مختصراً یہ کہ آپ پورے کے پورے اندر اور باہر سے ہندو بھی بن جائیں...... بلکہ میڈیا کے زور سے پوری قوم کو ہندوؤں کا دیوانہ و مستانہ بنا لیں...... اس کے باوجود ہندو آپ سے کبھی راضی نہ ہوگا۔ وہ ہر نازک موقعہ سے فائدہ اٹھائے گا جہاں نقصان نظر آئے گا کوئی بہانہ کر کے پیچھے ہٹ جائے گا...... اور ہر وقت پاکستان کو توڑنے کی پالیسیوں پر گامزن ہے اور رہے گا اور آپ کے کیے دھرے خوشامدانہ اقدامات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے موقعہ ملتے ہی فائدہ اٹھاتے ہوئے بغل میں چھری منہ میں رام رام کا ثبوت دیتے ہوئے ضرور چھرا گھونپ دے گا۔ آپ چونکہ اپنے آپ کو قائداعظم اور علامہ اقبال والی مسلم لیگ کے وارث کہتے ہیں، اس لئے ذرا تصور کی آنکھ سے دیکھیں کہ اس موقعہ پر آپ کے اس طرز عمل پر ماتھوں پر تلک لگوانے اور پھیرے لگانے پر علامہ اقبال کی فکر تڑپ کر رہ گئی ہے۔ اقبال کی فکر آج آپ کو دیکھ کر بے ساختہ پکار رہی ہے کہ:

وضع میں تم ہو نصاریٰ تمدن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں کہ جنہیں دیکھ کر شرمائیں یہود

آج ہی غور و فکر کریں کہ آپ خود کیا بننا چاہتے ہیں اور قوم کو کیا بنانا چاہتے ہیں!!؟؟

غیرت کی چنگاری

گلی میں جھگڑا ہو رہا تھا' اسلم نامی ایک شخص ایک ڈرے سہمے نوجوان کو مارنے کے لیے بپھرا تھا' لوگ اسے قابو کر رہے تھے' میں قریب پہنچا اور پوچھا کہ معاملہ کیا ہے؟ اسلم نے بتایا کہ یہ نوجوان اپنے ساتھیوں سمیت میری بہن عائشہ کا ذکر کر رہا تھا' اس کی یہ جرأت کہ میری بہن کا نام زبان پر لائے!...... ہم نے لڑکے سے پوچھا تو اس نے قسمیں اٹھا کر کہا کہ میں ان کی بہن کو جانتا ہی نہیں' ہم تو ایک نوجوان بھکارن کا ذکر کر رہے تھے جو بن سنور کر بھیک مانگ رہی تھی اور لوگوں کو اپنا نام عائشہ بتا رہی تھی' ہمیں افسوس تھا کہ اتنا مقدس نام اور اتنا گھناؤنا کام...... ہم یہی ذکر کر رہے تھے کہ یہ صاحب یہ سن کر گرم ہو گئے۔

اسلم صاحب کو ساری بات سمجھ آ گئی اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ اس واقعے کو دیکھ کر میرے ذہن میں خیال آیا کہ آج فحاشی وعریانی کی بہتات کے دور میں بھی غیرت مند باحمیت بھائی موجود ہیں جو اپنی بہن کا نام تک کسی کی زبان پر آنا برداشت نہیں کرتے لیکن اب ان بھائیوں کی ذمہ داریاں مزید بڑھ گئی ہیں اور اپنی بہنوں کے تحفظ کا فریضہ پہلے کی نسبت کہیں بڑھ گیا ہے۔

لیکن یہاں ایک المیہ بھی ہے...... وہ یہ کہ...... ایسے پاکباز' نیک صفت' متقی' پرہیز گار لوگ...... بعض اوقات ان بیٹیوں کی تربیت میں بعض پہلوؤں میں غفلت کر جاتے ہیں۔ وہ بیٹیوں کی مکمل ذہنی دینی تربیت کرنے کی بجائے عام حالات میں ''سب اچھا ہے'' کے تحت آنکھیں بند رکھتے ہیں۔ مثلاً ایسے ہی باپوں اور بھائیوں کو اگر یہ پوچھا جائے کہ وہ اپنی بیٹیوں یا بچیوں کی سکول جاتے وقت نگرانی کرتے ہیں کہ وہ کیسے جاتی ہیں؟ اور کن لوازمات

کے تحت جاتی ہیں؟ کہیں گے کہ: ہماری بیٹیاں تو بہت نیک' باحیاء ہیں' چہرے کا پردہ (ڈاکو پردہ) کر کے نکلتی ہیں۔ انہوں نے کبھی یہ نوٹ نہیں کیا کہ ان کی بیٹیاں سکول کالج یا اکیڈمی جاتے ہوئے' ایک سٹوڈنٹ فائل اٹھائے ہوئے..... سینے سے لگائے ہوئے..... وارفتگی سے قدم بڑھاتے ہوئے..... جا رہی ہوتی ہیں۔ ان سٹوڈنٹ فائلوں (کلپ بورڈز) پر ہندوستانی بدکاروں' اداکاروں' برائی کے فنکاروں کی فحش تصاویر پرنٹ ہوتی ہیں۔ مثلاً سنجے دت' امیتابھ بچن' شاہ رخ خاں' اکشے کمار' دھرمیندر جیسے مشرک' گائے کے پجاری' گندے 'غلیظ' خبیث اور زانی اس کی فائل کی زینت بنے ہوتے ہیں۔ وہ ان غلیظوں کو سینے سے لگائے چوک چوک..... گلی گلی..... محلّہ محلّہ..... چلتی پھرتی ہیں' اب تو یہ ہلاکت خیز وبا اس تیزی سے پھیلی ہے کہ چھوٹی پرائمری سکول میں پڑھنے والی بچیاں بھی یہ فائلیں اور کلپ بورڈز اٹھائے سکولوں اور اکیڈمیوں میں دھکے کھاتی نظر آتی ہیں۔

اے غیور بھائیو!..... اس مہلک وباء نے بچیوں کو ایک اور انداز سے بھی متاثر کیا ہے کہ بچیاں جس بدبخت کمینے ہندو کی تصویر سینے سے لگائے گھومتی ہے اس نے اس کی مشہور فلموں کے مشہور گانے اور ڈائیلاگ ازبر کیے ہوتے ہیں وہ ان کو بولتی اور گنگناتی ہوئی شیطان کو خوش کرنے میں مصروف چلتی پھرتی نظر آتی ہے' اسی طرح اوباش سٹوڈنٹ اور گندے لڑکے بھی ہندو فاحشاؤں ہیروئنوں' بدکاروں مثلاً کاجل' ایشوریا رائے' جوہی چاولہ' مادھوری' سری دیوی جیسی زانیہ بدکارہ اداکاراؤں کی تصویریں فائلوں پر سجائے سینے سے لگائے' سیٹیاں بجاتے ہوئے' بچیوں پر نازیبا فقرے کستے ہوئے' ہوٹنگ کرتے اور تذلیل کرتے نظر آتے ہیں۔ چلتے پھرتے بچیوں کو مخاطب کر کے ان اداکاراؤں سے تشبیہ دیتے ہیں کہ مجھے تو تم فلاں جیسی لگتی ہو۔ استغفر الله من ذالك الهفوات۔

اس سے بڑھ کر غیرتوں کی قاتل ایک چیز اور بھی نظر آتی ہے۔ ان فائلوں پر اس قدر حیا سوز جملے لکھے ہوتے ہیں کہ جن کو مرد بھی دوسروں کے سامنے بولنے سے شرماتا ہے۔ ایسے گندے واہیات فقرے فائل والے کی شخصیت اور خیالات و افکار کے آئینہ دار اور

ترجمان سمجھے جاتے ہیں۔

اے بھائی!...... کیا آپ یہ برداشت کریں گے کہ آپ کی بہن یا بیٹی اس قسم کے سلوگن اور تصاویر والی فائلیں اٹھائے ہوئے آپ کی غیرت کا جنازہ نکالتی پھرے؟ عام طور پر مہذب اور شائستہ سمجھے جانے والے یہ فقرے گتوں پر یوں چمکتے نظر آتے ہیں! مثلاً love کی تشریح یوں کی گئی ہوتی ہے:

L= Land of sorrow	(غم کی زمین)
O= Ocean of tears	(آنسوؤں کا سمندر)
V= Valley of death	(موت کی وادی)
E= End of life	(زندگی کا خاتمہ)
This is love	(یہی ہے محبت)

اور کسی فائل پر اس طرح کے واہیات شعر لکھے نظر آتے ہیں:

Some love one some love two,

I love one that is you.

کوئی ایک سے محبت کرتا ہے تو کوئی دو سے

میں تو ایک ہی سے محبت کرتا ہوں جو تم ہو

میرے ایک بھائی نے بتایا کہ وہ اپنی شریک حیات کے لیے سیکنڈ ائیر کے امتحانات کے لیے ایک کلپ بورڈ خریدنے بازار گئے۔ کہتے ہیں دکاندار سے میں نے چار درجن کلپ بورڈز اور سٹوڈنٹ فائلیں دیکھیں لیکن ایک بھی پسند نہ آئی ...... کیونکہ سب بے غیرت ہندو اداکاروں فحش تصویروں اور غلیظ جملوں سے لتھڑی ہوئی تھیں' دیوث لوگ تو ان کو اپنی بیٹی یا بیوی کے لیے لے جاسکتے ہیں لیکن میں نہیں۔ اب کیا کروں؟ سوچ میں پڑ گیا' دکاندار میری مشکل کو سمجھ گیا' کہنے لگا: نجم بھائی! میرے پاس صرف ایک سادہ کلپ بورڈ ہے' کسی نے آج تک اسے خریدا نہیں' اگر پسند آئے تو لے لیں۔ پھر اس نے مجھے دکھایا تو میں نے سکھ کا

سانس لیا اور یہ سادہ گتا لے کر گھر آ گیا۔ یہ اس کے پاس ایک ہی تھا جو ابھی تک کسی نے نہ خریدا تھا۔ یہ لوگوں کے اندھے اور گمراہ کن رجحان کی نشاندہی کر رہا تھا کہ جس کی وجہ سے ان کی اندر سے غیرت کی چنگاریاں یکے بعد دیگرے ختم ہوتی جا رہی ہیں۔

میرے دوسرے دوست عبدالقیوم شفیق آف راجووال نے بتایا کہ وہ بازار میں اپنی بہن کے لیے امتحان دینے کے لیے کلپ بورڈ خریدنے گیا۔ بہت بھاگ دوڑ اور تلاش کے بعد میں کوئی ایسا کلپ بورڈ یا سٹوڈنٹ فائل تلاش کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا جو میں ایک باحیاء خاتون اسلام کو پیش کرسکوں۔ یہاں تو میری پیاری بہن کا مسئلہ تھا۔ کافی سوچ بچار کے بعد میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی' میں نے ایک سادہ فائل خریدی' اس پر جہادی سٹکرز اور پوسٹرز لگا کر اس کو لیمی نیشن کروایا اور پھر گھر لا کر بہن کے حوالے کیا۔

ایسے مواقع پر جب بیٹی یا بیٹا ایسے فحش کلپ بورڈز یا سٹوڈنٹ فائلیں اپنے سینوں سے لگائے پھرتے ہیں..... تو..... کہاں چلی جاتی ہے باپ کی حمیت..... کہاں چلی جاتی ہے بھائی کی غیرت..... کہاں جا سوتی ہے ماں کی ممتا کی تڑپ..... وہ کیسے برداشت کرتے ہیں کہ ان کی پاکباز بیٹیاں کہ..... جن کو وہ..... آسمان کی آنکھ سے بھی..... چھپانا چاہتے ہیں..... کہ وہ اپنے سینے کے ساتھ..... غلیظ مشرکوں' زانیوں' بدکاروں کو بھینچے ہوئے..... گلی گلی' محلّہ محلّہ' گھر گھر..... گھومتی پھریں..... اور یوں آپ کی دینی غیرت اور اخلاق کا جنازہ نکالتی پھر رہی ہیں..... وہ اللہ تعالیٰ اور رسول کے دشمنوں کو دلوں میں بسا کر..... سینوں سے لگا کر..... امام الانبیاء کے اس فرمان کی مصداق بن رہی ہیں کہ..... جو دنیا میں جس کے ساتھ محبت کرتا ہوگا وہ قیامت کے دن اسی کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔

اے بھائی!..... تو یقیناً اپنی بہن کے معاملے میں غیرت کرنے والا ہے..... تو بہن کو کیسے روکے گا' کہیں تو خود بھی اس مہلک مرض میں مبتلا تو نہیں!!؟..... اے ماں!..... تیرے دل میں تو اپنی اولاد کے لیے کائنات میں سب سے زیادہ پیار ہے' تو اس پر صدقے واری اور قربان ہوجانے کا جذبہ رکھتی ہے..... اے شفیق باپ..... ! تیرے دل میں اپنی

لاڈلی کے لیے شفقت محبت اور پیار ہی پیار ہے..... تو نے ساری عمر اس کونپل کی آبیاری و نگہداری کر کے اس کو پروان چڑھایا ہے..... کیا آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی لاڈلی' راج دلاری' پیاری قیامت کے دن..... مومنوں' مسلموں' پاکبازوں' جنتیوں' متقیوں کے بجائے بدکاروں' زنا کاروں' مشرکوں' گائے کے پجاریوں اور اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں کے ساتھ..... ساری دنیا کے سامنے اٹھائی جائے..... یقیناً آپ ایسا نہیں چاہتے..... تو پھر آج ہی اس نادان اور معصوم کلی کو کانٹوں کی شاہراہ پر چل کر..... زخمی ہونے سے پہلے پہلے' گلستانوں' چمنستانوں اور پھولوں کی روشن مہکتی شاہراہ پر..... گامزن کریں۔

اے پیاری نادان بھولی بھالی دین سے دور بہن......! کیا تو یہ پسند کرتی ہے کہ سیدہ خدیجہ' سیدہ عائشہ' سیدہ فاطمہ اور سیدہ زینب رضی اللہ عنہن کے ساتھ نہ اٹھائی جائے..... بلکہ ناچوں' گویوں' لچوں' لفنگوں' مشرکوں' اللہ کے باغیوں اور دشمنوں کے ساتھ اٹھائی جائے..... اور ان سے محبت کرنے کی بناء پر ان کے ساتھ ہی چلا کر..... جہنم میں جھونک دی جائے......!!؟..... یقیناً تو ایسا ہرگز نہیں چاہتی..... اس لیے کہ تیری رگوں میں امت مسلمہ کے غیور مسلمانوں کا خون گردش کر رہا ہے..... تو مسلمان ہے..... رسول ہاشمی سے محبت کرنے والی ......اور ان کے دشمنوں سے سب سے زیادہ دشمنی کرنے والی ہے۔ تو پھر آج سے اپنی یہ روش چھوڑ کر..... گلستانوں کی شاہراہ پر گامزن ہو کر...... اپنے خاندان کے لیے..... دنیا و آخرت میں فخر و کامیابی کا باعث بن جا..... اللہ تیرا حامی و ناصر ہوگا۔

آپ کی بیٹی کس بازار میں؟

سکول دلہن کی طرح سجا سنورا ہے۔ ہر طرف گہما گہمی ہے۔ شور شرابا ہلا گلا' شوخ آوازیں..... نسوانی قہقہے اور ہنسیاں ہیں..... گنگناہٹیں ہیں..... مسکراہٹیں ہیں..... تنگ و چست لباس ہیں..... فیشن کے نت نئے شرما دینے والے انداز ہیں..... میچنگ کے انوکھے اور حیا شکن مناظر ہیں..... اس معمارانِ قوم کے مسکن میں..... نونہالان وطن کی تربیت گاہ میں..... سکول کی یونیفارمز کی جگہ زرق برق بھڑکیلے اور چمکیلے لباسوں میں ملبوس..... انتہائی تیز اور شوخ میک اپ زدہ..... برہنہ چہروں کی حامل..... یہ نادان بچیاں..... پینٹ شرٹ میں جکڑے لڑکے..... اور دیگر تماشائی خواتین و حضرات..... مختلف نظاروں میں محو غرق ہیں..... اس ماڈرن سکول کے اساتذہ جو ان کے روحانی باپ ہونے کے دعویدار ہیں..... ان لڑکوں' لڑکیوں کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں..... کیونکہ انہوں نے خود اس سکول میں مینا بازار کا اہتمام کیا ہے۔

سٹیج سج چکا ہے' انڈین گانوں پر ناچ اور ڈانس کرنے والی لڑکیاں بھی تربیت کے بعد اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کے لیے تیار ہیں..... ڈرامہ کرنے والی مخلوط ٹیم بھی سٹیج کے پاس پہنچ چکی ہے..... ابھی ابھی رنگ و نور کا سیلاب امڈنے والا ہے..... کیونکہ ''حیا'' اور ''شرم'' یہ پرانے زمانے کے پرندے، یہاں سے لمبی اڑان بھر چکے ہیں۔ لیجیے اس بازار کی کارروائی شروع ہو چکی ہے..... ہر نسوانی اور مخلوط پارٹی اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کے لئے تیار ہو چکی ہے۔ ادھر چند نوجوان اور سکول سے غیر متعلقہ لڑکے ان کے ارد گرد منڈلا رہے ہیں۔

اسی دوران اچانک سکول کے دفتر میں ایک لڑکا داخل ہوتا ہے اور پرنسپل سے کہتا ہے

اور پھر چند لمحات بعد...... یکدم فائر ہوتا ہے...... فائر کے دھماکے سے یکدم خاموشی چھا جاتی ہے......اور گولی سیدھی آمدہ پارٹی کے ایک فرد کے...... سینے میں...... جا گھستی ہے...... اور وہ فوراً...... وہیں...... دھڑام سے...... اوندھے منہ...... زمین پر گر پڑتا ہے...... سینے سے خون کا فوارہ ابلتا ہے اور...... سنگ مرمر کا سفید و شفاف فرش...... سرخ سرخ...... گرم گرم...... تروتازہ خون سے بھر جاتا ہے...... اب ہر طرف بھاگ دوڑ ہے...... ہٹو بچو کا شور ہے...... دھڑ دھڑ دھڑ...... فوراً ہر طرف سے سکول کی چھت کو جانے والے دروازے بند ہو جاتے ہیں...... لیڈی ٹیچرز بچوں کو کمروں میں بند کر کے اندر سے دروازے لاک کر لیتی ہیں...... بچوں کی چیخیں بلند ہو رہی ہیں...... خوف و ہراس کا ہر سو عالم ہے...... سب کو جان کے لالے پڑ گئے...... ہر کوئی بھاگ رہا ہے...... لاشہ گرتے ہی جوانوں کا ریلہ جب بازار میں...... مار دیا...... مار دیا...... قتل کر دیا...... کی آوازیں لگاتا...... سرپٹ دوڑتا گزر جاتا ہے تو...... دھڑا دھڑ بازار کی دکانوں کے شٹر بند ہونے لگتے ہیں...... لوگ بھاگتے بھاگتے کانپتے ہاتھوں جلدی جلدی تالے لگا رہے ہیں...... کوئی چابی تالے میں ہی چھوڑ کر گھر کو بھاگ گیا......

وہی میک اپ سے سرخ و سفید بنائے گئے چہرے جو ابھی ٹیبلو اور انڈین گانوں پر رقص کرنے والے تھے...... ان پر موت کی زردی...... اور خوف و ہراس کی پرچھائیاں تھیں۔ خوف سے پیلے پڑ جانے والے جسم...... کپکپا رہے تھے...... جبکہ سکول کے صحن میں...... ابھی تک ایک زندہ انسان کی...... باڈی...... ایک فوارے کی طرح خون ابلتا جسم...... پھڑک رہا تھا...... چند لمحوں بعد بولتا چالتا...... ہنستا مسکراتا...... دوڑتا بھاگتا...... جسم...... بت بن چکا تھا...... سانسیں ختم اور روح پرواز کر چکی تھی...... ادھر لڑکوں نے وارثوں کو بتایا وہ بندوقیں اٹھائے فوری پہنچ گئے...... دونوں طرف سے فائرنگ کی جا رہی تھی جبکہ مینا بازار کی شائقین خوف سے کمروں میں دبکی بیٹھی تھیں۔ والدین کہ جن کے بچے سکول میں اس منحوس تقریب میں شرکت کے لئے خاص طور پر تیار ہو کر آئے تھے' نہایت پریشان تھے...... بلبلا رہے تھے کہ ہائے ہمارے بچوں کا کیا بنا؟...... وہ گلیوں بازاروں میں بھی نہیں نکل رہے...... وہاں ہر

اور پھر چند لمحات بعد...... یکدم فائر ہوتا ہے...... فائر کے دھماکے سے یکدم خاموشی چھا جاتی ہے......اور گولی سیدھی آمدہ پارٹی کے ایک فرد کے...... سینے میں...... جا گھستی ہے...... اور وہ فوراً...... وہیں...... دھڑام سے...... اوندھے منہ...... زمین پر گر پڑتا ہے...... سینے سے خون کا فوارہ ابلتا ہے اور...... سنگ مرمر کا سفید و شفاف فرش...... سرخ سرخ...... گرم گرم...... تروتازہ خون سے بھر جاتا ہے...... اب ہر طرف بھاگ دوڑ ہے...... ہٹو بچو کا شور ہے...... دھڑ دھڑ دھڑ...... فوراً ہر طرف سے سکول کی چھت کو جانے والے دروازے بند ہو جاتے ہیں...... لیڈی ٹیچرز بچوں کو کمروں میں بند کر کے اندر سے دروازے لاک کر لیتی ہیں...... بچوں کی چیخیں بلند ہو رہی ہیں...... خوف و ہراس کا ہر سو عالم ہے...... سب کو جان کے لالے پڑ گئے...... ہر کوئی بھاگ رہا ہے...... لاشہ گرتے ہی جوانوں کا ریلہ جب بازار میں...... مار دیا...... مار دیا...... قتل کر دیا...... کی آوازیں لگاتا...... سرپٹ دوڑتا گزر جاتا ہے تو...... دھڑا دھڑ بازار کی دکانوں کے شٹر بند ہونے لگتے ہیں...... لوگ بھاگتے بھاگتے کانپتے ہاتھوں جلدی جلدی تالے لگا رہے ہیں...... کوئی چابی تالے میں ہی چھوڑ کر گھر کو بھاگ گیا......

وہی میک اپ سے سرخ و سفید بنائے گئے چہرے جو ابھی ٹیبلو اور انڈین گانوں پر رقص کرنے والے تھے...... ان پر موت کی زردی...... اور خوف و ہراس کی پرچھائیاں تھیں۔ خوف سے پیلے پڑ جانے والے جسم...... کپکپا رہے تھے...... جبکہ سکول کے صحن میں...... ابھی تک ایک زندہ انسان کی...... باڈی...... ایک فوارے کی طرح خون ابلتا جسم...... پھڑک رہا تھا...... چند لمحوں بعد بولتا چالتا...... ہنستا مسکراتا...... دوڑتا بھاگتا...... جسم...... بت بن چکا تھا...... سانسیں ختم اور روح پرواز کر چکی تھی...... ادھر لڑکوں نے وارثوں کو بتایا وہ بندوقیں اٹھائے فوری پہنچ گئے...... دونوں طرف سے فائرنگ کی جا رہی تھی جبکہ مینا بازار کی شائقین خوف سے کمروں میں دبکی بیٹھی تھیں۔ والدین کہ جن کے بچے سکول میں اس منحوس تقریب میں شرکت کے لئے خاص طور پر تیار ہو کر آئے تھے' نہایت پریشان تھے...... بلبلا رہے تھے کہ ہائے ہمارے بچوں کا کیا بنا؟...... وہ گلیوں بازاروں میں بھی نہیں نکل رہے...... وہاں ہر

طرف اندھی گولیاں مزید کسی کو گرانے اور شکار کرنے کے لیے برس رہی تھیں۔ آخر بچوں پر ترس کھاتے ہوئے کچھ محلّہ داروں نے خفیہ طور پر سکول کی چھت کے ساتھ سیڑھیاں لگا کر ان کو دوسروں کے گھروں میں اتارا اور محفوظ کیا۔

شدید جنگ میں فریقین کا کافی نقصان ہوا۔ کئی افراد کے سروں اور جسم پر شدید زخم آئے..... زخمیوں کو جان بچانے کے لیے فوراً ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ ایک اور کے اللہ کو پیارے ہونے کی خبر موصول ہوگئی۔ پولیس آئی اور دونوں فریقوں کو پکڑ لیا گیا..... اب فرینڈز ماڈل سکول آف شاہدرہ لاہور نام کے اس سکول کو تالا لگ چکا ہے..... ہنستے بستے گھر ویران و سنسان..... جبکہ جیلیں آباد و گنجان ہیں..... مقدمے کا سامنا..... دشمنیوں کی ابتداء..... خاندانوں کا اجڑنا..... متاثرہ افراد کے خاندانوں اور بچوں کا مستقبل تباہ..... کیوں؟..... کیوں؟..... اور آخر کیوں ہوا یہ سب کچھ؟؟؟..... صرف اس لئے کہ ہم نے سلطان مدینہ' شاہ امم' فخر انسانیت، جناب رسول اللہ ﷺ کے فرامین کو پس پشت ڈالا..... اسلام کی سنہری و روشن تعلیمات کو چھوڑ کر ہندی و مغربی تہذیب وتمدن کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا..... شرم وحیا کا جنازہ نکال کر بے حیائیوں کو اپنایا..... اگر کسی نے روکا تو مولوی کہہ کر' ملا کہہ کر تضحیک وتوہین کا نشانہ بنادیا..... ''آپ کس ماحول میں رہ رہے ہیں؟ موجودہ دور کے مطابق زندگی گزارنا سیکھیں..... یہ چودہ سو سال پرانا دور نہیں.....'' نشتر جیسے جملے کہہ کر ناصح کو چپ کروادیا۔

ہم نے ایک دفعہ ایک سکول والوں کو سمجھایا کہ آپ نے اپنے سکول کا نام سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے نام پر رکھا ہے لیکن اپنی طالبات کو درس ''بے حیائی والے بازاروں'' کا دے رہے ہیں۔ ایسے بازاروں میں شرکت سے بچی شرم وحیا اور عفت وعصمت کا گوہر نایاب کھو دیتی ہے۔ آپ یہ بازار کہ جس میں ڈانس، رقص، گانے اور ٹیبلو شو نچانے کیا کیا بے حیائیاں اور خرافات ہوتی ہیں' بند کر دیں۔ وہ کہنے لگے: ایسا نہیں ہوسکتا' یہ تو اب ہر سکول میں تعلیم کا لازمی حصہ بن چکا ہے۔ ہم نے بچی کو اٹھوا کر اقراء روضۃ الاطفال میں داخل کروا دیا،

دوسرے بچوں کو بھی اٹھوالیا لیکن ان کے کان پر جوں تک نہ رینگی بلکہ وہ آخر دم تک اس ضد پر اڑے رہے کہ آپ اپنی بچی کو فنکشن پر ضرور بھیجیں' ہم نے اس کی ابتداء تلاوت سے کرنی ہے' چلو وہ تلاوت ہی کر دے' کسی اور پروگرام میں کہ جس کو آپ برا سمجھتے ہیں' حصہ نہ لے۔

اے معزز و محترم باپ!...... اے غیور بھائی!...... اے شفیق اور نرم دل ماں!...... اور اے پیاری نادان بھولی بہن!...... کیا آپ کی بھی کوئی پھول سی بچی یا بہن سکول پڑھتی ہے؟...... اور کہیں آپ بھی اس کو ایسی تقریبات میں بھیجنے کا اہتمام تو نہیں کرتے؟...... کہیں آپ بھی ان کو اس بازار میں بھیجنے کا باعث تو نہیں بن رہے؟ ہاں...... ہاں...... یہ بازار ''اُس بازار'' کا پیش خیمہ ہی ہے۔ کہیں اس طرح ان کی شرم و حیاء کو ختم کر کے ان کو بے حیائی' بے حمیتی' قرآن، اسلام اور رسول خیرالانامؐ کی دشمنی و مخالفت پر تو تیار نہیں کر رہے؟...... اگر ایسا ہے تو...... مرنے سے پہلے پہلے فکر کریں...... کیونکہ...... مرنے کے بعد اسی بیٹی نے قیامت کے دن...... اللہ کے دربار میں...... آپ کو گریبان سے پکڑ لینا اور کہنا ہے کہ اے اللہ! اگر سزا دینی ہے تو ان کو دو...... اس لئے کہ میری بے راہ روی اور اسلام سے دوری...... ہندو و صلیبی تہذیب و طور طریقوں کو اپنانے کا باعث...... یہی میرے والدین بنے ہیں...... نہ انہوں نے مجھے روکا...... نہ سمجھایا...... نہ میری راہنمائی کی...... مجرم یہ ہیں، میں نہیں...... خطا کار یہ ہیں، میں نہیں...... گناہگار یہ ہیں، میں نہیں...... لہٰذا سزا بھی ان کو دی جائے...... اے بھائیو!...... اے بہنو! ان کلیوں کی...... ان پھولوں کی...... آبیاری کیجئے...... ان نازک پنکھڑیوں کو حیاء باختگی کی تہذیب کے تیزاب سے بچایئے...... ان کو ایسا مؤمنانہ شعور بخشئے کہ مرنے کے بعد...... یہ آپ کے لیے نیکیوں کے اور اجر و ثواب کے اخروی بچت بینک بن سکیں...... آپ آخرت کے ''مجرم'' نہ بنیں...... بلکہ ان کی دنیا و آخرت ہر دو کے محسن و ''مہربان'' بن جائیں۔

دلہنیں یونہی اجڑتی رہیں گی

12 دسمبر 2005ء کی تمام اخباریں اپنی چیختی چلاتی سرخیوں کے ساتھ نوحہ کناں تھیں۔ ہر قومی اخبار پر ایک ہی خبر چھائی ہوئی تھی' جس میں بتایا گیا تھا کہ کیسے پل بھر میں 40 سے 50 انسان جل کر کوئلہ بن گئے۔ سعودیہ سے آئے ہوئے ظہیر کی بارات گلشن راوی لاہور سے واپس غازی آباد آ رہی تھی کہ ایک باراتی نے بس میں پڑے آتش بازی کے کافی مقدار میں موجود سامان میں سے ایک ہوائی اٹھا کر چلائی اور چلتی بس سے باہر پھینک دی...... لیکن وہ باہر پھینکی نہ جا سکی بلکہ ہوا کے زور سے دوبارہ واپس بس میں آتش بازی کے سامان پر ہی گر گئی۔

جب لوگوں نے یہ منظر دیکھا تو سب کو جانیں بچانے کی فکر ہوئی' سب اپنی اپنی سیٹوں سے اٹھ کر بھاگ کھڑے ہوئے...... لوگ آپس میں ٹکرا رہے تھے...... چیخ چلا رہے تھے...... کانوں پڑی آواز سنائی نہ دے رہی تھی...... بچوں کی اور عورتوں کی آہ و بکا نے ایک کربناک منظر بپا کر چھوڑا تھا...... آخر کار...... لوگ بس کے شیشوں سے ہی باہر چھلانگیں لگانے کے لیے...... شیشوں میں لگے راڈوں کے اندر سے سمٹ سمٹ کر اپنے آپ کو گزارنے کی کوشش کرنے لگے...... ماؤں بیچاریوں کو اپنے لخت جگروں کی پڑی تھی...... ہائے میرے بچے کا کیا بنے گا؟...... کوئی کچھ بھی نہ کر سکا کہ فرشتہ اجل آن پہنچا۔ رب کے حکم سے ان کی جانیں قبض کرنے کے لیے آن پہنچا...... اچانک بس میں زوردار دھماکہ ہوا اور پھر ایک کے بعد کئی دھماکے ہونے لگے۔ آگ ساری بس میں پھیل گئی...... زندہ جسموں کو جھلسا دینے والی اور پانی بنا دینے والی ہلاکت خیز آگ نے چھو لیا...... چمڑے ادھڑنے لگے...... جسم پگھلنے

لگے ......شنیل کے قیمتی کپڑے اور سیٹوں کا فوم جسموں سے انگاروں کی صورت میں لپٹنے لگا ......چیخیں مزید بلند ہوئیں ...... بچاؤ بچاؤ ہمیں بچاؤ۔ بس کے باہر بہت سے لوگ اکٹھے ہو چکے تھے' لیکن کسی کو اندر جانے کی ہمت نہ ہو رہی تھی۔ آخر چند لمحوں میں درجنوں انسان' زندہ بے بس انسانوں کے دیکھتے ہی دیکھتے جل کر خاک ہو گئے اور فرشتہ اجل ان کی جانیں لے کر چلتا بنا۔

مرنے کے بعد بھی ماؤں کو گودیں خالی نہ ہو سکیں ...... ماں کی ممتا امر ہو گئی ...... ماؤں نے بچوں کو اپنے سینوں سے الگ نہ کیا' خود کوئلہ بن گئیں لیکن بچوں کو اپنی شفقت بھری گود سے دور کرنا اور بھاگ کر صرف اپنی ہی جان بچا لینا گوارا نہ کیا' اب یہ بچے بھی ماؤں کی گود کے ساتھ ہی کوئلہ بن چکے تھے۔ شیشوں کے راڈوں سے گزرنے کی کوشش کرنے والے وہیں دہکتے کوئلوں کے نیچے راڈوں پر لٹکے کباب بن چکے تھے۔ اب کسی کو پہچاننا مشکل تھا کہ وہ کون ہے؟ ہر کوئی جلی ہوئی لکڑی کا کوئلہ بن کر بکھر گیا تھا اور پہچان مٹ چکی تھی۔

اب وہی گھر جہاں کچھ دیر پہلے شہنائیاں بج رہی تھیں' وہاں آہوں سسکیوں اور بینوں کا راج تھا۔ دلہا جو کار میں سوار ہونے کی بنا پر بچ گیا تھا' پاگل ہو کر دیواروں سے ٹکریں مارتا پھر رہا تھا۔ آج شادی کی باقی دیگر رسومات روک دی گئی تھیں ......لیکن معذرت کے ساتھ ...... اب ان ہندوؤانہ رسموں کو روکنے کا کیا فائدہ تھا ...... فائدہ تو تب تھا جب شادی شروع ہوتی تو ایک مسلمان ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے فضول بے کار ہندوؤانہ رسومات کو ترک کر دیا جاتا اور پیاری شریعتِ اسلام کی رہنمائی کو حرز جان بنا لیا جاتا۔ لیکن کیا کریں ایسی مہذب شادیوں کو اکثر ''مولویانہ شادیاں'' کہہ دیا جاتا ہے۔

راقم کے والد حاجی لال دین مرحوم صاحب فیصل آباد کے ساتھ گول چوک سمندری شہر کے باسی تھے' تمام لوگ کہتے تھے کہ وہ ولی اللہ شخص تھے' ان جیسا بندہ دیکھنے میں کم ہی نظر آتا ہے' اس کے باوجود میرے عزیزوں' رشتہ داروں کو ان سے ایک شکایت تھی کہ وہ جب بھی اپنے بہن بھائیوں کی شادیوں کی تقاریب پر جاتے ہیں تو ڈھولکیاں اور ساز

والے مٹکے توڑ دیتے ہیں۔ موسیقی' گانے بجانے اور آتش بازی پر مبنی (غیر شرعی و ہندووانہ) رسومات کی وجہ سے ان کی شادیوں میں بھی شرکت نہیں کرتے تھے۔ اس وقت بعض لوگ کہتے ہیں کہ چونکہ ہم ایک ہزار سال تک ہندوؤں کے ساتھ رہے ہیں' ان کی تہذیب کا اثر ہمارے معاشرے سے آہستہ آہستہ چلا جائے گا۔ ہم بھی یہ سن کر مطمئن ہو جاتے کہ ہاں یہ پرانے لوگ ہیں جنہوں نے ہندوؤں کے ساتھ زندگی گزاری ہے' نئی نسل آئے گی تو ضرور علم کی روشنی کی بناء پر ہندو تہذیب و ثقافت کے چنگل سے نجات پالے گی' لیکن افسوس صد افسوس! ہوا اس کے بالکل برعکس' نئی نسل کو ہندو تہذیب و ثقافت پر مبنی میڈیا وار نے اپنے شکنجے میں کس لیا اور وہ اب ہر طرح سے بول چال' چال چلن' رہن سہن' شادی مرگ الغرض تمام معاملات میں وہ ہندو ثقافت کی اسیر ہو چکی ہے۔

بقول شاعر:

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کر شرمائیں یہود

فیصل آباد سے ہی میرے دوست رمضان یوسف سلفی نے بتایا کہ یہاں ایک مہندی کی رسم میں لوگوں نے بطور مہمان آنے والی ایک لڑکی کو دعوت رقص دی کہ وہ بھی آگے بڑھ کر اپنے ''فن'' کا مظاہرہ کرے۔ سب کے اصرار پر وہ لڑکی آگے بڑھی اور ناچنے لگی۔ شور شرابا جاری تھا' ڈھول بج رہا تھا' واہ واہ کی تحسین کے ڈونگرے برسائے جا رہے تھے کہ اچانک وہ عورت زمین پر گری اور تڑپنے لگی۔ اب وہ ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی' جبکہ لوگ سمجھ رہے تھے کہ یہ بھی ناچ کے فن کا ایک انداز' سٹائل اور حصہ ہے' جسے وہ نہایت کامیابی سے سرانجام دے رہی ہے۔ تھوڑی دیر تڑپنے اور پھڑ کنے کے بعد عورت کا جسم ساکت و جامد ہو گیا۔ لوگوں نے آگے بڑھ کر اس کو اٹھایا تو پتہ چلا کہ اس کی تو سانس نہیں چل رہی۔ ڈاکٹر سے رجوع کیا' تو اس نے بتایا جب یہ زمین پر ناچتے ہوئے گری تھی اصل میں اس کو دل کا دورہ پڑا تھا مگر وہ طبی امداد نہ ملنے کی بناء پر تڑپ تڑپ کر مر گئی ......''با

غیرت بھائی'' اور'' بے بس باپ'' اس کا فن دیکھتے رہ گئے جبکہ وہ بے چاری ناچتے ہوئے ہندو تہذیب اور رسم و رواج کی شہید قرار پائی۔

ہندو تہذیب اور رسوم و رواج سے ڈسے جانے والے ایک خاندان کا واقعہ پچھلے سال ہمارے سامنے آیا۔ دلہا نے بارات کی روانگی سے قبل دو بلیوں کو فائرنگ کر کے مارا اور پھر صادق آباد کی طرف بارات روانہ ہوئی۔ بارات میں زیادہ تر نوجوان طبقہ شامل تھا۔ بارات کے ساتھ ایک مووی والا اور ایک ڈھولکی والا تھا۔ راستے میں خوب ہلاّ گُلاّ رہا' شور شرابا' غل غپاڑہ' ہاؤ ہو اور ساتھ ڈھولکی بھی بجتی رہی' مووی والا فلم بناتا رہا۔

واپسی پر ایسی ہی خرمستیوں میں مصروف جوانوں سے بھری بس چیچہ وطنی کے قریب ایک پل سے نیچے گر گئی تو بالکل حالیہ آتش بازی کے نتیجے میں ہلاک ہونے والوں کی طرح 40 افراد ہلاک ہو گئے اور بہت سارے شدید زخمی ہو گئے۔ دوسرے دن دلہا کے قریبی رشتہ دار جو کسی وجہ سے ناراض تھے اور شادی پر نہ آئے تھے' تعزیت کے لیے شیخوپورہ سے فیصل آباد آئے تو واپس جاتے ہوئے ان کا شدید قسم کا موٹر وے پر کار ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ 7 افراد موقعہ پر ہی ہلاک ہو گئے۔ تیسرے دن دلہا نے دلہن کو منحوس قرار دے کر طلاق دے دی۔ چوتھے دن دلہن نے مزید صدمہ برداشت نہ کرتے ہوئے خودکشی کر لی۔

ہاں تو میرے بھائیو' بہنو اور معزز قارئین!...... کبھی آپ نے سوچا ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ صرف اور صرف سنت خیر الانام سے دوری...... اور ہندوانہ و غیر شرعی رسموں سے محبت کی بناء پر...... جب تک امام کائناتﷺ کی پیاری پیاری سنتوں کو نہ تھامیں گے ہمارے ساتھ ایسا ہی ہوتا رہے گا' بعض نادان کہتے ہیں شادی بیاہ کا موقعہ ہے' مُنڈے کھنڈے جو ہوئے' ایسے موقعوں پر ان کو نہ روکنا چاہیے...... بھئی اللہ کے بندے! یہی تو نئی زندگی کا زینہ ہے' آغاز ہے' شروعات زیست ہے۔ اگر آپ نے ان کو ایک نئی...... زندگی کے سفر کی ابتداء میں ہی غلط رہنمائی فراہم کر دی' منزل نہ بتائی تو پھر وہ اپنی اس زندگی میں کامیاب کیسے ہو سکیں گے؟

بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہندوانہ رسموں والی ہر شادی کے ساتھ ایسا نہیں ہوتا ..... تو ان کے لیے میں صرف اتنا کہوں گا کہ آپ یہ بات اپنے پلے باندھ لیں کہ جو شادی جانتے بوجھتے اور نشاندہی کرنے کے باوجود بھی سنت کی مخالفت و دشمنی پر استوار ہوگی وہ کبھی کامیاب نہ ہوگی۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ آدمی امام کائنات محمد مصطفیٰ ﷺ کی مخالفت و دشمنی کرے اور دنیا و آخرت میں کامیاب ہو جائے' یہ ناکامی ان صورتوں میں ہوتی ہے:

﴿۱﴾ اگر اللہ تعالیٰ کو فوری غصہ آ جائے تو اس کے عذاب کا کوڑا برس پڑے اور تباہی و ہلاکت مقدر ٹھہرے جیسا کہ اوپر والی مثالوں میں ہے۔

﴿۲﴾ وقتی طور پر تو ایسی بے حیاء رسموں سے خاموشی اختیار کیے رکھی کہ چلو ہم تو اسے برا جانتے ہیں' یہی لوگ مصروف ہیں' ان کو لگے رہنے دو' تو ایسی صورت میں بیوی کی مستقبل کی عملی زندگی کے رویوں اور اولاد کی تربیت پر بھی برا اثر پڑتا ہے' وہ بھی ایسی غیر مہذب و حیاء باختہ رسموں سے دامن بچانے کی بجائے ان میں رنگے جاتے ہیں۔

﴿۳﴾ یہ رسومات اپنے اندر نہ صرف وقتی تاثر و تاثیر رکھتی ہیں بلکہ تقریبات میں شریک لوگوں کے ذہنوں اور عقیدوں کو بھی بدل کر رکھ دیتی ہیں' مشرک اقوام کی رسومات سوائے شرک اور کچھ رسومات سوائے بدعت و ضلالت کے اور کچھ نہیں پھیلاتیں' ایسی صورت میں جب مسلمان کے عقیدے پر اثرات پڑیں تو جو ایسی تقریبات میں شریک ہوں' ان کا بھی بیڑا غرق اور خود دلہا دلہن کے بننے والے نئے خاندان کا دنیوی اور اخروی طور پر بیڑا غرق۔ یاد رکھیں! ......عقیدے کی خرابی خاص طور پر شرک کبھی معاف نہیں ہوتا اور یوں آدمی ہمیشہ کے لیے جہنم کا ایندھن بن جاتا ہے۔

اے میرے غیرت مند بھائی! ...... ایسے موقعوں پر باپ جو بڑھاپے میں ہوتے ہیں' بے بس و بے کس ہوتے ہیں' وہ اپنی مجبوری بیان کرتے ہیں کہ کوئی ہماری سنتا نہیں' سب اپنی مرضی کرتے ہیں' اور آج کل کے میڈیا کے دور میں لڑکیاں اگر کچھ ڈرتی ہیں تو

باپوں کی بجائے بھائیوں سے' لہٰذا تم ہی اپنی بہنوں کو سمجھاؤ' ان کو ہندو تہذیب کے تیزاب میں جھلسنے سے بچاؤ' شادیوں کو پاکیزہ اور مثالی بناؤ' ان کو غیر شرعی رسومات سے آزاد کراؤ......

اے نوجوانو......! آگے بڑھو' شادیوں کے موقعہ پر آواز اٹھاؤ!......کیا ہوگا؟ زیادہ سے زیادہ تمہیں ''مولوی'' کے لقب سے نواز دیا جائے گا......لیکن گھبرانا نہیں'......اس لیے کہ جس کی سنت کے لیے تم یہ سب کچھ کر رہے ہو' اس کو تو بہت برے برے القابات سے نوازا گیا لیکن وہ باز نہ آیا' اور اس نے صاف کہہ دیا کہ اگر تم لوگ میرے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے ہاتھ میں چاند بھی لا کر رکھ دو گے تو میں اپنی حق بات کہنے سے باز نہ آؤں گا۔ کیا تمہاری عزت و وقار اس پاکباز ہستی سے بھی بڑھ گیا ہے!!؟

اے بوڑھے شفیق باپو!......آپ بھی اپنا کردار ادا کرو' بڑی بڑی باراتیں لے جانا بند کرو' سہرے گانے پہننا' مہندی کی مخلوط رسمیں کرانا' تیل چڑھانا' نیوندرا' آتش بازی کرانا' وٹہ سٹہ کی شادی کروانا' جہیز کی لعنت کو پروان چڑھانا' وغیرہ جیسی قبیح رسموں کو بند کرو......ورنہ ......یہ تمہاری بیٹیاں......یہ جگر کے ٹکڑے......یہ دلوں کا سکون......یہ آنکھوں کی ٹھنڈک......اور یہ دلہنیں یونہی اجڑتی رہیں گی......خون فضا میں بکھرتا رہے گا......دنیا تباہ اور آخرت برباد ہوتی رہے گی......اور مرنے کے بعد تمہیں اللہ کے حضور اس کے متعلق ضرور پوچھا جائے گا۔

رنگیلے کا رنگیلا سفر آخرت

چند دن قبل بندہ کے غریب خانہ پر شاہ کوٹ سے حافظ عبدالخالق صاحب تشریف لائے، ان کے لئے مٹھائی لانے کے لئے ایک سویٹ ہاؤس پر گیا تو وہاں ٹی وی آن تھا اور پردہ سکرین پر بے حس وحرکت ایک انسانی لاشہ نظر آیا۔ یہ لاشہ چارپائی پر تھا۔ اردگرد سوگوار منہ بنائے کچھ مرد عورتیں جمع تھیں۔ دیکھتے ہی ایسے لگا کہ جیسے اس چہرہ کو پہلے بھی کہیں اخبار وغیرہ کے صفحات پر دیکھا ہوا ہے۔غور کیا تو پتا چلا کہ یہ تو فلمی دنیا کی مسکراہٹوں کے کامیڈین اداکار رنگیلا صاحب ہیں۔ ہم نے دل میں کہا: لو یہ بھی گئے اس دنیا سے۔لیکن دوسرے ہی لمحے ایک اداکارہ نے بڑی افسردگی سے نمونہ عبرت بنے رنگیلا کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ وہ شخص ہے جو پوری دنیا کو ہنساتا تھا لیکن آج اس حالت میں چارپائی پر پڑا ہے کہ بات بھی نہیں کرسکتا اور نہ ہل جل سکتا ہے۔ پھر وہ ایک طرف منہ کر کے رونے لگی' جیسے کہ کسی مرنے والے پر رویا جاتا ہے۔ دوسرے قریب بیٹھے مرد وزن بھی اداکار اور اداکارائیں تھیں۔ سب بہت غمگین تھے گویا ان کا دوست ابھی ابھی ہمیشہ کے لئے بچھڑ جائے گا۔ یاد رہے یہ سب لوگ رنگیلا کی خواہش پر اس کی سالگرہ منانے اکٹھے ہوئے تھے۔ رنگیلا نے ان کو ناچنے گانے کے لئے بلایا تھا۔ گویا رنگیلا اپنے آخری لمحات بھی رنگین بنانا چاہتا تھا۔ پردہ سکرین پر مناظر بدلتے جارہے تھے۔ کچھ دیر بعد اداکاروں نے ایسے آخرت کے مسافر کو الوداع کرنے کے لئے ایک انوکھا کام شروع کر دیا۔

قارئین یہ سوچ رہے ہوں گے کہ میں کہوں گا سب نے مل کر اس موقعہ پر کلمہ پڑھنے کی تلقین شروع کر دی ہوگی...... نہیں نہیں محترم قارئین!...... ان ہیرو ہیروئنز نے گانے گانے

شروع کر دیے۔ وہ مختلف فحش اور عشقیہ گیت گا کر زندگی کے مسافر کو سنا رہے تھے۔ ناچ رہے تھے...... گا رہے تھے...... اور خوب ہلا گلا کر رہے تھے۔ ایسے ہی ہنگاموں میں انہوں نے کیک کاٹا جبکہ چارپائی پر پڑا رنگیلا حسرت سے سب کو دیکھ رہا تھا۔ اناؤنسر نے بتایا کہ اگرچہ رنگیلا ہلنے جلنے سے قاصر ہے' بات کرنے کی طاقت نہیں رکھتا لیکن وہ ساتھی اداکاروں کو یہ کام کرتے دیکھ کر کئی بار دھیمی سی مسکراہٹ مسکرائے ہیں اور کئی بار روئے بھی ہیں۔ (شاید اس حسرت سے کہ میں اس ہاؤ ہو' شور شرابے اور ہلے گلے میں شریک کیوں نہیں ہوں) ہم رنگیلا صاحب کی ''ان لمحات'' میں بھی رنگین مزاجی کو ملاحظہ کر کے حیران رہ گئے۔ ہم ان کی ایک فلم ''کوڈے شاہ'' سے یہ گمان کیے بیٹھے تھے کہ رنگیلا کی زندگی رنگیلی ہونے کی بجائے سادگی پر مبنی ہے اور کسی حد تک جہالت سے بیزاری اور مذہب کی پاسداری کا عنصر ان کی زندگی کا حصہ ہے۔ ایسے لمحات میں ہر انسان اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے' توبہ کرتا ہے لیکن شاید ان کا فیلڈ ہی ایسا ہے کہ جہاں توبہ سے ہی توبہ کی جاتی ہے۔

مرتے وقت بعض لوگ عجیب و غریب خواہشات کا اظہار کرتے ہیں۔ جیسے ہمارے مشہور ادیب و تخلیق کار جناب اشفاق احمد نے وصیت کی کہ ان کے مرنے کے بعد ان کی قبر پر ڈھولکی بجانے والے ایک مقررہ وقت تک مقررہ ایام تک ڈھول بجائیں۔ شاید رنگیلا بھی کچھ ایسی ہی خواہش کریں کہ میرے مرنے کے بعد میری قبر پر قہقہوں کی برسات کی جائے اور لطیفے و چٹکلے سنا کر آنے والوں کو عبرت کے لئے رونے کی بجائے ہنسایا جائے۔

کچھ عرصہ قبل ایسے ہی ایک مرنے والے نے وصیت کی کہ میرے مرنے پر طوائفیں ناچیں اور رقص و سرود کی خوب محفل جمے۔ مرنے کے بعد لواحقین کو فکر لاحق ہوئی کہ مرنے والے کی خواہش تو ضرور پوری کرنی چاہیے۔ لہٰذا وہ ''اس بازار'' کی ناچنے والیوں کے پاس پہنچے' انہوں نے مدعا سننے کے بعد صاف کورا کورا جواب دیا کہ ٹھیک ہے ہم ناچتی گاتی اور رقص ضرور کرتی ہیں' مجرے کرتی ہیں لیکن ہم اتنی بھی بے غیرت نہیں ہوئیں کہ مرنے پہ ناچیں اور اپنے پیشے کی ''نیک نامی'' پہ بٹہ لگائیں۔ لواحقین پریشان تھے' وہ مرحوم کی آخری

خواہش کو ضرور پورا کرنا چاہتے تھے۔ لہٰذا وہ ہیجڑوں کے پاس گئے تو انہوں نے کہا: آیئے پدھاریئے مہاراج! ہم حاضر ہیں' ہم یہ خدمت ضرور سرانجام دیں گے اور مرحوم کی روح کو خوش کرتے ہوئے ایصال ثواب کریں گے۔ ہم مُردوں میں اور زندوں میں اسی طرح مردوں میں اور عورتوں میں بھی دونوں طرف چل جاتے ہیں۔ اس طرح انہوں نے پوری جذب و مستی اور وارفتگی کے عالم میں مرحوم کی روح کو خوش کیا۔

ایسے ہی یہ اداکار رنگیلا کی روح کو ناچ گا کر خوش کرنے کی کوشش کرتے رہے کہ مبادا یہ اس کا آخری وقت ہو۔ ان میں کوئی یٰسین پڑھنے والا' تلاوت کرنے والا یا کلمہ پڑھنے والا نہ تھا...... ہاں ایک فرد شاید ایسا کرنے والا یہاں ہوتا...... لیکن اس کو رنگیلا نے خود ایسے افعال سیکھنے سے منع کر دیا تھا۔ ہوا یوں کہ ایک دفعہ رنگیلا کا بیٹا جہادِ کشمیر میں بہنوں کے اڑتے آنچل اور لٹتی عصمتوں کے روح فرسا واقعات سے متاثر ہو کر عسکری ٹریننگ لینے کے لئے لشکر والوں کے معسکر (چھاؤنی) پہنچ گیا۔ رنگیلا کو جب پتا چلا کہ میرا بیٹا لشکر طیبہ والوں کے پاس پہنچ چکا ہے تو اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے' کہ یوں یہ لڑکا مولوی بن جائے گا...... ہماری فیلڈ کو چھوڑ دے گا...... جہاں ہم مسکرائیں گے...... گنگنائیں گے...... ناچیں گے...... کودیں گے...... انجوائے کر رہے ہوں گے...... تو یہ وہاں...... ایک نصیحت کرنے والا...... اور سپارہ پڑھنے والا...... مولوی بن کر کھڑا ہو جائے گا...... اور ہم کو سمجھائے گا' روکے گا' ٹوکے گا' یا کہیں کشمیر جا کر گن چلائے گا!!...... یہ نہیں ہو سکتا...... میں اس کو ایسا نہیں بننے دوں گا...... لہٰذا وہ بھاگا بھاگا مظفر آباد معسکر میں پہنچ گیا اور وہاں مجاہدین کے درمیان رہا' ان کی نمازوں' تلاوتوں' تہجدوں' دعاؤں' التجاؤں' اللہ کے حضور گڑگڑاہٹوں کو دیکھا...... لیکن...... لیکن...... اس کا دل نہ پسیجا اور وہ اپنے بیٹے کو واپس اپنے ساتھ لاہور لے آیا۔ وہاں جب مجاہدین نے اس کو اس نیت سے کہا کہ گدھے کی آواز نکال کر دکھاؤ کہ شاید وہ اپنی زندگی کی غلط سمت کے متعلق غور و فکر کرے' لیکن اس نے تو بڑے فخر سے یہ کارنامہ سرانجام دیا...... اور ہنہنانے اور ڈھینچوں ڈھینچوں کرنے لگا...... ٹریننگ کے لئے آنے والے لڑکے

بظاہر ہنس رہے تھے لیکن اندر سے افسردہ تھے اور دعا کر رہے تھے کہ اللہ انہیں ہدایت دے۔
آج وہی رنگیلا جو ہر جانور کی آواز نکال کر لوگوں کو ہنساتا تھا' بستر مرگ پر ہے' وہ دوائی اور پانی مانگنے کے لئے ہلکی سی آواز نکالنے پر بھی قادر نہیں۔ ہم رنگیلا سے فقط اتنا کہیں گے.... آخری وقت ہے اب اس زبان کو اللہ کے ذکر سے تر کر لو اس کی طرف رجوع کر لو' توبہ کے دروازے کھلے ہیں' خالق کائنات نے فرمایا ہے:

صِبْغَةُ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً

''اللہ کا رنگ ہی سب سے بہتر ہے اور جسے اللہ اپنے کرم سے رنگ دے اس کی قسمتوں کے کیا کہنے''

لہٰذا رنگین زندگی کے رنگیلے پن کو اب بھی چھوڑ دو' اللہ کے رنگ میں رنگ جاؤ' شاید وہ معاف کر دے اور زندگی..... بلکہ پرمسرت زندگی کے..... جھونکے پھر سے چلنے لگیں۔

ٹی وی کا فیض پہنچے گا اب ہر خاص و عام تک

ہماری ترقی پسند حکومت کی طرف سے ایک نیا قانون بنایا جا رہا ہے جس کے مطابق ہر اس شخص کو بھی ٹی وی کی سالانہ فیس ادا کرنی پڑے گی کہ جس نے آج تک ٹی وی رکھنے کی ''سعادت'' حاصل نہ کی ہوگی۔ جو ٹی وی رکھے وہ تو فیس دے لیکن جو اس کے وجود سے محروم ہو وہ کیوں دے؟ اس نے کون سا جرم کیا ہے کہ جس کی اس کو سزا دی جا رہی ہے' اس طرح کے خیالات آج کل عام طور پر لوگوں کے اندر گردش کر رہے ہیں۔ سینٹ کے اراکین نے بھی اس قانون کی مخالفت میں قرارداد پاس کی ہے لیکن حکومت ٹس سے مس نہیں ہوئی۔

ضیاء الحق کے دور میں ہم چھوٹے بچے تھے اور ہمیں یاد ہے کہ انڈین فلموں اور وی سی آر پر پابندی تھی' کوئی اپنے گھر میں چھپ کر بھی وی سی آر پر انڈیا کی فلم نہ دیکھ سکتا تھا۔ یہ مسلم معاشرے کو ہندو تہذیب و ثقافت اور مشرکانہ اثرات سے بچانے کی ایک قابل ستائش کوشش تھی۔ جو آدمی ہندوستانی فلم دیکھتا پکڑا جاتا اس کو سزا دی جاتی تھی۔ وی سی آر پر چھپ چھپ کر ہندوستانی فلمیں دیکھنے والوں کو قانون نافذ کرنے والے ادارے خفیہ چھاپے مار کر پکڑتے اور حوالات میں بند کر دیتے۔ ایسے مجرم جو انڈین فلمیں دیکھتے خواہ چھپ کر ہی' لوگ ان کو اچھی نظروں سے نہ دیکھتے تھے بلکہ معاشرے کے بے حیاء اور فحاشی کے رسیا کمینے افراد قرار دیتے تھے' ان پر طرح طرح سے انگلیاں اٹھاتے اور باتیں بناتے۔ اس لیے ایسے لوگ وی سی آر کا بندوبست کر کے یہ ''خدمات'' چھپ چھپا کر سرانجام دیتے تھے۔

ضیاء الحق مرحوم کا ہی دور تھا کہ ایک وزیر کے پیٹ میں معیشت کی بحالی اور خزانہ

کو بھرنے کا مروڑ اٹھا اور اس نے ضیاء حکومت کو نہایت ''خلوص'' سے یہ مشورہ دیا کہ اگر وی سی آر پر سالانہ فیس کی ادائیگی کا قانون بنا دیا جائے تو خزانہ میں اضافہ ہوگا۔ نہایت ''سیانے'' پالیسی ساز بزرجمہروں نے ''ہاں'' میں گردن ہلا دی اور یوں یہ ملک کا قانون بن گیا کہ کچھ روپے ادا کر کے جو چاہے وی سی آر رکھ سکتا ہے' البتہ انڈین فلموں پر اخلاقی و قانونی پابندی برقرار رہی۔ ضیاء حکومت کے وی سی آر پر فیس کے اجراء کے قانون نے قیام پاکستان سے لے کر آج تک بندھا ہوا اخلاقی بند ہمیشہ کے لیے توڑ دیا اور پھر بدتہذیبی اور حیاء باختہ ہندووانہ ثقافت کو وہ عروج ملا اور اسلامی اقدار کو ایسا زبردست دھچکا لگا کہ ہر کوئی ہندو تہذیب و ثقافت کا دیوانہ اور نشئی ہو کر رہ گیا۔ حتیٰ کہ جو مسلمان متحدہ عرب امارات یا دبئی سعودیہ میں حج و عمرہ وغیرہ میں جاتا اور پھر جب واپس آتا تو وہ بھی وی سی آر اور انڈین ویڈیو فلموں کا کارٹن بطور ''تبرک'' اٹھائے لاتا۔ پوچھنے پر بتاتا کہ یہ ٹی وی' وی سی آر اور یہ کیسٹیں (انڈین فلمیں) کافی سستی مل گئی تھیں اس لیے لے آیا۔ کچھ تو بازار میں بیچ دوں گا اور یوں ایک طرف کا کرایہ ہی نکل آئے گا' جبکہ باقی کیسٹیں گھر میں بچے استعمال کریں گے۔ جب سنجیدہ مسلمانوں کا یہ حال ہو گیا تو باقی لوگوں کی فکری تباہی کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔

انڈین فلموں' وی سی آر وغیرہ پر پابندی کے اس خاتمے اور فیس کے اجراء کے قانون سے برائی کے کئی درختوں نے جنم لیا۔ ٹی وی کی مقبولیت میں اضافہ اور ٹی وی کی خدمات کو فروغ ملا' ویڈیو کیسٹ کے وسیع کاروبار نے ترقی کی' وی سی آر کی صنعت نے باقاعدگی سے جنم لیا' پھر بڑھتے بڑھتے ٹی وی سے وی سی آر اور پھر ڈش انٹینا اور پھر ڈش انٹینا کو کیبل نے ناک آؤٹ کر دیا اور اب انٹرنیٹ اور کیبل چینلز سب سے آگے آگے یہودیوں کے سائے اور سرپرستی میں اسلامی اقدار اور مذہب کی گرفت کے خاتمے کے لیے اپنی ''بہترین خدمات'' سرانجام دے رہے ہیں۔

اب موجودہ گورنمنٹ نے عوام کے پرزور اصرار کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ٹی وی کا قبلہ درست کرنے کی کوشش تو نہ کی البتہ ٹی وی کی سالانہ فیس ہر پاکستانی کو لازمی ادا

کرنے کا قانون پاس کر کے لاشعوری طور پر ہر ایک کو ٹی وی رکھنے اور صلیبیوں یہودیوں اور ہندوؤں کے رنگ میں رنگے جانے کا حکم دے دیا ہے۔ دینی اقدار سے نا آشنا لوگ اس قانون کے نفاذ کے ردعمل میں کہہ رہے ہیں کہ جب ٹی وی کی فیس ہر حال میں ادا کرنی ہے تو پھر ہم بھی ٹی وی گھر میں لے آتے ہیں۔ ٹی وی نہ رکھ کر بل میں شامل مفت میں ان حکومتی مگرمچھوں کو کیوں فیس ہڑپ کرنے دیں۔ ایک پھل فروش ریڑھی والا جو اکثر رات ایک ڈیڑھ بجے تک پھل بیچتا ہے اور ہر وقت ریڈیو لگائے رکھتا ہے' پچھلے دنوں جب راقم اس کے پاس پھل لینے گیا تو اس نے ٹی وی لگا رکھا تھا۔ بندہ نے حیران ہو کر پوچھا: چچا جان! بڑی ترقی کر رہے ہو کہ اب ریڈیو کی جگہ ٹی وی نے لے لی ہے' تو وہ جواب میں کہنے لگا: ٹی وی رکھیں یا نہ رکھیں فیس تو ہر حال میں سرکار کے کھاتے میں جمع کروانی ہی ہے۔ میں ایک ٹی وی گھر میں لے آیا ہوں اور ایک دوسرا سیکنڈ ہینڈ خرید کر ریڑھی پر لگالیا ہے' اب کیا ڈر؟ آخر فیس جو بھرنی ہے۔ میں نے سوچا کیوں نہ ایک ٹکٹ (فیس) میں دو شو (ٹی وی) دیکھیں۔ اب اُن تمام جگہوں پر کہ جہاں خاندان اور اسلامی اقدار کی پاسداری میں آج تک ٹی وی نہ پہنچ سکا وہاں بھی لاشعوری طور پر پہنچ جائے گا اور اپنا رنگ جمائے گا۔ اور پھر ڈش اور کیبل کے لیے راستہ ہموار ہوگا اور جواز کے طور پر کہا جائے گا کہ فلاں آپریٹر صرف 125 روپے کیبل کے کنکشن کے طلب کر رہا ہے' ٹی وی کے پروگرام تو بہت بور ہیں' کیوں نہ کیبل کا کنکشن لے لیا جائے' تا کہ بروقت اطلاعات مل سکیں اور پتہ چلے کہ اس وقت دنیا میں کیا ہو رہا ہے اور ہم کہاں کھڑے ہیں؟؟ اس طرح ایک ایسا ''انقلاب بدتمیزی'' برپا ہوگا کہ جس کا سہرا موجودہ حکومت کے سر ہوگا۔ یوں اخلاقی و روحانی اقدار کا مزید جنازہ اٹھنے کا باعث بنے گا' اسلام کی زندگیوں پر گرفت کمزور ہوگی' سیکولرازم کا دور دورہ ہوگا' رشتوں کا تقدس پامال و مجروح ہوگا' اور یہی دنیا بھر کے صلیبی یہودی ہندو اور کافر چاہتے ہیں۔

ہم یہ سمجھ رہے ہیں کہ حکومتی اداروں کا یہ اقدام بھی اپنی مرضی سے نہیں بلکہ امریکہ کے دباؤ کی وجہ سے ہے جیسا کہ حکومت نے اس کے دباؤ میں آ کر وانا میں آپریشن کر کے

اللہ کے ولیوں کو شہید کر دیا ہے۔ یورپ کے ایسے سیکولر اقدامات اسلام کے خلاف نظریاتی سرحدوں پر خوفناک و ہولناک جنگ ہیں۔ یہ لڑائی جغرافیائی و علاقائی سرحدوں کی بجائے نظریاتی وفکری سرحدوں اور میدانوں میں لڑی جا رہی ہے۔ اگر چہ ہمارے حکمران تو زیادہ ہی روشن خیالی کا مظاہرہ کر کے اپنے ''دوستوں'' کے منظور نظر اور نور چشم بننا چاہتے ہیں لیکن ملک کو چلانے والے اداروں کے سربراہوں کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ صدر صاحب کو ایسے گھناؤنے اقدامات کے خطرناک و ہولناک ملکی، ملی، نظریاتی و مذہبی نقصانات بتا کر روکنے کی کوشش کریں، ورنہ وہ قیامت کے دن اللہ کریم کے دربار میں اپنے افعال کے جواب دہ ہوں گے۔ وہ سوچ لیں اس وقت وہ کون سا عذر و بہانہ پیش کریں گے کہ جس سے جان چھوٹ جائے۔ اور یہ بھی سوچ لیں کہ اس فیس سے آپ کے خزانے شاید کچھ بھر ہی جائیں لیکن آخرت کے خزانے خالی ہونے کا خطرہ پھر بھی سر پر تلوار کی طرح منڈلاتا رہے گا۔

سنہری لٹ

ایک ماہ ہونے کو ہے، میں جس کو دیکھتا وہی اس رنگ میں رنگا نظر آتا، جس لڑکے یا جوان کے سر کی طرف دیکھتا تو ترس کھا کر دل مسوس کر رہ جاتا کہ دیکھو! اس بیچارے کے سر کے درمیان سامنے پیشانی کے اوپر کے بال سفید ہو گئے ہیں اور اس بیچارے نے سفیدی کو چھپانے کے لئے مہندی لگا کر ان بالوں کو مہندی رنگ یا سنہری رنگ کر لیا ہے۔ اسی طرح گائیوں اور بھینسوں کی طرح کھلے چہرے کے ساتھ بے باکانہ گھومتی لڑکیوں پر نظر پڑی تو ان کا بھی یہی حال دیکھا۔ ان بے حجاب آوارہ منش بازار میں گھومنے والی بہنوں پر ایک عورت ذات ہونے کی بناء پر ترس آیا کہ لڑکی کے لئے تو بالوں میں سفیدی یا چاندی کا آجانا باعث عار وندامت سمجھا جاتا ہے۔ اگر کسی لڑکی کے سر میں سفید بال آجائیں اگرچہ اس کی عمر چھوٹی ہی ہو لیکن اس کو پسند کرنے کے لئے آنے والے سوچتے ہیں کہ اس کے سر میں چاندی آرہی ہے جبکہ یہ عمر اتنی تھوڑی بتا رہے ہیں، ضرور غلط بیانی سے کام لے کر عمر چھپا رہے ہیں۔ یوں لڑکیوں کا مستقبل خطرے کی زد میں آکر سمندری بھنور میں پھنسی کشتی کی طرح ہچکولے کھانے لگتا ہے۔ میں حیران و پریشان تھا کہ کس تیزی سے اس بیماری نے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں پر حملہ کیا ہے کہ ہر کوئی اس کا شکار ہو کر رہ گیا ہے۔ جدھر دیکھو سر کے درمیان بالوں کی لٹ پر مہندی رنگ لگائے سفیدی چھپانے کے لئے کوشاں نظر آتے ہیں۔ میں نے اپنے گھر میں بھی کئی دفعہ نوجوان نسل سے ہمدردی کے لئے اظہار کیا کہ دیکھو کس تیزی سے نئی نسل کے بالوں پر ایک بیماری نے حملہ کر کے ان کو سفید کر کے رکھ دیا ہے۔

یہی حال میں نے اپنے دفتر میں موجود بھائی عفان حیدر کا دیکھا تو از راہ ہمدردی منہ

سے نکل گیا: عفان بھائی آپ بھی...... مطلب تھا کہ آخر آپ بھی اس بیماری کا شکار ہو گئے۔
وہ اس کو تنقید سمجھے اور کہنے لگے: طاہر بھائی! یہ ضرور ایک فیشن ہے جو وبا کی طرح ہر طرف پھیل گیا ہے۔ لوگ حمام پر جا کر خود اپنے بالوں کو کیمیکل لگوا کر ایسا رنگ کرواتے ہیں اور اسے خوبصورتی کا ذریعہ تصور کرتے ہیں۔ میں نے شوق سے نہیں بلکہ مجبوری سے ایک شادی کے موقعہ پر چند دوستوں کے اصرار پر ایسا کیا ہے۔ اور یہ بال جو کیمیکل سے سفید ہو جاتے ہیں، مستقل ایسے نہیں رہتے بلکہ نیچے سے نئے بال اگ آنے اور پھر بڑھ جانے کی بنا پر ان سفید بالوں کی لٹ کو کاٹا جا سکتا ہے۔ اب مجھے پتہ چلا کہ یہ بیماری نہیں بلکہ غلاموں اور احساس کمتری کے شکار لوگوں کا فیشن ہے کہ جس کو نوجوان نسل نے فخر سمجھ کر اپنے ماتھوں کا جھومر بنا لیا ہے اور ہیجڑے بن کر گلیوں بازاروں میں بڑی ''شان'' سے آوارہ گردی کرتے پھر رہے ہیں، میڈیکل سٹوروں سے لیکوئیڈ ہائیڈروجن بھی یہ شیر دل جوان عورتوں کی طرح بال سنہری کرنے کے لئے دھڑا دھڑ خرید رہے ہیں۔

میں فوراً اس کی تحقیق کے لئے ایک ہیئر فیشن سنٹر پر گیا، دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ یہ فیشن یورپ سے آیا ہے۔ یورپ کی گوریاں دوسرے لوگوں کو مخصوص مقاصد کی خاطر اپنی طرف مائل کرنے کے لئے اور اپنے آپ کو دوسروں کی نظروں میں پرکشش بنانے کے لئے اپنے سر کے بالوں کے مختلف رنگوں کے سٹائل بناتی ہیں۔ سنٹر کے مالک نے اس بات کے ثبوت کے لئے مجھے بڑے جمبو سائز کا ایک موٹا لیمینیشن شدہ تہہ شدہ رنگین چارٹ بھی دکھایا' اس پر بالوں کو مختلف رنگوں میں رنگنے کی تفاصیل درج تھیں' ساتھ ساتھ یورپین گوریوں کی تصاویر بھی تھیں۔ میں حیران ہو گیا کہ یہ فیشن تو یورپ کی حیاء باختہ فاحشاؤں کا تھا۔ اس سے ان کا مقصد غیر محرم مردوں کو اپنی طرف متوجہ کر کے منہ کالا کرنا تھا جبکہ ہمارے ہاں عقل کے اندھوں کی اس قدر بہتات ہے کہ اس مسئلہ میں اگر ہم اپنے آپ کو خود کفیل کہیں تو مبالغہ نہ ہو گا۔ ہمارے ان عقل کے اندھوں میں عورت کہ جس کی اگر رہنمائی نہ کی جائے تو وہ فیشن کے معاملہ میں اندھی اور بیوقوف ثابت ہوتی ہے۔ یہاں صرف عورتوں نے ہی اپنا ''چاٹا''

(سر) سفید نہ کر لیا تھا بلکہ مرد بھی کسی سے پیچھے نہ رہے تھے۔

اب تو ان کو دیکھ کر صرف یہ کہنے کو دل چاہتا تھا کہ:

تولا چاٹا شرم دا گھاٹا

ماضی میں کبھی کوئی یہ تصور نہ کر سکتا تھا کہ عورت اپنے ہونٹوں کو کالا، پیلا، نیلا یا سبزی مائل بھی کر سکتی ہے، کیونکہ حسن وخوبصورتی کا باعث صرف اور صرف سرخ رنگ کو سمجھا جاتا اور اس کے لئے عورت دنداسہ یا لپ اسٹک کا استعمال کرتی تھی۔ لیکن تھوڑی دیر بعد یورپ کی فاحشاؤں نے اپنے گندے ہونٹوں کو کالا کرنا شروع کر دیا تو ہماری عورت نے بھی میچنگ کے نام پر اپنے ہونٹوں کو کالا، نیلا یا سبزی مائل ہرا کرنا شروع کر دیا۔

اس صورت حال کو دیکھ کر بے ساختہ یہ کہنے کو دل چاہتا ہے کہ:

دیسی میم ولایتی چیچاں

ہماری نادان عورتوں کا حال بھی بالکل ویسے ہی ہو گیا ہے جیسے کہ لاہور شاہو کی گڑھی کی ایک چوڑی (عیسائن) ولایت چلی گئی، چند سال وہاں گزار کر جب واپس پاکستان عزیز واقارب کے پاس ملنے آئی' ریلوے اسٹیشن پر اتری تو وہ چال ڈھال اور لباس سے بالکل ولایتی میم نظر آ رہی تھی۔ ہر دیکھنے والا اسے گوری سمجھ رہا تھا (اس کے دل میں اتنا ضرور آتا کہ بس میم صاحبہ رنگ سے رہ گئی ہیں یعنی رنگ اگر پورا گورا ہوتا تو کیا بات تھی) بہرحال جب یہ میم ایک تانگے والے کے پاس آئی تو اسے کہنے لگی:

''او ٹانگہ والا! ...... اِدھر آؤ'' کوچوان فوری فرمانبرداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے آیا اور جھک کر عرض کی: جی میم صاحبہ!

چوڑی بولی: شاؤ (شاہو) کی گڑھی جانا مانگتا ہے؟ کوچوان نے اپنی ترنگ میں اسی لہجے میں جواب دیا: جی میم صاحبہ! جانا مانگتا ہے'' چوڑی نے دوبارہ پوچھا: کتنا پیسہ مانگتا ہے'' ''5 روپے جانا مانگتا ہے'' کوچوان نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ یہ سنتے ہی چوڑی پھٹ پڑی اور پٹاخ سے بولی: ...... وے ٹٹ پینیاں پرے ہٹ' دو سال پہلے تے اسی اٹھ آنے دے

کے جاندے ہوندے سی، توں تے لٹن تے لک بنھیا ہویا اے۔“

یہ سن کر کوچوان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور وہ کاٹ دار لہجے میں بولا: دیکھ مائی! جے تے مانگتا مانگتا کرنا ای تے فیر پنج روپے ای لگن گے، تے جے اپنی اوقات تے آ کے ایس طراں بولنا اے تے پھر اج وی اٹھ آنے ای لگدے نے۔

افسوس صد افسوس، آج صرف عورتیں ہی نہیں' ہمارے مرد بھی اس مانگتا مانگتا والی چوڑی عیسائن کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔

ہیئر فیشن سنٹر کا مالک مجھے نہایت ادب سے کہنے لگا: سرکار! ہم آپ سے سنہری لٹ یا سنہری پف بنانے کے صرف 700 روپے لیں گے۔ میں نے دل میں کہا: شاید اس نے میری داڑھی دیکھ کر سنت رسول کا حیاء کیا ہے لیکن مجھے کیا ضرورت ہے، میرے سر میں تو قدرتی طور پر اکا دکا آنے والے کچھ سفید بالوں کا سفید پف بن چکا ہے، میں اس کو کیوں بدلوں، اس کی قدر تو رب کائنات بھی کرتا ہے' اس پف کی شرم اور لاج رکھتا ہے' میں کیوں تہذیب مغرب سے، صلیبیوں یہودیوں اور اللہ کے دشمنوں کے گندے کلچر سے مرعوب ہوں، یہ کلچر تو ذہنی اور جسمانی دونوں قسم کی بیماریوں کا سرچشمہ ہے۔

اے میرے پیارے بھائیو اور بہنو! ...... اگر آپ عزت و وقار اور دنیوی و اخروی کامیابی چاہتے ہیں تو اللہ کے دشمنوں کا رنگ آج ہی اتار دیجئے اور صبغة الله و من احسن من الله صبغة اللہ کریم کے رنگ میں رنگے جایئے یقیناً اس کے رنگ سے بہتر کسی کا رنگ دنیا میں نہیں ہے۔

وہ کون تھی

چمکتی دمکتی اور نئی نویلی پجارو کچے اور ناہموار راستے پر اٹھکیلیاں کھاتے اور ہچکولے کھاتے ہوئے لڑھکتی کودتی گرد و غبار اڑاتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ گاڑی کے باہر کائنات سخت گرم اور جھلسا دینے والی لُو سے جہنم زار تھی لیکن گاڑی کے اندر ائیر کنڈیشنر نے ماحول کو ٹھنڈا اور پر سکون بنا دیا تھا۔ انتہائی مختصر اور سمارٹ لباس پینٹ شرٹ پہنے میک اپ کیے ہوئے ایک نوجوان خوبصورت دوشیزہ اسے ڈرائیو کر رہی تھی۔ اس کے نیم برہنہ گلے میں پہنی ہوئی چمکدار صلیب بڑی آسانی سے دیکھی جا سکتی تھی۔ گاڑی کے اندر چلتے ہوئے انگلش میوزک سے گاڑی گونجتی اور تھرتھراتی ہوئی اونچے نیچے راستوں پر آگے ہی سندھ کے اس دور افتادہ تھر پارکر اور اس کے پاس کے گوشوں کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ایک بوڑھا کسان اپنے پسماندہ علاقہ میں میوزک سے تھرتھراتی ہوئی اس گاڑی کو حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔ اس کا ایک طالب علم بیٹا بھی اپنا کام چھوڑ کر اس منظر کو دیکھنے لگا۔ اچانک کسان نے کہا: بیٹا! یہ کون تھی جو ابھی قیمتی گاڑی میں گزری ہے؟ بابا تم نہیں جانتے اس کو؟ یہ وہی ہے جو ہر دفعہ اگلے گوٹھوں (گاؤں) میں جاتی ہے تو واپسی پر ہمارے گاؤں میں عموماً وڈیرے کے ہاں رات قیام کرتی ہے' صبح اپنی گاڑی میں واپس اپنے کام پر چلی جاتی ہے۔

بابا سوچتے ہوئے: ''مجھے تو کچھ یاد نہیں۔'' لڑکا دوبارہ یاد دہانی کرواتے ہوئے کہنے لگا: بابا تجھے یاد ہے جب پچھلی بار اسی لڑکی کے ساتھ ایک فادر پادری بھی تھا اور اس نے تقریر بھی کی تھی' جس میں اس نے بتایا تھا کہ تم مسیح کے پیغام امن کو اپنی زندگیوں میں اپنا لو تو وہ تمہیں دنیا میں غربت سے نکال کر مالا مال کر دے گا اور ہر وقت تمہاری بیماریوں' آفات

وبلیات اور مصائب وتکالیف سے حفاظت کرے گا۔ اس نے بتایا تھا کہ تم بنیاد پرست بلکہ دہشت گرد جہاد والا مذہب چھوڑ کر امن وآشتی پیار ومحبت والا مسیح کا مذہب اپنا لو تو ہر قسم کے دکھ درد سے نجات پا جاؤ گے اور پھر اس نے گاؤں کے ۱۵ افراد کو بپتسمہ بھی دیا تھا یعنی عیسا ئیت میں داخل کیا تھا

بوڑھے کے ماتھے پر شکنیں پڑ چکی تھیں۔ اس نے متفکرانہ لہجے میں کہا: اچھا یاد آیا' تو یہ وہ ملحدہ ہے۔ پھر اس کی پجارو کے تعاقب میں نظریں دوڑائیں لیکن اب وہ نظروں سے غائب ہوکر دور گرد وغبار کے بادل میں چھپ چکی تھی۔

پجارو سیدھی وڈیرے کے ڈیرے پر رکتی ہے۔ وڈیرا نہایت گرم جوشی سے استقبال کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہے اور لڑکی ایک ادائے دلنواز کے ساتھ آگے بڑھتی ہے اور اس سے ہاتھ ملاتی ہے۔ پھر رسمی باتوں سے فارغ ہوکر بتاتی ہے کہ وہ اپنے نئے چاہنے والوں یعنی مسلمانوں سے نئے عیسائی بننے والوں کے لیے سونے کے لاکٹ' سونے کی چین میں پروئی ہوئی صلیب لائی ہے' کل ہی ہمارے بزرگ فادر پادری آکر خود ان کے گلے میں پہنائیں گے اور بستی کے دوسرے لوگوں کو بھی درس دیں گے۔ پھر چونکتے ہوئے کہتی ہے: او ہاں! یہ تو میں بھول ہی گئی کہ آپ کے لیے بھی ایک تحفہ لائی ہوں' پھر وہ پرس سے ایک انگوٹھی نکالتی ہے جس پر عیسیٰ علیہ السلام کو سولی دیئے جانے کا منظر نمایاں ہے۔ وہ یہ کہتے ہوئے کہ یہ ''سپیشل طور پر آپ کے بہترین تعاون کے اعتراف میں ہمارے جرمن کیتھولک مشن نے آپ کے لئے جرمنی سے بھیجی ہے'' اس کی انگلی میں پہنا دیتی ہے۔ وڈیرا نہایت خوشی و ممنونیت کے جذبات سے سرشار اس کو دیکھتا جاتا ہے' کبھی اس میں لگے نگینے کو' کبھی سونے کی چین کو' اور ساتھ شکریہ ادا کرتا جاتا ہے اور پھر کہتا ہے: آپ آج رات میرے غریب خانہ میں ٹھہریں گی ناں؟ ''نہیں! آج میں آپ کے پاس رات بسر نہیں کرسکتی اس لئے کہ آج ہی مجھے فادر کو لینے حیدر آباد جانا ہے اور صبح ان کو ساتھ لے کر پھر یہاں پہنچنا ہے۔'' لڑکی نے جواب دیا۔ وڈیرے نے کہا: کوئی بات نہیں' آپ فادر کو لائیں' میں پہلے کی طرح اب

بھی گوٹھ کے سب رہنے والوں کو فادر کے درس کے لیے جمع کر چھوڑوں گا۔ پھر لڑکی ایک ادائے بے نیازی سے ہاتھ ملاتی ہے اور اپنی پجارو میں فراٹے بھرتی ہوئی اپنے مشن پر روانہ ہو جاتی ہے۔

قارئین! یہ کس علاقے میں ہو رہا ہے؟ پاکستان کے صوبہ سندھ میں غریب اور پریشان حال مسلمانوں کو ایسے ہتھکنڈے اختیار کر کے صلیب کے پجاری عیسائی بنا رہے ہیں۔ انہوں نے اپنا پرانا ہتھیار جو صلاح الدین ایوبی کے دور میں بھی استعمال کیا تھا آج پھر اس ہتھیار سے امت محمد ﷺ کو کاٹنے کے درپے ہیں۔ یہ لڑکیاں خواہ جرمن مشن کی ہوں یا انگلستان مشن کی طرف سے ہوں' عیسائیت کے پھیلاؤ کے مشن کی تکمیل کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دینا باعث نجات اور رضا مندی یسوع مسیح سمجھتی ہیں' یہ شکار کو پھانسنے کے لئے اپنے آپ کو بطور چارا پیش کرتی ہیں۔ ایسے ہی اسلام دشمن لوگ مذموم اور مکروہ ہتھکنڈوں کی وجہ سے پاکستان کے چاروں صوبوں میں مسلمانوں کو مرتد بنانے کے لیے بھیج رہے ہیں۔ ہمارا عوامی ملی قومی طبقہ ہو یا صاحب اقتدار طبقہ کبھی اس نے اس سنگین صورت حال کی طرف توجہ کرنا بھی گوارا نہیں کیا' اسی لئے عیسائی دنیا یہ کہتی ہے کہ عیسائیت کے پھیلاؤ کے لیے پاکستان سب سے زیادہ زرخیز زمین ہے' تاہم پاکستان میں انہیں کسی قسم کی پابندی کا سامنا نہیں۔ ڈاکٹر گلین ریڈ سوڈان پر ایسابائین مشنری تھا' وہ پاکستان آیا تو یہاں مشنری کی آزادانہ اور بلا روک ٹوک تبلیغ دیکھ کر پکار اٹھا:

اس نے کبھی ایسی مملکت نہیں دیکھی جہاں عیسائی' تبلیغِ عیسائیت میں اتنے آزاد ہوں جتنے پاکستان میں ہیں۔

Un printed report of the secretary of Pakistan

Mission dated30 - 3 - 1955

مشہور اسلام دشمن امریکی مشنری گلورا اپنی کتاب میں لکھتا ہے:

کسی بھی دوسرے ملک میں عیسائی مشنری اتنی آزادی سے عیسائیت کا کام نہیں کر سکتا

جتنا پاکستان میں کھلے بندوں تبلیغ عیسائیت ایک عام بات ہے اور مجمع جمع کر لینا کوئی دشوار نہیں۔ بہت سے مشن ہسپتالوں کے وارڈوں کے اندر تبلیغ عیسائیت باقاعدہ پروگرام کے تحت ہوتی ہے۔ بیرونی مریضوں کے درمیان بھی بلاناغہ تبلیغی سرگرمیاں جاری ہیں۔ مسلمانوں میں انجیل اور اس کی تعلیمات کو پھیلانے کی کوشش تیز تر ہو رہی ہیں۔

Glover Robet Haall the Progress of World Wide Missions New York 1960.p 89-93

انجیلیکن لاہور کی خادمہ دین John Dickergon نے اپنے ہیڈ کوارٹر کو پاکستان میں عیسائیت کے فروغ کے بارے میں یہ رپورٹ دی:

بڑے گرجے میں نہایت کامیاب سروسز عبادتی اجتماعات ہوتے ہیں خاص طور پر کرسمس کے وقت مسیحیت کی ترقی کی اور بہت سی علامات ہیں لیکن مجموعی حیثیت سے دیکھا جا ئے تو یہ کم ہیں۔ میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ اڑ کر پہنچوں اور آپ کو رپورٹ دوں کہ کس قسم کی زندگی پاکستان میں پسند کی جاتی ہے۔ بغیر رکاوٹ کے اس مسلمان ملک میں اور کتنے بڑے مواقع ہم کو پیش کیے جاتے ہیں۔ اگر آپ واقعی طور پر سمجھیں تو آپ یقیناً عیسائیت کو مزید تیزی سے پھیلانے کے لئے ہماری مقدور بھر مدد کی کوشش کریں گے۔

S R G Review of the Work 1958 59 p34

صرف 1957ء میں آٹھ ہزار پاکستانی مسلمانوں کو بپتسمہ دے کر عیسائی بنایا گیا ہے۔ Praskector Oct. 1958 England

قارئین! یہ تو صرف پرانی رپورٹیں ہیں جو پاکستان میں عیسائیت کی بڑھتی ہوئی یلغار کی سنگین صورت حال کی عکاسی کر رہی ہیں جبکہ موجودہ صورت حال اس سے کہیں زیادہ سنگین ہے اور خاص طور پر گیارہ ستمبر 2001 کو ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر اسامہ بن لادن حفظہ اللہ سے منسوب حملہ کے واقعہ کے بعد دنیا بھر کی عیسائی تنظیمیں پاکستان پر ٹوٹ پڑی ہیں' ہر علاقے میں عیسائیت پھیلانے کے لیے ہر وہ حربہ اختیار کر رہی ہیں جو ممکن ہو سکتا ہے۔

ہم سے تو وہ طالبان ہی اچھے نکلے کہ جن کو ان کی حکومت کے آخری دور میں بہت بڑی بڑی امدادیں دینے اور ڈالروں کی بارش پونڈوں کے سیلاب کی نوید سنائی گئی کہ یہ ہم آپ کے گھر تک پہنچائیں گے' آپ کے علاقوں میں رفاہی کام کریں گے' کنویں بنائیں گے' ہسپتال سکول سڑکیں بنائیں گے ...... ان کی بصیرت نے جان لیا کہ یہ تو دین بیچ کر دنیا کمانے کی سودے بازی ہے جو ان کی مجاہدانہ غیرت کو کبھی گوارا نہ تھی' کیوں کہ ان رفاہی پروگراموں کی آڑ میں عیسائی مشنریز پر تول رہی ہیں کہ ایک دفعہ افغانستان میں داخل ہونے کا موقعہ مل جائے' لیکن انہیں اس وقت بہت حیرانی اور پریشانی ہوئی کہ جب طالبان نے صرف ان کی پرکشش پیش کشوں کو پائے حقارت سے ٹھوکر ماردی بلکہ افغانستان میں خفیہ طور پر مسلمانوں کو عیسائی بنانے کے لئے کوشاں پادریوں اور صلیبی لڑکیوں کو پکڑ کر جیل میں ڈال دیا۔ یوں انہوں نے مادی دولت کی چکا چوند کو ٹھکرا کر ایمان کی دولت بچائی۔ لیکن ہمارا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ پاکستان کہ جس کو اسلام کا قلعہ کہا جاتا ہے آج اس قلعہ پر دنیا بھر کے صلیبی کمندیں ڈال رہے ہیں' رخنے ڈال رہے ہیں' اس کی بنیادوں کو کھوکھلا کر رہے ہیں' اسلام کے دشمن اس قلعہ کو منہدم کرنے کے لیے وسائل اور دولت پانی کی طرح بہا رہے ہیں' لیکن صاحب اقتدار طبقہ خواب خرگوش کے مزے لے رہا ہے' اسے پتہ بھی ہے کہ گیارہ ستمبر کے بعد پاکستان کی نظریاتی اور مذہبی سرحدوں پر ان لوگوں نے ہی حملہ کر رکھا ہے کہ جنہوں نے افغانستان میں اسامہ بن لادن حفظہ اللہ کو بہانہ بنا کر نہتے مظلوم مسلمانوں کی بستیوں کی بستیاں ملیامیٹ کر دیں لیکن ہم اپنے اپنے مفادات کی خاطر تجاہل عارفانہ کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہونٹوں پر قفل خاموشی لگائے بیٹھے ہیں۔

آج شاید میری باتوں کو کوئی مبالغہ قرار دے' لیکن میرے بھائی یہ تو دور افتادہ علاقہ ہے جہاں عیسائیت' لڑکیوں کو استعمال کرنے کے غیر شریفانہ طریقہ سے عیسائیت پھیلانے میں مصروف ہے لیکن پاکستان کے گنجان آباد صوبے پنجاب کے دل لاہور میں' پھر ایک گھنٹے کے فاصلہ پر شیخوپورہ' بلکہ اس کو بھی چھوڑیں' نارووال اور اس کو بھی چھوڑیں' سیالکوٹ اور پھر

ملتان وغیرہ کے درجنوں خاندان عیسائیت کی دلدل میں ہماری آنکھوں کے سامنے دھنس گئے ہیں اور مزید دھنستے جا رہے ہیں' لیکن ہم اس قدر مجبور ہیں کہ کچھ کر بھی نہیں سکتے...... کیوں؟ ...... اس لئے کہ ہمارے حکمران نام نہاد دہشت گردی کے خاتمہ کے لیے مسلمانوں کو خاک وخون میں تڑپانے کے بعد جب امریکی ویورپی آقاؤں کے منہ سے اپنے حق میں تعریف کے چند الفاظ سنتے ہیں تو:

غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

کے مصداق خوش ہو جاتے ہیں کہ ہمیں آقا کی خوشنودی کا سرٹیفکیٹ مل گیا۔ اتنی خوشی حاصل کرنے کے لئے ہزاروں مسلمانوں کو مروانے والے تبلیغ عیسائیت سے روکنے کی بات کرکے ان کو ناراض کیسے کر سکتے ہیں!؟؟ ...... تو پھر سوچنے کا مقام یہ ہے کہ دین محمد ﷺ کے دفاع کے لیے اب کون ہے جو دعوت دین کا پرچم تھام کر آگے بڑھے اور اسلام کا دفاع کرے' کون ہے جو اسلام کے قلعے کو منہدم ہونے سے بچائے !!؟

پیپسی کے سروے منیجر سے ایک ملاقات

میں سندھ سے لاہور آ رہا تھا کہ حیدر آباد اسٹیشن سے چند نوجوان' پیپسی کی شرٹیں پہنے گاڑی میں سوار ہو گئے۔ ان کے ساتھ ایک سنجیدہ آدمی فکر و پریشانی اور سوچوں میں گم میرے سامنے سیٹ پر بیٹھ گیا۔ لڑکے گاڑی میں سوار ہوتے ہی پیپسی کولا کی نئی طے ہونے والی پالیسی پر بحث کرنے لگے کہ یہ آخر پیپسی کمپنی کے ذمہ داران کو بیٹھے بٹھائے کیا خیال آ گیا کہ وہ یکدم انقلابی تبدیلیاں کرنے کے احکامات جاری کر رہے ہیں۔

میں نے اپنے سامنے سوچوں میں گم آدمی سے تعارف کیا تو پتا چلا کہ وہ پیپسی کولا کا سروے منیجر ہے اور ملک بھر میں پیپسی کے خلاف چلنے والی مسلمانوں کی تشہیری مہم کے اثرات ختم کرنے کے لئے کراچی میں بلائے گئے اجلاس میں شرکت کر کے واپس آ رہا ہے۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ ملک بھر میں مولوی حضرات نے پیپسی کے خلاف ایک طوفان کھڑا کر رکھا ہے' جس سے کمپنی کو بہت نقصان ہوا ہے۔ پیپسی کی کھپت بہت کم ہو کر رہ گئی ہے۔ لیبر بیکار ہے اور کئی یونٹ بند ہو چکے ہیں۔ اب ہم اسی مسئلہ کے حل کے لئے بلائے گئے اجلاس میں شریک ہو کر آ رہے ہیں اور ہماری ڈیوٹی سروے پر لگی ہے کہ جہاں پیپسی کی ڈیمانڈ کم ہوتی نظر آئے اس کو بہترین نئی پالیسی کے تحت کور کرنے کی کوشش کی جائے۔ نئی پالیسی میں ہم نے انعامات بھی رکھے ہیں' قیمت میں کمی بھی کی ہے' نئی تشہیری مہم بھی چلائی جائے گی تاکہ عوام کو متوجہ کیا جا سکے۔ ہم سکھر' لاڑکانہ اور دوسرے شہروں میں مارکیٹنگ کو چیک کرنے جا رہے ہیں' تاکہ نقصان کا اندازہ لگایا جا سکے۔ اس وقت کمپنی سر پکڑے بیٹھی ہے اور پریشان ہے۔ کئی دفعہ ریٹ کم کرنے کے باوجود نکاسی میں اضافہ نہیں

ہوسکا۔ جہاں مذہبی لوگوں کی آبادی زیادہ ہے وہ وہاں مساجد اور چوراہوں میں ہمارے خلاف بھرپور تشہیری مہم چلارہے ہیں۔ کمپنی بھی خاص طور پر ان علاقوں کی طرف توجہ دے رہی ہے اور متاثرہ علاقوں میں ٹیمیں روانہ کر رہی ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ کراچی میں جاری میٹنگ میں' ملک میں جاری تشہیری مہم کا جائزہ لیا گیا اور ہفت روزہ ضرب مومن' غزوہ اور روزنامہ اخبار ''اسلام'' کا خاص طور پر ذکر کیا گیا اور اس کے پیپسی مہم کے بائیکاٹ کے لیے جاری کیے گئے پرچے دکھائے گئے وغیرہ وغیرہ۔

مجھے ایک پیپسی فیکٹری کے ڈرائیور نے ملاقات میں بتایا کہ اس سے قبل پیپسی کولا کی اس قدر مانگ تھی کہ ہم سردیوں میں بھی سپلائی مہیا کرنے میں مصروف رہتے تھے' لیکن علماء کی یہود ونصاریٰ کے خلاف موجودہ مہم کے نتیجے میں ہمارے یونٹ کو بند کر دیا گیا ہے اور ہمیں ۶ ماہ کے لیے چھٹی دے دی گئی ہے' کہ جب کام ہی نہیں اور فیکٹری بند پڑی ہے تو آپ نے یہاں رہ کر کیا کرنا ہے؟

قارئین کرام...... ۱۱ستمبر کے بعد مسلمانوں کا امریکہ اور یہودی مصنوعات کے خلاف ان کے بائیکاٹ کا اقدام کافی مؤثر اور جاندار رہا' جس کا اعتراف پوری دنیا نے کیا' اور اسی بات کا اعتراف میرے سامنے سیٹ پر بیٹھا یہ پیپسی کا منیجر کر رہا تھا۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہم نے اپنے مظلوم ومقہور مسلمانوں کے حق میں بائیکاٹ کی پالیسی کو برقرار رکھا ہوا ہے یا بھول گئے ہیں؟ کہیں ہم نے چند دن کے وقتی غم و غصے اور بائیکاٹ کے بعد پھر پیپسی اور کوکا کولا کے مشروبات کو اپنے ہونٹوں سے تو نہیں لگالیا؟

اتنی راز داری کیوں؟

کبھی آپ نے سوچا ہے کہ یہودی صلیبی اور دوسری ملٹی نیشنل کمپنیاں اپنی مصنوعات کے فارمولوں کو اس قدر خفیہ کیوں رکھتی ہیں؟ اپنی مصنوعات اور پروڈکٹس کے فارمولوں کو خفیہ اور صیغہ راز میں رکھنے کے لئے ہر جائز و ناجائز ذریعہ اختیار کرتی ہیں۔ ان کو کتنا ہی مجبور کیوں نہ کیا جائے' وہ کسی صورت فارمولے سے آگاہی کے لئے لب کشائی پر آمادہ نظر نہیں آتیں۔ اگر چارو ناچار فارمولا درج کریں بھی تو پورے اجزاء ظاہر نہیں کرتیں' اور اگر پورے اجزاء درج کر بھی دیں تو بعض اجزاء کو کوڈ ورڈز میں لکھتی ہیں...... کیوں؟؟ اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ ہم اپنی مصنوعات میں ایسی ایسی غلیظ' گندی اور صحت کے لئے تباہ کن اشیاء شامل کرتے ہیں کہ اگر لوگوں کو اس کا پتا چل جائے تو پھر یہ چیزیں خریدے گا کون؟...... اور خاص طور پر وہ ایسی مصنوعات کے فارمولے چھپانے کی منصوبہ بندی کرتے ہیں کہ جن میں غلیظ اور خاص طور پر حرام اشیاء کی آمیزش ہو...... اس لئے کہ پوری دنیا میں ان کے سب سے بڑے خریدار اور گاہک مسلمان ہیں' اور اگر ان کو پتا چل گیا کہ ان چیزوں میں حرام اشیاء ملائی گئی ہیں تو وہ خریدیں تو کیا ان کو ہاتھ لگانا بھی گوارا نہ کریں۔ وہ ایسی مشکوک اشیاء مفت لینا بھی گوارا نہ کریں چہ جائیکہ پیسے دے کر۔

یہودی کاروبار کے اس اصول کو جانتے ہیں کہ جب ایک چالو، مقبول عام آئٹم فیل ہوگی یا اس کی مانگ میں کمی آئے گی تو لامحالہ اس خلا کو پر کرنے کے لئے اس ناکام آئٹم کی جگہ لینے کے لئے کوئی دوسری پارٹی کھڑی ہو جائے گی' اور پہلی چیز سے بہتر کوالٹی میں چیز پیش کر کے اپنی جگہ بنائے گی' یوں پہلے سے قائم شدہ مصنوعات ختم ہو جائیں گی۔ اگر مسلمانوں کو پتا چل جائے کہ فلاں فلاں اشیاء میں حرام چیزوں کی ملاوٹ ہے' مثلاً سور کا

خون اور چربی استعمال ہوتی ہے تو وہ اسے کبھی نہ خریدیں۔ یوں یہودی کمپنیاں دیوالیہ ہو کر ختم ہوجائیں اوران کی جگہ کوئی اور لے لے۔ وہ کوئی مسلمان بھی ہوسکتا ہے جو حلال ذریعہ سے بہتر چیز تیار کر کے پیش کرے اور ہٹ ہو جائے۔

اسی بنا پر اس معاملے میں یہودیوں، صلیبیوں اور دوسری ملٹی نیشن کمپنیوں کو اپنی موت نظر آتی ہے۔ اسی لئے وہ اپنے فارمولوں کو خفیہ رکھنے پر پانی کی طرح سرمایہ بہاتی ہیں کہ اگر مسلمانوں کو ان کا پتا چل گیا تو وہ پوری دنیا میں ہماری چیزیں قطعاً نہ خریدیں گے اور یوں معاشی طور پر ہمارا دیوالیہ نکل جائے گا۔ دنیا پر ہمارا معاشی و اقتصادی اقتدار، غنڈہ گردی اور حکمرانی ختم ہوجائے گی، ہماری جگہ مسلمانوں کی اپنی مصنوعات آجائیں گی...... اور یہ کافر و یہودی یہ کبھی نہیں چاہتے۔ مشہور یہودی مشروب کوکا کولا کی مثال لے لیں کہ ایک صدی (سو سال) تک اس کے فارمولے کو چھپا کر رازداری میں رکھا گیا' تاکہ کسی بھی طرح کسی کو اس کا پتا نہ چل سکے۔ اسی رازداری کے پردے میں مسلمان اس کو ہمیشہ پیتے چلے گئے اور یہودی ان کی دولت ''رازداری'' میں لوٹتا رہا۔

اس رازداری کا دلچسپ مظاہرہ اس وقت بھی دیکھنے میں آیا' جب ۱۹۷۷ء میں ہندوستان گورنمنٹ نے کوکا کولا کے فارمولے کو جاننا چاہا' یہودیوں نے بتانے سے انکار کر دیا' پھر گورنمنٹ کی طرف سے عدلیہ کے دو ججوں نے باقاعدہ احکامات جاری کیے کہ کوکا کولا کے فارمولے کو ظاہر کیا جائے...... اب اگر کوئی ایسی ویسی بات نہیں تھی' تو چاہیے تو یہ تھا کہ کوکا کولا مشروب کے مالک اس فارمولے کو سامنے رکھ دیتے کہ لو جناب!...... لیکن انہوں نے کیا کیا؟...... انہوں نے ایسا کرنے کی بجائے ہندوستان ہی چھوڑ دیا اور فارمولا نہ بتایا۔ کیوں نہ بتایا؟...... اس لئے کہ اگر وہ بتاتے تو ان کا نقصان تھا کہ اسی رازداری پر ہی ان کی ۹ بلین پونڈ کی فروخت کا انحصار تھا' اور اتنی بڑی عالمی تجارت کے متعلق وہ رسک نہیں لے سکتے تھے۔

جب دنیا کو اس حیران کن حقیقت کا پتا چلا کہ کوکا کولا میں الکحل ایک لازمی جزو کی

حیثیت سے شامل ہے تو کوک کے مالک یہودیوں نے فوراً اس کی تردید کر دی' لیکن فوراً ہی یہودیوں کو منہ کی کھانا پڑی اور ان کا بھانڈا بیچ چوراہے پھوٹ گیا۔ ۱۹۹۴ء میں یورپ میں تہلکہ مچا دینے والی کتاب (Secret) نے مشروبات کے متعلق تحقیق کے بعد ان کے فارمولوں کو تفصیل سے بیان کر دیا۔ اس کتاب کے مصنف کو مشروبات کے متعلق تحقیقات کے دوران ایک کوکا کولا کمپنی کے ریکارڈ کے دفتر میں کوکا کولا کا اصل فارمولا پیلے رنگ کے ایک کاغذ کے ٹکڑے پر لکھا مل گیا۔ اس فارمولے والے کاغذ پر X کا نشان لگا ہوا تھا۔ اس فارمولے کے اجزاء کی ترتیب میں الکحل بھی ایک لازمی جزو کے طور پر درج تھا۔

اس بہت ہی محفوظ اور خفیہ فارمولے کو بعد میں برطانیہ کے مشہور اخبار ''سنڈے ٹائم'' نے یکم اگست ۱۹۹۳ء کی اشاعت میں شائع کر دیا۔

فارمولے کے ظاہر ہوتے ہی کوکا کولا کے یہودی حلقوں میں کھلبلی مچ گئی۔ لہٰذا انہوں نے عوام اور ماہرین کو بے وقوف بنانے کے لئے مختلف حربے استعمال کرنے شروع کر دیے کہ یہ بات غلط ہے۔ اس پر ان کا ناطقہ بند کرنے کے لئے ''سنڈے ٹائم'' نے ۱۰ غیر جانبدار ماہرین کو مدعو کیا کہ وہ چھ قسم کے مشروبات کا نمونہ دکھائیں جن میں کوک، پیپسی، اکٹونولہ (کولا کو پایا کہ یہ شراب کشید کرنے کے طریقے سے حاصل ہوا ہے) کہا گیا ہے کہ کوک کی پہچان کریں۔ ان میں سے دو ماہرین نے بالکل درست طریقے سے کوکا کولا ہی کو اٹھایا اور تین نے اکٹونولہ کو۔

جدید تحقیق یہ بتاتی ہے کہ کوکا کولا میں الکحل اور دوسرے مہلک اجزاء کے علاوہ' ایک اور نقصان دہ جزو بھی پایا جاتا ہے۔ سنڈے ٹائم نے جو اکٹونولہ کے لئے فارمولا پیش کیا اس میں گلیسرین بھی استعمال ہوتی ہے۔ یہ ایک گاڑھا مائع ہے جو تیل کی کیمیائی اشیاء کو حل کرنے والے عنصر کے طور پر استعمال ہوتا ہے' خاص طور پر ان ذائقوں کو مکس کرنے کے لئے جو آسانی سے پانی میں حل نہیں ہوتے۔

''پنڈر گراسٹ'' کی کتاب میں یہ موجود ہے کہ کوکا کولا کے ایک پرانے فارمولے

میں‘ جو ۱۹۸۳ء میں اس کتاب میں درج کیا گیا تھا،’’بہت بڑا راز‘‘ کے عنوان سے مصنف ’’ولیم پونڈ سٹون‘‘ کے مطابق کوکا کولا میں بھی گلیسرین استعمال ہوتی ہے۔

کوکا کولا کی تاریخ میں کہیں بھی اس بات کا کھل کر انکار نہیں کیا گیا کہ ’’اس میں گلیسرین یا الکحل موجود نہیں ہے‘‘ یہ گلیسرین تیل اور چربی کی ضمنی پیداوار ہے جو صابن اور فیٹی ایسڈ کی تیاری میں استعمال ہوتی ہے۔ اگر چربی خنزیر یا دیگر جانوروں سے جو اسلامی طریقے سے ذبح نہ کیے گئے ہوں‘ سے ماخوذ ہو تو ان سے حاصل کردہ چربی بھی حرام وممنوع ہے (جو بعد میں خوراک میں استعمال ہوتی ہے اور مسلمانوں کو مہیا کی جانے والی اشیائے خورد ونوش میں مکس کی جاتی ہے، کہ یہ فارمولا کا حصہ ہوتی ہے۔)

کوک میں گلیسرین اور الکحل کی ممکنہ موجودگی مسلمانوں کے لئے دوسرا پریشان کن سوال ہے کہ کوک میں اور دیگر مشتبہ اجزاء کیا کیا ہیں؟

۲۵ دسمبر ۱۹۹۳ء کو نیو ملایا میں کوک کے وائس پریذیڈنٹ اور جنرل منیجر کو یہ سچی بات خود اپنے منہ سے کہنا پڑی‘ اگرچہ وہ کہنا نہیں چاہ رہا تھا‘ اس نے کہا: ’’ہر نئی نسل کے لئے کوکا کولا کا نیا ترجمہ کرنا ہوگا۔‘‘

راز داری کے لبادے میں کوکا کولا ایک صدی سے مسلمانوں کو دھوکا دیتی چلی آرہی ہے کہ وہ بغیر ان کے علم میں لائے ان کو الکحل پلاتی رہی۔ ایسا کر کے کوکا کولا مسلمانوں کی مذہبی حساسیت کو تباہ کر چکی ہے۔ قرآن وحدیث تو مسلمانوں کو ایسی خوراک استعمال کرنے سے منع کرتے ہیں کہ جس کے اجزاء مشکوک ہوں۔ ۲۰ اکتوبر ۱۹۹۳ء کے ایشیا ویک کے مطابق انڈونیشیا کونسل کے جید علمائے کرام نے واضح اعلان جاری کیا کہ مسلمانوں کے لئے الکحل کا ایک قطرہ بھی حرام ہے۔‘‘

اب ہم مسلمانوں نے دیکھنا ہے، سوچنا اور غور وفکر کرنا ہے‘ اپنے گریبان میں جھانکنا ہے کہ کہیں ہم یہودیوں کے ہاتھوں کھلونا تو نہیں بنے ہوئے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم اپنی دولت بھی ضائع کر رہے ہوں اور دولت ایمان بھی؟ ...... اس لئے کھانے اور پینے سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا لازم ہے کہ ہم کیا کھا رہے ہیں اور کیا پی رہے ہیں؟

کیمرے کی آنکھ اور لاتوں کے بھوت

آگ کا الاؤ جل رہا تھا..... لکڑی کے جلنے سے بننے والے کوئلے دہک اور چیخ رہے تھے..... آگ کے شعلوں پر گوشت کا ایک بہت بڑا ٹکڑا..... لوہے کی سیخ میں پرو کر بھونا جا رہا تھا..... اردگرد صحرائی ہیئت میں بدو اپنے ہونٹوں پر بے قراری سے زبانیں پھیر رہے تھے..... کہ کب یہ بھنا ہوا' روسٹ کیا ہوا لذیذ گوشت' ان کے ہاتھوں میں آئے اور وہ اس کو مزے سے چٹ کر جائیں۔ وہ اپنی زبان میں ''رنبا ہو..... رنبا ہو'' کے نعرے لگاتے ہوئے خوشی سے اس کے گرد گھوم رہے تھے۔ قریب ہی صومالیہ کے عظیم مسلم جرنیل فرح عدید کے سپاہی مسلح کھڑے تھے..... ایک طرف ایک ویڈیو کیمرہ اس سارے منظر کو محفوظ کرتا جا رہا تھا..... یعنی فلم بن رہی تھی..... پھر تھوڑی دیر بعد اچانک کیمرے کی آنکھ کے سامنے منظر بدلا۔ اب یہ لوگ ایک امریکی فوجی کو جیپ کے پیچھے باندھ کر گھسیٹتے ہوئے یہاں تک لائے۔ پھر انہوں نے اسے کھڑا کیا اور اس سے مختلف سوالات کیے۔ اس نے بتایا کہ میرا نام مائیکل ہے' امریکہ کی ریاست ٹیکساس کا رہنے والا ہوں' فلاں بٹالین' فلاں رینک سے تعلق رکھتا ہوں..... اور میرا اپیٹی (بیلٹ) نمبر یہ ہے۔ میرے والدین اور خاندان کے دیگر افراد کے نام یہ ہیں' فلاں کاروبار کرتے ہیں' فلاں علاقے میں رہتے ہیں' وغیرہ وغیرہ۔

پھر صومالیہ کے گوریلوں نے اسے پکڑا اور اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا' جیسے عید کے دن قصائی بکرے کو زمین پر لٹا کر' تکبیر پڑھتے ہوئے' چھرا جانور کی گردن پر پھیرتا ہے' خون کا فوارہ ابلتا ہے' جانور تڑپتا ہے' پھڑکتا ہے' ہاتھ پاؤں مارتا ہے' اس کا جسم جھرجھریاں لے لے کر کانپ کانپ کر ٹھنڈا ہو رہا ہوتا ہے..... اردگرد خون ہی خون بکھر جاتا ہے..... بالکل

ایسے...... ہاں ہاں!!...... بالکل ایسے ہی...... اس امریکی فوجی کے ساتھ ہوا...... ٹھنڈا ہونے کے بعد یہ بھی اب لوہے کی سیخ پر چڑھ کر دہکتی آگ پر روسٹ کیا جا رہا تھا...... کیونکہ پہلے انسان نما حیوان کا گوشت ختم ہو چکا تھا۔ کیمرے کی آنکھ ان تمام مناظر کو اپنی یادداشت میں محفوظ کرتی جا رہی تھی۔

اس کے بعد تیسرا فوجی آیا اور روسٹ ہوا' پھر چوتھا...... یوں مناظر بدلتے گئے اور کیمرہ کی آنکھ ان کو مسلسل محفوظ کرتی رہی' اس کے بعد اعلان کر دیا گیا کہ امریکی برائلر وں (فوجیوں) کا گوشت بہت ہی لذیذ ہے' جہاں یہ ملیں ان کو ذبح کرو اور کھا جاؤ کہ صومالیہ کی قحط سالی کی بنا پر غذائی قلت کا مسئلہ بھی حل ہوگا اور صحرا میں لذت کام و دہن کا انتظام بھی خوب رہے گا۔ اب امریکی فوجی خوفزدہ برائلر وں اور چوہوں کی طرح جھاڑیوں ، ٹیلوں ، کونوں کھدروں اور ڈھلوان رستوں میں چھپتے پھر رہے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو پکڑے جائیں اور صومالیہ کے گوریلوں کے برگر بن جائیں۔ ان گوریلوں نے یہ ویڈیو کیسٹ امریکہ والوں کو ''تحفہ'' بھیج دی۔ ''تحفہ'' کیوں نہ بھیجتے کہ وہ ان کے ''آقا'' تھے۔ انہوں نے ان کی صحرائی سرزمین پر امداد' قحط' غذائی قلت اور انسانی ہمدردی کے نام پر دھوکا دے کر قبضہ کرلیا تھا' اور اب ان اہل صومالیہ کو غلام بنانے کے لیے دھڑا دھڑ ثقیل وخفیف اسلحہ بحری جہازوں کے ذریعہ یہاں لا رہے تھے۔ بڑے بڑے رن وے' ہوائی اڈے اور فوجی چھاؤنیاں بلندوبالا اور عالیشان عمارتیں یہاں قائم کرتے چلے جا رہے تھے...... اس لئے کہ...... وہ یہاں ہمیشہ قابض رہنے کے لیے آئے تھے' اور یہاں کے مسلمانوں کو طاقت کے بل بوتے پر غلام بنا کر اپنی دہشت و وحشت اور بربریت کا دائرہ وسیع کرنے آئے تھے۔ وہ دنیا کے سامنے اپنی مظلومیت کی بپتا سنا سنا کر تھک چکے تھے' قراردادیں' باتیں' ٹیبل ٹاکس' مذاکرات سب ناکام ہو چکے تھے۔ امریکی ہاتھی اپنی طاقت کے نشے میں ایسا مست تھا کہ وہ ان صومالی مسلمانوں کو حقیر چیونٹی کی حیثیت سے دیکھتا تھا...... کہ اس کا کیا ہے؟ اس کو جب چاہوں گا' مسل کر رکھ دوں گا۔ اگر دنیا کی آواز کے ردعمل میں وہ اپنی فوجوں کے صومالیہ سے واپس

جانے کا عندیہ دیتا بھی تو کہتا کہ امریکی فوجوں کی واپسی مرحلہ وار ہی ممکن ہے' یکدم ایسا نہیں ہوسکتا کہ اس قدر وسیع پیمانے پر وسائل دستیاب نہیں ...... اور یہ مرحلہ وار واپسی دنوں' ہفتوں یا مہینوں میں نہیں بلکہ سالوں میں بتائی جا رہی تھی......

جب صومالی مجاہدین اور گوریلوں نے امریکہ کے مسلمانوں پر روا رکھے گئے ظلم وستم کے رونگٹے کھڑے کر دینے والے مناظر دیکھے...... اور یہ جانا کہ وہ تو یہاں مسلمانوں کی تباہی و بربادی اور صلیب وصلیب پرستوں کی' آبادی کا ایجنڈا لے کر آیا ہے تو انہوں نے امریکی فوجیوں پر گھاتیں لگا کر، یلغاریں کر کے، ان کو پکڑ کر مسلسل ذبح کر کے ان کو بھوننا شروع کر دیا' جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے...... پھر جب مجاہدین نے ویڈیو کیسٹ امریکہ بھیجی' وہاں کے ایک ٹی وی چینل نے اس کو نشر کر دیا...... امریکی عوام نے جب دیکھا کہ صومالیہ میں ہمارے پیاروں کا ...... ہمارے فوجیوں کا...... یہ حال ہو رہا ہے' وہ آگ پر بھون کر کباب بنا کر مزے سے کھائے جا رہے ہیں!!!...... تو یکدم انسانی حقوق کی تنظیمیں جاگ اٹھیں' انھوں نے عوام کو جگایا...... سارے امریکہ میں کہرام مچ گیا...... پھر کیا تھا؟ ہر طرف آہ و زاریاں اور سسکیاں تھیں...... نالے اور فریادیں تھیں' ہر مرد وزن چلاّ رہا تھا کہ فوجیوں کو صومالیہ سے واپس بلاؤ' ان کی جانیں بچاؤ...... ان کو ان کے بیوی بچوں سے ملواؤ...... ان کو ان کے پیاروں اور چاہنے والوں کے پاس بلاؤ...... یوں پورے امریکہ میں ایک احتجاجی طوفان کھڑا ہوگیا...... عوام سمندر کی لہروں کی طرح حکومت سے ٹکرانے کے لیے بپھر گئے......

بھونے گئے فوجیوں کے لواحقین، رشتہ دار، عزیز و اقارب اور دوستوں نے سب سے بڑھ کر حکومت سے ٹکرا جانے کا باغیانہ راستہ اپنا رکھا تھا اور ساتھ عوام کو بھی بھڑکا رکھا تھا۔ آخرکار امریکی حکومت نے گھٹنے ٹیک دیے اور صومالیہ سے اپنے فوجیوں کو واپس بلانے کا اعلان کر دیا۔ یوں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اور اپنی جان بچا کر امریکی وہاں سے چند دنوں ایسے بھاگے کہ امریکہ پہنچ کر ہی سکھ کا سانس لیا۔

امریکہ اب عراق پر غاصبانہ قبضہ کیے بیٹھا ہے' وہاں سے ملنے کا نام نہیں لیتا' مسلمانوں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑ رہا ہے۔ اب عراقی مسلمانوں نے صومالی گوریلوں کی لائن اپنا لی ہے' جس کا ثبوت چند دن قبل عراق میں چار امریکی ٹھیکیداروں اور چھ فوجیوں کے عبرتناک انجام کی صورت میں سامنے آیا۔ ہوا یوں کہ عراقی باشندوں نے عراق کی تباہی سے فائدہ اٹھانے اور اپنی ٹھیکیداری چمکانے کے لیے عراق آنے والے چار ٹھیکیداروں سمیت ۶ فوجیوں کو جیپوں میں بیٹھے ہی برسٹ مار کر بھون دیا۔ پھر ان کو گھسیٹ کر کار سے باہر نکالا۔ ان کی لاشوں کو سڑکوں پر گھسیٹا' ان پر جوتوں اور پتھروں کی بارش کر دی اور پھر ایک امریکی کو کھمبے کے ساتھ فضا میں بطورِ عبرت پھانسی دینے کی طرح لٹکا دیا...... اور وہ اس پر جوتے مارتے رہے۔ ایک امریکی کی لاش کو کلہاڑے نما بیلچوں سے ٹکڑے ٹکڑے کرتے رہے۔ اخبارات میں شائع ہونے والے فلوجہ کے ان مناظر کو کیمرہ کی آنکھ نے محفوظ کر کے اسی دن پوری دنیا میں نشر کر دیا۔ امریکہ چیخ اٹھا کہ یہ جنیوا معاہدہ اور انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہے۔ جب وہ شہید طالبان کے سروں پر پٹرول ڈال کر ان کو دھماکوں سے اڑا رہا تھا' ان کے پیٹوں میں کلاشنکوفوں کی سنگینیں مار مار کر انتڑیاں باہر نکال رہا تھا' ان کے گلے کٹوا رہا تھا ' ان کو جانوروں کی طرح ذبح کروا رہا تھا' ٹینکروں میں بند کر کے مار رہا تھا...... اس وقت جنیوا معاہدہ اور انسانی حقوق کے چارٹر جل گئے تھے کیا!!؟......

ایسی کارروائیوں سے ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایسا کرنا اسلام میں جائز ہے؟...... تو اس کے لیے صحیح بخاری کتاب المغازی باب قصہ عُکل وعرینہ کی ایک حدیث کی تلخیص پیش خدمت کرتا ہوں کہ قبیلہ عُکل وعرینہ کے لوگ مدینہ آئے اور انھوں نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے اسلام قبول کیا' کلمہ پڑھا لیکن ان کو آب و ہوا راس نہ آئی تو رسول اللہ ﷺ نے چند اونٹوں کے ساتھ انہیں چراگاہ روانہ کر دیا اور ہدایت کی کہ ان کا دودھ اور پیشاب پیؤ بیماری جاتی رہے گی۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ جب صحت یاب ہوئے تو جانوروں کے رکھوالوں کو انھوں نے دردناک انداز میں قتل کیا اور جانور ہانک کر چلتے بنے اور مرتد

ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کو بھیجا' انہوں نے گرفتار کر لیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس طرح انہوں نے میرے پیارے صحابہ کو تکلیف دے کر قتل کیا ہے بالکل اسی طرح ان کو بھی قتل کیا جائے۔ لہٰذا آپ ﷺ کے حکم کے مطابق ان کی آنکھوں میں دہکتی ہوئی گرم سلائیاں پھیری گئیں..... ہاتھ بھی کاٹے گئے..... اور پاؤں بھی کاٹے گئے..... اور پھر ان کو باندھ کر حرہ کے کنویں میں ڈال دیا گیا..... ان کو پانی تک نہ دیا گیا..... اور وہ اسی عبرتناک اور سبق آموز حالت میں تڑپ تڑپ کر اور سسک سسک کر دم توڑ گئے۔

تو ثابت ہوا کہ آج دنیا میں ہر جگہ مسلمانوں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑنے والوں پر ..... ظلم و جبر کی آندھیاں چلانے والوں پر..... خون کو پانی کی طرح بہانے والوں پر..... بارود سے ننھے معصوموں اور عفت مآب ماؤں بہنوں کے چیتھڑے اڑانے والوں پر..... ویسے ہی جوابی حملوں اور یلغاروں کی ضرورت ہے کہ جو ان کی راتوں کی نیندیں حرام کر دیں' یوں کہ ان کو ہر طرف سے اپنی جان بچانے اور وہاں سے بھاگنے میں ہی عافیت نظر آئے۔

اب عراقی مسلمانوں نے صومالی مسلمانوں کی طرح امریکیوں کا قیمہ کرنا شروع کر دیا ہے..... ان کے انگ انگ کاٹنے شروع کر دیے ہیں' ان کو پھانسیاں دینی شروع کر دی ہیں..... لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ عراق میں امریکی فوجیوں کے بھنے اور روسٹ شدہ جسموں کو وہاں کے کتوں نے زیادہ ٹیسٹی اور لذیذ پایا ہے' جہاں وہ خوب مزے سے امریکی فوجیوں کا ناشتہ کرتے ہیں۔ ایسے ہی عبرتناک مناظر دیکھنے کے لیے روزنامہ امت یکم اپریل ۲۰۰۴ء ملاحظہ کریں اور اندازہ لگائیں کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے ماننے والے نہیں۔ اب ان کی خاطر تواضع شروع ہو چکی ہے۔ مجاہدین حرکت میں آ چکے ہیں اور رات دن اپنے شکار پر جھپٹ کر ان کو پکڑ رہے ہیں' ان کو عبرت کا نشان بنا رہے ہیں..... اب نوشتہ دیوار صاف نظر آ رہا ہے کہ وہ دن دور نہیں جب امریکہ یہاں سے بھی مرحلہ وار کی بجائے یکدم سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر' اپنی جان بچا کر' بھاگے گا اور آئندہ ایسی جرأت نہ کرے گا..... اور یوں روس کے بعد دوسری نام نہاد سپر پاور امریکہ کا بھی خاتمہ ہو گا ان شاء اللہ..... اور اللہ کے

بندے مجاہدین ہی پاور میں رہ جائیں گے۔ ان شاء اللہ...... عنقریب کیمرہ کی آنکھ یہ مناظر بھی محفوظ کرے گی...... جو مستقبل کی نسلوں کے لئے پکار پکار کر کہہ رہے ہوں گے...... ؎

نگاہ عبرت سے دیکھ ہمیں
نقش لوحِ مزار ہیں ہم

امریکی سکریپ کا کاروبار پھر شروع ہو گیا!

انٹرنیٹ پر یکے بعد دیگرے تصاویر آنکھوں کے سامنے آتی اور پس منظر میں جا رہی تھیں، تصاویر کچھ اس طرح تھیں کہ ایک امریکی گاڑی تباہ ہو چکی ہے، عراقی بچہ ایک آلے کی مدد سے اس کا سامان اور پرزے اتار رہا ہے۔ دوسری تصویر میں چند عراقی آلات اور اوزاروں سے مسلح ہو کر مجاہدین کے حملوں کی وجہ سے تباہ ہونے والی بکتر بند گاڑیوں، جیپوں وغیرہ سے پرزے نکال رہے ہیں۔ مجھے علی عمران بھائی کہنے لگے: کچھ سمجھے؟ میں الجھا ہوا ان تصاویر کو دیکھ رہا تھا لیکن اس کارروائی کا مطلب نہ سمجھ سکا، علی بھائی کہنے لگے: یہ لوگ امریکی گاڑیوں کے سپیئر پارٹس اور آلات اس لئے کھول رہے ہیں تاکہ ان کو سکریپ کے طور پر بیچ کر پیسے کمائیں۔

یہ سن کر میں حیران و پریشان ہو گیا اور میری آنکھوں کے سامنے تاریخ کے دو مناظر گھومنے لگے: پہلا منظر...... یہ ویت نام ہے، یہاں امریکہ حملہ آور ہوتا ہے، ایک طویل مدت تک جنگ ہوتی ہے، ویت نام کے غیوروں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور امریکہ کی جدید ترین ٹیکنالوجی کا مقابلہ کرنے کے لئے ہر وہ غیر عسکری حربہ استعمال کیا کہ جس کا امریکیوں کے ذہن میں کبھی گمان بھی نہ گزرا تھا۔ مثلاً انہوں نے امریکی فوجوں پر حملہ کرنے کے لئے شہد کی مکھیوں سے لے کر جنگل کے جانوروں تک کو استعمال کیا۔ یہ ان کی جانبازی تھی کہ ایک طویل جنگ سے اکتا کر امریکہ کے فوجی ذہنی مریض ہو گئے اور ویت نام امریکہ کا قبرستان ثابت ہوا۔ امریکہ جب خائب و خاسر اور ناکام و نامراد ہو کر وہاں سے لوٹا تو ویت نام کی سرزمین پر کئی کئی فٹ تک بموں کے خول اور تباہ شدہ امریکی ٹینکوں، توپوں، بکتر

بند گاڑیوں، ہیلی کاپٹروں اور جہازوں کے ملبے کی تہہ چڑھ گئی۔ یعنی زمین کئی فٹ نیچے چھپ گئی اور اس پر ہر طرف ملبے ہی کا راج ہو گیا۔ امریکہ کے جانے کے بعد ''جدید ترین امریکن ٹیکنالوجی'' پر مشتمل یہ سکریپ ویت نامیوں نے خوب بیچا' حتیٰ کہ روس نے بھی اس ٹیکنالوجی کو خوب جی کھول کر دولت کے بدلے خریدا۔ کئی سال تک ویت نامی یہ سکریپ بیچ کر دولت کماتے رہے۔

دوسرا منظر: یہ افغانستان کی سنگلاخ چٹانیں ہیں، روس کے بدمعاش فوجی طاقت کے نشے میں مست ہاتھی کی طرح' ٹینکوں کے میلوں لمبے لشکروں کے ساتھ' افغانستان میں داخل ہو جاتے ہیں۔ مجاہدین نے راستہ روکا...... سالوں یہ سال بیتتے چلے گئے لیکن روس افغانستان پر قابض نہ ہو سکا، البتہ جہاں جنگ کا بازار گرم ہوا، وہاں ایک اور بازار بھی بام عروج پر پہنچ گیا' وہ تھا روسی اسلحے اور ٹیکنالوجی کے سکریپ کا بازار...... مجاہدین دھڑا دھڑ طیارے گراتے، ٹینک تباہ کرتے، بکتر بند گاڑیوں کے قافلوں کو بارودی سرنگوں سے ملیامیٹ کرتے...... یہ مناظر ہر آن بپا رہے' حتیٰ کہ روسی افواج کی اس قدر ٹھکائی ہوئی کہ پہاڑی دروں میں ہر طرف تباہ شدہ روسی فوجیوں کے قافلوں کے قافلے نشان عبرت بنے ملتے۔ راقم خود جب اسد آباد کے ایئر پورٹ پر گیا کہ جو مجاہدین نے روسی فوجیوں کے قبضے سے چھڑایا تھا تو وہاں کتنے ہی دیوہیکل تباہ شدہ ٹینکوں کی لاشیں دیکھیں۔ اتنے مضبوط' بھاری بھرکم' روسی جنگی ٹیکنالوجی سے لیس ہیبت ناک ٹینک میں نے پہلے کبھی نہ دیکھے تھے۔

ان کی ساخت میں جو لوہے کی چادر استعمال ہوئی تھی اس کی موٹائی کئی کئی انچ تھی۔ ان کی آہنی چادر اس قدر موٹی اور مضبوط تھی کہ راکٹ لانچر اور میزائل اس پر ایسے ہی لگتا جیسے ایک ہاتھی کو مسواک کے ساتھ ہلکی سی ضرب لگائی جائے' لیکن یہ مجاہدین کے جذبہ جہاد اور عزم و استقامت کے سامنے رکاوٹ نہ بن سکے۔ دریائے کنہڑ کے ساتھ ساتھ قطاروں میں کھڑے سکریپ کا ڈھیر بنے اور یہ ٹینک اب محض ریت کا ڈھیر اور عبرت کا نشان تھے۔

بہرحال ہر چند دن بعد ہی مجاہدین کی یلغاریں روسی اسلحے اور ٹیکنالوجی کو ہزاروں ٹن

سکریپ میں بدل دیتیں جو نواپاس اور دوسری سرحدوں کے راستے بڑے بڑے ٹینکروں پر لاد کر پاکستان پہنچ جاتا۔ پھر مختلف دھاتیں علیحدہ علیحدہ کر کے ان کی مشینیں اور مختلف آلات بنا لیے جاتے۔ کبھی کبھی اس سکریپ میں سٹنگر و سکڈ میزائل اور ٹینک بھی آ جاتے جو بظاہر ناکارہ ہو چکے ہوتے تھے۔ افغان جہاد کے نتیجے میں سکریپ کا کاروبار ایسا بڑھا کہ کئی لکھ سے لکھ پتی اور لکھ پتی سے کروڑ پتی اور پھر کئی فیکٹریوں، ملوں اور کارخانوں کے مالک بن گئے۔ اس کی مقبولیت، اہمیت اور خام مال کی فراوانی اور نفع کو دیکھتے ہوئے بہت سے عام لوگوں نے بھی اس کاروبار کو اپنا لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے دولت میں کھیلنے لگے۔ ہمارے ایک دوست جو لوگوں کو چھوٹے موٹے پرنٹنگ کے کام کروا کر دیتے تھے ایک دفعہ انہوں نے بھی ترنگ میں آ کر ڈیڑھ کروڑ کی سکریپ کا سودا کر لیا۔

روسی اسلحہ کے سکریپ بننے اور اس کی وسیع پیمانے پر تباہی کا اندازہ اعداد وشمار میں لگانا ممکن نہیں۔ بہت سارا اسلحہ کہ جس کو شمار کرنا ممکن نہیں، مجاہدین کو بھی بطور مالِ غنیمت ملا۔ اس میں خفیف سے لے کر ثقیل اسلحہ تک شامل تھا۔ محترم امیر حمزہ صاحب نے اپنے دورۂ افغانستان کی روداد سناتے ہوئے راقم کو بتایا کہ ایک دفعہ وہ (غالبًا) جلال آباد کے قریب سے گزر رہے تھے کہ ایک کسان کو ٹینک چلاتے ہوئے دیکھا، پہلے تو میں گھبرایا کہ شاید کوئی خطرہ ہے، لیکن دوسرے ہی لمحے میں ٹھٹک کر رہ گیا کہ یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں!! کسان ٹینک پر سبز چارا لادے آ رہا تھا۔ میرے استفسار پر بتانے لگا کہ یہ ٹینک مجھے مالِ غنیمت میں ملا ہے اور میں اس پر اپنے مویشیوں اور جانوروں کے لیے اپنے کھیتوں سے چارا کاٹ کر اور اس پر لاد کر لاتا ہوں یعنی وہ اس سے گدھے کا کام لے رہا تھا اور مزے کی بات یہ کہ اسے ہانکنے کے لیے چھڑی بھی نہ مارنی پڑتی تھی، یہ جہاد کی عظمت اور روسی عسکری ٹیکنالوجی اور قوت کے منہ پر ایک جہادی طمانچہ تھا کہ جس کے پڑتے ہی وہ ریزہ ریزہ ہو کر سکریپ کا روپ دھار کر پشاور کے بازاروں اور باڑہ مارکیٹ میں کھلے بندوں ٹھوکریں کھانے پر مجبور تھی۔ الغرض روس کی قوت جہادی طمانچوں سے افغانستان میں سکریپ ہوگئی اور اب امریکہ

کی باری ہے' کہ پشاور اور باڑہ کی مارکیٹوں سے اب امریکی ہیلی کاپٹرز، طیارے، بم، گاڑیاں اور گنیں وغیرہ سکریپ کی صورت میں اور بلیک میں بکنے کی خبریں آنے لگی ہیں۔ یہی بازگشت اب عراق کے میدانوں سے آ رہی ہے اور اب میں نے اپنی آنکھوں سے امریکی ٹیکنالوجی کا حشر عراق کی سڑکوں پر مجاہدین کے ہاتھوں دیکھ لیا ہے۔

اس سے اللہ کریم کی عطا کی ہوئی بصیرت اور جہاد کی برکت کی بنا پر ہر مسلمان اب یہ دیکھ رہا ہے کہ عراق میں بھی امریکی سکریپ کی مارکیٹ میں تیزی آ رہی ہے۔ عراقی باشندے کہ جو صدام کے ہوتے ہوئے بادشاہ تھے' اب امریکہ نجات دہندہ کے زیر سایہ قلاش ہو کر فقیروں سے بدتر زندگی گزار رہے ہیں۔ کھانے پینے کو ترس گئے ہیں۔ درہم و دینار بینکوں سے امریکی لوٹ کر لے گئے ہیں۔ ملک میں پولیس، فوج، عدلیہ وغیرہ کا وجود ختم، امن قائم کرنے والے ادارے ختم، دہشت و غنڈہ گردی' چوری چکاری اور قتل و غارت عام ہے۔ عزتوں کو سرعام لوٹا جا رہا ہے۔ مزاحمت کرنے والوں کو بے دریغ گولی ماردی جاتی ہے۔ بغداد کی بجلی ابھی تک بحال نہیں کی گئی (جبکہ تیل کے کنوؤں کی بجلی اگلے دن ہی بحال کر کے کام شروع ہو گیا تھا) جس کی وجہ سے صحرا کی گرمی میں زندگی کباب بن کر رہ گئی ہے۔ لوگوں کا کوئی مستقل ذریعہ معاش نہیں۔ ان کو کوئی کام نہیں مل رہا۔ وہ اس انتظار میں رہتے ہیں کہ کب مجاہدین کوئی کارروائی کر کے امریکی ٹینک، بکتر بند گاڑی یا جیپیں ناکارہ بنائیں یا ہیلی کاپٹر گرائیں یا اسلحہ ڈپو کو تباہ کریں تو وہ وہاں سے سکریپ اکٹھا کر کے بیچیں اور اپنی زندگی کی گاڑی چلائیں۔ اس کے لئے کئی دفعہ وہ موقعہ ملتے ہی خود بھی کارروائی کر جاتے ہیں اور کسی امریکی کانوائے کو سکریپ کا ڈھیر بنا دیتے ہیں۔ یہ جو انٹرنیٹ پر میں امریکی گاڑیوں وغیر کو کھول کر ان کے پرزے علیحدہ کرتے ہوئے لوگوں کو دیکھ رہا ہوں، یہ مناظر یہیں پر ختم نہیں ہو جائیں گے' بلکہ دن بدن بڑھتے جائیں گے اور اس بات کی نشاندہی اس سے بھی ہو رہی ہے کہ افغانستان اور عراق میں امریکی سکریپ کا کاروبار بڑھتا جا رہا ہے اور عنقریب یہ عروج پر پہنچنے والا ہے۔ چشم فلک دیکھے گی کہ جس طرح روس افغانستان میں

سکریپ کا ڈھیر ہوا اور ذلت و نامرادی اس کا مقدر ٹھہری اسی طرح امریکہ بھی عراق میں سکریپ کا ڈھیر ہو گا اور ناکام و نامراد ہی نہ ہو گا بلکہ جس طرح اس کی ٹیکنالوجی اور اسلحہ سکریپ بنا ہے' اسی طرح جہاد کی برکت سے اس کے اپنے بھی ٹکڑے ٹکڑے ہوں گے اور وہ بھی روس کی طرح ٹوٹ پھوٹ جائے گا۔ ان شاء اللہ!

❀❀❀❀

مردوں کی مخصوص نشستیں

پچھلے دنوں قومی اسمبلی کے لئے ایک حلقہ کی امیدوار خاتون صاحبہ کہ جن کو انتخابی نشان ''گائے'' الاٹ کیا گیا تھا، اخبار والوں کے روبرو اپنا دکھڑا بیان کرتے ہوئے کہہ رہی تھی کہ الیکشن کمیشن نے جب مجھے انتخابی نشان الاٹ کیا تو مخصوص (طنزیہ) مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھتے ہوئے کہا: ''لو بی بی اپنا نشان'' میں نے دیکھا تو میرا نشان ''گائے' تھا (یعنی اب مجھے الیکشن کمیشن کی مسکراہٹ کا مطلب سمجھ میں آیا)...... غالباً یہ محترمہ گائے کے نشان الاٹ ہونے کو اپنی توہین تصور کر رہی تھیں۔ اگر یہ توہین یا ہتک آمیز سلوک ہے تو پھر یہ تو کچھ بھی نہیں، یہ تو ابتداء ہے آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟ اگر عزت اتنی ہی پیاری تھی تو گھر سے نکلی ہی کیوں تھی۔

جس کو ہو جان و دل عزیز
وہ اس گلی میں آئے کیوں

کیونکہ یہ تو جمہوری منڈی ہے، یہاں عزت و بے عزتی کے الفاظ کچھ معنی نہیں رکھتے بلکہ فریق مخالف کو نیچا دکھانے کے لئے سرعام پبلک جلسوں میں اس سے بھی بہت نیچے جایا جاتا ہے۔ جو جس کو جتنا ذلیل کرے وہ اتنا ہی کامیاب سمجھا جاتا ہے۔ وہ ذلیل کرنے والا ہندو ہو یا عیسائی اور مقابلے میں مسلمان ہو، اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ اب تو پورا پاکستان حقیقی جمہوریت کی دلدل میں پھنس کر ذلت وشرمندگی کے گھونٹ پی رہا ہے۔

پچھلے دنوں کی بات ہے کہ سندھ میں وہی مسلمان جو کبھی ہندوؤں، عیسائیوں اور غیر مسلموں کے سامنے مسلمان ہونے کی حیثیت سے سر اٹھا کر جیتے تھے، ہندو کی غلاظت اور

کمینگی سے نفرت کرتے تھے، خاص طور پر عقیدہ توحید کی بنا پر ان کی بت پرستی اور اسلام دشمنی سے بیزار تھے ان کی ملک دشمن، اسلام دشمن ہر سازش کے آگے بند باندھتے تھے اب جمہوریت نے ...... ہاں ...... حقیقی جمہوریت نے حقیقت میں ان کے نظریات، افکار حق کے لئے تعصب کا جنازہ نکال دیا تھا۔ اس لئے کہ اس حقیقی جمہوریت نے ہندوؤں عیسائیوں اور غیر مسلموں کو یہ حق دے دیا ہے کہ وہ ایک مسلمان کے مقابلے میں دو دو ووٹ کاسٹ کر سکتے ہیں، اپنے اقلیتی نمائندے کو بھی ووٹ دیں گے اور اس علاقے کے مسلمان کینڈی ڈیٹ کو منتخب کرنے کے لئے بھی دوبارہ ووٹ کاسٹ کر سکیں گے۔ یوں ایک ہندو کو ایک وقت میں دو ووٹ ڈالنے کا حق دے دیا۔

ہماری سخی اور فراخ دل گورنمنٹ نے، اب وہی مسلمان جو ہندوؤں کی اسلام و ملک دشمن سازشوں کو ناکام بنانے کے لئے ان سے ہمیشہ سے ٹکر لئے ہوئے تھے انہی ہندوؤں کی چوکھٹوں پر ماتھے رگڑتے نظر آئے کہ بھگوان کے لیے اپنا دوسرا مسلم حلقے میں کاسٹ ہونے والا ووٹ ہمیں دینا۔ ہم آپ کا ہر طرح کا خیال رکھیں گے۔ کبھی کوئی مسلمان ان کے پاس جا رہا ہے، کبھی کوئی، کبھی کوئی لمبی داڑھی والا مولوی جا کر فریاد کرتا ہے کہ بھگوان کے لئے ووٹ ہم کو دینا، ہم آپ کی ہر طرح سے خدمت کریں گے۔ یہ بھی اطلاعات ملیں کہ بعض مسلمان نمائندوں نے صرف ووٹ لینے کے لئے اپنے افکار نظریات مذہب وعقائد کا جنازہ نکالتے ہوئے ہندو کلچر کی پیروی بھی کی کہ کہیں ان پر بنیاد پرست کا لیبل نہ لگ جائے اور یوں وہ پیارے پیارے ہندوؤں اور عیسائیوں کے ووٹوں سے محروم نہ ہو جائیں۔ یہاں تک کہ ایک مسلم نمائندے نے ہندوؤں کی شراب و کباب اور رنگ و نور سے بھرپور ضیافت بھی کر ڈالی کہ دیکھیں! ہم میں اور تم میں صرف نام کا فرق ہے ورنہ ہم ایک جیسے ہی ہیں ......

یہ خلافت کو چھوڑ کر جمہوریت کی دم پکڑنے کا نتیجہ ہے کہ آج توحید کا علمبردار مسلمان صرف ووٹ لینے کے لئے اللہ کے دشمنوں غلیظ ہندوؤں مشرک صلیبیوں کے تلوے چاٹتا ہے، ان کی خوشنودی میں اپنی کامیابی تصور کرتا ہے۔ یہ کیسی جمہوریت ہے کہ جس میں ایک

مسلمان صرف ایک ووٹ کاسٹ کرنے کا اختیار رکھتا ہو اور غیر مسلم اقلیت اس کے مقابلے میں بیک وقت دو ووٹ!!

طالبان کہ جن کو دہشت گرد رجعت پسند، پسماندہ، بنیاد پرست وغیرہ کے ناموں سے موسوم کر کے مطعون کیا گیا' وہاں تو ایسی جمہوریت نہ تھی...... مانا آپ کے بقول وہاں ان کا بنیاد پرستانہ نظام تھا...... لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ اکرام مسلم تھا، مسلم سر بلند کر کے چلتا تھا' اسلام کی چھاپ ہر طرف غالب نظر آتی تھی، کوئی اسلام کے خلاف ذرہ برابر کام کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا...... ذرا تصور کریں اگر وہاں بھی جمہوری نظام ہوتا تو کیا ایسا ہوتا......؟!!

وہاں جو اسلام کا بول بالا تھا تو یہ جمہوریت نہ ہونے ہی کی برکتیں تھیں' ورنہ اگر جمہوریت ہوتی تو کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے ان کو سوچنا پڑتا کہ ایسا کرنے سے امریکہ ناراض ہو جائے گا۔ ایسا کرنے سے برطانیہ اور یوں کرنے سے ہندوستان کے ماتھے پر شکنیں پڑیں گی۔ یہ نظام امارت کی برکات تھیں جو باطل کے آگے جھکنے اور ڈرنے دبنے سے انسان کو بچاتا ہے۔ ہمارے ملک میں تو کامیاب ہونے کے باوجود بھی مجلس عمل کو کورا کورا جواب دے دیا گیا ہے کہ آپ کو وزارت عظمیٰ، وزارت خارجہ اور داخلہ کسی صورت میں نہیں دی جا سکتیں...... کیوں؟...... اس لئے کہ ایسا کرنے سے امریکہ و برطانیہ ناراض ہوتے ہیں...... اسی لئے تو ہم کہتے ہیں کہ یہ نظام ان کا ہے، ان کے مفادات کا محافظ ہے لہٰذا انہی کو مبارک، ہمارا نظام وہی خلافت و امارت اور دعوت و جہاد ہے کہ جو امریکہ و یورپ کو ایک آنکھ نہیں بھاتا' کہ اس کے ہوتے ہوئے اس کی کہیں بھی دال نہیں گلتی' بلکہ جہاں یہ ہوگا وہاں سے اس کو بھاگنا پڑتا ہے۔ اسی لیے وہ دنیا میں ہر جگہ سب سے پہلے جمہوریت بحال کرنے کی رٹ لگاتا ہے کہ اسی راستے سے وہ اپنے ایجنٹ لا کر مسلمانوں پر شب خون مار سکتا ہے اگر اس راستے سے بھی کبھی اسلام کے متوالے اوپر پہنچ جائیں تو ان کو بے اختیار کر کے بٹھا دیا جاتا ہے۔

بہرحال بات ہو رہی تھی ایک محترمہ کو الاٹ ہونے والے گائے کے نشان کی، یہ تو ایک خاتون ہے کہ جس نے گھر کی دہلیز سے قدم باہر نکالا اور اب پہلے ہی مرحلے پر ڈر رہی ہے۔ اسی طرح کتنی ہی پردہ دار خواتین گھر کی دہلیز پار کر کے الیکشن میں بھرپور شریک رہی ہیں، کچھ اسمبلی میں بھی پہنچ چکی ہیں۔ مزید ۶۰ خواتین اور بھی مخصوص نشستوں پر اسمبلی پر ہلہ بولنے والی ہیں۔ بلدیاتی الیکشن لڑ کر بھی اسمبلی میں پہنچ رہی ہیں۔ مخصوص نشستوں سے اس کے علاوہ ہیں جو ۶۰ ہیں، سینٹ میں علیحدہ اور اب تو ایک معروف سیاستدان خاتون نے انکشاف کیا ہے کہ چند دنوں میں ان کو وزیراعظم بنائے جانے کا اعلان کیا جا رہا ہے۔ یہ ساری صورت حال دیکھ کر معلوم ہو رہا ہے کہ عورتوں کا ایک سیلاب ہے جو حکومتی ایوانوں میں امڈتا چلا آ رہا ہے اور اس کی سیلانی وطغیانی بتا رہی ہے کہ شاید یہ مردوں کو بہا کر لے جائے۔ موجودہ حالات کو دیکھ کر یہ خدشہ محسوس ہو رہا ہے کہ عنقریب ایسا وقت آنے والا ہے جب اسمبلی میں خواتین ہی نظر آئیں گی، مرد خال خال ہوں گے۔

اب عورتوں کو اس کثرت سے نمائندگی دینے کے بعد ایک اور مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ عورتوں کے حقوق بحال کیے جائیں اور ان کو فطری تناسب سے نمائندگی دی جائے۔ فطری تناسب کیا ہے؟ کہا جا رہا ہے کہ چونکہ عورتیں آبادی کا ۵۴ فیصد ہیں اور مرد ۴۶ فیصد یعنی وہ مردوں سے اکثریت میں ہیں اس لئے ان کو ان کی تعداد کے حساب سے سیٹیں دی جائیں اور مردوں کو ان کی تعداد کے حساب سے، یوں عورتوں کے غصب شدہ حقوق بحال ہو جائیں گے۔

اگر یہ مطالبہ مان لیا جائے تو ان کو ان کی تعداد کے اعتبار سے سیٹیں مل جائیں پھر ملک کی ہر سیٹ پر مردوں سے خواتین کا مقابلہ ہو، دیکھنے میں آیا ہے جو پارٹی طاقت ور ہوتی ہے لوگ اسی طرف رجوع کرتے ہیں۔ عورتیں چونکہ ۵۴ فیصد ہوں گی، مضبوط ہوں گی، الیکشن میں اپنی امیدواروں کو سپورٹ کریں گی...... یوں کتنی ہی جگہوں سے مرد ہاریں گے، عورتوں کے اسمبلی کے اندر مزید زیادہ تعداد میں آنے کے چانس بڑھتے جائیں گے۔ عورتیں جو آبادی

کے تناسب سے ابھی غالب ہیں مزید غالب ہوں گی اور اب بھی ہو رہی ہیں بلکہ اس اسمبلی میں بھی عورتوں کی اتنی تعداد آ رہی ہے کہ پچھلے پچاس سال میں کبھی نہ آئی تھی اور یہ بات بھی ریکارڈ پر ہے کہ دنیا کی کسی پارلیمنٹ میں خواتین کی اتنی زیادہ تعداد نہیں ہے جس تناسب سے ہماری اسمبلی میں ہے۔ اس صورت حال کو دیکھو تو یہ خطرہ پیدا ہو گیا ہے کہ عنقریب ایسی صورت حال پیدا ہو سکتی ہے جب جمہوری دیوی کا ڈنکا بجے گا اور عورتوں کا تناسب اس قدر بڑھ جائے گا کہ مردوں کی مخصوص نشستیں مقرر کرنا پڑیں گی۔ ان کے حقوق کے تحفظ میں تنظیمیں سامنے آئیں گی۔ یہ ہماری مذہبی اور معاشرتی قدروں کی موت ہو گی۔ ۷۰ کے قریب مردوں کی نشستوں پر تو اس اسمبلی میں ہی عورتیں قبضہ کر چکی ہیں۔

یہ سب کچھ کیا ہے؟ صرف مغرب کو خوش کرنے کے لئے مدعی سست گواہ چست کے مصداق ہم اتنے آگے نکل گئے ہیں کہ ہماری فکری موت واقع ہوتی نظر آ رہی ہے۔ دنیا بھر میں ذلتیں اور رسوائیاں ہمارا مقدر کیوں بن رہی ہیں؟ صرف اس لئے کہ ہم اپنی بنیاد (اسلام) سے ہٹ گئے ہیں۔ عورت کا نام عورت ہے ہی اس لئے کہ وہ تمام کی تمام چھپانے کی چیز ہے، اسلام تو اس کی آواز کو بھی چھپانے کی ترغیب دیتا ہے، اس کا مقام گھر میں ہے۔ خاندان کی تربیت اس کی ذمہ داری ہے...... اب جب ہم نے شریعت سے روگردانی کرتے ہوئے ان کو گھر سے اٹھا کر بازار کی رونق بنا دیا ہے...... جب پارلیمنٹ کو ان سے سجانے کی کوشش کی ہے تاکہ دنیا بھر کے کمینے غلیظ صلیبی اور سازشی یہودی خوش ہو جائیں تو پھر ذلتیں مزید اس طرح ہمیں گھیر سکتی ہیں کہ حکومت کے تمام یا اکثر شعبوں میں عورت کی حکمرانی ہو جائے، جیسا کہ عمومی طور پر ہو رہا ہے تو پھر ہم رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کے مصداق ٹھہریں گے، جس میں آپ نے فرمایا:

''وہ قوم کبھی بھی فلاح نہیں پا سکتی جس نے اپنے معاملات عورت کے سپرد کر دیے۔''

اللہ کریم ہمیں اس دن سے بچائے جب عورتوں اور کافرانہ نظاموں کا سیلاب تند ہمیں خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جائے۔ آمین

حافظ سعید کی رہائی اور امریکہ و انڈیا کی پریشانیاں

پچھلے دنوں جب حافظ سعید صاحب کی رہائی ہوئی تو ہندوستان نے اپنے رد عمل کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان دہشت گردی کے خاتمے کے لئے سنجیدہ نہیں ہے اس نے سرحد پار دہشت گردی کے مرتکب حافظ سعید کو رہا کر دیا ہے۔ اسی طرح امریکہ نے اپنے رد عمل میں کہا کہ حافظ سعید کے کیس میں حافظ صاحب کو رہا کر کے انصاف کے تقاضے پورے نہیں کیے گئے۔ لہٰذا انصاف کے تقاضے پورے کیے جائیں۔ یعنی ان کو گرفتار کیا جائے اور ان پر ایسے (مضبوط اور جھوٹے) کیس بنائے جائیں کہ وہ رہا نہ ہوسکیں اور اگر ایک مقدمے سے رہا ہو بھی جاتے ہیں تو دوسرے میں دھر لئے جائیں۔ امریکہ کی زبان میں حافظ سعید کو رہا کر کے بہت بڑی نا انصافی ہوئی ہے..... کن کے ساتھ؟..... امریکہ کے ساتھ..... انڈیا کے ساتھ..... لہٰذا اب وہ پاکستانی حکومت سے انصاف مانگ رہے ہیں۔ انصاف ان کو کب ملے گا..... کہ جب مظلوموں کے حق میں اور ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے والے اس شخص کو دوبارہ سلاخوں کے پیچھے بھیج دیا جائے۔

امریکہ کے بھی انصاف کے قوانین اور تقاضے نرالے ہیں کہ امریکی' حقیقی انصاف کو جو کسی پریشر اور دباؤ کے تحت نہ ہو' کو انصاف نہیں سمجھتے۔ ان کے نزدیک انصاف اور حق وہی بات ہے جس کی وہ اجازت دیں' خواہش کریں یا تصدیق کر دیں' باقی سب نا انصافی ہے۔ کوئی ان سے پوچھے کہ عدل و انصاف اور امن کو قائم کرنے والوں کو تو آپ ختم کر رہے ہیں بلکہ ان کو دہشت گرد قرار دے کر ان پر ڈیزی کٹر بموں کی بارش برسا رہے ہیں تو پھر آپ کس انصاف کی بات کرتے ہیں؟..... طالبان کہ جنہوں نے دنیا میں عدل و انصاف کے

اچھے نمونے اور پائیدار قدریں قائم کی تھیں ان کو تو تم نے اسی انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے جرم میں تباہ و برباد کر دیا۔ جب انصاف کرنے والے ہی دفن کر دیئے جائیں تو انصاف پھر قائم نہ رہ سکے گا، پھر تو جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا قانون چلے گا۔ اس ضمن میں مجھے ایک واقعہ یاد آ رہا ہے یہ پڑھ کر آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جہاد ہی عدل و انصاف کے قیام کا باعث ہے کہ جسے آج دہشت گردی کا نام دے دیا گیا ہے۔ ہاں! یہ دہشت گردی کی علامت ضرور ہے مگر ظالموں کے لیے' غاصبوں اور قاتلوں کے لیے۔

11 ستمبر 2001ء سے پہلے کا واقعہ ہے کہ پاک فوج کے ایک ریٹائرڈ صوبیدار کا اکلوتا بیٹا کوئٹہ میں ٹیوٹا ہائی لکس چلاتا تھا۔ ایک دن اس کے پاس دو افغان باشندے آئے' انہوں نے چمن چلنے کا کرایہ طے کیا اور سفر پر روانہ ہو گئے۔ ان کے ساتھ دو خواتین بھی تھیں۔ جب وہ چمن پہنچے تو کہنے لگے کہ چند کلو میٹر دور ہمارا (افغانستان میں) گاؤں ہے ہمیں وہاں چھوڑ آئیں ہم مزید کرایہ دے دیں گے۔ صوبیدار کا لڑکا گاڑی میں افغانستان چلا گیا۔ دوران سفر ایک افغانی نے پیچھے سے اس پر خنجر سے وار کیا کیونکہ ان کی نیت میں فتور آ چکا تھا کہ اس کو مار کر گاڑی اپنے قبضہ میں کر لیتے ہیں۔ زخم کھا کر لڑکے نے گاڑی روکی اور تیزی سے باہر نکلا۔ دونوں نے اس پر یکبارگی خنجروں سے حملہ کیا اور 42 زخم لگا کر اس کو ہلاک کر دیا۔ اس کی لاش وہاں گڑھا کھود کر دبائی اور گاڑی لے کر روانہ ہوئے۔ ادھر جب مقررہ وقت پر لڑکا گھر نہ پہنچا تو اس کا والد ریٹائر صوبیدار اس کی تلاش میں کوئٹہ اڈا پر پہنچا۔ اڈا پر موجود لوگوں نے بتایا کہ گاڑی چمن گئی ہے۔ جب وہ وہاں پہنچا تو پتہ چلا کہ گاڑی افغانستان گئی تھی ابھی تک واپس نہیں آئی۔ لہٰذا اس نے طالبان سپاہیوں سے رابطہ کیا اور ساری صورت حال بتائی۔ انہوں نے آگے اپنے پولیس اسٹیشن میں وائرلیس کر دی۔ فوری ان کی مشینری حرکت میں آ گئی اور تلاش شروع ہو گئی۔

ادھر ہوا یہ کہ جب یہ قاتل آگے بڑھے تو ایک نالے کو کراس کرتے ہوئے ان کی گاڑی اس کی ریت اور پتھروں میں پھنس گئی۔ نکالنے کی کوشش میں شام ہو گئی تو قریبی بستی

میں چلے گئے کہ صبح کسی ٹریکٹر وغیرہ کی مدد سے نکالیں گے اور پھر سفر شروع کریں گے۔ طالبان کے دو تفتیشی سپاہیوں کی ٹیم یہاں پہنچی' انہوں نے دیکھا کہ گاڑی بھی وہی ہے' نمبر بھی وہی حلیہ بھی وہی جو وائرلیس سیٹ پر بتایا گیا' یہ تو یہاں پھنسی ہوئی ہے لیکن کوئی انسان موجود نہیں ہے۔ وہ سارا معاملہ سمجھ گئے اور کہنے لگے کہ صبح اسے ضرور کوئی نکالنے آئے گا تو اصل حقائق کا پتہ چلے گا۔ لٰہذا وہ اپنے فرض کو نبھاتے ہوئے وہیں پتھروں کی اوٹ میں چھپ کر بیٹھ گئے کہ کب کوئی اس کو نکالنے آئے اور ہم اس سے تفتیش کر سکیں۔ مجرموں کے انتظار میں رات بیت گئی مگر کوئی نہ آیا۔ جب دن چڑھا تو انہوں نے دیکھا کہ کچھ لوگ ٹریکٹر نکالنے کے لیے وہاں آئے اور زور آزمائی کرنے لگے۔ دونوں سپاہیوں نے آگے بڑھ کر اچانک خاموشی سے نکل کر گاڑی کے مبینہ مالکوں کو عورتوں سمیت گرفتار کر لیا اور قاضی کے پاس لے گئے۔ وہاں جا کر یہ عقدہ کھلا کہ یہ عورتیں جن کو وہ اپنی ماں اور بہن ظاہر کر رہے تھے حقیقت میں ان کے چنگل میں پھنسی ہوئی ہیں' جن کو وہ اغواء کر کے لا رہے تھے' اور دھمکیاں دیتے آ رہے تھے کہ اگر تم نے کسی کو کچھ بتایا تو اسی وقت تمہارا کام تمام کر دیں گے۔ انہوں نے قتل کی تمام تفصیلات بتا دیں۔

اب انصاف کے تقاضے پورے کرنے کا وقت تھا۔ لٰہذا طالبان نے پاکستان سے ریٹائرڈ صوبیدار کو بلوایا اور جیل میں لے جا کر بتایا کہ یہ تمہارا مجرم ہے۔ اس نے تمہارے بیٹے کو قتل کر دیا ہے۔ ہم نے اس کو حوالات میں بند کر دیا ہے۔ اس کے بعد قاضی آیا اس نے کہا اسلام کی رو سے اگر معاف کر دے تو اختیار ہے ورنہ ہماری طرف سے تین صورتیں آپ کے سامنے رکھی جاتی ہیں جون سی چاہو اختیار کر لو:

① اگر چاہو تو اس کے خاندان سے رشتہ لے دیتے ہیں۔

② اگر چاہو تو اس کے خاندان والے قتل کی دیت جتنے لاکھ بنتے ہیں دینے کو تیار ہیں۔

③ اگر ان دونوں صورتوں میں سے کوئی بھی قبول نہیں تو پھر کلاشنکوف دیں گے اس کو اپنے ہاتھوں سے ختم کر دو۔

صوبیدار کہنے لگا: میرا ایک ہی بیٹا تھا جو اس نے مار دیا' اب میں نے رشتہ کس کے لیے لینا ہے۔ رہا مال و دولت تو مجھے اللہ نے کافی دے رکھا ہے اس کی مجھے حاجت نہیں۔ میں تو اس درندے سے ظلم کا بدلہ لوں گا لہٰذا طالبان نے قاتل کو 20 فٹ کے فاصلہ پر باندھ دیا اور کلاشنکوف میں 20 گولیاں لوڈ کر کے اس کو تھما دیں اور کہا کہ اگر ان گولیوں کے لگنے کے بعد بھی یہ زندہ رہا تو یہ اس کی قسمت۔ صوبیدار نے گن پکڑی نشست لی اور اس کی کنپٹی کا نشانہ لے کر چار فائر کیے اور اس کو وہیں ڈھیر کر دیا۔ باقی 16 راؤنڈ سمیت کلاشن طالبان سپاہیوں کو واپس کر دی۔ انصاف کے تقاضے پورے ہو چکے تھے' قاتل اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا لیکن اب صوبیدار کو اپنی جان خطرے میں محسوس ہوئی' اس نے سوچا کہ جب میں پاکستان واپس جاؤں گا تو اس کا قبیلہ کہیں مجھے راستے میں قتل ہی نہ کر دے۔ جب اس نے اپنے خدشے کا طالبان سے اظہار کیا تو انہوں نے کہا کہ اس کا آپ سوچیں بھی نہ' یہ افغانستان ہے پاکستان نہیں' ہم خود اپنی حفاظت میں آپ کو پاکستان کے اندر تک چھوڑ کر آئیں گے۔ اس کا قبیلہ آپ کی ہوا کو بھی نہیں پہنچ سکے گا۔ اس کے بعد طالبان انصاف کے تقاضے پورے کرتے ہوئے اس کو بحفاظت پاکستان چھوڑ گئے۔

آج یہی انصاف پرور لوگ امریکہ کی آنکھ میں دہشت گرد اور امن دشمن ہیں۔ عدل و انصاف کے تقاضوں کو ختم کرنے کے لیے ہی امریکہ بارہا پاکستان کو کہہ چکا ہے کہ قادیانیوں پر عائد پابندیاں ختم کرو' وفاقی شرعی عدالت کو ختم کرو' حدود آرڈیننس ختم کرو' پھر امداد دیں گے۔ امریکہ بہادر کو اگر انصاف کا اتنا ہی خیال ہے تو اسے کشمیر میں ظلم و ستم کے پہاڑ ٹوٹتے نظر نہیں آتے۔ فلسطین میں معصوم بچوں کو کھڑا کر کے اوپر سے ٹینک گزارے جا رہے ہیں۔ بوسنیا میں مسلمانوں کی اجتماعی قبریں ابھی تک دریافت ہو رہی ہیں اور ظلم و ستم کی داستان سنا رہی ہیں۔ افغانستان کے مسلمان شہریوں پر نیوکلیائی بموں کی بارش کون سے انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لیے ہے۔ آج امریکہ نے عراق کے ہر طرح کے معائنہ کے بعد ایٹمی ہتھیار نہ ملنے کے باوجود بھی اس پر بارود کی بارش کر رکھی ہے۔ یہ کہاں کے انصاف کے

تقاضے پورے کیے جا رہے ہیں!! اور اب ایران میں مہلک ہتھیاروں کی تیاری کا بہانہ بنا کر پیش قدمی کرنا کون سے انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لیے ہے۔

محترم حافظ سعید صاحب کی رہائی پر جو امریکہ کے پیٹ میں مروڑ اٹھ رہے ہیں اور وہ دہائی دے رہا ہے کہ انصاف کے تقاضے پورے کیے جائیں تو وہ محض حافظ سعید کی ذات کے خلاف اقدامات نہیں کر رہا بلکہ حقیقت میں وہ اسلام کو ہدف بنائے ہوئے ہے...... نہ وہ حافظ سعید کہ جس نے پوری دنیا کے مظلوموں میں جہاد فی سبیل اللہ کی روح پھونک دی اور اس کو پروان چڑھایا ہے اور جس کے وہ نشان بن چکے ہیں یعنی جہاد فی سبیل اللہ' اب اس جہاد سے کہ جس کو مظلوم اور مجاہدین کھڑا کر چکے ہیں' سے امریکہ تھر تھر کانپ رہا ہے اور انصاف کی اپیل کر رہا ہے' وہ انصاف کہ جو اس کو مجاہدین کی یلغاروں سے بچا سکے۔ وہ سمجھتا ہے کہ جہاد کے نشان حافظ سعید کو اگر کسی طرح قابو کر لوں تو جہاد کی اٹھی ہوئی لہر کو بھی کنٹرول اور ختم کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا مگر یہ اس کی خام خیالی ہے۔ اب جہاد کھڑا ہو چکا ہے۔ یہ فریضہ شخصیات کا محتاج نہیں۔ یہ اب یہ کسی کے روکے نہ رکے گا ...... یہ عالمی جنگوں کی جگا گیری' اجارہ داری اور ظلم و جبر کو ختم کرے گا۔ اس جہاد سے یہی کچھ انہیں نظر آ رہا ہے' اسی لیے وہ ''انصاف'' کے تقاضے پورے کرنے کی بھیک مانگ رہے ہیں' اور حافظ سعید کی دوبارہ گرفتاری کے مطالبے کر کے جہاد کو روکنے کی منصوبہ بندیاں کر رہے ہیں۔ لیکن ان کو جان لینا چاہیے کہ الجهاد ماض الى يوم القيامة کہ رسول امن و آشتی کے اس فرمان کی روشنی میں ہر مسلمان کا عقیدہ ہے اور یہ ایک اٹل حقیقت بھی ہے کہ جہاد قیامت تک (ہر حال میں) جاری رہنا ہے وہ کسی کے روکے کبھی نہ رک سکے گا۔ ان شاء اللہ۔

”توبہ“ سے توبہ

انسان ختم ہو جاتا ہے لیکن اس کی یادیں باقی رہ جاتی ہیں۔ اگر اس نے تحریر کی صورت میں کوئی نشانی چھوڑی ہو تو یہ اس کی یاد کی بازگشت کے لیے بہت بڑا ذریعہ ہوتا ہے۔ خاص طور پر اگر وہ اپنی کوئی تالیف یا تصنیف ورثے میں چھوڑے تو یہ صدیوں اس کی یادوں کو زندہ رکھتی ہے۔ کتاب کی تالیف کے حوالے سے بات چلی تو مجھے فہرست ابن ندیم کا ایک دلفریب جملہ یاد آیا' آپ بھی پڑھیں' لکھتے ہیں:

ببکاء الاقلام تتبسم الکتب (فہرست ابن ندیم)

قلم کی اشکباری سے کتابیں مسکراتی ہیں۔

بعض مسکراتی کتابیں دوسروں کو بھی مسکرانے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ وہ لوگوں کے دلوں کا سکون' ٹھنڈک' نیک نامی اور تاریخ کا ایک مثبت و یادگیری ریکارڈ ثابت ہوتی ہیں۔ بعض کتابیں پشیمانی' بدنامی' پریشانی' شرمندگی اور جگ ہنسائی کا باعث بنتی ہیں۔ قلم وہی کچھ قرطاس پر بکھیرتے ہیں جو لکھنے والے کے دل و دماغ میں ہوتا ہے۔

ہمارے صدر پرویز مشرف صاحب کو بھی کتاب لکھنے کا شوق ہوا۔ کتاب ”ان دی لائن آف فائر“ چھپی' کئی چینل اس کی تشہیر کے لیے وقف ہو کر رہ گئے۔ اگر کسی نے کتاب پکڑ کر پڑھی نہیں بلکہ دیکھی ہی سہی تو اس کی تصویر بھی اخبارات میں چھپ گئی کہ دیکھیں ایک فوجی صدر صاحب کی کتاب کی طرف دیکھ رہا ہے۔ جن لوگوں نے کتاب پڑھی وہ پچھتانے لگے کہ کاش نہ پڑھتے تو اچھا تھا۔ وہ اب صدر صاحب پر برس رہے تھے۔ یہ کتاب پوری دنیا میں مسلمانوں' پاکستانیوں اور پاکستان کی بدنامی کا باعث بنی۔ امریکہ کو خوش کرنے کے لیے

جو کچھ امریکہ کے متعلق منسوب کر کے لکھا گیا امریکہ نے اس کا انکار کر کے مشرف صاحب کے دعوؤں کو جھٹلا کر بیچ چوراہے بھانڈا پھوڑ دیا۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد پوری قوم صدر صاحب کے خلاف ہے اور کہہ رہی ہے کہ یہ کتاب بزدلیوں' ملت فروشوں' دین دشمنوں' مسلمان و اسلام دشمنوں' جہاد دشمنوں اور قرآن دشمنوں کی امنگوں کی ترجمان ہے۔ اس کتاب میں صدر صاحب نے اپنے جو مزموم ''کارنامے'' بیان کیے ہیں کہ جنہوں نے شرم سے ہمارے سر جھکا دیے ہیں' اس کے متعلق چوہدری شجاعت حسین نے شجاعت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کورڈ ورڈز میں برملا کہہ دیا ہے کہ:

''یہ کتاب ''جھوٹ'' کا پلندہ ہے''

کتاب کے منظر عام پر آنے کے بعد پوری قوم کے سر شرم سے جھک گئے ہیں۔ یقیناً تنہائی میں صدر صاحب بھی یہ کتاب لکھ کر پچھتا رہے ہیں اور سوچ رہے ہیں کہ اگر یہ کتاب نہ لکھتا تو اس قدر بدنامیاں اور رسوائیاں تو نہ ہوتیں۔ اس کتاب کے متعلق بیزاری کا عالم یہ ہے کہ نہ کوئی اس کو خریدنے پر تیار ہے اور نہ پڑھنے پر۔ اب سننے میں آ رہا ہے کہ بدنامی سے بچنے کے لیے کتاب کا کافی سارا مواد آئندہ ایڈیشن میں نکالا جا رہا ہے۔

اسی عرصے میں ایک دوسری کتاب بھی منظر عام پر آئی جس کو جماعۃ الدعوۃ کے امیر پروفیسر حافظ سعید (حفظہ اللہ) نے تالیف کیا ہے۔

قسمت میں کیا قسام ازل نے
جس چیز کے جو شخص قابل نظر آیا

جونہی کتاب منظر عام پر آئی لوگوں نے دیوانہ وار اس کو خریدا' پڑھا اور پھر دوسرے لوگوں کو پڑھنے کے لیے تحفۃً دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے چند دن میں کتاب کے پندرہ ہزار نسخے کاؤنٹر پر ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گئے۔ دارالاندلس میں ایسے مخیر حضرات بھی آ رہے ہیں جو اپنے آرڈر بک کروا رہے ہیں کہ ایک ہزار کتاب ہمیں چھاپ کر دی جائے' ہم اسے عوام میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں۔ حافظ محمد سعید امریکی اشارے کے نتیجے میں حکومت کی طرف سے

نظر بندی کی قید میں ہیں جبکہ عوام کتاب پڑھ پڑھ کر ان کے لیے اجر و ثواب اور جلد رہائی کے لیے دعائیں کر رہے ہیں۔ یہ لوگوں کی جہاد اور مجاہدین کے ساتھ محبت کی دلیل ہے جو حکومت اور امریکہ کے لیے یقیناً تشویش کا باعث ہوگی۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ پرویز مشرف کی کتاب کا تو بتا دیا...... لیکن حافظ سعید کی کتاب کا نہیں بتایا تو میرے واجب الاحترام قارئین! صدر صاحب کی کتاب کے منظر عام پر آنے کے ساتھ ساتھ حافظ صاحب کی منصۂ شہود پر آنے والی کتاب کا نام ''تفسیر سورۂ توبہ'' ہے۔ یہ قرآن کی اس سورت کی تفسیر ہے کہ جس سے امریکیوں اور یورپینز کی جان جاتی ہے۔

یہ کتاب اس وقت ہمارے سامنے آئی ہے جب حکومت پاکستان نے محترم حافظ محمد سعید (حفظہ اللہ) کو امریکی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے قید و بند میں محبوس کر رکھا ہے۔ وہ مسلسل حکومت کی تحویل میں نظر بند ہیں' جیسا کہ آج کل ہر طرف جہاد کا ہی بول بالا ہے۔ امریکہ' برطانیہ' انڈیا اور اسرائیل خاص طور پر جہادیوں سے خوفزدہ ہیں۔ ان کو اپنی بقا کی فکر دامن گیر ہے۔ یہودیوں و صلیبیوں نے لمبی تحقیق و ریسرچ کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے کہ مسلمانوں میں یہ جہادی و قتالی جذبے قرآن حکیم کی وجہ سے ہیں۔ انہوں نے قرآن کو مسلمانوں کی زندگیوں سے خارج کرنے کی منصوبہ بندیاں کیں۔ پاکستانی حکومت کو بھی اپنی تشویش سے آگاہ کیا۔ انہوں نے امریکہ کو جواب دیا: آقا!...... آپ پریشان نہ ہوں' جیسے آپ کہیں گے ویسے ہی ہوگا۔ سورۂ توبہ پاکستان کے تعلیمی نصاب میں شامل تھی' یہ وہ سورت ہے جو مسلمانوں کے اندر جہاد و قتال اور حمیت و غیرت اور باطل طاقتوں' طاغوتوں اور اسلام دشمنوں سے ٹکرا جانے اور اللہ تعالیٰ کے دین کی سربلندی کے لیے کٹ مرنے کا جذبہ بھر دیتی ہے۔ مسلمان اس سورت کا مطالعہ کرنے کے بعد جہاد کے لیے مچلنے لگتا ہے اور جہادی و قتالی میدانوں کو ڈھونڈنے لگتا ہے۔ امریکہ کے بس میں یہ تو نہ تھا کہ وہ اس سورت کو قرآن سے ہی نکال سکتا' البتہ اس نے حکومت پاکستان کو حکم دیا کہ وہ سورۂ توبہ کو پاکستان کے نصاب تعلیم

سے نکال دے۔ ان ذہنی و جسمانی غلاموں نے فوری حکم کی تعمیل کی اور سورۂ توبہ کو مسلمان بچوں کے نصاب سے ہمیشہ کے لیے نکال دیا کہ نہ کوئی قرآن (کی سورۂ توبہ) پڑھے اور نہ ہی اسلام دشمنوں، کافروں، یہودیوں، ہندوؤں اور صلیبیوں کے لیے خطرہ کا باعث بنے، اور اوران کے عزائم کے آگے رکاوٹ بنے، نہ ہی فدائی دستے معرض وجود میں آئیں اور کافروں کی نیندیں حرام کرسکیں۔

یہ ان کی خام خیالی تھی، انہوں نے حکومت پاکستان کی مدد سے اسے نصاب تعلیم سے تو نکال دیا تھا لیکن قرآن سے تو نہیں نکال سکتے تھے۔ وہ مسلمانوں کے سینوں سے کیسے نکال سکتے ہیں۔ کروڑوں لوگوں نے اسے زبانی حفظ کر رکھا ہے۔ جب تک قرآن ہے اور اس میں یہ سورہ ہے، مسلمان اسے پڑھتے رہیں گے اور جہاد کی چنگاریاں سلگتی رہیں گی۔ ان شاء اللہ

حافظ محمد سعید (حفظہ اللہ) نے جب دیکھا کہ حکومت نے سورۂ توبہ کو نصاب سے نکال کر اس کو پھیلانے اور اس کی نشر واشاعت اور تعلیم و تبلیغ سے توبہ کر لی ہے تو انہوں نے پوری قوم میں اس سورت کی بیان کردہ تعلیمات کو پہنچانے کا بیڑا اٹھایا اور اس کے لیے سرگرم عمل ہوگئے۔ انہوں نے بڑے مجمع میں اس کی تفسیر بیان کرنی شروع کر دی۔ جناب عبیدالرحمن محمدی صاحب ترتیب و تسہیل کے بعد اسے ساتھ ساتھ قلم برداشتہ ہو کر کتابی شکل دیتے گئے، اور یوں یہ تکمیل کے مراحل کو پہنچ گئی۔ برطانیہ اور دنیا کے دوسرے کافر یہ چاہتے ہیں کہ مسلمان اس سورت کی تعلیمات سے دور رہیں، اس کو نہ پڑھیں جبکہ حافظ صاحب نے اس کے پیغام اور تفسیر کو عام کرنے کا عزم کر رکھا ہے، یہی جرم ہے ان کا کہ جس کی بنا پر ان کو قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑ رہی ہیں۔ قرآن اور جہاد کی خدمت کا یہ جرم وہ کرتے رہیں گے ان شاء اللہ۔

پچھلے دنوں جب چند گھنٹوں کے لیے رہا ہو کر آئے تو ہم نے پوچھا کہ حافظ صاحب آپ قید کے دوران کیا کرتے رہے؟ تو کہنے لگے: اللہ کا قرآن پڑھتا رہا۔ یہ بھی عجب حسن اتفاق ہے کہ جتنی مرتبہ بھی ان کو نظر بند کیا گیا وہ قرآن پر کسی نہ کسی نوعیت کا کام کرتے

رہے۔ جس چیز سے روکنے کے لیے کافران کو قید کرتے ہیں' وہ قید میں وہ کام پہلے سے بھی زیادہ تیز رفتاری سے کرتے ہیں۔ یہی خدمت قرآن اور خدمت جہاد ہی جرم ہے اس مرد مجاہد کا۔ اب جبکہ ان کو قید کر دیا گیا ہے تو وہ اس کام سے رکنے کی بجائے دوران قید قرآن کے ایک اور جز پر تحقیقی وتفسیری کام کر رہے ہیں۔

یہ بڑے کرم کے ہیں فیصلے
یہ بڑے نصیب کی بات ہے

امریکہ و برطانیہ کا ناک میں دم کرنے والی قرآن کی سورۂ توبہ کی تفسیر اب دارالاندلس کے سٹیج سے خوبصورت انداز میں شائع ہوکر منظر عام پر آ گئی ہے۔ اب جو چاہے اسے پڑھ کر اپنے دل و دماغ کو منور و روشن کرسکتا ہے اور یہ سمجھ سکتا ہے کہ آخر دنیا کے کافر اس سورت سے اتنے خائف کیوں ہیں؟ حکومت پاکستان کو رب کے حضور اپنے گناہوں سے توبہ کرنی چاہیے' نہ کہ کلام اللہ کی تعلیم وتبلیغ سے۔

یقیناً اس مرعوبیت کے دور میں سورۂ توبہ کی تفسیر کا منظر عام پر آنا عامۃ المسلمین کے لیے بہت خوشی کا باعث ہے۔ اسی طرح راقم کی مرتب کردہ سورۂ نور کی تفسیر جس کو حافظ محمد سعید حفظہ اللہ نے ارشاد کیا تھا' کو بھی دارالاندلس جلد منظر عام پر لا رہا ہے' جو خواتین اسلام کے لیے روشنی کا مینار ثابت ہوگی۔ ان شاء اللہ۔

محترم قارئین!...... ذرا سوچیے کہ امریکہ' یورپ اور اللہ کے دین کے دشمن چاہتے ہیں کہ اس سورت کو مسلمانوں کے دل و دماغ سے نکال دیں' اسی لیے انہوں نے نصاب سے خارج کروا دیا' تاکہ نئی نسل بھی اس سے لاعلم رہے۔ سوچیے ہمیں اس صورت حال میں کیا کردار ادا کرنا چاہیے۔ کیا ہمیں من حیث القوم اس کتاب کو ہر گھر' ہر دفتر' ہر لائبریری' ہر طالب علم' ہر پڑھے لکھے فرد تک پہنچانا چاہیے یا امریکہ کی خوشی اور رب کی ناراضی کو دعوت دینی چاہیے۔ ہم! اپنا فرض پہچانیں اور اس کتاب کو ہر فرد تک پہنچا کر اللہ سے اجر حاصل کریں اور اسلام کے دشمن کافروں کا ناطقہ بند کریں۔ اللہ ہمارا حامی و ناصر ہو۔ آمین

لوٹ آؤ

بدنصیب' نادان اور شیطان کا شکار انسان جب گناہ کرتا ہے تو دیکھنے والے دیکھتے ہیں' اس کے پاپ کی نشاندہی اور اسے نصیحت محض اس لئے نہیں کرتے کہ وہ اس کے شر سے خائف ہوتے ہیں' کہ کہیں اس کو سمجھانے سے لینے کے دینے نہ پڑ جائیں اور کہیں ہم اپنی بے عزتی ہی نہ کروا بیٹھیں' لہٰذا وہ خاموش رہتے ہیں' اگر ان میں سے کوئی جرأت کر کے محض اس بدنصیب کی خیرخواہی کے لیے اسے اس گناہ یا برے کام سے روکتا ہے' اسے وہ اس کا گناہ اور نقصان بتاتا ہے کہ جو اسے لاحق ہوسکتا ہے، تو وہ جواب میں اس گناہ کو نہایت ڈھٹائی اور بے حمیتی سے کرتا چلا جاتا ہے اور اس برائی کے جواز میں طرح طرح کے دور از حقیقت جواز پیش کرنے لگتا ہے۔ وہ مثالیں پیش کرتا ہے کہ دیکھو وہ فلاں جو بڑا حاجی' نمازی اور غازی بنا پھرتا ہے' یہ کام تو اس نے بھی فلاں موقعہ پر کیا تھا اور پھر وہ جو نہایت پرہیزگار اور صوفی بنا پھرتا ہے، اس کا بیٹا بھی تو ایسے کرتا ہے' اس کے بغیر آج کل گزارہ ہی نہیں۔ یعنی وہ یوں الٹی سیدھی مثالوں سے جواز فراہم کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ بھی جائز ہی کر رہا ہے' چنانچہ اس فعل سے باز نہیں آئے گا۔

لیکن جب سلیم الفطرت انسان کسی گناہ یا غلط کام کا ارتکاب کرتا ہے تو وہ یہ جان رہا ہوتا ہے کہ وہ غلط کر رہا ہے یا ظلم و زیادتی کر رہا ہے یا فسق و فجور کر رہا ہے' رسول اللہ ﷺ کے طریقے کی مخالفت کر رہا ہے اور اللہ کے فرامین سے بغاوت کر کے اس کے قہر و غضب کو دعوت دے رہا ہے۔ یوں وہ اپنی دنیا بھی تباہ اور آخرت بھی برباد کر رہا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ خواہشات کا غلبہ' گناہوں کی عارضی لذت' دنیا کی چکا چوند' جھوٹی اور کھوکھلی

عزت کا نشہ...... بناوٹی شان وشوکت...... معاشرے میں ناک نہ رہنے کا اندیشہ اور پگ' شملہ و دستار نیچی ہو جانے کا خدشہ...... اسے یہ سمجھتے ہوئے بھی کہ وہ گناہ کر رہا ہے، اس پر قائم و دائم رہنے پر مجبور کرتا ہے۔

☜ گناہوں کے ارتکاب کے وقت جب اس کے ضمیر پر ضرب لگتی ہے تو وہ یہ بہانہ کر کے اسے خاموش کرا دیتا ہے کہ ابھی بڑی عمر پڑی ہے' میں جلد ہی اس سے معافی مانگ لوں گا' عنقریب توبہ کر لوں گا۔ یہ ایک موہوم امید' ایک ناروا اور خام خیال' دل کو ایک دلاسا اور ایک بہکاوا اسے بے فکر کیے رکھتا ہے اور یوں وہ گناہوں کی دلدل میں دھنستا چلا جاتا ہے۔

☜ وہ گناہوں کے ارتکاب کے لئے دل کو یہ کہہ کہہ کر تسلیاں دیتا رہتا ہے کہ بس فلاں الجھن دور ہو جائے پھر میں نے یہ غلط کام چھوڑ دینا ہے۔ کاروبار میں آئی ہوئی فلاں رکاوٹ جونہی دور ہوگئی تو پھر ایسا ہرگز نہ کروں گا......

☜ یہ مقدمہ جیت جاؤں کہ جو عزت و بے عزتی اور انا کا مسئلہ بن چکا ہے بس پھر سکون ہی سکون ہے' پھر میں اللہ سے توبہ ہی میں وقت گزاروں گا، دوبارہ ایسا نہ کروں گا۔

☜ کبھی وہ سوچتا ہے کہ بس اس قدر رقم جمع کر لوں یا اس کا بندوبست ہو جائے تاکہ تمام قرضے اور لین دین کے جھنجٹ ختم ہو جائیں......

☜ یا یوں سوچتا ہے کہ کیا کروں بچیاں جوان ہو چکی ہیں' ان کے ہاتھ پیلے کرنے ہیں' ان کا جہیز تیار ہو جائے یا تمام بچوں کے نام کا جب تک ایک ایک پلاٹ نہیں بن جاتا' ایسا کرنا ناگزیر ہے' جونہی ایسا ہوگیا میں بالکل گوشہ نشین ہو جاؤں گا' اللہ اللہ کرتا رہوں گا اور توبہ کر لوں گا۔

☜ یا سوچتا ہے کہ بچے تعلیم حاصل کر لیں تو پھر اس لعنت سے چھٹکارا حاصل کر لوں گا۔ یہ رکاوٹ ختم ہو جائے یا فلاں ہدف حاصل ہو جائے یا یہ کہ یہ بیماری جس نے رات دن کا سکون برباد کر رکھا ہے یہ دور ہو جائے تو پھر ہمہ تن ہر وقت اللہ کو یاد کروں

گا اور اپنے موجودہ گناہوں کی معافی مانگ لوں گا۔

☜ ابھی بڑی عمر پڑی ہے۔ عمر کا طویل عرصہ ابھی میرے پاس ہے۔ ابھی میری عمر ہی کیا ہے؟ ابھی میں نے دنیا میں دیکھا ہی کیا ہے؟ ابھی بہت وقت پڑا ہے۔

اگر کوئی اللہ کا بندہ اس غلط روش اور طرز فکر وعمل کی نشاندہی کر کے سمجھائے تو انسان شیطان لعین کے دھوکے میں آ کر کہتا ہے کہ چھوڑو جی! ان کی کون سی بات ہے' یہ تو ہر وقت اللہ تعالیٰ سے ڈراتے ہی رہتے ہیں...... ان کو تو جی جہنم اور اللہ کی ناراضی وغضب کے علاوہ کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ اللہ تعالیٰ تو بہت غفور ورحیم اور نہایت ہی رحم کرنے والا ہے۔ ہمیں بس اس کی رحمت کا سہارا چاہئے۔ وہ معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے۔ اس کی رحمت بہت وسیع ہے۔ یہ جو ہمیں سمجھا رہے ہیں نا! یہ خود تو زندگی کے مزے لوٹ چکے ہیں' اب عاجز و بیکار ہو گئے ہیں تو ہمیں سمجھانے آ گئے ہیں۔ سو چوہے کھا کر بلی حج کو چلی ہے!! جب ان کی جوانی تھی' قوت تھی' اختیار تھا' مال و دولت تھا تو خوب زندگی کی رعنائیوں اور زیبائیوں کو لوٹا...... اور اب...... ناصح بن کر ہمیں سمجھانے آ گئے ہیں۔ یہ جوان جو ہمارے لئے ناصح بنا کھڑا ہے...... ہمیں وعظ کر رہا ہے ابھی سال پہلے ایسا تھا ویسا تھا' فلاں فلاں عیب تھا اس کے اندر' اب کہتا ہے: اب مجھے اللہ نے ہدایت دے دی ہے' وہ مجھے معاف کر دے...... تو اس سے کوئی یہ پوچھے کہ یہ پہلے اس زندگی پر چلا ہی کیوں تھا؟ جواب پلٹا ہے۔

اے میرے بھائی!...... ابھی بھی وقت ہے۔ زندگی کی سانسیں چل رہی ہیں...... اعضاء حرکت میں ہیں۔ گناہوں سے کنارہ کش ہو جاؤ...... برائیاں چھوڑ دو...... یہ الٹی سیدھی گمراہ کن دلیلیں ترک کر دو۔ معاصی کا ارتکاب بند کر دو...... اللہ جانے یہ زندگی کا سفر کس موڑ پر ختم ہو جائے...... چلتی چلتی گاڑی رک جائے...... متحرک گھڑی کی سوئیاں جامد و ساکت ہو جائیں...... ابھی وقت ہے توبہ کر لے' تو یہ ہی تیری نجات کا پروانہ ہے...... تیری اخروی کامیابی کی علامت اور ضمانت ہے۔

کہتے ہیں کہ ''مچھلی پتھر چاٹ کر واپس مڑتی ہے'' اے بھائی! تو بھی مچھلی کی طرح نہ

بن..... یاد رکھ! اگر موت کا پتھر چاٹ کر واپس پلٹے تو کیا پلٹے' ابھی سے پلٹ آیئے..... ان شیطانی بہکاووں اور دھوکوں میں نہ آئیں۔ اگر موت کے مہلک پتھر کو چاٹ کر ہی واپس پلٹے تو صرف ندامت' شرمندگی' ذلت و رسوائی اور ہمیشہ کی ناکامی و نامرادی ہی حصے میں آئے گی۔

بھلا تجھے گناہ چھوڑ کر اللہ ارحم الراحمین کی طرف واپس پلٹنے میں کون سی چیز مانع ہے؟.....

- کیا تو شرماتا ہے؟ اگر ایسا ہے تو اس خالق سے کیا شرمانا کہ جس نے تیرے وجود کو بنایا.....
- اگر تجھے توبہ کرنے میں چھوٹا پن محسوس ہوتا ہے تو یہ تکبر ہے۔ ذرا سوچ! اس کبریا کی کبریائی کے سامنے کیا تکبر؟ کیسا تکبر؟ اور کس کا تکبر معنی رکھتا ہے؟
- اگر اس سے توبہ کرنے میں سستی حائل ہے تو یہ اس کی ناشکری اور بے قدری ہے.....
- اگر توبہ کے لئے تیرے پاس آنسو نہیں ہیں..... آہ و زاریاں اور سسکیاں نہیں ہیں..... رقت اور وقت نہیں ہے..... تو یہ تو تیری بدنصیبی ہے' رب کی ناراضی کی نشانی ہے۔ ابھی اس کے دربار میں حاضر ہو اور معافی مانگ کہ اے اللہ! مجھے گناہوں سے پاک کر دے۔
- دیکھ' یاد رکھ!..... اگر تجھے اللہ کے حضور توبہ کرنے میں دولت رکاوٹ بنی ہوئی ہے تو ذرا اپنے اردگرد نظر دوڑا' تو یہ دیکھے گا کہ یہ ڈھلتا ہوا سایہ ہے' اڑتا ہوا پرندہ ہے' اس کا کوئی اعتبار نہیں' یہ ہمیشہ کسی کے پاس نہیں رہتی بلکہ مکین بدلتی رہتی ہے۔ آج کسی کے پاس' کل کسی اور کے پاس، بلکہ بعض اوقات جب اللہ کی رحمت کا سایہ اٹھ جاتا ہے تو یہ مشکلات اور ہلاکت کا باعث بھی بن جاتی ہے، لہٰذا اس پہ مان کر کے توبہ سے دور نہ ہو.....
- اگر جوانی مستانی نے تجھے توبہ سے غافل کر رکھا ہے..... تو دیکھ کہ کتنے ہی لوگ روزانہ درد دل' درد قولنج کتنے ہی گبھرو جوان کہ سر درد کے معمولی عارضے سے دیکھتے

ہی دیکھتے دم توڑ دیتے ہیں۔ کتنے ہی روزانہ موڑ کاٹتے ٹریفک حادثے کا شکار ہو کر خاک وخون میں لت پت ہو کر جوانی کی کہانی ادھوری چھوڑ کر چلتے بنتے ہیں......

- اگر برادری کے جھمیلوں نے تجھے توبہ سے دور کر رکھا ہے تو...... اس حقیقت کو ذہن نشین کر لے کہ یہ برادری تجھے رب کے عذاب سے چھڑا نہ سکے گی۔ یہ لوگ تو دنیا کی چھوٹی سی عدالت سیشن کورٹ کی پیشی میں بھی ساتھ چھوڑ جاتے ہیں اور بندہ تن تنہا بے یار و مددگار کھڑا رہ جاتا ہے۔ تیری یا تیرے کسی قریبی کی بیماری پر علاج معالجے کے وقت اگر پیسے لگانے پڑ جائیں تو اپنے پیارے کو موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا مرتا چھوڑ کر غائب ہو جاتے ہیں۔ اس وقت بھی ان کے رشتوں کا بھرم کھل جاتا ہے، دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جاتا ہے......
- اگر تجھے تیری پیاری اولاد' دلربا بیوی' دوستوں' عزیزوں نے توبہ سے کسی طرح بھی روک رکھا ہے تو انجان و نادان!...... ان پر مان اور بھروسا نہ کر' ان کی خاطر اپنے خالق و مالک رب، رحیم و کریم اور جبار و ستار مولا کو ناراض نہ کر' ان لوگوں نے تو تیری آنکھیں بند ہوتے ہی تیری قیمتی گھڑی وغیرہ کو بھی فوراً قبضے میں کرنا ہے۔ پلک جھپکنے میں تمہاری جیب سے نقدی نکالنی ہے' کپڑے اتار لینے ہیں اور تجھے خالی ہاتھ قبر کے اندر بند کر آنا ہے۔ واپس آتے ہی تیری چھوڑی ہوئی جائداد کی تقسیم پر گتھم گتھا ہو کر مرنے مارنے پر تیار ہو جانا ہے کہ یہ زمین میری، وہ تیری۔ یہ بڑی دکان میری وہ بنگلہ تمہارا۔

تیرے آنکھیں بند کرتے ہی انہوں نے تجھے بھول کر تیری میری کے چکروں میں پڑ جانا ہے۔ لہٰذا ان پر مان اور بھروسا نہ کر...... ابھی بھی وقت ہے' توبہ کی طرف بھاگ...... کہ توبہ کے دروازے ابھی کھلے ہیں۔ اپنے گناہوں کو مولا کریم کے' اپنے خالق و مالک کے سامنے رکھ دے اور گڑگڑا لے' رو لے' اس کو منا لے' توبہ میں ذرا بھی سستی و کاہلی کا مظاہرہ نہ کر' یاد رکھ! ایسا نہ ہو کہ زندگی کی گاڑی چلتی رہے...... سفر ہوتا رہے...... لیکن تو منزل کی جستجو

سے خالی، انجانی منزلوں کا راہی بن کر سفر کرتا رہے...... لیکن پھر بھی منزل تجھے نہ ملے۔

اس لئے تو ان کھوکھلے رشتوں کو خاطر میں نہ لا۔ زندگانی اور جیون کے اس سفر کے دوران وہ وقت آجائے کہ جب آنکھیں بند ہوجائیں...... سانسیں پلٹ جائیں...... ہاتھ اکڑ جائیں...... دل کی دھڑکنیں بے قابو ہوجائیں...... دماغ کی سوچیں کام کرنا بند کر دیں...... خون کی گردش جامد و ساکت ہوجائے...... بے ہوشیوں کے دورے شروع ہوجائیں...... قوت سماعت جواب دے دے...... رزق کے دانے پورے ہوجائیں...... زندگی کا وقت پورا ہوجائے...... اور پھر...... توبہ کے دروازے بند ہوجائیں' اور فرشتے نامہ اعمال کے رجسٹر بند کردیں' زخرہ بولنے لگے...... آنکھیں تاڑے لگ جائیں' روح جسم سے نکلنے لگے......

اب اگر...... تو باقی ماندہ پوری قوت جمع کر کے آواز نکالنے میں کامیاب ہو بھی گیا کہ:

اِنِّیْ تُبْتُ الْآنَ

''اب میں نے توبہ کی''

تو اس وقت اے بھائی! ...... یہ کہنا کچھ فائدہ نہ دے گا' اللہ کا فیصلہ آچکا ہوگا' زندگی کے لمحات ختم ہوچکے ہوں گے' اس وقت تیرا توبہ کرنا بے وقت کی راگنی ہوگی' اس وقت توبہ کی قبولیت کا وقت ختم ہوچکا ہوگا۔

لہٰذا ہم تجھے دعوت دیتے ہیں کہ مرنے سے قبل بلکہ آج ہی واپس پلٹ آؤ اور اپنے اللہ کے حضور گناہوں کی زندگی کو چھوڑنے' ترک کرنے اور خوش بختیوں اور سعادتوں بھری زندگی کا حصول چاہنے کی خاطر توبہ کے لیے ہاتھ اٹھا دو۔ یقیناً تیرے اٹھے ہوئے ہاتھوں کی اللہ لاج رکھ کر تجھے گناہوں سے پاک صاف کر کے تیری توبہ قبول کرلے گا اور گناہوں سے داغدار دامن کو پاک صاف کرنے کی توفیق بخش دے گا، لہٰذا اب بھی وقت ہے لوٹ آؤ، پلٹ آؤ...... توبہ کی طرف، رجوع الی اللہ کی طرف۔

مطبوعات دار الابلاغ

نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف کا نام	قیمت
(۱)	خطاؤں کا آئینہ	صالح عبدالعزیز آل شیخ	-/140 روپے
(۲)	دعائیں التجائیں (احادیث صحیحہ پر مشتمل مسنون دعائیں)	شیخ الحدیث مولانا محمد داؤد راز دہلوی	-/120 روپے
(۳)	میں نماز کیوں پڑھتا ہوں؟	عبدالرؤف الحناوی	-/36 روپے
(۴)	تحفہ برائے خواتین (خواتین کے مخصوص مسائل)	ڈاکٹر صالح بن فوزان	-/80 روپے
(۵)	محبتیں الفتیں (رسول اللہ ﷺ کا نظام تربیت)	سراج الدین احمد ندوی	-/120 روپے
(۶)	مجالس خواتین	محمد امین بن مرزا عالم	-/36 روپے
(۷)	دوست کیسے بنائیں؟	عبداللہ بن علی الجعیثن	-/40 روپے
(۸)	بچوں کی تربیت کیسے کریں؟	سراج الدین ندوی	-/140 روپے
(۹)	گناہوں کی نشانیاں اور ان کے نقصانات	امام ابن قیم الجوزیہ	-/40 روپے
(۱۰)	گناہ چھوڑنے کے انعامات	ابراہیم بن عبداللہ الحازمی	-/100 روپے
(۱۱)	سپنوں کا شہزادہ (ٹیلی فون کے غلط استعمال کے عبرت ناک نتائج)	محمد طاہر نقاش	-/120 روپے
(۱۲)	ابولہب کی یلغاریں	محمد طاہر نقاش	-/44 روپے
(۱۳)	جنت کی تلاش میں (جنت واجب کرنے والے اعمال)	عبداللہ بن علی الجعیثن	-/50 روپے
(۱۴)	اصلاح عقیدہ	فضیلۃ الشیخ محمد بن جمیل زینو	-/12 روپے
(۱۵)	بدعات سے دامن بچایئے	شاہ اسماعیل شہید	-/36 روپے
(۱۶)	ادائیں محبوب کی (رسول اللہ ﷺ کی دلآویز اداؤں کا منظر)	محمد بن جمیل زینو	-/80 روپے
(۱۷)	اپنے گھروں کو بربادی سے بچائیں	روبینہ نقاش	-/90 روپے
(۱۸)	اسلامی طرز زندگی	ڈاکٹر علی محمد ہاشمی	-/220 روپے
(۱۹)	اللہ کی تلوار	ابوزید شاطی	-/150 روپے
(۲۰)	حسن عقیدہ	مرتب: محمد طاہر نقاش	-/66 روپے
(۲۱)	عفت و عصمت کا تحفظ	ظفیر الدین ندوی	-/220 روپے
(۲۲)	حسن و جمال کا چاند	حافظ عبدالاعلیٰ	-/116 روپے
(۲۳)	حج توحید کے آئینہ میں	عبدالرزاق عبدالحسن	-/42 روپے
(۲۴)	جہنم میں لے جانے والی مجلسیں	عدنان طرشہ	-/100 روپے

دارالابلاغ
DARULIBLAGH
کتاب و سنت کی اشاعت کا مثالی ادارہ
پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز غزنی سٹریٹ بالمقابل رحمٰن مارکیٹ اردو بازار لاہور۔

سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

ایک دفعہ ترکستان کے گاؤں نخشب میں ایک انہونی، ایک اچنبھا اور ایک انوکھا چمتکار ہوگیا۔ آدھی رات کے وقت جب اصلی حقیقی چاند غائب تھا، پھر بھی سو مربع میل کے علاقے میں روشنی ہی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ نور کے سیلاب سے زمین جل تھل تھی۔ کیوں؟ جب چاند نہیں نکلا تھا تو پھر یہ اتنے وسیع رقبہ یعنی 100 مربع میل کو رنگ و روشنی کے سیلاب میں کس نے نہلا دیا تھا...... جی ہاں...... ایک چاند نے ہی ایسا کیا تھا...... مگر یہ مصنوعی اور نقلی چاند تھا۔ جسے حکم بن ہاشم ایک مسلمان سائنسدان نے بنایا تھا۔ یہ چاند بہت بڑا تھا۔ جو سارا دن ایک بہت بڑے کنویں کے اندر چھپا رہتا۔ جونہی سورج غروب ہوتا یہ آٹو میٹک اپنے کنویں سے برآمد ہوجاتا۔ جیسے جیسے رات گہری ہوتی جاتی یہ آسمان کی طرف بلند ہوتا جاتا۔ یہ باقاعدگی سے بلاناغہ 100 مربع میل علاقہ کو رات بھر منور کرتا اور طلوع آفتاب سے پہلے ڈوب جایا کرتا تھا۔ مسلمان سائنسدان کی اس ایجاد کا کمال یہ تھا کہ کوئی موسم بھی ہو جونہی سورج کا آخری حصہ پنہاں ہوتا تو چاند نکل آتا، آدھی رات کو وہ عین سر پر آجاتا۔ اور پھر رفتہ رفتہ اسی رفتار سے واپس اپنے کنویں کی طرف جاتا۔ جونہی اس کا آخری کنارہ کنویں میں غائب ہوتا تو سورج نکل آتا۔ سورج نے کبھی اس کا سامنا نہیں ہوا تھا۔

دنیا والوں کو اس سائنس دان نے یہ حیرتناک ایجاد کرکے ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ لوگ آج تک نہیں سمجھ سکے کہ اس چاند میں اس قدر روشنی کہاں سے آئی تھی، کنویں میں اس کو ٹھیک درست زاویے پر بروقت کون سی طاقت و کشش کھینچ کر لے جاتی تھی۔ اس کو کیسے پتا

چلتا تھا کہ اب سورج نکل آیا ہے لہٰذا اس کے آنے سے پہلے میں اپنے گھر کنویں کے اندر چھپ جاؤں۔ آج تک دنیا اس کی نظیر لانے سے تو قاصر ہے ہی لیکن اس کی ٹیکنالوجی سمجھنے سے بھی عاجز و لاچار ہے۔ یہ تو صدیاں پرانی بات ہے لیکن اللہ کریم نے عصر حاضر میں بھی امت مسلمہ کو ایک ایسا انمول انسان بخشا، کہ جس کے سائنسی کارناموں سے یہود و ہنود اور صلیبی درندے تھر تھر کانپنے لگے۔ ماضی قریب میں ایک ایسا وقت آیا جب پاکستان کا ازلی دشمن ہندوستان اپنی تباہ کن ٹیکنالوجی اور ہتھیاروں سے ہمیں نیست و نابود کرنا چاہتا تھا۔ اس نے سازشی یلغار کر کے پاکستان کے دو ٹکڑے کر دیئے، اس کے بعد یہودی اس کے ساتھ مل کر پاکستان کی کہوٹہ کی ایٹمی تنصیبات کو تباہ کرنے کے لئے مشقیں کرنے لگے، روس اپنے آہنی کیل کانٹے لیکر پاکستان پر حملہ آور ہونے کیلئے گوادر کی طرف بڑھا، ہمارے حکمران مکار ہندو بنیے سے اس قدر پریشان تھے کہ وہ خود امن کے لئے عدم جارحیت کے معاہدے اور فارمولے پیش کر رہے تھے جبکہ ہندو بنیا اپنی طاقت کے نشے میں مست تھا، اور اس پر ہماری درخواستوں کے باوجود کان پر جوں تک نہ رینگتی تھی۔

ایسے حالات میں جب ساری دنیا کے کافر مسلمانوں کے اور خاص طور پر پاکستان کے دشمن بن کر، صفیں باندھ کر اس پر ٹوٹ پڑنے اور تکا بوٹی کر چھوڑنے کے لئے کمر بستہ ہو رہے تھے...... اللہ کریم نے اپنا ایک عاجز بندہ ہمارا مددگار بنا کر بھیجا۔ یہ فقیر و درویش بندہ ایک سائنسدان تھا۔ یہ کمر کس کر پاکستان کے دفاع کے لئے دن رات محنت میں ڈٹ گیا۔ چند سال کی محنت شاقہ کے بعد اس نے ایسا ایٹم بم بنا ڈالا کہ اتنا طاقتور ایٹم بم آج تک عالم کفر کے جگوں کے وہم و گماں میں بھی نہ آیا تھا، یعنی اب پاکستان دنیا کے سب سے طاقتور ترین ایٹم بم کا مالک تھا۔ دنیا کو اپنے بم کا تجربہ کرنے کے لئے کبھی ریگستانوں اور کبھی سمندروں کا رخ کرنا پڑا۔ کسی نے پہاڑوں میں تجربہ کیا تو دھماکے کی طاقت اور شدت سے بڑے بڑے پتھر ٹوٹ کر دور دور جا گرے...... لیکن جب پاکستان نے اس درویش صفت

انسان محسن پاکستان کی نگرانی میں ایٹمی دھماکہ کیا تو پہاڑ کا پہاڑ خاموشی سے آٹا بن کر رہ گیا...... یہ پاکستان کے ایٹم کی طاقت تھی جس نے دنیا کو حیران کر کے رکھ دیا۔

اس درویش صفت، نیک دل، محبّ وطن محسن پاکستان کے پاکستانیوں پر بلکہ امت مسلمہ پر بہت سے احسانات ہیں۔ اس نے ہمیشہ اپنی ذات پر اسلام پاکستان اور امت مسلمہ کو ترجیح دی ہے۔ یہ نابغہ روزگاز اور تاریخ کے اوراق پر ہمیشہ جگمگانے والی شخصیت ہیں ڈاکٹر عبدالقدیر خان۔

ہم وہ دن کبھی نہیں بھول سکتے جب پاکستان کا ایٹمی میزائل غوری لانچ ہونا تھا۔ سوئے اتفاق کہ اسی دن ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔ کونسی والدہ؟...... وہی والدہ کہ جو ہر انسان کے لئے سایہ رحمت اور آغوش شفقت ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو اپنی والدہ سے نہایت پیار تھا۔ وہ جب والدہ کے پاس جاتے تو گود میں سر رکھ کر لیٹ جاتے۔ والدہ پیار محبت لاڈ اور شفقت کی برکھا برساتی، بیٹے کے بالوں میں اپنے بوڑھے ہاتھوں کی کنگھی کرتی تو ڈاکٹر صاحب والدہ کی گود میں سر رکھے ایک معصوم بچے کی طرح مطمئن اور پرسکون ہوکر سو جاتے۔

آج کراچی سے اسی عظیم ہستی کے ہمیشہ کے لئے بچھڑ جانے کی روح فرسا خبر آئی۔ بتایا گیا کہ اس عظیم ہستی کو قبر میں اتارنے اور جنازہ پڑھانے کیلئے آپ کا انتظار کیا جارہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا: ظہر تک میت کو رکھیں میں غوری لانچ کر کے آؤں گا۔ ظہر تک میزائل لانچ نہ ہوسکا تو اس عظیم انسان نے دوبارہ فون کر کے کہا کہ میری شفیق والدہ کی میت کو ابھی جنازہ کیلئے تیار نہ کریں میں عصر تک آجاؤں گا۔ عصر کا وقت بھی ہوگیا بھائیوں نے فون کیا ڈاکٹر صاحب آپ پہنچے نہیں۔ دنیا انتظار کر رہی ہے، جنازہ پڑھانا صرف آپ کی وجہ سے رکا ہوا ہے۔ آیئے اور اپنی شفیق و کریم ہستی کا آخری دیدار کر لیجیے۔ ڈاکٹر صاحب کا دل رو رہا تھا کہ اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر مجھے اس مقام تک پہنچانے والی عظیم ہستی آج کتنی مجبور،

بے بس اور محتاج ہے میں ہوں کہ ان کے جنازے میں بھی بروقت پہنچا نہیں جا رہا۔ دل کے دلسوز درد کے باعث بہنے والے آنسو ڈاکٹر صاحب کے ارادوں کو متزلزل نہ کر سکے۔ انہوں نے کہا میری ماں کی میت کو احترام سے رکھیں میں ان شاء اللہ مغرب تک پہنچ جاؤں گا۔ لیکن یہ کیا والدہ کی میت رکھی ہے...... سب رو رہے ہیں...... جنازہ کیلئے...... والدہ کو قبر میں اتارنے کے لئے...... سب منتظر ہیں ڈاکٹر صاحب کے...... لیکن ایک فنی مسئلہ کی وجہ سے میزائل مغرب تک بھی لانچ نہ ہو سکا...... ماں کی شفقت، محبت، مدھر دھنوں، لوریوں، دعاؤں کو یاد کر کے خون کے آنسو رونے والا ڈاکٹر عبدالقدیر فون کرتا ہے اور دنیا والوں کیلئے ایک انمٹ مثال قائم کرتے ہوئے بھائیوں سے کہتا ہے: میرے بھائیو اور بہنو! مجھے معاف کرنا، میں امی جان کے جنازہ میں شریک نہ ہو سکوں گا، پاکستان کا وقار اور مفاد مجھے اپنی جان اور امی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے...... اس لئے میں جنازہ میں شرکت کیلئے نہیں آ سکتا...... آپ والدہ کو دفنا دیں۔

لہٰذا ڈاکٹر صاحب کی شرکت، دیدار اور کندھا دیئے بغیر ہی والدہ کو دفنا دیا گیا...... ڈاکٹر صاحب پاکستان کے غوری میزائل کی کامیاب لانچنگ کے بعد والدہ کی قبر پر گئے تو اپنی اس محرومی اور والدہ کی یاد پر ننھے بچوں کی طرح بلک بلک کر روتے رہے۔

پوری دنیا کے صلیبی و یہودی ڈاکٹر صاحب کی جان کے دشمن بن گئے۔ صدر ضیاء نے ڈاکٹر صاحب کی حفاظت اور قدر دانی کا حق اس طرح ادا کیا کہ جب فیصل مسجد اسلام آباد کے عقب سے ڈاکٹر صاحب خان ریسرچ لیبارٹری کے لئے روانہ ہوتے تو پچاس گاڑیاں آپ کے آگے پیچھے ہوتیں۔ ہر ایک میں ایک ڈاکٹر عبدالقدیر بیٹھا نظر آتا۔ کسی کو علم نہ ہوتا کہ اصل ڈاکٹر کون سا ہے سوائے ڈاکٹر عبدالقدیر کے۔ حتیٰ کہ ہر گاڑی چلانے والے، حفاظتی گارڈز اور سکیورٹی والوں کو بھی علم نہ ہوتا تھا کہ اصل عبدالقدیر کون ہے، یوں 50 گاڑیوں کا قافلہ چلتا اس دوران اگر اس سڑک پر ایک لمحے کے لئے بھی ٹریفک رکتی تو آناً فاناً چوڑے

چکلے سینوں والے گھبرو فوجی جوان نکلتے اور متعلقہ گاڑی یا شخص کو اٹھا کر غائب کر دیتے۔ ڈاکٹر صاحب کے لیبارٹری تک سفر کے دوران حفاظتی انتظامات اس قدر سخت ہوتے کہ چڑی بھی پر نہ مار سکتی تھی۔

پاکستان کا ایک ناقابل تسخیر ایٹمی قوت بن جانا اور ڈاکٹر صاحب کا اس میں بنیادی کردار ادا کرنا عالم کفر خاص طور پر یہودیوں صلیبیوں اور ہندوؤں کی نیندیں حرام کر گیا۔ انہوں نے ڈاکٹر صاحب کو عالمی مجرم بنا کر سزا دینے کیلئے پاکستان سے طلب کرنا شروع کر دیا کہ ڈاکٹر صاحب کو ہمارے حوالے کیا جائے۔ ادھر ہمارے حکمرانوں نے ذہنی اور جسمانی غلاموں نے بہادر جرات مند مسلمان ہونے کا ثبوت دینے کے بجائے دم ہلانا شروع کر دیا۔ انہوں نے یورپ سے بھی پہلے امت مسلمہ کے اس محسن کو گرفتار کر لیا۔ ان پر ذہنی تشدد کیا، ان کو قید تنہائی میں رکھ کر ٹارچر کیا گیا، اور ٹی وی کے پردہ سکرین پر انکو گرفتار کر کے زبردستی لایا گیا...... اور انہیں پاکستان کو ایٹمی قوت بنانے کے عظیم الشان کارنامے کے انجام دینے کو ہی ان کا جرم بنا کر اس پر ساری دنیا کے سامنے بزور قوت معافی منگوائی گئی۔ یوں امت مسلمہ کا ہیرو، محسن...... ایک مجرم کے روپ میں دنیا کے سامنے پیش کیا جا رہا تھا...... صرف اس لئے کہ امریکا و یورپ والے ہم سے خوش ہو جائیں اور ہماری حکومت کی کرسی پکی ہو جائے......

شاید اس جفا کار قوم کے نزدیک محسنوں کے ساتھ ایسا ہی ''شاندار'' سلوک کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب کو ان کے مکان کے اردگرد کے درجنوں مکان خالی کروا کر ایک مکان میں تن تنہا قید کر دیا گیا۔ اس دوران اس مکان سے کچھ فاصلے سے صبح صبح چھوٹے چھوٹے بچے گزرتے تو ڈاکٹر صاحب انکو ہاتھ ہلا کر سلام کرتے اور ان کا محبتوں بھرا اشارتاً جواب پا کر خوش ہوتے، حکمرانوں کو یہ بھی گوارا نہ ہوا انہوں نے ڈاکٹر صاحب کی بالکونی کے آگے دیوار نما پردہ بنا دیا۔ اب نہ وہ باہر دیکھ سکتے تھے نہ بچوں کو سلام کا جواب دے کر خوش ہو سکتے تھے ظالموں کو ڈاکٹر صاحب کی یہ خوشی برداشت نہ ہوئی۔

اب وہ اس قید خانے میں ہر وقت تن تنہا قید بھی رہتے۔ ان کا دل تڑپتا کہ اپنی بیٹیوں کو، نواسوں کو ننھے بچوں کو ایک دفعہ ہی دیکھ لیں، ان سے باتیں کر لیں، پھر شاید زندگی کی شام ہو جائے...... وہ اپنے اوپر متعین کیے گئے فوجیوں کی منتیں ترلے اور درخواستیں کرتے کہ مجھے اپنی بیٹی سے ننھے منے نواسوں سے ملوا دیا جائے...... لیکن وہ تو اوپر سے حکم کے غلام تھے...... یوں ڈاکٹر صاحب محرومیوں اور ذلتوں کی زندگی کے اسیر ہو کر بیمار ہوتے چلے گئے...... ایک دفعہ جب مشاہد حسین سید، شجاعت حسین اور ایس ایم ظفر نے ان سے ملاقات کی تو ڈاکٹر صاحب نے رونے کے سے انداز میں رندھی ہوئی آواز میں کہنے لگے کہ: بہتر تو یہ ہے آپ مجھے گولی مار دیں، میں آپ کا مجرم جو ہوں، یا میں آپ لوگوں کا قیدی ہوں، کم از کم مجھے قیدی کے حقوق تو دیئے جائیں، عرصہ گزر گیا کہ میں نے اپنی بیٹیوں کی شکل بھی نہیں دیکھی۔

جی ہاں۔

یہ ہے قوم کا ہیرو، قوم کا محسن بلکہ امت مسلمہ کا محسن...... جسے عرصہ چار سال سے ہمارے حکمرانوں نے قید کر کے رکھا ہوا ہے۔ اسے سزا دے رہے ہیں۔ اس جرم کی کہ اس نے اللہ کی رحمت سے پاکستان کو ایٹمی قوت بنایا ہے...... کیوں ہو رہا ہے ایسا...... یہ تو ہیرو کے ساتھ ظلم و زیادتی ہے اور ہماری بے حمیتی و بے غیرتی ہے...... کیا کریں ہمارے حکمرانوں کو امریکا و یورپ کی طرف سے آرڈر ہی یہی ہے۔ پچھلے دنوں امریکی وزیر ریان سی کروکر نے کہا کہ اب پاکستان کی مائیں ڈاکٹر عبدالقدیر جیسا بیٹا جنم نہ دے سکیں گی، اسے شاید علم نہیں کہ موسیٰ تو فرعون کی آغوش میں بھی جنم لیتے رہے ہیں۔ یہ تو پاکستان ہے امت مسلمہ کا قلعہ...... اس کی ماؤں کی گودیں، بنجر نہیں ہوگئیں۔ وہ ہمیشہ اسامہ، ڈاکٹر عبدالقدیر، جنرل حمید گل، جنرل اختر عبدالرحمٰن اور حافظ سعید جیسے سپوتوں کو جنم دیتی رہیں گی جو کفر کی نیندیں حرام کیے رکھیں گے۔ ان شاء اللہ۔ اس وقت محسن پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو حکومت پاکستان نے ان کی خدمات پر خراج تحسین پیش کرنے کی بجائے قید کر رکھا ہے۔ ان کو ایک مجرم کی

طرح ذہنی اذیتیں دی جارہی ہیں۔ ان کا نام ونشان مٹانے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔ وہ طرح طرح کی بیماریوں کا شکار ہوگئے ہیں وہ انتہائی کمزور و لاغر ہوچکے ہیں، چلنے پھرنے سے قاصر ہیں۔ صرف بیڈ تک محدود ہوکر رہ گئے ہیں۔

- جسم کا آدھا خون شریانوں میں جم چکا ہے، باقی کو بچانے کی کوششیں جاری ہیں۔
- مثانے میں کینسر ہوچکا ہے۔
- کانوں سے پیپ بہہ رہی ہے۔
- دانتوں میں شدید درد ہے اور مسوڑھے سوزش زدہ ہوچکے ہیں۔
- بائیں ٹانگ سوج (سوزش زدہ ہو) کر ایک انچ تک جسم سے موٹی ہوچکی ہے۔
- دل و دماغ کی شریانیں کسی وقت بھی بند ہوسکتی ہیں۔
- پاؤں سوزش زدہ ہوکر موٹے ہوگئے ہیں۔
- مسلسل بخار آنے لگا ہے۔
- بلڈ پریشر کا عارضہ بھی لاحق ہوگیا ہے۔
- بیہوشی کے دورے پڑتے رہتے ہیں...... وغیرہ وغیرہ۔

جی ہاں ...... یہ ہیں محسن پاکستان...... یہ ہیں ہمارے ہیرو...... یہ قدر کی ہے ہم نے اپنے ہیرو کی...... ایسے لوگ دنیا میں کبھی بلند مقام پاسکتے ہیں جو اپنے محسنوں کا شکریہ ادا کرنے کی بجائے اس کی جان کے دشمن بن جائیں...... اس کی عزت و احترام کا جنازہ نکال دیں...... ہرگز نہیں...... ایسے بدنصیب لوگوں کے مقدر میں ہمیشہ رسوائی جگ ہنسائی، مسکنت اور ذلت وتحقیر اور غلامی ہی آتی ہے۔

اے میری قوم!...... تمہیں یہ سن کر یقیناً دکھ ہوگا کہ تمہارا مسیحا، تمہارا محسن تم سے ناراض ہوچکا ہے، مایوس ہوچکا ہے، اسے تم سے اس قدر بے وفائی کی توقع ہرگز نہ تھی۔ گزشتہ دنوں ڈاکٹر صاحب ایک شعر لکھ کر بھیجا ہے کہ یہ شعر میری قبر پر کندہ کرکے آویزاں کردیا جائے۔

وہ شعر میں آپ کو بھی سنا دیتا ہوں آپ اندازہ لگائیں کہ ہم نے من حیث القوم ان کا کس قدر دل دکھایا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ شعر لکھنے کیلئے بھیجا:

گزر تو خیر گئی عبدالقدیر حیات تیری
ستم ظریف! مگر کوفیوں میں گزار دی

واقعی ہم نے ان کے ساتھ کوفیوں والا سلوک کیا ہے اور کوفیوں کے متعلق مشہور ہے کہ الکوفی لا یوفی ....کوفی کبھی وفا نہیں کرتے۔

اے محسن پاکستان! ہم شرمندہ ہیں..... ہم سب آپ کے دکھ میں برابر کے شریک ہیں..... ہمارے دل آپ کے ساتھ دھڑ کتے ہیں ہم آپ کے سانحے پر خون کے آنسو روتے ہیں، آپ نے اب تک نہایت خندہ پیشانی اور جانفشانی سے عالم کفر کے واروں کا اور پھر بیماری کا ڈٹ کر مردانہ وار مقابلہ کیا ہے۔ آپ پریشان نہ ہوں، پوری قوم وملت آپ کے ساتھ ہے۔ ملت اسلامیہ اتنا بھی برداشت نہیں کرسکتی کہ آپ کو آنچ بھی آئے..... یا ایک کانٹا بھی چبھے۔ آپ حوصلے جوان رکھیں عنقریب منظر بدلنے والے ہیں..... خوشخبریاں آنے والی ہیں..... پھر وہی کامیابیوں کامرانیوں اور ترقیوں کے پھریروں والے دن لوٹنے والے ہیں۔

آپ دل چھوٹا ہرگز نہ کریں..... بلکہ اگر دل پارہ پارہ ہوں تو کفر کے، جو چاغی میں آپ کی تخلیق ایٹم بم سے ریزہ ریزہ ہوجانیوالے گرینائیٹ کے پہاڑ کی طرح ریزہ ریزہ ہو ہی چکے ہیں۔ چاغی میں ایٹمی دھماکے کا منظر جب میری آنکھوں کے سامنے گھومتا ہے تو اقبال کا یہ شعر یاد آجاتا ہے کہ:

دو نیم ان کی ٹھوکر سے دریا و صحرا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

ڈاکٹر صاحب کی تخلیق ایٹم بم سے اسلام دشمنوں کے دل دہشت سے پھٹ چکے ہیں اب سہارا اور ہمارے حکمرانوں کا فرض ہے کہ وہ دبنے کی بجائے جرأت مندی کا مظاہرہ کریں۔ اللہ تعالیٰ ان کو دنیا میں سربلند ومعزز اور دولتوں سے مالا مال کردے گا۔ ان شاء اللہ

سچے موتیوں کی مالا

چند سال قبل بھائی سیف اللہ خالد مدیر دارالاندلس اور ان کے والد مرحوم کے ساتھ سعودیہ کا ایک سفر کرنے کا موقع ملا۔ یہ سفر بہت سی خوشگوار یادوں کا باعث بنا۔ اسی سفر میں ایک روز میں اور سیف اللہ بھائی جدہ میں دارالسلام کے ہیڈ آفس کے سامنے واقع بہت بڑے اسلامی کتب کے شوروم میں بھائی عبدالصمد کی وساطت سے پہنچ گئے۔ اتنا بڑا شوروم دیکھ کر ہم حیرت کے سمندر میں غوطے کھا رہے تھے، اور سوچ رہے تھے کہ دور دور تک پھیلے ہوئے شوروم کا کونسا حصہ دیکھیں اور کونسا چھوڑیں۔ ہم نے محسوس کیا کہ اگر اسلامک بکس کا شعبہ ہی سرسری نظر سے دیکھ لیں تو بڑی بات ہے۔

اب ہم اسلام کے متعلق تحقیقی کتب پر طائرانہ نظر ڈالتے آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ اگر ہم ہر کتاب کا تفصیلی جائزہ لیتے یا پڑھتے تو پھر ہمیں یہ کتب دیکھنے میں کئی دن لگ جاتے۔ اسی دوران ہماری نظر ایک اخوانی عالم کی سیرت النبی ﷺ پر لکھی گئی ایک کتاب پر پڑی۔ ہم نے اٹھا کر دیکھا تو اس کے ٹائٹل پر فقرہ جلی حروف میں لکھا تھا کہ ''صحیح احادیث کی روشنی میں سیرت النبی ﷺ'' یہ دعویٰ ہم نے زندگی میں پہلی دفعہ دیکھا تھا کہ کسی نے کہا ہو کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی سیرت ضعیف روایات کو ترک کر کے صرف صحیح احادیث کی روشنی میں لکھی ہے۔ ہم بڑے متعجب ہوئے۔ یہ دعویٰ ہمارے علم کے مطابق آج تک پہلے کسی نے نہ کیا تھا۔

ہم جب پاکستان آئے تو اس بات کا اور اپنے جذبات کا اظہار اپنے محترم بھائی مولانا

امیر حمزہ صاحب چیف ایڈیٹر ہفت روزہ غزوہ سے کیا۔ وہ یہ سن کر سوچ میں پڑ گئے۔ ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ بھی اپنے ذہن کے نہاں خانوں میں اس نہج پر صحیح سیرت النبی ﷺ کے سکیچ کا تانا بانا بننے میں مصروف ہیں۔ وہ چونکہ ادیب بھی ہیں اور خطیب بھی، ان کو ایک شاعر کی طرح کہ جس کو ایک طرح مصرع مل جائے تو وہ پوری غزل لکھ دیتا ہے، بالکل ایسے ہی ایک آئیڈیا مل گیا تھا۔ ان کے دل مضطرب میں یہ خواہش انگڑائیاں لینے لگی کہ کیوں نہ میں بھی آقائے دو جہان کی سیرت پر قلم اٹھاؤں، اسی دوران جب یورپ میں سرکار دو عالم، شاہ امم، سلطان مدینہ، سرور قلب وسینہ جناب محمد ﷺ کی ذات پر مضحکہ خیز کارٹون اور خاکے شائع کر کے توہین کرتے ہوئے آپ کی ناموس پر حملہ کیا گیا تو یورپ کی اس گستاخانہ حرکت اور جرأت سے پورے عالم اسلام میں غیرت وحمیت کی آگ بھڑک اٹھی۔ ہر کلمہ گو تڑپ کر رہ گیا۔ رسول ہاشمی ﷺ کی عصمت وعزت کا تحفظ اور آپ کی توہین مسئلہ ہی ایسا ہے کہ کمزور سے کمزور ایمان والا بھی اپنی جان قربان کر دینا یا پھر کچھ کر گزرنا اپنے لئے باعث سعادت سمجھتا ہے۔

اس موقع پر مجھے ایک واقعہ یاد آرہا ہے آپ بھی پڑھ لیں اور رسول ہاشمی ﷺ کے ساتھ ہر مسلمان کی والہانہ محبت کے بیکراں سمندر کا اندازہ لگائیں۔ ہندوستان میں ایک مشہور و معروف شاعر تھے، ان کی خوبی یہ تھی کہ وہ اپنے مقابلے میں کسی دوسرے شاعر یا شخصیت کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ ایک دفعہ یہ شاعر صاحب نشے میں دھت تھے شراب کی بوتل ہاتھ میں تھی اور خوب جھوم رہے تھے۔ اتنے میں کچھ کمیونسٹ حضرات ان کے پاس پہنچ گئے۔ جب دیکھا کہ خوب پی کر حواس کھو چکے ہیں تو ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور پھر ان شاعر صاحب سے یوں سوال کرنے لگے: حضور! میر تقی میر کے بارے میں کیا خیال ہے؟ وہ نشے میں جھوم کر کہنے لگے: چھوڑو اسکو وہ کوئی شاعر ہے، نہ قافیے کا پتہ نہ ردیف کا، جو منہ میں آئی کہہ دی۔ جگر مراد آبادی کیسا شاعر ہے؟...... بھئی گزارا ہے، اکبر

الہ آبادی کیسا فنکار ہے...... وہ کیا جانے شاعری کو! شاعری کرنی نہیں آتی شاعری کرنے لگے، شاعری کو سمجھ کر گھاس گدھے چرنے لگے۔ حضور، مومن خاں مومن کا بہت شہرہ ہے...... بھئی مولوی بن گیا ہے بس۔ مولوی کا کام وعظ ونصیحت کرنا ہوتا ہے...... غالب کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس پر یہ جذبات کے عالم میں بولے: بھئی! ہم غالب کو کیا سمجھتے ہیں غالب ہوگا تو اپنے گھر میں، ہمارا مقابلہ وہ کیسے کرسکتا ہے، بس مشہور ہو گیا ہے، اور ہم، نہ تو کسی غالب سے کم ہیں اور نہ اس کو خاطر میں لاتے ہیں۔ جب ان کمیونسٹوں نے لوہا گرم دیکھا اور دیکھا کہ شراب خوب دماغ کو چڑھ گئی ہے تو اپنے اصل مقصد کی طرف آتے ہوئے کہنے لگے: حضور! مسلمان جن کو اپنا نبی مانتے ہیں وہ بھی بہت قادر الکلام تھے، ان کے بارے میں حضور کی کیا رائے ہے؟...... یہ سنتے ہی جیسے شاعر پر بم گر پڑا ہو...... سارا نشہ یکدم اتر گیا...... غصے سے سرخ آنکھیں کھول کر ان کو قہر بھری نظروں سے گھورا...... شدت جذبات اور غصے سے ہاتھ میں شراب کی پکڑی بوتل کانپنے لگی...... اور پھر یکدم انکا ہاتھ بجلی کی طرح حرکت میں آیا...... بوتل فضاء میں لہرائی اور سیدھی سامنے بیٹھے کمیونسٹ کے سر پر آ رہی، اب اس کمیونٹ کا سر فالودہ بن چکا تھا...... خون تیزی سے بہہ رہا تھا، کمیونسٹ لہولہان ہوکر زمین پر گر چکا تھا۔ اور اس شاعر نے غیرت وحمیت بھرے جذبات میں بوتل ایک طرف پھینک کر چکنا چور کر دی اور کہنے لگا: بدبختو!...... تم اس ہستی کے متعلق میری رائے پوچھ رہے ہو جسکا کلمہ پڑھ کر میں مسلمان ہوا ہوں، میں کون ہوتا ہوں ان کی ذات گرامی قدر کے متعلق رائے زنی کرنے والا، تمہیں یہ جرأت اور گستاخی کرنے کی ہمت کیسے ہوئی؟ ان سے محبت تو ہمارے ایمان کا حصہ ہے، تم سمجھتے ہو گے کہ میں شراب کے نشے میں کوئی الٹی سیدھی بات کہہ جاؤں گا، جان لو ایک مسلمان ہوش میں ہو یا مدہوش وہ آقائے نامدار ﷺ کی شان میں گستاخی کبھی برداشت نہیں کرسکتا خواہ اپنی جان ہی دینی پڑے۔ ہاں تو میں بتا رہا تھا کہ کوئی کتنا ہی کمزور مسلمان ہو وہ محبوب کائنات ﷺ کی شان میں گستاخی پر اپنے ردعمل کا اظہار

ضرور کرتا ہے۔ جیسے غازی علم دین شہید رحمہ اللہ نے دھرمپال کو واصل جہنم کر کے کیا اور مولانا ثناء اللہ امرتسری نے گستاخان رسول کا ہمیشہ کیلئے ناطقہ بند کرنے کیلئے ''رنگیلا رسول'' کا جواب ''مقدس رسول ﷺ'' لکھ کر کیا۔

صحیح احادیث کی روشنی میں سیرت النبی ﷺ پر قلم آرائی کی خواہش مولانا امیر حمزہ صاحب کے دل میں پہلے ہی مچل رہی تھی اوپر سے یورپ کی رسول اللہ ﷺ کی شان میں کارٹونوں کے ذریعے گستاخی نے اس جذبے پر جلتی پر تیل کا کام کر کے اسے اور مہمیز دی، تو آپ نے پاکستان میں ''تحریکِ حرمتِ رسول'' کی قیادت کر کے مسلمانوں کو جگایا اور عالم کفر کو اپنے ردعمل کی صورت میں دندان شکن جواب دیا۔ اس کے بعد آپ کا قلم بھی حرکت میں آ گیا۔ آپ پیارے نبی ﷺ کی پیاری سیرت کو مکمل تحقیق و تفتیش کے بعد رقم کرنے لگے۔

دوران تصنیف محترم مولانا حمزہ صاحب نہایت مسرت و محبت و خوشی سے مجھے آگاہ کرتے رہے کہ اب میں آقا کی سیرت کے فلاں گوشے کو سپرد قلم کر رہا ہوں، اب آپ کی ہجرت کی منظر کشی کر رہا ہوں، اب فتح مکہ اور دنیا کے بادشاہوں کو اسلام قبول کرنے کے لئے آپ کے بھیجے گئے دعوت ناموں کو اردو کے قالب میں ڈھال رہا ہوں۔ سیرت پر ان کی مہکی مہکی باتیں سن کر میرے اندرونی جذبات صرف اس طرح ہوتے تھے، کہ سیرت پر قلم اٹھانا ہر ایک کے بس کی بات نہیں بلکہ:

یہ بڑے کرم کے ہیں فیصلے
یہ بڑے نصیب کی بات ہے

اللہ کریم کی رحمت و عطا سے اہل علم اور ہی یہ سب ممکن ہے جسے شاعر نے یوں الفاظ کا جامہ پہنایا ہے:

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

قارئین! دنیا میں ہمیشہ سے اہل دل کی مرتے دم تک یہ خواہش رہتی ہے کہ وہ خاص طور

پر دو موضوعات پر لکھ کر اپنی آخرت کا بہترین سامان جمع کر لیں۔ ① قرآن کریم پر۔ ② سیرت النبی ﷺ۔

چند دن پہلے ملک کے مشہور و معروف ادیب مداح صحابہ رضی اللہ عنہم اور جناب مولانا امیر حمزہ صاحب کے استاد محترم مولانا ابو ضیاء محمود احمد غضنفر حفظہ اللہ کہ جو فالج کے حملہ کی وجہ سے علیل ہیں، فرما رہے تھے: طاہر بھائی! زندگی کا کوئی پتا نہیں کتنے دن وفا کرے اور کب ساتھ چھوڑ جائے، میری خواہش ہے کہ قرآن پر کام کر جاؤں اور اپنی آخرت کا توشہ وافر جمع کر لوں۔ اللہ ان کی خواہش پوری کرے آمین۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس موضوع پر بے شمار لوگوں نے طبع آزمائی کی ہے لیکن مقبولیت بہت کم لوگوں کے حصہ میں آئی ہے۔

مجھے یاد ہے میں نے ایک دفعہ آقائے نامدار ﷺ کی سیرت طیبہ پر لکھی گئی مشہور عالم کتاب قاضی سلیمان منصور پوری رحمہ اللہ کی تالیف ''رحمۃ اللعالمین ﷺ'' پر غزوہ میں ہی تبصرہ کیا تھا، جسے برادرم محمد سرور عاصم نے مکتبہ اسلامیہ کے پلیٹ فارم سے شائع کیا تھا۔ میں نے تبصرہ میں مرحوم مولانا ضیاء الرحمن فاروقی رحمہ اللہ سے تبادلہ معلومات کے نتیجے میں لکھ دیا کہ دنیا میں اب تک سیرت النبی ﷺ پر سینکڑوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں لیکن رحمۃ اللعالمین کی طرح مقبولیت صرف چند ایک کو نصیب ہوئی۔ پھر مجھے محسوس ہوا کہ فاروقی صاحب کی فراہم کردہ معلومات کی بنا پر لکھا گیا یہ فقرہ کہیں مبالغہ پر ہی مبنی نہ ہو۔ چونکہ ہم غزوہ میں ہر ایسی بات سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں کہ جو کسی بھی پہلو سے مبالغہ کی طرف جاتی ہو۔ میں نے تسلی کیلئے مکتبہ کتاب سرائے کے مدیر جمال الدین افغانی بھائی سے محقق دوراں مولانا عبدالجبار شاکر صاحب کا موبائل نمبر لیکر دریافت کیا کہ حضرت! میں سیرت النبی ﷺ کی ایک کتاب کے تبصرہ کے ضمن میں یہ لکھ بیٹھا ہوں کہ ''سیرت النبی ﷺ پر اب تک کئی سو کتابیں لکھی جا چکی ہیں'' کہیں یہ مبالغہ تو نہیں!؟ فرمانے لگے: طاہر نقاش بیٹا! کیا کرتے ہیں! آقائے دو جہاں کی سیرت پر بہت لوگوں نے لکھا ہے اور تاریخ کے اوراق میں ان نام

ہمیشہ کیلئے ثبت اور روشن ہوگیا۔ آپ نے مبالغہ پر مبنی فقرہ نہیں لکھا بلکہ بہت کم لکھا ہے، اس لئے کہ آقائے دو جہاں، محبوب کائنات سرکار دو عالم، شاہ امم ﷺ کی سیرت طیبہ پر پانچ ہزار کتب تو میری اپنی لائبریری (بیت الحکمت نزد منصورہ) لاہور میں موجود ہیں، باقی دنیا میں موجود دیگر کتب کا شمار نہیں...... یہ سن کر مجھے تسلی ہوگئی۔

جس نے بھی سیرت پر لکھا اگر چہ اسے مقبولیت نہ مل سکی لیکن اس کی شخصیت اور کتاب محفوظ ہوگئی۔ ایک دن مولانا محترم حمزہ صاحب نے بتایا کہ طاہر بھائی! آقائے دو جہاں کی سیرت طیبہ پر میری کتاب مکمل ہوگئی ہے۔ مجھے بہت خوشی ہوئی اور دل سے دعا نکلی کہ اللہ آپ کی اس کاوش کو قبولیت کا درجہ بخشے۔ آخرت میں اسے ذریعہ نجات بنائے اور محبوب کائنات کی شفاعت کا حقدار بنائے آمین۔

اس کے بعد دارالاندلس کی قابل جفاکش اور محنتی ریسرچ ٹیم نے دن رات ایک کر کے اسے رمضان المبارک ۲۰۰۷ء میں ایک خوبصورت عنوان ''سیرت النبی ﷺ کے سچے موتی'' سے عوام کے سامنے پیش کر دیا۔ بندہ نے بھی جب دیکھا تو دل خوش ہوگیا کہ یہ اس آئیڈیا کی عملی شکل تھی جو ہم نے جدہ میں دیکھا تھا۔ اس میں محبت بھرے قلم کے ساتھ آقائے دو جہاں کی محبت میں ڈوب کر لکھا گیا تھا۔

اس کتاب کی خوبیاں تو بہت ہیں جو قاری کو پڑھنے پر معلوم ہوں گی۔ میں صرف دو کا تذکرہ یہاں کروں گا ایک تو یہ کہ یہ پڑھنے والے کے دل میں آقا علیہ السلام کی محبت میں فراوانی کا باعث بنتی ہے۔ دوسرا یہ کہ پڑھنے والا مطمئن ہوکر پڑھتا ہے کہ وہ جو کچھ پڑھ رہا ہے وہ روایت و درایت کے اصولوں کے مطابق تحقیق کی چھانٹی سے چھانا ہوا صحیح و معتبر تذکرہ پڑھ رہا ہے۔ اس کے دل میں یہ کھٹکا نہیں رہتا کہ کہیں یہ بات یا یہ روایت ضعیف ہی نہ ہو۔ اس لئے کہ ہمارے ہاں فضائل اعمال اور مناقب کے باب میں ضعیف روایات کو لانا معیوب نہیں بلکہ محبوب سمجھا جاتا ہے۔ مگر مولانا امیر حمزہ کی کتاب کو قاری بلا دھڑک پڑھ کر اس پر

عمل کرسکتا ہے۔ ہر بات کا حوالہ تخریج کی شکل میں ہر صفحہ پر موجود ہے جو علماء و محققین کیلئے یقیناً مددگار اور عام قارئین کیلئے تسلی و تشفی اور اعتماد کا باعث ہوگا۔ میری معلومات کے مطابق دنیا میں سیرت النبی ﷺ پر لکھی جانیوالی کتابوں میں یہ واحد کتاب ہے جو صحیح روایات کی روشنی میں لکھی گئی ہے۔ جس میں کوئی ضعیف روایت نہیں کہ جو کسی کیلئے تشکیک و تردد کا باعث بن سکے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ کتاب میں آقا ﷺ کے ان خطوط کا فوٹو بھی دیا گیا ہے جو آپ نے دنیا کے مختلف بادشاہوں کو اسلام قبول کرنے کی دعوت کے سلسلے میں لکھے۔ مبنی بینی اور دلآویز خوشبو پر مبنی پھول اور کلیوں کو چن چن کر ترتیب دے کر مہکتا ہوا گلدستہ پیش کردیا گیا ہے، اب یہ کتاب ہر گھر کیلئے سرکار دو عالم ﷺ کی سیرت کے ایسے سچے انمول موتی ہیں کہ جن سے روشنی و نور کی کرنیں ہر وقت پھوٹتی رہتی ہیں اور جہالت و گمراہی اور کفر و شرک کے اندھیروں کو دور کرنے کا باعث بنتی ہیں، گھر کے ہر فرد خاص طور پر نوجوان نسل کے لیے اس کا مطالعہ کرنا ان کے لئے زندگی کے نئے گوشے روشن کردے گا ہر گھر اور خاندان کو چاہئے کہ وہ اپنے گھر کی فضاؤں کو ان سچے موتیوں کی روشنی سے روشنائے، اسکی مہک سے مہکائے...... بلکہ ہر فرد سچے موتیوں کی اس مالا کو اپنا نصیب بنائے اور آقائے دو جہاں ﷺ کی سیرت طیبہ کی ضوفشانیوں میں چلتا ہوا جنتوں میں جانے کا سامان کرے......اللہ تعالیٰ آقا علیہ السلام کی معیت میں حوض کوثر سے شیریں جام نصیب فرمائے۔ آمین۔

دنیا میں اس کتاب کی مقبولیت کا یہ عالم ہے لوگوں کی ڈیمانڈ پوری نہیں ہورہی اور اردو بازار کے تاجروں کا مجھ سے گلہ ہے کہ دارالاندلس والے ہمیں کتاب مہیا نہیں کر رہے، ان کو کیسے بتائیں کہ کتاب آنے سے پہلے ہی نکل جاتی ہے ان کو کیسے ملے! اللہ کرے آخرت میں بھی یہ کتاب ایسے ہی مقبول ہوکر توشہ آخرت ثابت ہو۔ آمین!

دیدارِ محبوب

اپنے محبوب کی صرف ایک جھلک دیکھنے کیلئے آخر ہم اپنے شہر سے سفر کرتے کرتے اسلام آباد پہنچ ہی گئے۔ فیصل مسجد پہنچ کر میرے ہمراہ دونوں ساتھی منزل مقصود یعنی کاشانہ محبوب کی طرف جانے کی بجائے فیصل مسجد کی سیر کرنے پر زور دینے لگے اور جس مقصد کی خاطر ہم یہاں پہنچے تھے اس سے گریزاں و پس و پیش کرتے نظر آنے لگے۔ میں نے ان کا یہ رویہ دیکھ کر بلند آواز میں قسم اٹھائی کہ اللہ کی قسم! میں فیصل مسجد کی طرف فی الحال ایک قدم بھی نہ اٹھاؤں گا اس لئے کہ میں اس کی اس سے قبل کئی دفعہ سیر کر چکا ہوں۔ میں ہر صورت میں اپنے محبوب کے کوچہ کی طرف جا رہا ہوں، تم نے ساتھ دینا ہے دو، نہیں دینا نہ دو۔ وہ کہنے لگے: طاہر بھائی! سمجھنے کی کوشش کریں جس علاقہ میں آپ کے محبوب کا بسیرا ہے وہاں جانا جان جوکھوں میں ڈالنا ہے، جان کو خطرہ ہی خطرہ ہے۔ میں نے کہا کہ کوئی پرواہ نہیں میں تمام باتیں سوچ کر گھر سے چلا تھا، یہی ہوگا کہ ہمارا وجود اس دھرتی سے غائب کر دیا جائے گا، ہمیں منظور ہے۔ اب میرے ساتھیوں میں سے ہی ایک مجھ سے متاثر ہو کر پکار اٹھا: میری جان کیا چیز ہے اگر میرے خاندان کو بھی ذبح کر دیا جائے میں طاہر بھائی کے محبوب کا دیدار کئے بغیر نہ جاؤں گا۔ یوں تیسرے ساتھی کو بھی ماننا پڑا۔

اب ہم نے اپنے بچاؤ اور حفاظت کی رب کریم سے دعائیں کیں اور آتش عشق میں بے خطر کود پڑنے کیلئے اس خطرناک جنگل کی طرف چل پڑے...... جہاں میرے دل کی دھڑکن بسیرا کئے ہوئے تھی۔ مارگلہ اسلام آباد کے دامن میں فیصل مسجد کے عقب سیکٹر 7 میں واقع یہ

جنگل سینکڑوں مسلح کمانڈوز سے بھرا پڑا ہے۔ چلتے چلتے ہم جنگل میں محبوب کے کاشانہ اور خلوت کدہ کے سامنے سے گزرنے والی سڑک پر پہنچ ہی گئے۔ جونہی ہم نے اس شاہراہ پر قدم رکھا ہمارے تمام حواس وحسیات بیدار ہو گئے۔ یہاں سڑک کے دونوں جانب واقع و ایستادہ درختوں و دیگر مقامات پر حساس خفیہ طاقتور کیمرے فٹ ہیں، جو ہر آنے جانے والے کی ذرا ذرا سی حرکت نوٹ کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ ہر درخت کے عام روش سے ہٹ کر ہلنے والے پتوں کی حرکت کو بھی نوٹ کرتے ہیں۔ ہماری آوازیں اور حرکات و سکنات خفیہ کیمروں کی مدد سے نوٹ کی جارہی ہیں۔ ہمیں اس کا علم تھا۔

یہاں بالکل خاموش رہ کر سفر کرنے سے بھی مشکوک افراد کے زمرے میں آنے کا خدشہ تھا۔ لہٰذا ہم آہستہ آہستہ چلتے چلتے درمیانی آواز میں پاکستان کے دیگر خوبصورت مقامات کا تقابل اسلام آباد سے کرتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ سڑک کے دونوں جانب ظاہر و پوشیدہ ایجنسیوں کے مسلح کمانڈو انجان بنے کھڑے تھے لیکن غیر محسوس انداز میں ہمارا جائزہ لے رہے تھے۔ اس موقع پر ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے سارا جنگل اور ہل سائیڈ روڈ بھی شرم و ندامت کے احساس سے غمزدہ ہو کر خاموش جھکے ہوئے ہیں۔ کسی وقت بھی یہ خدشہ تھا کہ کوئی گاڑی اچانک ہمارے پاس آ کر رکے اور بغیر پوچھے ہمیں دبوچ کر اس میں ڈالا جائے، اور پھر کسی نامعلوم مقام پر پہنچا دیا جائے اور پھر ہمارا نام بھی نامعلوم مطلوبہ افراد کی لسٹ میں شامل ہو کر قصہ پارینہ بن جائے۔

انسان کوئی بڑا جرم کرتے ہوئے بھی اتنا خوف محسوس نہیں کرے جتنا ہم یہاں سے گزرتے ہوئے محسوس کر رہے تھے۔ چند قدم ہی چلے تھے کہ سامنے نوگو ایریا (No Go Aria) یعنی ''ادھر مت جائیں'' کا بورڈ آویزاں نظر آیا۔ لیکن ہم اپنی دھن میں ہلکی ہلکی باتیں کرتے اسے کراس کر گئے۔ اب تھوڑا ہی آگے ایک اور اعلان لکھا نظر آ رہا تھا جس کے مطابق خبردار کیا گیا تھا کہ ''یہاں کوئی بھی تصویر مت بنائے'' ہم اسے بھی کراس کر گئے......

ہمارے تعاقب میں دو سادہ کپڑوں میں ملبوس خفیہ ایجنسی کے جوان چل رہے تھے۔ جو مسلسل ہمارے پیچھے ہی پیچھے تھے، آگے نہ جا رہے تھے۔ ہم دل ہی دل میں اپنے پروردگار کو پکار رہے تھے کہ اے مالک کائنات ان کی دستبرد سے بچانا۔ اب ہمیں جدید مہلک اسلحہ سے لیس مسلح اہلکاروں کے بوٹوں کی چاپ سنائی دینے لگی۔ ہمارے گائیڈ نے چلنے سے پہلے مجھے بتا دیا تھا کہ طاہر صاحب! آپ کا محبوب چونکہ بظاہر بہت بڑی طاقت کی قید میں ہے اور خفیہ کیمرے ہماری ایک ایک حرکت کی منٹ منٹ کی نگرانی کر رہے ہیں، اس لئے جب آپ کے محبوب کا گھر آئے گا تو میں محبوب کا نام تو نہ لے سکوں گا، کیونکہ یہاں ایسا کرنا بھی کسی ناگہانی افتاد کے نازل ہونے کا پیش خیمہ ثابت ہوسکتا ہے، لیکن جونہی آپ کے محبوب کے گھر کی حدود شروع ہوں گی تو میں ''بہاولپور'' کا لفظ بولوں گا۔ سمجھ لینا کہ کوچہ محبوب کی حدود کا آغاز ہوگیا۔

ہم اس کے لبوں سے ''بہاولپور'' کا لفظ سننے کے بے تابانہ انتظار میں اس کی بے ربط باتوں کو ناگوار سنتے چلے جا رہے تھے کہ اب ہمارے سامنے سپیڈ بریکر آ گیا، جس کے اوپر سرخ رنگ (خطرے کے الارم) کی بڑی بڑی پٹیاں پینٹ کی ہوئی تھیں۔ جونہی ہم نے اس سپیڈ بریکر کو کراس کیا ہمارے گائیڈ کے منہ سے لفظ ''بہاولپور'' اچھل پڑا۔ اور پھر وہ بہاولپور کے محاسن بیان کرنے لگا...... اب کیا تھا...... مقام یار آن پہنچا تھا...... دیدار کے لمحات سر پر تھے...... کسی بھی لمحے ہماری نظریں محبوب کے رخ زیبا پر پڑ سکتی تھیں، رونگٹے کھڑے ہو گئے...... حسیات بیدار...... دل تیزی سے دھڑکنے لگا...... دماغ کے پردہ سکرین پر اس حسین منظر کو دل کے نہاں خانوں میں محفوظ کرنے کے لئے مکمل تیاری کے اشارات ہونے لگے...... آنکھیں بے تاب و بے قرار ہیں...... ایسے لگ رہا تھا کہ جیسے ہم عالم خواب و خیال میں چل رہے ہوں...... اسی اثنا میں ایک تیز رفتار کار ہمارے پاس سے گزری، در محبوب کے سامنے پہنچتے ہی کار میں بیٹھے دیوانے نے کسی کو سلیوٹ کیا اور پھر تیز رفتاری سے کار بھگاتا ہوا

یہ جادہ جا...... ہمارا گائیڈ پکار اٹھا...... کار والے کا سلیوٹ کرنا بتا رہا ہے کہ محبوب کا دیدار ہونے ہی والا ہے...... خاموشی، مدہوشی اور محویت کے عالم میں ہم نے چند گز کا فاصلہ طے کیا ہی تھا کہ گائیڈ وارفتگی کے عالم میں مگر سرگوشی کے انداز میں بولا: دائیں طرف سامنے دیکھو...... کاشانہ محبوب کا گیٹ آ چکا ہے...... جونہی ہم نے دائیں دیکھا، اُف اللہ!...... یہ کیا!! یقین نہیں آ رہا...... ایسے لگا جیسے چند لمحات کیلئے تمام نظارے ساکت و جامد ہو گئے ہوں...... جیسے حس و حرکت اور لمس کا سفر ختم ہو گیا ہو...... جیسے ادراک و شعور اور ہوش و حواس کے دھارے رک گئے ہوں...... بصارتوں کے زیر و بیم کام کرنا چھوڑ گئے ہوں...... میرے سامنے 25 فٹ کے فاصلے پر میرا محبوب کھڑا تھا...... وہ مجھے دیکھ کر مسکرا رہا تھا، اور پھر اس کا ہاتھ اٹھا اور اس نے مجھے اشارے سے السلام علیکم کہا...... جواباً میکانکی انداز میں میرا ہاتھ بھی اٹھا...... ماتھے تک گیا اور اسے سلام محبت...... سلام عقیدت...... سلام الفت و چاہت پیش کیا، آنکھیں پتھرا چکی تھیں اور یقین نہیں آ رہا تھا کہ میرے سامنے میرا ہی محبوب نہیں بلکہ تمام پاکستانیوں کا اور عالم اسلام کا محبوب، محسن پاکستان امید عالم اسلام...... ڈاکٹر عبدالقدیر خان...... ہاں ہاں اللہ کی رحمت سے پاکستان کو ایٹمی قوت بنانے والا ڈاکٹر عبدالقدیر خان کھڑا ہاتھ ہلاتے ہوئے مسکرا رہا تھا...... کہ امریکہ، برطانیہ، اسرائیل اور ہندوستان اور اسلام دشمن کافروں کے دل جس کی دہشت سے دہل رہے ہیں۔

دل کی دھڑکنیں تھیں کہ قابو میں نہ آ رہی تھیں...... آنکھیں ساکت و خاموش اس نظارے میں جم کر رہ گئی تھیں، میرا محبوب حکومت کی حراست و قید میں کس قدر کسمپرسی بے کسی و بے بسی کی حالت میں...... بیمار و لاغر اور کمزور ناتواں نظر آ رہا تھا...... مغموم و محزون تھا...... اداس و پریشان تھا...... ہم نے اس کو دیا ہی کیا تھا، وفا کی جگہ جفا، عزت و احترام کی جگہ بے قدری و ذلت، دنیا کو آزادیوں کے نغمے سنانے والا خود بند پنجرے کا قیدی تھا، لیکن یہ کیا، اس کے باوجود بھی مسکرا رہا تھا اور خوشی سے ہمیں ہاتھ ہلا کر ہماری محبتوں کا جواب دے رہا تھا، ہم پر

اپنی چاہتوں کی برکھا برسا رہا تھا، بے اختیار دل نے پکارا:

چاروں طرف سے کانٹوں میں گھیرا گیا ہے پھول
پھر بھی کھلا ہوا ہے، عجب خوش مزاج ہے

اپنے محبوب ومحسن کو چاروں طرف سے کمانڈوز کے زیر حراست دیکھ کر دل تڑپ اٹھا، اور چیخا: اے محبوب! ہم تجھے کیا پیش کریں!!؟ وفا پیش کریں یا جفا پیش کریں!! دولت، ہیرے جواہرات کے ڈھیر پیش کریں، ملکوں کی بادشاہی، اپنی جانوں کی قربانیاں، دلفگاریاں، جانثاریاں، دلداریاں، کیا پیش کریں؟ نہیں! نہیں ہم تجھے کچھ بھی تو نہیں پیش کر سکتے، ہم بے بس و مجبور ہیں، کفار ہنود و یہود اور صلیبیوں کے غلاموں کے ستائے ہوئے ہیں، ہم تجھے کچھ بھی نہیں پیش کر سکتے، ہاں! ایک چیز...... اپنی خالص محبت کے پھولوں کا، ایک گلدستہ پیش کر سکتے ہیں، اس کے ساتھ ہی میری آنکھوں کے ساغر چھلک پڑے، رم جھم رم جھم آنسوؤں کی بارش برسنے کو تیار، لیکن میں نے کمال ضبط سے آنسوؤں کو پلکوں کے حصار سے آزاد نہیں ہونے دیا، انہیں پی گیا، بقول شاعر

یہ پلکوں کے کنارے جو ہم نے بھگوئے نہیں
کہیں یہ نہ سمجھنا کہ ہم روئے نہیں......!

میں ساکت و جامد بت بنا اپنے محبوب دلگیر کو دیکھتا چلا جا رہا تھا، ٹک ٹک دیدم لب نہ کشیدم...... اپنے آپ اور گردوپیش سے بے خبر مسحور و مسرور کھڑا، ساعتوں کے زیر و بم سے محروم ہو کر بصارتوں کے شربت دیدار سے سیر ہو رہا تھا، اتنے میں میرے گائیڈ نے میرے پہلو میں ایک ہلکی سی ضرب لگائی اور دھیرے سے سرگوشی کی: طاہر نقاش! ہوش میں آؤ، آگے بڑھو، کوئی نیا مسئلہ نہ کھڑا کر لینا، سب الرٹ ہو کر ہماری طرف دیکھ رہے ہیں، اور ساتھ ہی میرا بازو پکڑ کر کھینچتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ میں بھی بے خودی، مدہوشی اور بیگانگی کے عالم میں اس کے ساتھ آگے چل پڑا، گو محبوب کا چہرہ آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تھا لیکن دل کے

جھروکوں میں ایستادہ وفروکش تھا۔

ہم محسن پاکستان کے گھر سے تیسرے بنگلے کے سامنے پہنچے تو ایک نیم برہنہ گوری کو اپنے پالتو کتے کے ساتھ نہایت تکبر وغرور اور نخوت ونخرے کے ساتھ سڑک پر ٹہلتے اور خراماں خراماں چہل قدمی کرتے ہوئے پایا۔ تو دل چیخ اٹھا: یا ربا! یہ کیسا دیس ہے جہاں یہ انسان نما حیوان اور یہ پلید کتے تو آزادیوں کے مزے لوٹ رہے ہیں جبکہ میرا محبوب، محسن پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خان قید تنہائی میں زندگی کے آخری ایام نہایت اذیت وتکلیف اور درد کے عالم میں گزار رہا ہے، بقول سعدی

کتے کھلے ہوئے ہیں
اور پتھر بندھے ہوئے ہیں

تعاقب کرنے والے ہمارا تعاقب کر رہے تھے جبکہ ہمارے قدم اب آگے ہی آگے بڑھتے جا رہے تھے، اس لئے کہ مقصد ''دیدار محبوب'' پورا ہو چکا تھا، محبوب کے گھر سے تھوڑے فاصلے پر ایک مسجد جامع فریدیہ نظر آئی، پتا چلا کہ ڈاکٹر صاحب کو اس مسجد اور اس کے قریب بچوں کے مدرسہ میں نماز کیلئے بھی جانے کی اجازت نہیں، حالانکہ اس مدرسہ کی تعمیر میں ان کا بنیادی کردار اور تعاون شامل ہے۔ یہ سن کر میری آنکھوں کے سامنے وہ منظر گھوم گیا جب محسن پاکستان سعودیہ گئے تو وہاں کے فرمانرواؤں نے قدر دانی کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کے وزن کے برابر اپنے ملک کی کرنسی کے بڑے نوٹ تول دیئے یعنی ڈاکٹر صاحب کو اعلیٰ کرنسی میں تول کر محبت کا اظہار کرتے ہوئے یہ تمام کرنسی تحفہ کے طور پر ڈاکٹر صاحب کی نذر کر دی۔ ڈاکٹر صاحب آبدیدہ ہو گئے، کہنے لگے: میں نے اس دولت کا کیا کرنا، میری ایک خواہش ہے اگر پوری کر دی جائے، پوچھا گیا: کون سی خواہش ہے؟ کہنے لگے: اس میرے برابر تولی جانے والی دولت کو امام کائنات محبوب کائنات محمد رسول اللہ ﷺ کی مسجد، مسجد نبوی میں لگا دیا جائے اور میری طرف سے مسجد نبوی کا ایک حصہ تعمیر کر دیا جائے لہٰذا ایسا

ہی کیا گیا۔ سبحان اللہ اللہ اکبر۔

اپنے محبوب کی یادوں کی مہلک میں بسے ہوئے ہم یہاں سے مزید آگے جنگل کے اندر ہی اندر چل پڑے حتیٰ کہ ہم سیاچن روڈ پر پہنچ گئے۔ یہاں پہنچے تو ایک اور نظارہ منتظر تھا۔ ایک پک اپ میں دو بوڑھے پٹھان بابا اور چھوٹے چھوٹے بچے اور خواتین برقع میں بیٹھی تھیں۔ آرمی والے ان بابوں کو اپنی حراست میں لے کر صرف ایک ہی سوال بار بار حیرانگی کے عالم میں کرتے جا رہے تھے کہ بابا! آپ یہاں تک پہنچ کیسے گئے...... ہمیں سمجھ نہیں آ رہی کہ آپ کس طرح یہاں تک پہنچ گئے!!؟ ان کا مطلب تھا کہ اس ایریا میں تو چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی آپ کیسے آ گئے وہ بھی پک اپ سمیت، حالانکہ یہ روڈ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی رہائش گاہ سے کافی دور ہے اور ہے بھی دوسری سڑک پر۔ ڈاکٹر صاحب کے گھر کی طرف آنے والے ڈائریکٹ راستہ کو چوک کے درمیان رکاوٹیں کھڑی کر کے مسدود و محدود اور بند کر دیا گیا تھا۔

ہم نے جب یہ منظر دیکھا تو فوری وہاں سے آگے چل پڑے کہ کہیں ہم سے بھی پوچھ تاش نہ شروع ہو جائے۔ سکیورٹی اور ٹریفک والوں کا دھیان ویسے بھی دوسری طرف لگا ہوا تھا اس لئے کہ ابھی یہاں سے کوئی وی آئی پی شخصیت گزرنے والی تھی۔ لہٰذا ہم نے اس کو غنیمت جانا اور چلتے چلاتے، بچتے بچاتے اسلام آباد کو آباد کرنے والے اور بنانے والے صدر ایوب خان کی کوٹھی کے سامنے پہنچ گئے۔ اب ہم بہت تھک گئے تھے اور ہمارا تعاقب بھی ختم ہو چکا تھا لہٰذا ہم نے ٹیکسی پکڑی اور مسحور کن محبوب کی یادوں کے جلو میں اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

واپسی کا سفر جاری تھا لیکن گاڑی کے پہیے کے گھومنے کے ساتھ ساتھ میرا دماغ بھی تیزی سے سوچ بچار کر رہا تھا۔ یہ وہ محبوب پاکستان، محسن پاکستان اور محبوب عالم اسلام ہے کہ جس نے اپنے وطن کیلئے اپنا تن من، دھن نچھاور کر دیا، وہ اقوام عالم میں پاکستانی ترقی

کے خواب دیکھتے رہے تھے اور اسے اوج ثریا پر لے جانا چاہتے تھے وہ چاہتے تھے کہ میرا وطن دنیا کا سب سے طاقتور، ترقی یافتہ اور تعلیم یافتہ ہو، اسی لئے انہوں نے پاکستان کی ترقی کیلئے مندرجہ ذیل تین نکاتی ایجنڈے پر کام شروع کیا:

① ناقابل تسخیر پاکستان کا قیام

② تعلیم یافتہ پاکستان

③ ترقی یافتہ پاکستان (صنعت اور ٹیکنالوجی کے اعتبار سے)

اپنے اس منصوبے پر وہ تیزی سے عمل کر رہے تھے۔ پاکستان کی خوشحالی و ترقی کیلئے 18`18 گھنٹے مسلسل کام کرتے۔ پاکستان کو ایٹمی قوت بنا کر وہ ناقابل تسخیر تو بنا چکے تھے ان شاءاللہ۔ اب وہ دوسرے مرحلے تعلیم یافتہ پاکستان پر کام کر رہے تھے، اس مقصد کیلئے انہوں نے کتنے ہی جدید سکول اور کالج قائم بھی کر دیئے اور باقی تعلیمی اداروں کے قیام کیلئے رات دن سرگرداں تھے کہ امریکہ و یورپ کو ان کا یہ پروگرام ایک آنکھ نہ بھایا لہٰذا امریکیوں کے کہنے پر ہمارے حکمرانوں نے نمک حلالی کا ثبوت دیتے ہوئے ان کو گرفتار کیا اور جیل میں ڈال دیا۔ اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے تک کام کر کے اپنے آپ کو مصروف رکھنے والے انسان کو قید تنہائی اور تفتیش کے نام پر ذہنی اذیت کے عذاب میں پھینک دیا گیا ہے۔ آج ان کو سورج دیکھنا بھی نصیب نہیں ہوتا صرف 20 یا 25 منٹ کیلئے اپنے مکان کی بالکونی میں بیٹھنے کی اجازت ہے۔ اس محسن کی 6 عیدیں قید تنہائی نظر بندی اور سزا بھگتتے گزر گئیں مجرموں جیسی تفتیش میں گزر گئیں، میں سوچ رہا تھا کہ نہ صرف قوم بلکہ ملت اسلامیہ کے اس محسن کو ہم نے عزتیں دینے کی بجائے کیا دیا..... صرف رسوائیاں، جگ ہنسائیاں، بدنامیاں، پشیمانیاں، الزام تراشیاں، کردار کشی، پریشانیاں، بدگمانیاں، کیا ہم اللہ کریم کے دربار میں سرخرو ہو سکیں گے! کیا تاریخ ہمیں معاف کر دے گی!!؟؟

المکتبۃ الرحمانیۃ

"قلم کے آنسو" کے متعلق

محسنِ پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خان فرماتے ہیں

برادرم جناب محمد طاہر نقاش صاحب کی تحریر کردہ کتاب

قلم کے آنسو

پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ جب شروع کی تو ختم ہونے تک ہاتھ سے رکھنے کو جی نہیں چاہا۔

جس طرح قرآن شریف اور اس کی تفسیر کے بعد صحیح بخاری شریف، سیرت النبی، تاریخ اسلام، تذکرۃ الاولیاء، بہشتی زیور وغیرہ ہر مسلمان گھرانے میں لازمی طور پر ہونا چاہئیں۔ بالکل اسی طرح محمد طاہر نقاش صاحب کی لاقیمت، بے انتہا مفید کتاب "قلم کے آنسو" بھی ہر مسلمان گھر کی زینت ہونی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نقاش صاحب کے قلم میں مزید قوت عطا فرمائے، تاکہ وہ مسلمان امت کی مزید خدمت کرسکیں۔ آمین!

احقر: ڈاکٹر عبدالقدیر خان

ڈاکٹر عبدالقدیر خان

۱۹/اکتوبر ۲۰۰۸ء اسلام آباد